جمیلہ ہاشمی

دشتِ سُوس

حسین بن منصور حلّاج ——— ایک غنائیہ

صدائے ساز

نغمۂ شوق

زمزمۂ موت

جمیلہ ہاشمی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

موت کی آغوش میں ڈوبے دو سفینوں

عائشہ کے بابا اور اپنے ابّا کے نام

دشتِ سُوس

حُسین بن منصُور حلّاج ـــــ ایک غِنائیہ

صدائے ساز

مسجد کا صحن نمازیوں سے پُر تھا اور میناروں پر ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں گلرنگ روشنی سے دھندلے سفید اجالے میں اور پھر دھواں دھواں نیلے اندھیرے میں بدل رہی تھیں۔ مؤذن نے اپنی جگہ سنبھالنے کے لیے پہلی سیڑھی پر قدم دھرا، وضو خانوں میں پانی رواں ہونے کی صدائیں آئیں، کاروانوں کے سالار اونٹوں کو روکے رکھنے کا حکم دے کر ساربانوں کی معیت میں دالان در دالان اونچی چھتوں سے مزین صحنوں میں داخل ہوئے۔ لوگ درود وسلام میں منہمک اور پھر خاموش ہو گئے۔ اذان کا جلال آسمانوں اور زمینوں پر منکشف ہوا۔ اونچے ایوان سبزہ زار اور باغوں سے گھری بستی میں یہ مشکبو گونج ہوا کے ساتھ ساری پستیوں اور بلندیوں پر جاری و ساری بلند ہوئی۔

درویشوں کی ایک ٹکڑی اپنے فرغلوں کو سنبھالتی ہاتھوں سے کلاہ تھامے ایک اندازِ مستانہ سے چلتی اپنے نعروں کے خروش کو اپنے سینوں میں دبائے ملحقہ خانقاہ سے آکر نمازیوں کی صفوں میں شامل ہو گئی۔ یہ غیاب... حضور کی کیفیت سے سرشار عجیب لوگ تھے کہ جب سجدے کے لیے جھکتے تو انہیں اٹھنے کا ہوش نہ رہتا۔ جب اٹھتے تو امام کی آواز سنائی دینے کے باوجود کھڑے رہتے۔ یہ کیسی نماز میں سرشار تھے؟

نمازی اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہے تھے، جب انہیں نماز کا ہوش نہیں تھا تو یہ جماعت میں کیوں شامل ہوئے تھے؟ آج سے پہلے ایسی کسی جماعت نے نماز میں شرکت نہ کی تھی جو امام کے پیچھے اپنی الگ نماز میں مشغول ہو۔ خانقاہ میں یہ کہاں سے وارد ہوئے تھے؟

نماز ختم ہوئی تو بعض لوگ ان درویشوں سے بچ کر باہر نکلے اور کچھ ان کے

گرد حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے کہ جب وہ فارغ ہوں تو ان سے استفسار کیا جا سکے۔ خضوع و خشوع کی کونسی کیفیت تھی جو ان کے سجدوں کو طویل اور ان کے قیام کو طویل تر کر رہی تھی؟ دعا میں ان کے ہاتھ سینوں پر بندھے تھے۔ وہ سر جھکائے تھے اور کم پڑتی روشنی میں ان کے چہرے آنسوؤں سے تر تھے۔ زاری والحاح سے ان کی جانیں کیوں اتنی بے تاب تھیں۔ ان کا مسلک کیا تھا؟ مناجات کا طریقہ انہوں نے کہاں سے سیکھا تھا؟

نہایت عاجزی سے ان میں سے ایک نے جس کے شانے بیٹھے ہوئے باقی لوگوں سے ذرا بلند اور گردن لمبی تھی ہاتھ سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

عشق ایک مزرعِ گلاب ہے
اس کی پگڈنڈیاں ان کے لیے ہیں
جو عاشقوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں
عشق کی نشانیاں توفیق اور مہربانیاں
ان کی منزل ہیں
اور مہجوریاں غم خاموش اور برداشت
کبھی نہ ختم ہونے والا سوز ہیشگی اور اذیت ناکی
اس کی شان ہے
اس کے سوا باقی سب گم کردۂ منزل
جہالت اور وحشتِ تنہائی
اور بے جادہ گردش ہے
عشق مزرعِ زندگی ہے

کاروانِ سالار آقائے رازی نے اپنے قریب بیٹھے کلاہ پوش کا کندھا ہلا کر کہا۔ "یہ دل سوز لَے اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنی۔ کیا کلام ہے اور کیا ادائیگی، کیا نغمہ ہے، کیا جان کو پگھلانے والے بول۔" اس نے بیٹھے بیٹھے اپنے زانو پر زور سے ہاتھ مارا۔

اس کے سوا باقی سب گم کردۂ منزل

درویش نے اس کی طرف منہ کر کے نہایت آہستگی سے کہا۔ "ہاں، اس کے سوا باقی سب گم کردۂ منزل۔" یہ اوائل شعبان کی راتیں تھیں، نیم گرم ہوا ستاروں کے ساتھ باغوں کی خوشبوؤں پر اتر آئی تھی اور آسمان درویشوں کی صداؤں پر نفس گم کردہ مراقبے میں کھویا ہوا صوفی تھا۔

کاروانوں کے گزرنے کی شاہراہ جو خُتن سے دمشق کو جاتی تھی اس بستی کو چھو کر گزرتی تھی اور یہ مسجد جو اس کے انتہائی سرے پر تھی نارنگی کے پھولوں کی خوشبو سے بھری تھی اور مسافروں سے آباد رہتی تھی کیونکہ یہاں جاری پانی تھا اور ذکر کی محفلیں رات کے ہر حصّے میں بپا رہتیں اور اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹیں حدی خوانوں کی نواؤں کے ساتھ برابر سنائی دیتیں۔ کبھی تیز جب منزل دور ہوتی چلنے والوں کے قدموں کو تیزی کی ضرورت ہوتی کبھی نہایت آہستہ جیسے منزل کے قرب کا احساس بے خودی میں بدل جائے۔

آقائے رازی دمشق سے خُتن جا رہا تھا اور سامانِ تجارت سے لدے اس کے اونٹ مسجد کے باہر بس ذرا کی ذرا رُکے تھے۔ اس کے قافلے کو صبح تک چلتے رہنا تھا اور کہیں اگلی بستی میں ان کا قیام ہوتا۔ جب سورج ان کھنڈروں پر سے طلوع ہوتا جو کتنی تہذیبوں کے آغاز اور انجام پر گواہوں کی طرح انسانیت کی عدالت میں حاضر تھے۔ عبرت پر صاد کرنے کے لیے بہت بہتر اور بہت عمدہ لوگوں کے مدفن رواجوں، مذہبوں، سلطنتوں کے نشان اور سورج پر گواہی دینے کے لیے کہ سفر جاری رہتا ہے، بنا اس خیال کے کہ دنیا میں کون ہے!

مگر کاروان سالار نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ باہر نکل کر اس نے ساتھیوں سے کہا کہ وہ قریب کی پہلی سرائے میں ٹھہر جائیں، اونٹوں کو چارہ اور پانی دیں، سامان اتار لیں اور ستانے کے لیے کمریں کھول لیں۔ مسافر حیران ہوئے مگر وہ ایک اچھا ساتھی اور مہربان سالار تھا۔ دانشمند اور دکھ درد میں شریک ہونے والا بلا وجہ راہ میں توقف کرنے والا بھی نہیں تھا۔ منزلوں کو بے جا طول دینے والا اور راہ میں ٹھہرنے والا بھی نہیں۔ لوگوں نے بنا سوال کیے سرائے کا رخ کیا اور آقائے رازی نے اس حلقۂ ذکر میں جس کو پُرسوز لَے میں ایک درویش تھامے تھا، پھر شرکت کی۔ ہولے ہولے نوا بلند اور لَے تیز

ہونے لگی۔ صحنِ مسجد میں ادھر ادھر بکھرے مسافر اور نمازی گویا ایک نادیدہ رشتہ سے بندھے حلقے میں بیٹھتے گئے۔

اس کے سوا باقی سب گم کردۂ منزل

جب ایک درویش چپ ہوتا تو دوسرا

"جہالت اور وحشتِ تنہائی اور بے جا گردش"

کا ذکر شروع کرتا۔ باری باری وہ سب اپنے گرد ہونے والے مجمع سے بے پروا سر جھکائے اپنے آپ میں مشغول تھے۔ یہاں تک کہ عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا۔ نمازی پُر جلال بلاتی ہوئی، ہوش دلاتی ہوئی ربِ جلیل کی طرف سے ہوش دلاتی صدا سن کر وضو خانوں کی طرف بھاگے۔ درویش پھر امام کے پیچھے اپنی نمازیں قائم کرنے کے لیے خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔

رات کا آسمان ستاروں سے مزین گھرا چاندنی میں دھلا دھلا اور زردی مائل تھا اور کہکشاں کروڑوں زمین سے بھی بڑے سیاروں سے سجی اپنی خاکساری میں سب سے زیادہ روشن ایک بڑے دھارے کی طرف افق سے تا با افق اپنے غبار میں ڈھکی بہہ رہی تھی اور بستی سے پرے کھلا صحرا ریت کے ژولیدہ لہریوں میں الجھا ہوا تھا اور قافلے رواں دواں شاہراہ پر سے گزر رہے تھے اور شعبان کی آباد راتوں کی رونق میں اضافہ کر رہے تھے۔

جب درویشوں کی نماز طویل ہو گئی تو آقائے رازی چغہ اپنے گرد لپیٹ کر اٹھا اور سرائے کی طرف روانہ ہوا۔ اس سے پہلے بھی وہ اس سرائے میں قیام کر چکا تھا۔ ایک آتش پرست مخّی اس کا مالک تھا۔ مخّی لین دین میں ایماندار اور نیاز مند تھا۔ اسے مسافروں کے آرام کا بطورِ خاص خیال رہتا تھا۔ جب دشتِ سُوس کی کھلی ہوائیں یخ کرنے والی سردی سے بریشان کرتیں تو وہ سرائے میں اقامت گزیں لوگوں کے لیے آگ تاپنے اور کوٹھڑیوں کو گرم رکھنے کا بندوبست کرتا اور اس کے لیے وہ زیادہ دام بھی وصول نہیں کرتا تھا۔ لوگ کہتے تھے وہ آتش پرست ہے اس لیے اپنی عاقبت سنوارنے کی خاطر ایسا کرتا ہے، مگر وہ ان سب باتوں سے بے پروا تھا۔ گرمی کی شدت میں جب سورج صبح ہی سے بے پناہ تیزی سے چمکتا تو ٹھنڈے پانی کا بندوبست بھی وہ اسی التزام

سے کرتا۔ ڈھکے ہوئے حوض لبالب ہوتے اور نہانے کے لیے علیحدہ جاری پانی ہوتا۔
اس کی طبیعت میں انکساری اور خوفِ خدا تھا جس کا اعلان وہ کبھی نہیں کرتا تھا، مگر جانوروں تک کی نگہداشت کرنے میں اسے کوئی امر مانع نہ ہوتا۔ اس لیے سرائے میں ایک الگ احاطے میں سایہ دار درختوں تلے ان کے لیے باندھنے کی جگہ تھی اور چارہ بھی مہیا کیا جاتا تھا۔ وہ اونٹوں اور خچروں کی چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج بھی کر سکتا تھا اور قافلے والوں میں سے جب کسی کی طبیعت خراب ہوتی تو پریشان ہو جاتا۔ بستی میں ایک دانا حکیم تھا جو اکثر سفر پر رہتا مگر محّی نے کچھ دواؤں کے نام اور بیماریوں کے علاج اس سے دریافت کر لیے تھے اور ذرا سی ناسازیٔ طبع میں وہ اپنی یادداشت کام میں لاتا۔
آقائے رازی سے اور اس سے گہری دوستی کا تو نہیں مگر ایک خاموش معاہدے کا سا رشتہ تھا۔ جب بھی قافلہ یہاں سے گزرتا تو سرائے میں ضرور قیام ہوتا۔ اب کے بھی ایسا ہو ہی گیا تھا اگرچہ یہ رواں رہنے کا وقت تھا اور قاعدے کی رُو سے انہیں سفر جاری رکھنا چاہیے تھا۔

جب لوگ داستان گو کے پاس بیٹھ چکے اور قصّہ گو نے پرانے بادشاہوں کے نام سے اپنے قصے کا آغاز کیا تو آقائے رازی محّی کے پاس ہو بیٹھا۔ وہ اندر سے بہت مضطرب تھا۔ اس نے آج تک بہت سفر کیے تھے۔ اصل میں وہ ہمیشہ قافلوں کے ساتھ کوہ و صحرا میں سرگرداں رہا تھا۔ تیز بہتے دریاؤں کے ساتھ ساتھ پہاڑوں میں نہایت بلندی سے جا کر وادیوں میں اترتے راہوں پر اس نے چابکدستی سے اپنے سارے سفر کیے تھے۔ آنکھیں کھلی رکھی تھیں اور کانوں کو ہر آواز پر لگائے رکھا تھا۔ ہمت اور دانائی سے اس نے بہت کچھ دیکھا، بہت ان کہی باتیں سنیں اور بہت کچھ برداشت کیا تھا۔ بچپن سے اب تک اس نے زمانہ دیکھا تھا۔ ہاں! زمانہ دیکھا تھا اور اس کے الٹ پھیر دیکھے تھے۔ اس نے نئے فرقوں اور نئے مذہبوں کو طلوع ہوتے اور غروب ہوتے دیکھا تھا۔ نئے مہدی جو دنیائے ختم کی گواہی دینے کے لیے اپنی امامت کا اعلان کرتے تھے اور پھر مارے جاتے تھے۔ نئے نبی جو عجیب و غریب شریعتوں کو لاتے اور پھر جھٹلائے جاتے اور دار پر کھینچے جاتے تھے۔ دنیا نئی دریافتوں سے کبھی خالی نہیں ہوئی۔ شوریدہ سر اور دیوانوں کے ذہنوں میں خیالوں کی یورشیں انہیں بے تاب کرتی اور موت کی طرف بلاتی

ہیں اور پھر وقت جو بے پایاں، مسلسل اور شکست دینے والا ہے کبھی نہیں رکتا اور ان بستیوں اور ان کے مکینوں پر سے گزرتا ہے تاکہ وہ جو پہلے گزرا ہے بھلایا جا سکے اور زمین نئے فتنوں کی آماجگاہ بنتی رہے، نئی رحمتوں کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتی رہے۔

"آقائے رازی! بہت اچانک آپ نے اپنا سفر ملتوی کیا ہے۔ گو میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے مگر میں جاننا چاہوں گا کہ کیا واقعہ تاخیر کا سبب ہوا ہے؟ اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو؟" مُحّی نے قالین کے حاشیے پر دو زانو بیٹھتے ہوئے ادب سے سر جھکا کر پوچھا۔ آقائے رازی نے کھلے دریچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "برادر مُحّی جو چیز میرے لیے حیرت اور دلچسپی کا باعث ہے وہ آپ نے شاید دیکھی بھی نہ ہو۔ شام مسجد میں چند ایسے درویشوں کو دیکھا ہے جو اپنی نمازوں میں غلو کرتے اور اپنی جانِ پُرسوز سے دلوں کو مضطرب کرتے ہیں۔ ان کی آوازوں میں بے پناہ سوز ہے مگر وہ کون ہیں، یہ جاننا بھی از حد ضروری ہے۔ کہیں وہ کسی نئے فتنے کو ہوا نہ دے رہے ہوں۔"

مُحّی ہنسا، دبی دبی سی خوشگوار ہنسی۔

"آقائے رازی بس اتنی سی بات؟ آخر آپ کس شے سے خوفزدہ ہیں؟ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر شخص جس کا مسلک الگ اور جس کا طریقہ مختلف ہو، کسی تازہ فتنے کا پیش خیمہ ہو اور پھر جانِ بے تاب کے لیے کوئی نام بھی ہو سکتا ہے مگر جہاں تک میری معلومات ہیں یہ لوگ سارے زمستان اسی خانقاہ میں مقیم رہے ہیں۔"

"کیا ہر نماز کے وقت ان کے وجد و کیف کا یہ حال ہوتا ہے؟"

"نہیں، مگر کبھی کبھار جب یہ زیادہ جوش میں ہوتے ہیں تو مسجد میں آتے ہیں ورنہ اکثر خانقاہ میں مراقبے میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی جماعت کو کبھی خانقاہ سے باہر آتے نہیں دیکھا گیا۔" آقائے رازی بہت دیر خاموش رہا۔ کچھ سوچتا ہوا، بہت کچھ یاد کرتا ہوا۔

"کیا آپ پسند فرمائیں گے اگر میں مقدس آگ سے مدد چاہوں کہ یہ گروہ ملک کے لیے سعید ہو گا یا منحوس۔" مُحّی نے بہت انکساری سے کہا۔ "ہمارے ہاں آتش سے شگون لینے کا رواج بہت پرانا ہے۔ ہماری برزِ سواہ جو کبھی بجھ نہیں سکتی جسے سورج کی کرن چھو نہیں سکتی۔"

"کیا مطلب سورج کے چھو نہ سکنے کا؟" آقائے رازی نے پوچھا۔

"یہ آگ اندھیروں میں تابناک ہوتی ہے۔ زندگی کے رہنے کا نشان۔ شعلہ مستعجل بے قرار اور ہمیشگی سے ہمکنار۔ دنیا کی رست خیز میں ایک جائے پناہ۔ دنیا کی تطہیر کرتی ہوئی اور جاودانی آسمان کی طرف اشارہ کرتی ہوئی انگلی کی طرح اٹھتی ہوئی سعود کی طرف مائل سعود کا حصہ جو زائد اور بے جا ہے، اس سے نجات دلانے والی، پاک کرنے والی۔"

آقائے رازی نے سر ہلایا۔

پھر دونوں خاموشی سے اندرونی کمرے کی طرف بڑھے جو تہہ خانہ تھا اور آتش کدے کا کام دیتا تھا۔ سلگتے ہوئے کندے پر خوشبودار لکڑی رکھ کر محّمی نے اسے ہوا دی، تو شعلہ بلند ہوا۔ پھر اس نے سپند کے چند دانے اس آگ پر ڈالے جو شاید تعداد میں سات یا پانچ تھے، انہوں نے ایک دم آگ پکڑی، چٹخے اور ننھے شعلوں کی طرح بڑے شعلے میں مٹ گئے۔ صرف ایک دانہ الگ رہا اور اس پر دور ہونے کی وجہ سے آگ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ محّمی آنکھیں بند کر کے دعائیں پڑھ رہا تھا۔

برکت دے اور ہم کو اٹھا سورج کی تپش اور برف کی ٹھنڈک میں

ہمیں ہمیشہ اپنے سیدھے راہ پر لگا

تمہاری جلائی ہوئی آگ اور تمہارا دین

ہمارا راہ نما ہو

سپند کے دانے کو ایک طرف پڑے دیکھ کر محّمی نے اپنا سر اور جھکا لیا۔ وہ دل ہی دل میں جانے کیا کہہ رہا تھا۔ آقائے رازی دلچسپی سے آگ کی روشنی میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ یہ عبادت جس کو آج تک اپنی انتہائی فطرت میں اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"آقائے رازی!" محّمی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ آگ جس کو میں نے آپ کے لیے فروزاں کیا تھا، میرے لیے فتنے اور مصیبتیں لائے گی۔ آہورامزدا میری مدد کرے اور مجھے اپنی پناہ میں رکھے۔"

"کیا خاص بات ہے برادر!" اس نے بہت فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں فکر کی کوئی بات نہیں۔ جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ آگ نے جس دانے

کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے وہ میرے گھرانے کا ہی فرد ہو گا۔ میرے خون کی امانت کو لیے ہوئے مجھ سے باغی میرا حصہ اور مجھ سے روگردانی کرے گا! جانے ابھی اندھیرے میں کیا کچھ ہے۔" پھر اپنے پیچھے تہہ خانے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "مگر آقائے رازی آپ کے لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔ نہ ملک کے لیے اور نہ حکومت کے لیے۔ میری آتش کبھی غلط نہیں کہتی اور میرا شگون کبھی غلط نہیں ہوا۔"

دونوں پھر قالین پر آن بیٹھے۔ باہر گرد باد کی وجہ سے رات دھندلا گئی تھی اور دشتِ سُوس پر مٹی اور ریت ملی ہوئی خوشبو کی طرح برس رہی تھی۔

"مگر اس سے پہلے میں ان درویشوں سے کبھی کیوں نہیں ملا؟" آقائے رازی نے کہا۔ "کیا تمہارے ہاں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نئے مسلکِ عبادت کے نئے طریقے رائج ہوئے ہوں؟ کسی آدمی نے دعویٰ کیا ہو کہ وہ دوسروں سے زیادہ جانتا ہے؟"

"ہمارے ہاں معینہ وقت پر ایک سوشیات آئے گا جو رستخیز میں دنیا کو بچائے گا، وہ کسی کسی کے خیال کے مطابق بہرام وڑ ہو گا، دنیا کو بچانے والا۔ جب بدی کی طاقتیں زور آور ہو جائیں گی اور اندھیرا ہر طرف سے چھا جائے گا، تب آہورامزدا اور اہرمن میں جنگ ہو گی اور یزدان جیت جائے گا۔ بدی رخصت ہو جائے گی، شکست کھا جائے گی اور امن وامان کا دور دورہ ہو گا۔ ایک طرح سے تو وہ امام مہدی ہو گا۔ تمہارے مذہب کا امام مہدی یا سوشیات یا بہرام وڑ جو تم اسے کہو۔" آقائے رازی نے بہت پُر امید ہو کر کہا۔

مُحّی نے قالین پر بیٹھے بیٹھے جھک کر اپنے گھٹنوں کو چھُوا۔

"ہاں آقا سوشیات جہاں کہیں بھی ہو گا پیدا ہو چکا ہو گا۔ اب دنیا فسق و فجور سے بھر گئی ہے۔"

وہ چپ ہو گیا تو آقائے رازی نے کہا۔ "میں ذرا خانقاہ کی طرف جا رہا ہوں تاکہ ممکن ہو تو ان درویشوں سے پھر ملاقات کروں۔ ہو سکتا ہے مجھے ان کے متعلق مزید کچھ معلوم ہو سکے۔ کل پچھلے پہر ہمارا کوچ ہو گا۔ تب تک کے لیے سارے انتظام امید ہے حسب دلخواہ ہو سکیں گے۔"

مُحّی نے سر جھکا کر صاد کیا۔

آقائے رازی نے عمامہ اپنے سر پر رکھا اور بڑے رومال سے منہ چھپا کر کہ

صرف آنکھیں کھلیں رہیں، سرائے سے باہر نکل گیا۔

کاروان سرائے میں عجیب گہما گہمی تھی، لوگ ٹولیوں میں بٹے یہاں وہاں باتیں کر رہے تھے۔ داستان سنانے والا ایک راوی تو نہیں تھا مختلف گروہ تھے اور الگ الگ تذکرے تھے۔ صحن میں درختوں کی سائیں سائیں آندھی کے شور، برستی ریت اور بکھری ہوئی داغ داغ چاندنی کی وجہ سے عجیب طلسم کا ساسماں تھا۔ پھر گھوڑوں کا ہنہنانا، اونٹوں کا جگالی کرتے میں سر ہونے سے گھنٹیوں کی آوازیں، گدھوں کا پچھلے پہر رینگنا اور شاہراہ پر جاتے ہوئے قافلوں کی مسلسل حرکت اور آگے بڑھنے کا احساس۔

"تم نے سنا ہے۔" عثمان بن عمر نے لیٹے لیٹے کہا "کہ مشرقی مُورت گر گئی ہے۔"

"مُورت کا کیا ذکر ہے؟" اس کے ساتھی نے یونہی پوچھا۔

"ہمارے بعد جو کارواں سرائے میں آکر ٹھہرا ہے، وہ مغرب سے آیا ہے اور ان لوگوں کے قیاس کے مطابق قاہرہ میں ابن سعد کی مسجد اور شہر کے درمیان ایک مینار ہے جس پر دو مورتیں بنی تھیں، ایک کا رخ سمتِ مشرق اور ایک کا رخ مغرب کی طرف تھا۔ مغربی مورت پہلے گر چکی ہے اور اس لیے مشرق نے مغرب پر تسلط جما لیا تھا۔ اب مشرقی مورت گر گئی ہے اور مغرب کے لوگ اس علاقے پر قابض ہو جائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قُربِ قیامت کے آثار ہیں۔"

"کب کب قیامت کے آثار ہویدا نہیں رہے۔" ساتھی نے پھر کہا "اور پھر قیامت اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک امام مہدی آسمان سے چالیس ہزار فرشتوں کے ہمراہ تشریف نہ لائیں، دنیا کو برائی سے پاک نہ کریں اور حکومت نہ کریں۔ تم آرام سے باقی رات گزارو اور غمگین مت ہو یار جانی کہ قیامت میں ابھی بہت دیر ہے اور پھر جب تک ہم اپنے اپنے وطنوں تک پہنچیں، امام مہدی کا ظہور نہیں ہو سکتا۔" اس نے ہنس کر بات ختم کی۔

"کیا تم زندگی اور موت پر قادر ہو؟" عثمان نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ایک طرح سے تو ہیں کہ امید پر چلتے رہتے ہیں، اس امید پر کہ لوٹ کر وطنوں میں آئیں گے اور جن کو پیچھے چھوڑا ہے ان سے پھر ملیں گے۔ خدا اتنا مہربان تو

ہے ہی کہ ہمیں مسافت میں بے آسرا موت نہیں دے گا۔ ہمیں اس کی مہربانی سے ناامید ہونا نہیں چاہیے۔''

''تمہارا فلسفہ امید اور زندگی کا ہے، مگر اتنی خوش کن باتیں ہمیشہ واقع نہیں ہو سکتیں۔ تمہیں معلوم ہے موت اپنا کوڑا لیے تلاش میں رہتی ہے اور چونکہ اندھی ہے، بے سوچے سمجھے اس کو لہراتی ہے۔ کون اس کی زد میں آ جائے، اسے کیا۔'' اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

''تم اتنے اداس ہو آج کی گھڑی یا حُزن پسند ہو؟'' ساتھی نے کہا۔

رقصاں درویشوں کا نیم دائرہ خانقاہ کے صحن میں ہولے ہولے گردش میں تھا۔ نقارہ بجانے والا تقریباً خوابیدہ جھکا ہوا کبھی کبھار نقارے کو ایک پتلی لکڑی سے بس ذرا چھیڑ دیتا اور پھر اس ارتعاش سے خود بھی مست ہو جاتا جو قدموں کی مسلسل مگر سنائی نہ دینے والی تھاپ سے اس کے خیال میں پیدا ہو رہا تھا۔ لمبی قباؤں میں ہوا بھرنے سے کبھی وہ دائرہ پھیل جاتا اور کبھی سکڑ جاتا۔ نیم شب کا چاند تابناک اور ماند ستاروں کے گھیروں میں کبھی زیادہ روشن ہو جاتا اور کبھی بجھا بجھا سا۔ ہوا کبھی چلنے لگتی اور کبھی تھم جاتی۔ دراز قد اور سفید ریش اپنی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتا تو سب حرکتیں ساکن ہو جاتیں جیسے موت کا سانس قریب اور قریب ہو۔ حلقہ تنگ ہو جاتا اور سر ایک ساتھ جھک جاتے۔ پھر نقارے پر ہلکے سے چوٹ پڑتی جیسے برفانی سرد ہواؤں میں کوئی پیچھے رہ جانے والا پرندہ یکلخت چیخنے لگے۔ قدم آہستگی سے اٹھتے اور ان پر آہوں کا گمان ہوتا۔ ہر درویش اپنے گرد اپنے دائرے میں الگ گھومتا اپنی نمازِ عشق اپنے طور پر قائم کرتا۔

آقائے رازی حوض کے کنارے بیٹھ گیا اور اس کے تھمنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر شائد یہ رقص نامختتم تھا کہ جاری تھا اور کسی طور کوئی آثار اس کے انجام تک پہنچنے کے نہیں تھے۔ نقارہ بجانے والا شاید محو خواب تھا اور رقص کرنے والے محو خروش تھے کہ ان کا خروش ان کے سینوں کے اندر ان کی جان کو نہایت مضطرب کیے ہوئے تھا اور ان کے قدم اور ان کے خاکی جسم ان کی آرزوؤں کے دائرے میں محو خرام تھے۔ پھر جب ستاروں کا قافلہ جانبِ مشرق جھکنے لگا اور ناہیدِ آسمان تھک کر تھمنے لگی اور بادِ صبحگاہی

نے چلنا شروع کیا، پرندے ایک ایک دو دو درختوں میں روشنی اور خوابوں کی وجہ سے چونکنے لگے تو آقائے رازی جو شب بیداری سے نہیں گھبراتا تھا، کیونکہ اس کا عادی تھا، نقارہ بجانے والے کی طرف گیا۔

"تم بھی اس تلاش میں آئے ہو کہ ان کا راز معلوم کرو۔" اس نے نقارہ ایک طرف رکھ کر کہا۔

رازی نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔

"تو پھر سوچ لو۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "یہ راز ایسے ہی رہے گا، وہ صرف نماز پڑھنے کے لیے تھمتے ہیں اور وضو کرنے کے لیے رکتے ہیں، رقص کناں سوتے ہیں، ان کی جسمانی حاجتیں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں اور سوائے اپنی مناجات کے وہ آپس میں بھی بات نہیں کرتے۔ وہ صرف الحاح وزاری کرتے ہیں تو ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔"

"وہ کب سے اس خانقاہ میں ہیں اور تم کب سے ان کے نقیب بنے؟" رازی نے ویسے ہی سرگوشی میں کہا۔

"مَیں ان کا ساتھی نہیں ہوں، میرا تعلق اس خانقاہ سے ہے۔ میں یہاں نقارہ بجانے پر ملازم ہوں۔ میرا مطلب ہے زمانوں سے میں یہاں پر ہوں۔"

"مگر تم ان کے لیے نقارہ بجانے پر کیسے لگ گئے؟" رازی نے اس سے ذرا وضاحت سے پوچھا۔

"یہ بھی بس ایک الگ کہانی ہے۔ ایک دن جب تہجد کے وقت پانی بھرنے کے لیے میں اندر آیا تو ان کو میں نے یہاں رقص کرتے پایا۔ نقارہ لے کر یونہی میں نے چوٹ کی تو ان کے رقص میں یوں طوفان سا آ گیا جیسے پہاڑی خشک دریا میں اچانک پانی کا ریلہ آ جائے۔ تب سے میں بھی یہاں ہوں اور عجیب رشتے میں پرو دیا گیا ہوں کہ میں نقارہ چھوڑنا چاہنے پر بھی اسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

"لوگوں کو تعجب نہیں ہوتا، وہ پوچھتے تو ہوں گے؟" رازی نے کہا۔

"مگر وہ جواب کس سے چاہیں گے، جواب کون دے گا۔ مجھے تو اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں جو مَیں نے بتا دیا ہے۔"

"یہ شاید ہماری زبان بھی نہیں سمجھتے۔" اس نے ہولے ہولے کہا اور نقارے پر چوٹ کی۔

پھر صبح کی اذان کے لیے موذن سیڑھی پر چڑھا، مینار کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا اور اس نے لوگوں کو نیند سے بیدار کرنے کے لیے انہیں جنت کی بشارت دی۔ انہیں بتایا کہ نماز نیند سے افضل ہے، خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے گواہی دی کہ وہی آقا ہے اور اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہی ہر طرف شش جہات سے آئینہ اور آئینوں کے مقابل پرتو بھی خود اور پرتو میں منعکس بھی خود اپنی عظمت پر آپ گواہی دینے والا، کیونکہ اس کی گواہی دینے والا بھلا کون ہو سکتا ہے؟ اسے جاننے والا کون ہو سکتا ہے؟ وہ تخلیق کرنے والا خالق بھی خود اور مخلوق کی جانوں کا امین بھی خود۔ روحوں کو پیدا کرنے والا بھی اور روحوں کے جواب "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" سننے والا بھی۔ جب اس نے چاہا کہ اپنے آپ کو دیکھے تو اس نے دنیا بنائی۔ ہر شے سے ماورا بھی اور ہر ایک میں جلوہ فگن بھی۔ پتہ نہیں جب ہر طرف وہ خود ہے تو وہ پوشیدہ کس سے ہے؟ اس کی زیبائی، اس کی رعنائی اس کے سوا کون جان سکتا ہے۔ آدمی کو پیدا کر کے اس کی نارسائی پر بھی وہ خود ہی خندہ زن ہے۔ انسان کی کوششوں کو کبھی وہ شرفِ قبولیت بخشتا ہے اور کبھی رقص میں محو رکھتا ہے۔ بس رقص میں لگے رہنے کی طاقت دیتا ہے اور اس سے آگے؟ جب تک وہ توفیق نہ دے، بھلا کون ہے جو کچھ بخشنے کے قابل ہو؟

اذان کی صدا سن کر درویشوں کے قدم تھم گئے۔ ایک مخلوق وضوخانوں کی طرف بڑھی، چشمے کا پانی رواں ہوا، شفاف میٹھا پانی جو نور کے دھارے کی طرح تھا اور فرحت بخش تھا۔ امام کے پیچھے کھڑے ہو کر آقائے رازی نے نماز پڑھی اور سجدے میں نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ دنیا کے لیے، کائنات کے لیے، اپنے لیے، اپنے پیاروں کے لیے اس نے وہ سب دعائیں پڑھیں جو اسے یاد تھیں۔ جانے کتنی دیر وہ خالقِ کائنات کے سامنے ہاتھ پھیلائے، نظر جھکائے دل اور جان کی ساری حضوری کے ساتھ دعا مانگتا رہا۔ آنسو اس کی انگلیوں، ہتھیلیوں اور چہرے پر بارش کے پانی کی طرح تھے۔ اس کے دل کی کدورتوں کو، اس کے نفس کی کثافتوں کو دھویا جا رہا تھا۔ جیسے بارش ہوا کو دھو کر سبک، نرم اور شفاف کر دیتی ہے۔

جب غبار ڈھل چکا اور سکونِ قلب ہوا تو اس نے دیکھا، درویشوں کے گروہ کا پتہ نہیں تھا۔ نقارہ بجانے والا وہیں حوض کی منڈیر پر سویا ہوا تھا اور اسکے ہاتھ میں چوبِ خشک، جس سے وہ نقارے پر چوٹ لگاتا تھا، ٹوٹی پڑی تھی۔ دیر تک آقائے رازی حیران اور کھویا ہوا سا وہیں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سوچا خدا کو شاید ابھی اس راز سے پردہ اٹھانا مقصود نہیں ہوگا۔ جانے کیا راز ہے، میں اس کی ٹوہ میں بھلا کیسے لگ سکتا ہوں۔ میں جو مسافر ہوں اور محض تجسس کی وجہ سے میں نے ایک رات گنوائی ہے۔ میں جس پر قافلے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے اور جس نے اپنے دل کی تسکین کے لیے اس پردے کے پیچھے جھانکنا چاہا جس پر میرا کوئی اختیار نہیں تھا، میرے لیے تو صرف سفر کی شرط ہے، سفر کی۔ اور ذکر و حضوری کی یہ رات میں نے گنوا دی! اس پر مایوسی اور ندامت کا ایک حملہ سا ہوا۔ شعبان کی یہ مبارک ساعتیں جو پھر لوٹ کر نہیں آئیں گی، وقت جو لمحہ لمحہ گریزاں تھا، گھٹ رہا تھا اور جو پل پل ہمیشگی کا ماضی کا حصہ بنتا جاتا تھا۔ وقت جو ازل سے ہے اور جاری رہے گا، وقت جو آدمی کی شکست اور اس کی گھنگی ہے، بے پایاں، مسلسل جس کو کوئی سمجھ نہیں سکا مگر جو ان بستیوں اور زمینوں اور ان مکینوں پر سے گزر جاتا ہے۔

دنیا شورشوں سے پُر ہو گئی تھی۔ ہمیشہ سے تھی، نئے فتنے پرانے رنگوں کے لبادے اوڑھ کر سر اٹھاتے تھے۔ قرامطہ اور معتزلہ اور صاحب الزنج وہ اسلام میں موشگافیاں کرتے تھے اور دنیا کی محبت میں دیوانے تھے۔ انہوں نے نئی شریعتیں رواج دی تھیں اور نئے فلسفے تعمیر کیے تھے۔ وہ عقل و دانش کی روباہی سے دنیا پر مسلط ہو جانے کے خواب دیکھتے تھے اور مال و دولت پر جان دیئے دیتے تھے۔ انہوں نے نئے مذاہب کی بنیادیں رکھی تھیں اور نئے کلمے ایجاد کیے تھے۔ وہ قرآن کا جواب لکھتے تھے اور خدا کو اس کے کلام میں (نعوذ باللہ) شکست دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے سحر کے زور سے اپنی طاقتوں کو صیقل کیا تھا اور اس کے بل بوتے پر وہ دلیر ہو گئے تھے۔ ایسے گیدڑوں کی طرح جو شیر کی کھال پہن کر جنگل کے قانون کو ہاتھ میں لے لیں۔ انہوں نے خلقت میں فتنے پیدا کیے تھے اور ہزاروں سادہ لوح لوگوں کی گمراہی اور موت کا سبب ہوئے تھے۔ انہوں نے علماء کی جانوں کو فتنے میں مبتلا کیا تھا اور بے وقوفوں کے لیے سستی،

آسان اور قابل حصول جنت کا وعدہ کیا تھا جس کو بنا اس راہ میں کوئی مصیبت اٹھائے اور جان کو ہلکان کیے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ہاروت ماروت کی طرح جو سحر سیکھنے کے چکر میں چاہِ بابل میں قید کر دیئے گئے تھے۔

آقائے رازی نے نقارہ بجانے والے کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور سرائے میں جا کر اس نے محّمی کو سب واقعہ سنایا اور خود سونے کے لیے لیٹا کہ شاید نینداس اضطراب کو کچھ کم کر دے جو اس کے قلب میں بپا تھا۔ لگتا تھا اس نے خواب دیکھا ہے۔

اس کے سوا سب گم کردۂ منزل

عشق مزرعِ گلاب ہے

عشق مزرعِ زندگی ہے

رقص کرتے ہوئے درویش ان کے سر پر اونچے کلاہ اور بہت ڈھیلی قبائیں تمام رات وہ تقریباً ان کے قریب ہی کہیں موجود رہا تھا، مگر ان کے چہرے اس کی نظر سے پوشیدہ رہے تھے۔ کیا وہ ان کے دل کا راز جان گئے تھے یا پھر اس کی نظر کا دھوکا تھا۔ نماز کی جماعت میں وہ رکوع و سجود کی قید سے آزاد تھے اور پھر وہ اپنی کوشش کے باوجود انہیں دیکھ نہ سکا تھا۔ کیا اس نے انہیں دیکھنا نہیں چاہا؟

تیز روشنیوں والا دن ڈھل چکا تھا۔ سائے لمبے ہو کر ذرا ٹھنڈے ہو گئے تھے جب محّمی نے اسے بیدار کیا۔ وہ خواب دیکھتا رہا تھا جس کا بے کنار بحر کی طرح کوئی کنارہ نہ تھا۔ جس میں نہ کوئی شے واضح تھی اور نہ ہی پوشیدہ۔ پھیکی بے کیف بے آرام نیند سے جاگ کر اس نے کوچ کا حکم دیا کیونکہ اب انہیں تمام رات سفر کرنا تھا اور اگلی صبح کے قریب کہیں ان کا قیام ہو گا۔ وہ راستے میں صرف نمازوں کے لیے رکیں گے اور پھر سفر پر رواں ہی رہیں گے۔

ہوا میں مگس کی بھنبھناہٹ اور پھولوں کی خوشبو تھی۔ مکھیاں آنے والے موسموں کے لیے شہد تیار کرنے میں لگی تھیں اور تندی سے مسافروں کا پیچھا نہیں کرتی تھیں۔ باغوں کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ گھنٹیوں کے شور کو بھی نظرانداز کر دیتیں اور خوب مصروفیت سے وہ رس جمع کرنے میں لگی تھیں۔ اونٹ موسم کے کیف و مستی کو محسوس کرتے اور اپنے بار سے بے نیاز لمبی قطار میں سے باہر نکلنے کے لیے ضد

کرتے اور بے فائدہ چکر لگاتے، بلبلاتے جیسے ناچنا اور بولنا چاہتے ہوں۔ گدھے اور خچر شرارت پر اتر آتے جیسے پیٹھ پر بندھے بوجھ سے نجات حاصل کرنا ہو اور پھر بے چین ہوتے۔ پانی کے مشکیزوں میں حوضوں سے پانی بھر لیا گیا تھا اور بستی کے لوگ ضرورت کی چیزیں فروخت کرنے کے لیے قافلے والوں کے گرد اژدہام کیے ہوئے تھے۔ شور و غوغا، رختِ سفر باندھنے اور مسافروں کو بار بار بلانے کی ضرورت۔ ہولے ہولے سائے اور لمبے ہوتے گئے۔ مسجدوں میں اذان کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اونٹوں پر بیٹھے ایک دو لوگوں نے بربط اپنے سامنے رکھ لیے، شاید وہ رات کی خاموشی میں، تاروں کی روشنی میں، بہار کی سحر طراز ہوا میں موسیقی کی دلنواز تانوں سے اپنا جی خوش کرنا چاہیں۔

باغوں میں بلبلیں گا رہی تھیں جب قافلہ دشتِ سُوس کی زرد اور سرخی مائل سیاہ ریت کے قریب سے نکلا ہے۔

مُحّمی نے الوداع کہتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے اگلے پڑاؤ پر آپ کی ان درویشوں سے ملاقات ہو کیونکہ نقارہ بجانے والے کی روح تو ان کے پیچھے سرگرداں ہونے کے لیے پہلے ہی روانہ ہو چکی ہے۔"

آقائے رازی نے تاسف سے اس کی موت پر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ o پڑھا۔ پتہ نہیں اس کو سفر میں کیا پیش آنے والا تھا کیونکہ یہ دو بڑی ناکامیاں تھیں جو اس کی جان کا عذاب بن گئی تھیں اور باوصف نہ چاہنے کے وہ دونوں میں اپنے آپ کو قصوروار سمجھتا تھا۔ درویشوں کا یوں نگاہوں سے پھسل کر گم ہو جانا اور نقارہ بجانے والے کی موت!

شعبان میں قافلے ختن سے دمشق کی طرف تو جاتے تھے مگر شاذ ہی کبھی کوئی قافلہ ختن کی طرف جاتا ہوا یہاں سے گزرتا۔ لوگ اس مہینے کے احترام کی خاطر وطنوں کو جلد لوٹتے تاکہ رمضان کے دنوں میں باآسانی گھروں میں آرام سے رہیں۔ اس لیے محمی کو اس ایک قافلے کے بعد کام کا زیادہ بوجھ نہیں تھا۔ وہ ایک آزاد خیال آتش پرست تھا اور جندیسابور کے مدرسے میں فلسفۂ لاہوت کی درس و تدریس کا جو کام ہو رہا تھا اس میں خاصی دلچسپی رکھتا تھا۔ اسے معتزلہ کے عقائد سے ہمدردی تھی۔ انہوں نے دلائلِ عقلی اور براہینِ غیر منقول سے جس طرح اپنے مخالفوں کو ہرانے میں فوقیت

حاصل کی تھی، اس پر اسے تعجب ہوتا تھا۔ وہ علم الکلام کا طالب علم تھا۔ اور جس طرح ایک ہوشیار وکیل اپنے دلائل سے حاضر کو غائب اور غائب کو حاضر ثابت کرنے پر قدرتِ کاملہ رکھتا ہے، اسی طرح معتزلہ بھی نہایت ہوشیاری سے اپنے عقائد کو صحیح ثابت کر سکتے تھے۔ پھر ہر مکتبۂ خیال کے استاد نسطوری عیسائیوں کے اس مدرسے میں آن شامل ہوتے تھے۔ یونان کا فلسفہ خلیفہ منصور کے وقت سے ہی یہاں پڑھایا جاتا تھا اور ذہنوں کو جلا بخشتا تھا۔ اگرچہ معتزلہ مجوسیوں کے سخت ترین مخالف تھے مگر یہ بات مخّی کو حیران کرتی تھی کہ وہ کس خوش اسلوبی سے ہر مخالف کو منہ توڑ جواب دینے پر قادر تھے۔ اس کا اپنا بیٹا منصور اسی مدرسے میں طالب علم رہا تھا اور مجوسیت کے خلاف اسے اتنا قائل کر لیتا کہ وہ آتش پرستی کو کفر سمجھنے لگتا، حالانکہ وہ ثنویت اور مانویت سے دور تھا۔ وہ صرف زرتشتی تھا۔ بحث کی محفلوں میں منصور کو شکست دینا ناممکن تھا اور سرشاری کی کیفیت جو زیادہ آگاہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا اور اسے اپنے مجوسی ہونے پر فخر تھا، مگر ایک دیوانگی کی حد تک محبت جو عقائد کو غیر متزلزل بنا دیتی ہے، آدمی نامعلوم سے لڑ جاتا ہے، جان کی پروا نہیں کرتا۔ اس کا بہر حال دور دور پتہ نہ تھا کیونکہ یہ علم الکلام کے عام ہونے کا زمانہ تھا اور فتنے بیدار ہو رہے تھے۔ ان فتنوں سے دور رہنے کی خاطر منصور نے اپنے آپ کو مخّی کے ساتھ سرائے میں نہیں لگایا تھا اور یہ کاروبار اس کے مزاج کے مطابق بھی نہیں تھا۔ وہ دشتِ سُوس کے کنارے کنارے ذرا اوپر کی طرف ایک ایسے قصبے میں سکونت پذیر تھا جہاں شہتوت کے درختوں کے جنگل تھے اور ریشم کے کیڑے پالنے اور پھر ریشمی کپڑا بُننے کا کام ہوتا تھا۔ یہ ہنر زمانہ قدیم میں وہاں کے لوگوں نے چینیوں سے سیکھا تھا اور اس صدی کے شروع میں اسے وہاں رواج دیا تھا۔ آب و ہوا شہتوت کے لیے سازگار تھی اور اس سارے عرصے میں باقی باریکیاں سیکھ کر اب جو کپڑا وہ بناتے تھے وہ کسی طور بھی چینی ریشم سے کمتر نہیں ہوتا تھا۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس میں جو نفاستیں ہونی چاہئیں، ایرانی مزاج کی جدت اور حدت وہ سب اس میں سرایت کرتی جاتی تھی۔

سلطنتِ اسلامیہ یوں بھی بڑھ اور پھیل رہی تھی۔ خود مختار ریاستوں کا ایک نیم

دائرہ تھا جو بغداد کے نقطے کے گرد وجود میں آیا تھا۔ یہ وہ حکمران تھے جنہوں نے اپنے
اپنے صوبوں میں اپنے خاندانوں کی حکومتوں کی بناڈالی تھی۔ وہ عظیم الشان سلطنتوں
کے بانی مبانی تھے اور دربارِ خلافت کی طرف ایسے دیکھتے تھے جیسے اپنے گھر میں مطمئن
اولاد اپنے والدین کے گھر کی طرف دیکھے۔ اطاعت گزار، احسان مند اور خود مختار۔
بغداد کے گرد اور دربار بڑھتے جارہے تھے جو شان و شوکت میں کسی طور اس سے کم نہ
تھے مگر جو سعادت مندی کی وجہ سے اپنا سر جھکائے رکھتے تھے۔

ہنر مند لوگ جو اقصائے عالم سے کھنچ کر دربارِ خلافت میں باریابی کے لیے
برسوں منتظر رہتے تھے اب اور ٹھکانوں کی طرف بھی دیکھ سکتے تھے اور اس لیے ان
علاقوں میں چینی حریر و دیبا کی مانگ بھی بڑھ گئی تھی۔ منصور نے اپنا کاروبار بہت پھیلایا
نہیں تھا، مگر وہ جو کچھ بھی بناتا تھا اس میں اس کی ندرتِ طبع اور جدتِ خیال نے عجیب
موشگافیاں کی تھیں۔ لوگ منصور کے نام کو ایک سند سمجھتے تھے۔ آقائے رازی کے
رخصت ہو جانے کے بہت دنوں بعد تک بھی جب محمّی اس راز کو حل نہ کر سکا اور ان
رقصاں درویشوں کا حال کسی طور نہیں کھلا تو اس نے منصور کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔
اسے اپنے پوتے حسین سے بہت محبت تھی اور اب جب اس نے منصور کے پاس جانے
کا ارادہ کر لیا تھا، وہ اسے اور بھی شدت سے یاد آرہا تھا۔ اس کی باتیں اور حرکتیں اور وہ
بے پناہ آنکھیں عجیب سحر کرتی ہوئیں۔ اس کی نگاہ سے اکثر گھبرا جایا کرتا تھا۔ یوں لگتا تھا
وہ تمہارے سینے کے اندر تک دیکھ رہا ہے۔ وہ ذرا سا معصوم بچہ، خاموش بس دیکھتا چلا
جاتا۔ ایسے میں اسے ہنسانے کی جتنی بھی کوشش کرو وہ ذرا سا بھی نہیں ہنسے گا۔ جیسے وہ
دلوں کے بھید جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایسا بس کبھی کبھار ہی ہوتا تھا ورنہ صحن میں
لڑھکنیاں کھاتا وہ کبھی رک جاتا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔ پھر زمین کے کسی نقطے پر
نگاہ مرکوز کر لیتا۔ پھر بھاگتا اور گرتا اور ماں کی طرف ہاتھ پھیلاتا اور ضد کرتا اور چلّا کر روتا
اور کسی طور ہاتھ نہ آتا، بہلائے نہ بہلتا۔ منصور کہتا، "سمجھ میں نہیں آتا یہ چاہتا کیا ہے"
اور محمّی سے کہتا، "کیا ہی اچھا ہو، آپ اسے لے جائیں اور سختی سے اس کی تربیت کریں۔"

محمّی ہنسا۔ "تم اس ذرا سے بچے سے عاجز آجاتے ہو۔ ہم نے بھی تمہیں یونہی
پالا تھا۔ سب بچے ایک سے ہوتے ہیں، وہ والدین کو اپنی انگلی کے گرد گھمانا جانتے

ہیں۔" وہ حسین کو گود میں بٹھالیتا۔

"نہیں پدرِ محترم! آپ اسے نہیں سمجھ سکتے۔ آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا۔ اسے پالنا اور اس کی تربیت کرنا روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے۔" منصور کہتا۔

مخّی کو یہ سب باتیں یاد آرہی تھیں اور اس کا جی بے چین ہو رہا تھا۔ اب حسین کی شرارتوں میں اضافہ ہو گیا ہو گا۔ اب منصور پھر اس سے کہے گا کہ "آپ اس کو اپنے ساتھ لے جائیں۔" چھ ماہ میں اس نے اور قد نکالا ہو گا، ذرا سا بڑا ہو گیا ہو گا۔ سمجھدار اور اپنی بے پناہ آنکھوں سے اسی طرح پھر مجھے گھبرائے گا، دیکھتا چلا جائے گا۔ سینے کے اندر ٹٹولتے ہوئے وہ ہنسے گا بھی نہیں۔ مخّی بے چین سا ہو گیا۔ جیسے اتنی دوری سے بھی پوتے کی نگاہوں کو محسوس کر رہا ہو۔ پھر اس نے اپنے ملازم سے (حبشی نژاد مگر تھوڑا سا ایرانی کہ ایران میں پیدا ہوتا تھا) خچر لانے کو کہا اور خود لکڑی کی گھوڑا گاڑی کو احتیاط سے باندھنے لگا جو اس نے ایک ہندوستانی سوداگر سے خریدی تھی۔ گاڑی جس میں بیل جتے تھے اور جس کے اندر سرخ رنگ سے روشنی سی لگتی تھی اور بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے اتنے مکمل تھے، گویا وہ بس ذرا سی دیر میں باتیں کرنے اور اپنے اپنے حال ایک دوسرے سے کہنے لگیں گے۔ وہ سوچتا رہا، یہ لکڑی جس درخت سے کاٹی گئی ہو گی وہ جانے کہاں اگا ہو گا۔ سیاہ جنگلوں کے گہرے اندھیروں میں مسلسل بارشوں کے جادوئی خوشبو پھیلاتے ریلے میں اور آرواز شت نے اگنے، بڑھنے، پھیلنے کے سارے مراحل میں نگہداشت کی ہو گی۔ یہ آتش جو بیج کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے اور گرمیِ حیات میں ہر شے کے اندر سرایت کرتی ہے اور اس کی نمو کا سبب بنتی ہے۔ اہرمن ویزداں کے اس کھیل میں جسے دنیا کہتے ہیں، ایک مسلسل دوڑ جاری تھی۔ زرتشت کا قول تھا کہ "دنیا میں رہے اور اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارے اور اولاد پیدا کرے اور آبادی میں اضافہ کرے، حیوانات کی پرورش کرے اور بے آباد زمینوں کو آباد کرے۔" زرتشت کا قول ہے کہ "جو شخص زمین میں بیج بوتا اور کھیتی اگاتا ہے وہ اس شخص سے ہزار درجہ بہتر ہے جو صرف مناجاتیں پڑھتا ہے۔" اسے اور اقوال بھی یاد آرہے تھے۔ "وہ گھر جس میں بال بچے ہوں، کھیتی باڑی کرنے والے مرد ہوں اور

حفاظت کرنے والا کتا ہو۔" اس نے اور اس کے بیٹے منصور نے کھیتی باڑی نہیں کی تھی۔ زمین کے ساتھ ان کا رشتہ بس واجبی تھا مگر زرتشت کے وقتوں سے اب تک زندگی نے کتنے رنگ بدلے تھے۔ مذاہب، سلطنتیں، امتیں، لوگ، عبادتیں اور بادشاہتیں سبھی بدل گیا تھا۔ دنیا ایک حالت پر کب رہتی ہے۔

آقائے رازی کا قافلہ کسی اور منزل پر پہنچ رہا ہوگا۔ یہ شاہراہ جو ختن تک جاتی تھی بے کھٹکے سفر کے قابل سمجھی جاتی تھی۔ ایشیا کے طول و عرض میں اسلام کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو مذہبی آزادی بھی تھی اور خطرات بھی ٹل ہی گئے تھے۔ امن و آشتی کا دور دورہ تھا۔ جنگیں سرحدوں کی طرف مرکز سے دور ہو رہی تھیں۔ جنگ کرنا بھی بہت ضروری تھا۔ یہ ہوسِ ملک گیری نہیں ایک پرامن سلطنت کی حفاظت کے انتظامات تھے۔

چین سے لے کر ساحلِ نیل تک قافلے آتے جاتے تھے اور یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا۔

کیا رقصاں درویش محض خیال تو نہیں تھے؟ محّمی نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

پھر یکایک اس نے سوچا، کیوں نہ منصور سے پوچھا جائے؟ ہو سکتا ہے اسے کسی ایسے فرقے کی خبر ہو، کیونکہ جندیسا پور کے اس مدرسے میں ہندوستان کے لوگ دروس میں شامل ہوتے تھے۔ وہ دوسرے فلسفوں اور مذہبوں کا مطالعہ کرنے آتے تھے۔ بدھ کے پیروکار جو کاشان کی پہاڑیوں سے لے کر شمال اور مشرق میں منگولیا تک پھیلے ہوئے تھے۔ خود جھیل بیکال کے گرد رہنے والے دور دراز قبیلوں کا الگ مذہب تھا جو آسمانی دیوتا کی پرستش کرتے تھے اور جن کا اپنا فلسفۂ حیات اور نقطہ نظر تھا۔

آلِ علی کے لیے ان کی بے بسی کو محسوس کر کے دلوں نے خون کے آنسو بہائے تھے اور ان کے لیے نہایت عجیب و غریب عقائد اور مذاہب معرضِ وجود میں آئے تھے۔

حسین ابنِ علی کو بچایا نہ جا سکا تھا۔ رسولِ خدا کے عاشقوں نے ان کے نواسے کو بے آب و گیاہ صحرا میں بیچارگی کی حالت میں گھیر لیا اور قتل کر دیا۔

زرتشت کے کسی مقلد کو بھی نقصان پہنچانے کا خیال دل میں نہیں لایا جا سکتا۔

وہ کیسی قوم تھی جنہوں نے اپنے پیاروں کے خون سے ہاتھ رنگے۔ کیا اس خون کا رنگ چھوٹ سکے گا؟ مگر یہ درویشوں کا سلسلہ کن واسطوں سے آلِ علی تک پہنچتا ہو گا؟

اور منصور نے جانے کیوں اپنے بیٹے کا نام حسین رکھا تھا؟ کیا اسے خوف نہیں آتا تھا؟ وہ وہمی نہ ہونے کے باوجود سوچتا ضرور تھا، جہاں تک اس کی رسائی تھی۔

محّمی چونکہ شخصی آزادی کا بہت قائل تھا اور اپنے اکلوتے بیٹے کے معاملات میں کم ہی کم دخل دیتا تھا۔ اس لیے اس نے منصور سے کبھی پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ اس نے اپنے بیٹے کا نام حسین کیوں رکھا تھا۔ حکمرانوں کی نقل میں یوں بھی لوگ ایسا کرتے تھے۔ بادشاہ کا مزاج ملک کا مزاج بن جاتا ہے۔ عباسی خلفاء کے عہد میں اس کے باوجود کہ اہلِ بیت سے وہ سلوک نہیں کیا جاتا تھا جس کے وہ حقدار تھے۔ منصور کے بیٹے کا نام حسین تھا۔ خود وہ کہتا تھا، ”پدرِ محترم مجھے اس نام کا اختصار اس کی عظمت اور اس کا مکمل ہونا پسند ہے۔ آپ دیکھئے نا لکھنے میں یہ کتنا مختصر اور جہانِ معانی رکھنے میں لاجواب ہے اور پھر اس کی نسبتیں کتنی عظیم ہیں۔ کوئی زرتشتی نام اس کو نہیں پہنچتا۔“

محّمی ہنس کر سر ہلا دیتا۔

”آپ میری بات کو جی سے ٹھیک نہیں سمجھتے پدرِ محترم، مگر دیکھئے تو سہی۔“ منصور اسے وضاحت سے کہتا۔ محّمی ہاتھ کے اشارے سے اسے چپ کراتا۔ ”عزیزم جو بات تمہیں پسند ہے مجھے بھی پسند ہے اور پھر ناموں میں کیا رکھا ہے۔“

”یہی بات تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ نام بہت بڑی شے ہے، نام ہی سب کچھ ہے۔“ منصور مختصر کہتا۔

محّمی جب کوئی جواب نہ دیتا تو لگتا منصور شرمندہ ہے اور اپنی توجیہات کرنے پر نادم۔ پھر وہ اور باتیں کرنے لگتا۔ ریشم کی نفاست اور اس کی ملائمیت اور آب و ہوا کے اختلاف کی جو چینی دنیا میں ایرانی ریشم میں مختلف نتائج کی وجہ ہے۔ اعلیٰ قسم کا کپڑا بُننے والے ان کاریگروں کا ذکر جن کے اجداد چین سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ ہندوستانی ریشم کا ذکر جو آب و ہوا کی شدت کی وجہ سے چینی اور ایرانی ریشم سے کمتر تھا، مگر ایک اور کپڑے کی بہت تعریف کی جاتی جو نفاست اور نرمی میں چینی اور ایرانی ریشم

سے بڑھ کر تھا۔ یہ مرطوب آب و ہوا اور بارشوں کے شدید علاقے میں بُنی جانے والی ململ تھی۔ جو سوداگر صرف خلفاء کے لیے یا امراء کے لیے تحفتاً لاتے تھے اور جس کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ پھر ہندوستانی مزاج کی نفاستوں اور نزاکتوں کا ذکر ہوتا اور محمّی چپ چاپ مگر دلچسپی سے یہ سب باتیں سنتا۔ اسے حیرت تھی کہ اس کا بیٹا جو علمی محفلوں میں اٹھتا بیٹھتا، علماء کی صحبتوں میں شریک رہتا اور طبعاً درویش تھا، اپنے پیشے میں بھی کسی قدر وسیع معلومات رکھتا تھا، مگر اسے تجارت کو بڑھانے اور دوسرے ملکوں میں قافلے لے جانے کا شوق نہیں تھا۔

"کیا ہی اچھا ہو، تم کبھی کسی قافلے کے ساتھ جاؤ۔ دنیا کی سیر کرو اور امکانات کا جائزہ لو۔" محمّی نے ایک بار اس سے کہا۔ "میں سفر کی صعوبتوں کو بیکار اٹھانے کا قائل نہیں ہوں۔ قناعت آدمی کے لیے سب سے بڑی دولت ہے اور پھر میری مختصر زندگی کی ضروریات بھی کیا ہیں؟" منصور نہایت ادب سے کہتا۔

آدمی صرف ضروریات کے لیے ہی زندہ نہیں رہتا۔ اگر یوں سوچا جائے تو کوئی بھی بڑھنے اور ترقی کرنے کا نہ سوچے۔ جانِ پدر تم دوسروں سے مختلف کیوں ہو؟ آقائے رازی، وہ سالارِ کارواں بہت جوان آدمی ہے۔ تقریباً تمہارا ہی ہم عمر، مگر سال کے اکثر مہینوں میں وہ سفر میں رہتا ہے۔ پھر اور بہت سے لوگ ہیں جو مشرق سے مغرب تک اور دیارِ شام سے ملک چین تک ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔

"ہر انسان ایک طرح کا نہیں ہے پدرِ بزرگوار۔ میری آرزو تو بس یہی ہے کہ علمی مجلسوں میں شریک رہوں اور اس لیے میں حسین کو بھی جندیساپور کے مدرسے میں بھیجنا چاہتا ہوں۔"

"مگر تم خود اس سے مطمئن نہیں رہے۔ نسطوری عیسائیوں کے شدید مخالف ہو، ان کے بڑے نکتہ چیں، تم تو سرے سے ابن مریم کی اس مختصر اور شعلے کی سی زندگی اور صلیب اور حواریوں پر بحث کرتے رہے ہو۔ ان استادوں کو تم نے کئی بار معتزلہ کے دلائل و براہین سے مباحث کی مجلسوں میں شکست دی ہے۔ پھر جندیساپور پر تمہیں اتنا یقین کیسے ہو گیا ہے؟ میرا خیال ہے نعیبین میں جو مدرسہ ہے وہ بہتر رہے گا۔"

"تو مَیں سرے سے اسے عیسائی مدرسے میں بھیجوں گا ہی نہیں۔" منصور نے قطعیت سے کہا۔

محّمی نے نرمی سے کہا۔ "میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں جو چیز تمہیں اندر سے بے چین کرتی ہے اور جس کے تم قائل نہیں ہو، جس مذہب اور اس کی تعلیمات کو تم اپنی روحانی تربیت کے راستے میں حائل جانتے ہو، اسے کیوں اختیار کرتے ہو۔ اپنے لیے تو تم نے اس کو ناپسند کیا تھا۔"

"جی پدرِ محترم! اور یہی بات میں چاہتا ہوں حسین میں پیدا ہو۔ اس کو وہ تعلیمات اندر سے مضطرب رکھیں گی تو وہ سچ کی تلاش میں سرگرداں رہے گا۔ وہ غلط سے صحیح کی طرف اپنے طور پر اپنا سفر جاری رکھ سکے گا۔ اسے اقصائے عالم میں تجارتی قافلوں کی اور دولت کی نہیں، اصل حقیقت کو پانے کی خاطر گھومتے رہنا ہوگا۔"

"کیسی عجیب باتیں کرتے ہو منصور؟" محّمی نے تعجب سے کہا۔

"آپ کو بظاہر یہ باتیں ایسی ہی لگیں گی۔ مگر مجھے سمجھائیے، اگر آقائے رازی تجارت کا سامان لے کر چین تک کا سفر کر سکتا ہے، کوئی قلاش اور مفلس اور بظاہر دنیاوی طور پر تہی دست آدمی محض طلبِ صادق کے لیے کیوں دنیا میں نکل نہیں سکتا؟"

"عزیزم! دولت میرا بھی مطمعِ نظر نہیں، زندگی کی حقیقت چاندی اور سونے سے بہت زیادہ ہے مگر حسین کے لیے میں بھی سوچ سکتا ہوں۔ وہ میرا خون ہے، اس کی رگوں میں وہی کچھ ہے جو میرے جسم میں گردش کرتا ہے۔ میرا خیال ہے نعیبین میں کچھ دنوں اسے ابتدائی تعلیم دلوا کر اپنے ساتھ اپنے کام میں لگاؤ۔ ریشم بننا اور اس میں انتہائی کامیابی حاصل کرنا کوئی ایسا برا خیال نہیں۔ اگر آدمی جوانی میں کسی دربار سے منسلک ہو جائے تو بے شمار منافع اور دنیاوی کامیابیاں حاصل ہو سکتی ہیں۔"

"کیا دربار کا حال آپ سے پوشیدہ ہے؟ کیا زندگی اتنی کم مایہ شے ہے کہ اسے مالی منفعت کے لیے قربان کر دیا جائے؟" منصور نے بڑے دکھ سے پوچھا۔

"تم مالی منفعت کے اتنے خلاف ہو، یہ مجھے اس سے پہلے کبھی معلوم نہ تھا۔" محّمی نے کہا۔ "مگر حسین کے لیے ہی تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟ عام آدمی کی طرح اسے

زندگی گزارنے کے لیے تیار کرو۔ یہ تمہارا فرض ہے۔ ہر شخص کو اپنے راستے چننے کا حق ہے۔ تم نے سرائے میں میری ساتھ کام کرنا نہیں چاہا، ٹھیک ہے اور میں نے بھی تمہیں مجبور نہیں کیا۔ پھر تم اپنے بچے کے لیے خود سے بربادی کی راہیں کیوں متعین کرو گے؟"

محمّی کو اب غصہ آرہا تھا۔

پھر تقریباً چھ ماہ تک باپ بیٹے میں کوئی سلام وپیام نہ ہوا اور اب وہ مجبور ہو کر دل کے ہاتھوں اور جدائی سے بے تاب ہو کر جا رہا تھا۔ وہ دل میں سوچتا تھا کہ وہ اپنے پوتے کے لیے جا رہا ہے مگر اصل میں اس کا جی منصور کے لیے بے چین تھا۔ وہ اپنی رخصت کی گھڑیوں کو طویل کر رہا تھا۔ اپنے آپ کو روکنا چاہتا تھا کیونکہ ان مہینوں میں جب تک اس نے سلسلہ جنبانی نہیں کی، منصور نے اس کی خیریت کی خبر بھی نہیں منگائی، اُروی بہشت سے شعبان تک ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ آدمی اپنی ساری آزاد پسندی کے ساتھ اولاد سے توقعات رکھتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ چاہا جائے۔ اپنے آخری دنوں میں وہ احسان کا بدلہ چاہتا ہے جو اس نے اولاد کی نگہداشت اور اچھی تربیت اور کامیاب دنیادار بنا کر کیا تھا۔ دل ہی دل میں وہ اپنے فرض کو پورا کرنے کی حقیقت کو تسلیم کرنا نہیں چاہتا۔ ناشکر گزار بچوں کے لیے اس کے جی سے دعا نہیں نکلتی اور اس لیے آخری گھڑی میں جب اس کے حبشی ملازم نے خچر کو تیار کر دیا اور وہ سوار ہونے والا تھا، اس کا خیال تھا وہ نہ جائے۔ صبح دھندلی اور ملحقہ مسجد میں مجلسِ ذکر کی وجہ سے بہت آباد تھی۔ یہ ایک نہایت عمدہ تعمیر کا نادر نمونہ عبادت گاہ تھی جس کو زرِ کثیر کے صرف سے ایک رئیس نے بنوایا تھا اور داخلی دروازے کی دہلیز کے عین اندر، جہاں جوتے اتارے جاتے تھے، اس نے اپنا نام سرِ فرش کھدوایا تھا۔ عاقبت کو سنوارنے کا یہ اچھا ذریعہ تھا ورنہ باقی دنوں میں وہ نہایت ہی متکبر اور بہت ہی غصہ ور شخص تھا۔ وہ نہایت اکڑ کر چلتا تھا اور مسجد میں شاذ ہی نماز پڑھنے کے لیے آتا تھا۔ خدا کو خوش کرنے اور خریدنے کے لوگوں نے کیسے کیسے طریقے ایجاد کیے تھے۔ محمّی کی اور اس کی ملاقات تقریباً کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ عیدین کے موقع پر مسجد میں آتا تو اس کے ساتھ ایک بھیڑ ہوتی جو اس کے لیے راستہ بھی بناتی اور عام لوگوں کو اس سے دور رکھتی۔

خوشامدیوں کے اس گروہ کی وجہ سے نماز کی پہلی صفوں میں کھڑے ہوئے اس رئیس کو ملنا تقریباً ناممکن ہو جاتا اور پھر مُحمّی میں بھی ایک بے نیازی تھی اور وہ کسی کو شکایت کا موقع بھی نہیں دیتا تھا۔ ایک دو بار اس رئیس کے درباریوں نے کہا بھی کہ آقائے محمد آپ کو یاد کرتے ہیں مگر وہ مصروفیت کی وجہ سے جا نہ سکا۔ وہ یوں بھی سلامتی چاہتا تھا اور اپنے کنارے پر ہی رہنا چاہتا تھا۔ اسے زیادہ نفع کی حاجت نہ تھی۔

دشتِ سُوس کے کھنڈرات آبِ دز کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلے ہوئے تھے اور مشرق کی طرف ذرا فاصلے پر وہ پل تھا جس کو پار کر کے ان شہتوت کے جنگلوں میں داخل ہوتے تھے جس کے سرے پر منصور کی بستی تھی۔ شاہراہ کبھی بالکل ہی کنارِ آب جھک جاتی کہ اگر کسی موسم میں پانی زیادہ ہو اور لہریں ساحلِ دریا کو چھوئیں تو وہ راستے کو بھی سیراب اور لبریز کر دیں گی۔ جھاڑیوں کے اندر سے جھانکتا نیلا پانی سکون سے بہتا ہوا، درخت آئینہ آب پر جھکے ہوئے اپنے آپ پر نثار ہونے کو تیار، اور کبھی پگڈنڈی ان مٹے ہوئے نشانوں اور بارگاہوں پر سے گھوم کر نکلتی ہوئی جن ایوانوں میں بار کے لیے جانے کون منتظر رہا ہوگا۔ ساسانی بادشاہوں کے محلات اور ان کی بادشاہتیں، کچھ بھی تو نہیں رہتا، صرف فنا کو بقا ہے اور یہ دریا ان زمانوں میں بھی اسی طرح رواں ہوگا۔ یہ ہوائیں جو ان کھنڈروں میں گھومتی ہیں، عالیشان بارگاہوں کے نشان اونچی چھتوں والے اطاقوں میں بھی اپنے لہریا دامن لہراتی یونہی گھوما کرتی ہوں گی۔

انسان کیا ہے کہ ہر گھڑی ہر لحظہ گزرتا ہے اور پھر بھی لمحہ گزراں کو پکڑنا چاہتا ہے۔ نسلیں، قومیں، سلطنتیں سب اس گرد میں چھپ جاتا ہے اور پھر بھی دنیا کی محبت اور شدید چاہت آدمی کے جی کو بے چین رکھتی ہے۔ وہ ساری فانی چیزوں سے تعلقِ خاطر کی وجہ سے حیران اور سرگرداں بھی ہوتا ہے۔ مُحمّی نے خچر کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ سورج آغازِ صبح سے ہی گرم تھا اور دھوپ کی تمازت دن کے پہلے حصے میں ہی تندی و تیزی دکھانے لگی تھی۔ پانی سیال چاندی کی متحرک چادر کی طرح تھا اور اس میں سے چمک نکلتی تھی جو آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ کبھی کبھار کوئی تودہ تیز رو کی لپیٹ میں آجاتا اور آواز سے پانی میں گر جاتا۔ چھوٹے چھوٹے بھنور سطحِ آب میں پڑ رہے تھے۔ آبادیاں شاید آبِ دز کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اس سے دور ہٹ گئی تھیں۔ پہلے

زمانوں میں کشتیوں کے ذریعے سے جو سامانِ تجارت اِدھر سے اُدھر آتا جاتا تھا، اب اس کا بھی کوئی چرچا نہیں تھا اور پورے طول میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کشتی کے ذریعے تجارت ہوتی ہو۔ ساسانی جو آتش پرست تھے اور جن کے عہد میں رب النوع کے معبد میں آتش ہمیشہ فروزاں رہتی تھی اور ان کھنڈرات میں بھی وہ آتش رہی ہو گی۔ یہ قانونِ قدرت تھا کہ ہر شے زوال کی زد میں فنا کی زد میں رہے اور آنے والی نسلیں اس سے عبرت حاصل کریں، مگر دنیا تو خوش ہونے، زندہ رہنے، بہار کی ہوا میں سانس لینے اور رقصاں رہنے کا نام ہے۔

رقصاں درویشوں کا کیا مذہب تھا؟ وہ کونسا فرقہ تھا؟ منصور شاید جانتا ہو؟ دھوپ ذرا سا گہنا گئی تو مخّی نے دیکھا بادل کا ایک ٹکڑا سورج کے سامنے ایک گستاخ طفلِ مکتب کی طرح کھڑا تھا۔ پھر اس نے اپنا دامن لہرایا تو ہوائیں پرے باندھے اس کی مدد کو آئیں۔ کھنڈروں کی سرخ مٹی جو اینٹوں کی مسلسل کنگی سے ہوا کی رگڑ سے اس میں شامل رہتی ہے۔ آندھی نے تندی اختیار کر لی، وہ نہایت غصہ ور ملکہ کی طرح کرخت آواز میں احکام صادر کرتی اپنے دامن جھٹکتی ہوئی آبِ دز کے پانیوں کے مقابلے میں جم کر کھڑی ہو گئی۔

ساسانی عہد کا یہ کافی عریض پل تھا جس کی اونچی محرابوں تلے سے طغیانی کے موسموں کا پانی بھی آسانی سے گزر جاتا تھا۔ مخّی جب اس پر سے گزر رہا تھا تو ایک آدمی نے جس کی قبا تار تار اور جس کا کلاہ تقریباً ٹکڑے ٹکڑے تھا اس کے خچر کو روک لیا۔

"برادر کیا تم مجھے بستی تک لے جاؤ گے؟"

"کون سی بستی؟" مخّی کا خچر زور زور سے سر ہلاتا اور کانوں کو جھٹکتا تھا جیسے انکار کر رہا ہو۔

"وہ جہاں ریشم کا کپڑا بُننے والے رہتے ہیں۔ میں دور سے آیا ہوں اور میرے پاؤں زخمی ہیں۔"

"مگر یہاں تک اس پل تک کیسے پہنچے ہو؟" مخّی عجیب شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گیا۔

"ہوا نے مجھے یہاں لا پٹخا ہے۔" اس نے لگام چھوڑ دی۔

"ہوش میں تو ہو برادر۔" محّی نے خچر کو آگے بڑھایا۔

"تمہیں کیوں یقین نہیں کہ ہوا جو زندہ اور متحرک اور دنیاؤں کے کناروں تک آمد ورفت رکھتی ہے ایسا کرتی ہے اکثر۔"

"میں نے یہ تو کبھی نہیں سنا کہ کسی آدمی کو ہوا نے اٹھایا اور پٹخا ہو اور ٹھکانے سے دور لا پھینکا ہو۔" محّی نے پھر باگ کو ذرا ڈھیل دی تاکہ اپنی منزل کی طرف بڑھے۔

"تو سنو وقت اور حرکتیں اور طاقتیں سب اسی کے تابع ہیں۔" اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی، پھر رقص کرنے لگا اور پھر یکایک ایک بگولے کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

محّی حیران اور خوفزدہ سا تقریباً خچر کو بھگاتا ہوا پل کے دوسری طرف اتر گیا۔ گھنے درختوں کے اندر بنی پگڈنڈیاں بھاگتے خچر کی ٹاپوں سے گونجنے لگیں۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور اسے یقین نہیں تھا کہ جو اس نے دیکھا، وہ حقیقت تھی۔ شاید اس نے جاگتے میں خواب دیکھا تھا۔

منصور نے باپ کو دیکھا تو شدتِ انبساط سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے محّی کے سامنے جھک کر اس کے پاؤں چھوئے۔ اپنے لبادے سے ان کی گرد جھاڑی اور زور زور سے حسین کو پکارنے لگا۔

محّی ابھی تک پل پر اپنے عجیب اتفاق کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس لیے ہاتھ کے اشارے سے اس نے اسے روکا اور چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

دونوں باپ بیٹا نشست کے اس چھوٹے سے کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔ منصور نے دوزانو بیٹھتے ہوئے ادب سے کہا۔

"کیا بات ہے پدرِ محترم؟ کوئی حادثہ پیش آیا ہے کیا؟"

"میں اسے حادثہ نہیں، خواب کہوں گا۔" اس نے منصور کو واقعہ سنا کر کہا۔

منصور تھوڑی دیر چپ رہا اور پھر اس نے کہا۔ "رقصاں درویشوں کا تو میں نے سنا ہے، مگر کسی آدمی کا ہوا کے ساتھ اڑ کر آنا اور ہوا میں تحلیل ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا راز تھا!"

محّی نے کہا "اور خچر اس قدر بے چین تھا حالانکہ طبیعت کا بہت غریب جانور ہے یہ۔"

"ہوا میں مافوق العقل ہستیاں اور روحیں جو قرار نہ پاسکیں اور جنّات ہوتے ہیں۔" منصور نے جواب دیا۔

حسین نے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا۔ "دادا آپ حیران نہ ہوں، عرش سے لے کر فرش تک سمجھ میں نہ آنے والی طاقتیں ہیں۔"

محّی اور منصور نے بیک وقت مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ گوئے بازی کی گیند ہاتھ میں لیے کھڑا تھا جو پچھلی ملاقات میں اس کو دادا نے لا کر دی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں جیسے سورج کی روشنی کسی پُراسرار طریقے سے ان میں سما گئی ہو یا آبِ دز کی سیال چاندی کا چمکتا ہوا دھارا وہاں فروزاں تھا۔ پھر وہ اندر آیا اور محّی سے لپٹ گیا اور اس کی رخساروں، چہرے اور آنکھوں پر بوسوں کی بارش کر دی۔

"آپ ہمیں بھول گئے ہیں۔" اس نے محّی سے لپٹتے ہوئے کہا۔

عجیب دیوانگی سے دادا اور پوتا ایک دوسرے کو لپٹا رہے تھے۔ منصور نے سوچا، باپ نے کبھی اس طرح سے نہیں لپٹایا، کبھی وارفتگی سے پیار نہیں کیا۔ ہمیشہ ایک دیوار اس کے اور میرے درمیان رہی۔ کچھ نہ کچھ تھا، ایک حجاب ایک جھجک جس نے دونوں کو ہمیشہ الگ رکھا جیسے دریا کے دو کنارے ہوں ایک ساتھ بھی اور جدا بھی۔ فاصلوں کی وجہ سے دھند سی ہمارے مابین رہی۔ شاید اولاد کے ساتھ سب باپ ایسے ہی کرتے ہیں۔ پھر اولاد کی اولاد میں وہ سارے ان کہے جذبے پہاڑی چشمے کی طرح کمزور سطح پا کر پورے زور سے ابلتے ہیں اور سیرابی کی وہ کیفیت سرشاری کی سی ہوتی ہے۔ حسین اور اس کا دادا دونوں سیراب تھے جیسے بچپن اور بڑھاپا ایک ہی تصویر کے دو رخ ہوں۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ راہ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے؟" محّی نے پیار سے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

ان چھ ماہ میں اس نے خوب قد نکالا تھا۔ سنجیدہ اور پُراعتماد اور بڑھتا ہوا اور بے نیازی اور پُروقار سا۔ سیاہ بالوں سے ڈھکا سر اور سرخ و سفید رنگ۔

حسین ہنسا، بہت کچھ جانتی ہوئی پُراسرار سی مسکراہٹ اور اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا۔ "مجھے دکھائی دیا تھا جب اس نے آپ کے خچر کی لگام تھامی تھی، آپ کا راستہ روکا تھا اور پھر رقص کناں گم ہو گیا تھا۔"

منصور نے اپنا سر جھکا لیا جیسے وہ اپنے بچے کی اس عادت سے سخت بیزار ہو۔
"پدرِ محترم! یہ خوابوں کے تانے بانے میں گم رہتا ہے اور میں پریشان رہتا ہوں۔ کوئی اس کے خوابوں کو سچ تو نہیں سمجھے گا مگر لوگ اسے دیوانہ پکاریں گے۔"
حسین اپنی گیند سے کھیلتا رہا۔ پھر اس نے دادا کے دامن کو مضبوط پکڑا، "میرے لیے آپ کیا لائے ہیں؟"
"منصور میں تو تقریباً بُھلا بیٹھا تھا، خورجین میں اس کے لیے ایک گاڑی ہے۔"
گاڑی کہہ کر حسین بھی منصور کے ساتھ ہی باہر کی طرف بھاگا۔ محّمی نے ان کی غیر موجودگی میں دیکھا کہ نشست کے اس کمرے میں ایک آفتابہ رکھا ہوتا اور جائے نماز تہہ کر کے ایک طرف اونچے طاق میں پڑی تھی اور کلام پاک بھی عمدہ ریشمی کپڑے میں لپٹا ہوا پاس ہی تھا۔ محّمی کو لگا کمرہ گھوم گیا ہے۔ اس کے باہر کی طرف کھلنے والے ذرا ذرا سے دریچے بند ہو گئے ہیں اور چھت اس کے سر پر گرنے والی ہے۔ جندیسا پور کے نسطوری عیسائیوں کے مدرسے میں پڑھنے کا یہ انجام ہوا تھا۔
زرتشتی محّمی کو خون اپنی رگوں میں کذب وافترا کی طرح خاموش ہوتا محسوس ہوا۔ اس کے سارے رشتے ماضی اور مقدس آتش اور معبد کے ساتھ ایک دم شکست ہو گئے۔ تنہا رہ جانے کا اور گم ہو جانے کا احساس اس پر چھا گیا۔ جیسے سیاہ اور صاعقہٗ بلا کوئی لمحہ اس پر اپنا تسلط جمارہا ہو۔ اس کے حلقوم میں کچھ بگڑنے لگا، رکنے اور سکڑنے لگا۔ سینے پر کسی نادیدہ بلا نے پنجہ مارا۔ سر ایک دم گھوما اور وہ اپنا آپ بچانے کی خاطر اپنے آپ کو بکھرنے سے بچانے کی خاطر جھک گیا۔ ایک ہی جست میں اس کی روح اپنے قید خانے کے شکستہ دروازوں کو توڑ کر قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

خُر داد کی پہلی تاریخیں تھیں۔ کوہِ الوند پر برف پگھلنا شروع ہو گئی تھی اور بہار کا سانس ابھی شجرِ سایہ دار کے زیر سایہ محسوس ہوتا تھا جب حسین کو لے کر منصور تستر پہنچا۔ اس نے اپنے بیٹے کو بہت سے مدرسوں میں اس امید پر بھیجا تھا، شاید وہ اپنی رگوں میں بستے آتشیں خون کی امانتوں کو ایمان افروز بنا سکے۔ آگ گلزار ہو جائے اور براہیمی امانتوں کو سعادت نصیب ہو۔

حسین کی روح بے چین تھی کیونکہ زاہد و پارسا اسے پسند نہ تھے۔ ہم سبقوں سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تھا۔ استادوں کی غلطیاں وہ پکڑنے لگتا تھا اور درس کے لیے جو فضا ضروری ہے اسے درہم برہم کر دیتا تھا۔ منصور محمّی کے بعد خاندان سمیت سرائے میں اٹھ آیا تھا۔ اس نے کاروانوں کے لیے اسے بند کر دیا تھا مگر اِکا دُکّا مسافر بے منت دام و درہم وہاں ٹھہر سکتے تھے۔ وہ ان کے آرام کا خیال بھی اسی طرح کرتا تھا جیسے باپ کی زندگی میں ٹھہرنے والوں کی خدمت کی جاتی تھی۔ اس نے آتش کدے کو ایک حجرے میں تبدیل کر دیا تھا جہاں یخ راتوں میں جب باہر طوفان اٹھتے اور برف گرتی اور صحرا کی طرف سے ہوا چلتی اور درختوں کو جھکاتی سائیں سائیں کرتی ہوئی بے چین ہوتی تو وہاں بیٹھ کر کلام پاک پڑھا جاتا۔ اس کے معانی پر غور کیا جاتا اور ہر لحظہ حیرت بڑھتی۔ تہہ در تہہ جہانِ معانی اور آہنگِ نو اور معجزہ ناممکن البیان ہوتا جس سے اس کی روح سیراب ہوتی۔ اس کا دل نئے ذوق و شوق سے مشغول ہوتا۔

حسین ان دنوں اسی آبادی کی خانقاہ میں پڑھتا تھا۔ ایسی راتوں میں جب ہوا تھم تھم کر چل رہی ہوتی، استاد صحن میں الاؤ جلوا کر اس کے گرد بیٹھ کر درس دیتے اور

حسین سر جھکا کر سننے کی بجائے آگ کے دائرے سے پرے اندھیرے کی طرف دیکھتا اور دیکھتا چلا جاتا۔ پھر اپنے چہرے پر خوف کی کئی کیفیتیں پیدا کرتا اور دوسرے طالب علموں کی توجہ میں مخل ہوتا۔ وہ عمر میں ان سب سے کم تھا اور اس لیے استاد بے توجہی پر انہی کی سرزنش کرتے۔ منصور کو یاد آیا کہ جب بارہا ایسا ہو چکا تو استاد نے الاؤ میں سے جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر اس کی پیشانی کو داغ دیا۔ زخم گہرا تھا اور مندمل ہونے میں کئی ماہ صرف ہو گئے۔

حسین کہتا تھا میری پیشانی پر یہ داغِ دلربائی ہے۔

ہاں یہ داغِ دلربائی تھا جسے اپنی پیشانی پر سجائے منصور اور وہ تستر میں وارد ہوئے تھے۔

سہل بن عبداللہ تُستری کا یہ مکتب تُستر کی باغ و بہار سرزمین پر ایک خاموش اور کم آباد گوشے میں تھا۔ پہاڑ کے دامن میں وادی کے سرے پر جہاں آوازیں کم سنائی دیتی تھیں، جب شام ہوتی تو نیلے دھوئیں کی لکیریں نیچے سے اوپر اٹھتیں اور طویل سائے مسجد اور اقامت گاہ کی طرف بڑھتے اور چاروں اطراف سے رات ایک دم یورش کر کے در آتی۔ چراغوں کی ٹمٹماتی لوئیں دور پرے فاصلے پر دکھائی دیتیں اور ان پر ستاروں کا گمان ہوتا۔ کبھی فرحت وانبساط کی محفل میں جب نقارہ بجایا جاتا اور رقص کناں مرد و زن زور زور سے ہاؤ ہو کرتے تو وہ صدائیں گونج پیدا کرتی ہوئی اپنے ساتھ نغموں اور لہروں کے سے ارتعاش کی بازگشت کو لاتیں، دیر تک سنائی دیا کرتیں جیسے خالی کمروں میں کوئی اپنی ہی صدا کو سنتا ہوا اپنے گرد گردش کرے۔ مکتب سے مشرق کی طرف ایک کم بلند پہاڑی کے سرے پر جہاں جگہ کھلی تھی اور چشمہ تھا، ایک خانقاہ تھی۔ مراقبے میں گم اور مشغولِ عبادت گوشہ نشینوں کے ذکر سے فضا معمور رہتی۔ لوگ دُور دراز سے زیارت کرنے آتے۔ قبولیتِ دعا کی طمانیت کے ساتھ۔ کیونکہ یہاں کا حلقہ درویشاں شب زندہ دار تھا۔ شوق ان کی جانوں کو بے قرار رکھتا تھا۔ ان کے دل گرم، ان کی نگاہ پاک اور جان بے تاب تھی اور مشک نافے کی بو کی طرح سارے عجم میں ان کی بو پھیلی ہوئی تھی، مشامِ جان کو معطر کرتی ہوئی۔

دروس میں شریک طالب علموں کو کڑی ریاضت، فاقہ کشی اور شب بیداری

کے مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔ جان کو تحلیل کرنا پہلی منزل تھی۔ یہ سختیاں عام آدمی برداشت نہیں کرپاتا تھا۔ یہاں پہنچ کر حسین کی خوشی دیدنی تھی۔

منصور نے حسین کو سہل بن عبداللہ تُستری کے سامنے پیش کیا۔ "کلامِ پاک سے محبت اس کی واحد سند ہے جو جرأت اور عاجزی سے آپ کے سامنے حاضر کرسکتا ہوں۔"

سہل سر ہلا کر چپ ہوگئے اور حسین ان کے دروس میں شریک ہوگیا۔

رخصت ہوتے وقت منصور نے بیٹے سے کہا۔ "جانِ پدر اپنے آپ کو اس درس کا اہل ثابت کرنا اب تمہارا کام ہے۔"

"پدرِ محترم! میرا خدا جب مجھے یہاں تک لایا ہے تو رہنمائی بھی وہی کرے گا۔"

منصور نے کہا۔ "جانِ پدر میں کپڑا بُننے والا ایک کم علم آدمی ہوں۔ خدا اور آدمی کے درمیان رشتے کا شناسا بھی نہیں۔ زہد و ریاضت سے بھی مجھے کچھ حصہ نہیں ملا مگر میرے اشواق جلیل ہیں، میرا جی چاہتا ہے تم ان کی تکمیل کرو۔ میرے خوابوں کی تعبیر بنو۔ خواب جن کی آہٹ بھی والدِ بزرگوار کی حیات میں میں نے کسی کو نہیں سنائی۔ میں نماز پڑھتا ہوں تو اپنی طبیعت کے ناقہ کو بس قطار میں رکھنے کے لیے، ورنہ بے حضوری کے سجدوں میں کوئی لذت نہیں ہے۔ حضوری کی سعادت میرے نصیب میں کہاں؟ مگر خدا تمہیں کسی طوفان سے آشنا کردے۔"

حسین نے بازو اپنے باپ کے گرد ڈالے اور اس تنگ حلقے میں ایک لحظے کے لیے منصور نے اپنی نگاہوں سے بہت کچھ دیکھا، بہت محسوس کیا، جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ بیٹے کی پیشانی پر وہ بوسہ شہد آگیں تھا جس کی شیرینی کو حسین نے اس کے بعد ہمیشہ اپنی جان میں محسوس کیا۔ وہ ایک گنج گرانمایہ تھا۔ وہ ساری محبتیں اپنے دامن میں پوشیدہ جو منصور کو اب تک نصیب ہوئی تھیں، چشمے کی نغمگی کی طرح انہوں نے حسین کے گوش و ہوش کی آبیاری کی۔

پھر منصور ان چوڑی سیڑھیوں پر سے اترا اور پہاڑی کے نیچے کھڑے ہوکر اس نے مڑ کر اوپر دیکھا۔ حسین کا ہاتھ اٹھا ہوا تھا جیسے بحرِ ناپید میں ڈوبنے والا مدد کے لیے پکارنا چاہے۔ اس کا دل عجیب طرح سے بے چین ہوا، اس نے چاہا کہ واپس جائے اور

بیٹے کو پھر اپنے سینے سے لگائے مگر اس نے بھی ہاتھ ہلایا، پھر موڑ کی وجہ سے سب کچھ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

سرائے میں واپس پہنچ کر منصور بہت مطمئن تھا جیسے کسی بارِ گراں سے سبکدوش ہو گیا ہو۔ اسے یاد آیا کہ جب آخری بار حسین نے اس سے معانقہ کیا تھا تو ایک ردِ نور اسے اپنے وجود میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ عرش کے ساتوں در ایک دم وا ہوئے تھے جیسے آسمانی بجلی کا لہریا اس کی آنکھوں کے سامنے کوند گیا ہو۔ یہ سب اسے اپنا وہم لگا تھا۔ اس کے اشواقِ جلیل اور اس کی ہمت قلیل تھی۔ وہ تو ایک نہایت عام آدمی تھا۔ بے بضاعت! جس کو حضورِ حق سے جانِ بے تاب عطا ہوئی تھی، مگر اس کی رسائی کہیں تک نہ تھی۔ وہ عبادت گزار نہ تھا، صرف نماز پڑھتا تھا۔ کلامِ پاک سے اس کی بے تابی اور بھی بڑھ جاتی، اس سکون سے بھی افزوں تر جو اسے حاصل ہوتا تھا۔ اسے یک گونہ حیرت بھی ہوتی کہ وہ خدا سے ہم کلام ہے۔ وہ ذرۂ ناچیز براہ راست اس خالقِ کائنات سے روبرو ہے، حاضر ہے۔ اس نگاہ سے کہیں چھوا جاتا ہے ”جو کن“ ہے۔ سارا دن وہ عجیب بے خودی کے عالم میں اپنے کاموں میں لگا رہتا۔ ایک چکاچوند سے سرشار اس لہریے کی بے پناہی میں غلطاں۔

”تیر“ شروع ہو چکا تھا۔ جب سرائے میں ایک گروہ آن کر رکا۔ وہ بڑی پُراسراریت کے حامل تھے اور بے چین تھے۔ انہوں نے آرام کرنے کے لیے کمریں نہیں کھولیں۔ ان کے خچروں کی خورجینیں ان پر اسی طرح بندھی رہیں۔

”کھانے کو کچھ مل سکے گا کیا؟“ انہوں نے منصور سے پوچھا۔

”سرائے بند ہو چکی ہے۔“ منصور نے اپنی کتاب سے نگاہ اٹھا کر بہت بے نیازی سے کہا۔

”وہ آتش پرست جو اس کا مالک تھا، کہاں ہے؟“ ان میں سے ایک نے تیزی سے استفسار کیا۔

”آپ کو کیا چاہیے، میں آپ کی خدمت کرنے کو تیار ہوں برادرانہ۔“ منصور نے کہا۔

”ہمارے پاس وقت کم ہے بلکہ بالکل نہیں ہے۔ کچھ بھی جو مل سکے، ہم اسے

اپنے ساتھ لے جا سکیں۔"

"برادرم گرمی اس قدر شدید ہے اور دوپہر سر پر ہے۔ کیا آپ آرام فرمانا پسند نہ کریں گے؟ اندر برودت بھی ہے اور سائے میں جانور بھی ذرا کی ذرا دم لے لیں گے۔"

نہایت بے حوصلگی سے ایک نے اپنے لبادے کو گرد لپٹتے ہوئے کہا۔ "ہمارے پاس تو ڈھنگ سے موت کو خوش آمدید کہنے کا وقت نہیں ہے، ٹھہرنے اور دعوت قبول کرنے کے لیے کہاں سے لائیں گے؟"

منصور نے بولنے والے کی طرف گہری نظر سے دیکھا، ان سب کی داڑھیاں بڑھی ہوئی اور لباس میلے تھے۔ بال الجھے ہوئے اور پراگندہ تھے۔ ناخنوں میں نیلے رنگ کا میل تھا۔ آنکھیں بے خوابی کی وجہ سے بند ہوتی ہوئی اور گدلی سرخ تھیں۔ تلواریں ان کے پہلوؤں سے بے ترتیبی سے بندھی تھیں اور وہ مڑ مڑ کر باہر سے داخلے کے دروازے کی طرف دیکھتے تھے۔ پتہ نہیں یہ کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟

منصور نے اُبلا ہوا گوشت اور خشک روٹی حاضر کر دی۔ مشکیزہ پانی سے بھر دیا اور بے صبری سے انتظار کرنے والے شکریہ کا ایک لفظ کہے بنا اپنے خچروں کو تقریباً سرپٹ دوڑاتے گرد کے بادلوں میں غائب ہو گئے۔ وہ آب دز کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف سفر کرنے والے تھے۔ آثار یہی کہتے تھے۔

منصور نے کتاب کھولی اور گرم ہوا کے تیز جھونکوں سے بچنے کے لیے دریچے کو بند کیا۔ یہ کونسا فتنہ تھا؟ اسلامی سلطنت کی پھیلی ہوئی حدیں کتنی قیامتوں کو ہوا دے رہی تھیں۔ عجیب ادیان، عجیب و غریب فرقے اور عقائد پیدا ہو رہے تھے۔ پھر اس نے کتاب اٹھالی۔

گھوڑوں کی ٹاپوں کے شور سے صحن گونج اٹھا۔ جانے یہ اسی کے ساتھی تھے یا کون لوگ تھے جو پانی اور کھانے کی تلاش میں آئے تھے مگر اب تو کسی کی خدمت کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ گوشت اور روٹی وہ پہلے ہی پیش کر چکا تھا اور اب دینے کے لیے کچھ باقی نہ تھا۔ پھر تلوار کی نوک اس کے سینے میں چبھو کر ایک فوجی نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم نے کچھ زندیقوں کو دیکھا ہے؟ ہم ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔"

منصور حیران و پریشان ان کی شکلوں اور وضع قطع سے شک میں مبتلا ہو گیا۔ وہ انکار اور اقرار، کچھ بھی کہنا نہیں چاہتا تھا۔

"زندیق؟" اس نے پوچھا اور نہایت آہستگی سے تلوار کو اپنے سینے سے پرے ہٹا دیا۔ وہ ان سے ترساں لرزاں نہیں تھا، صرف دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ یہ لوگ کم گرد آلود اور تھوڑے غلیظ تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے شراب پیے ہوئے ہوں مگر وہ سخت غصے میں تھے، جھلائے ہوئے جیسے شکار کے نکل جانے کے بعد شکاری۔

"ان کے درمیان ایک شخص ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔" انہوں نے وضاحت کی "اور اگر ابھی اسے سرِ دار نہ کھینچا گیا تو مزید فتنے کا سبب ہو گا۔"

منصور ہنسا۔ "نبی کو بھاگنے کی ضرورت؟"

"ہاں، وہ اور اس کے ساتھی کاذب ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا نے انہیں اپنا جلوہ دکھایا ہے، اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔"

"وہ اپنے آپ کو اہل بیت سے کہتا ہے، نبوت کا مدعی ہے۔" دوسرے نے مزید تفصیل سے بتایا۔

"آپ لوگوں نے سورج کی نمو کے ساتھ شبنم کو فنا ہوتے دیکھا ہو گا۔" منصور نے کہا۔

پاس کے درختوں میں ایک لمبی تان گونجی جیسے راگ شروع کرنے سے پہلے ساز کو درست کیا جا رہا ہو۔ پھر سرائے سے پرلی طرف بستی کے باغوں میں ایک کے بعد ایک جیسے گواہی دینے والے ہوں۔ طوفانِ گرد بار آس پاس منڈلایا۔ دشتِ سوس کی زرد اور سیاہ ریت لہروں میں اوپر اٹھی اور ہر شے پر مسلط ہو گئی۔ اس میں دور کھنڈروں اور ویرانوں میں آگے سخت جان پودوں اور پتوں کی خوشبو تھی۔ زمانوں سے شکست و ریخت میں گرفتار عمارتوں کی پرانی خاک تھی۔ آب دڑ کے اوپر کی نمی اور ہوا تھی، مگر سارے راستے مسدود ہو چکے تھے۔

یہ ہلاکت آفریں ہوا تھی جس کی زہرناکی سے بچنے کے لیے دریچوں کو بند کرنا ضروری تھا ورنہ اس کی خشکی جلد کو اپنی سمّیت سے متاثر کرتی ہے اور اوپر کی کھال

ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے جس کا علاج دنوں میں نہیں ہو پاتا تھا۔ پیاس بجھائے نہ بجھتی تھی اور زبان سوکھ کر لٹک جاتی۔ البتہ جانوروں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

قالین پر بیٹھ کر اس نے ان سے کہا۔ ''آپ لوگ میرے مہمان ہیں، تشریف رکھئے۔ میں آپ کے لیے جو کچھ کر سکتا ہوں، وہ گو آپ کے شایانِ شان نہیں ہوگا، اس سے میری تسلی ضرور ہوگی۔''

''مگر ہم جس کی تلاش میں آئے ہیں، اس کا کیا ہوگا؟'' ان میں سے اکثر قالین پر بیٹھ گئے۔ ''یہ ہوا جو دشتِ سوس سے چلتی ہے مفید نہیں۔ اگر کوئی ایسے میں ان اطراف میں ہوگا تو اس کی بربادی پر صاد کر لیجئے۔'' منصور نے اندر کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''آخر لوگ کمتر اعلانات کیوں نہیں کرتے۔ نبی ہونے کا دعویٰ، خدا ہونے کا، مافوق الفطرت ہونے کا ہی کیوں؟'' مہمانوں میں سے جو سب سے سنجیدہ تھا، اس نے باقیوں سے پوچھا۔

''لوگوں کو چونکانا انہیں حیران کرنا مقصود ہوتا ہوگا۔'' کسی نے کہا۔

''صرف یہی کافی نہیں، باقی لوازمات کا بندوبست۔ کچھ کرامات، کچھ غیب دانی، اپنے گرداگرد بے وقوفوں کو جمع کرنا۔''

''لوگوں کی تسلی کے لیے کوئی شعبدہ تو لازم ہے۔''

''یہ نبی جس کے عقب میں ہم حیران و پریشان ہیں، کیا تجلّی رکھتا ہے؟''

''کہتا ہے مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ میں ذوالقرنین ہوں اور میں نبی ہوں۔ عجیب تاویلات سے اپنے مطلب کی وضاحت کرتا ہے۔''

''کیا اس کے ساتھ ایک بڈھا آدمی نہیں؟ سفید ریش! جو کہتا ہے کہ اس نے اپنے عالمِ ہوش میں اپنی ان فانی آنکھوں سے وحی نازل ہوتے دیکھی ہے۔''

''وہ کیا پڑھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی کتاب، کوئی شریعت؟'' منصور نے پوچھا۔

''یہ شوریدہ سر اور دیوانے ہوتے ہیں۔ خیالوں کا دباؤ اور کچھ کر گزرنے، دوسروں سے اپنے آپ کو ممتاز کرنے کی تمنا انہیں اس نازک مقام پر لے آتی ہے

جہاں انہیں خواب دکھائی دیتے ہیں اور سائے اور صورتیں اور وہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کو عام لوگوں سے زیادہ طاقت عطا کی گئی ہے۔ ان پر وحی اترتی ہے۔"

"کیا محمود بن فرج کا بھی یہی دعویٰ ہے؟" منصور نے پوچھا۔

ملازم نے آکر دستر خوان بچھایا اور سلفچی لے کر سب کے ہاتھ دھلائے۔ پھر کبابوں کی مہک پھولوں کی خوشبو کی طرح اڑی اور مشامِ جان کو سیراب کر گئی۔ سلیقے سے مگر تیزی سے سینکے ہوئے سیخ کے کبابوں میں عمدہ مصالحے اور روغن کی ہلکی سی چکناہٹ تھی۔ ہندی پکوانوں کی سی گھلاوٹ ان ایرانی کھانوں میں بھی محسوس ہوئی، کیونکہ ہندوستان دور نہیں تھا اور سوداگروں سے اکثر ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ سرائے میں محمّی کے وقتوں میں زرتشتی دستور زیارتوں کے لیے اکثر دور دراز کا سفر طے کر کے معبدوں میں آتے اور اس سرزمین کی محبت میں اکثر یہیں رہ جاتے۔ ناہید کے بڑے معبد کے غلاموں میں تقریباً ہندی لوگ تھے جو عالم اور بہت خواندہ تھے اور کہانیاں کہنے میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کہانیوں کی سرزمین جس پر زمانوں کے بعد اکثر اوتار آتے رہتے تھے۔

"میں آپ کی تواضع حسبِ دلخواہ نہیں کر سکا۔" منصور نے کہا۔ دستر خوان اٹھایا جا چکا تھا اور گردباد کا شور ہر لحظہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ آسمان خاک سے پوشیدہ اور سورج اس سے بھی دور۔

"ایران ایک دنیا ہے۔ سب طرح کی آب و ہوا اس میں ملتی ہے اور ہر مذہب و ملت کے لوگ اور ابھی اس سے پرے کچھ نامعلوم قبائل اور صحراؤں کی دوسری طرف شدید موسموں کا دباؤ۔ بلند پہاڑوں کی اوٹ میں بسنے والے خانہ بدوش جو خدا کی ذات پر یقین نہیں رکھتے اور یہاں اپنے آپ پر بے طرح نازاں غیر معمولی سمجھ کر دعویٰ نبوت کرنے والے آدمی اور ان کے تعاقب میں سرگرداں اپنے پر نیند اور آرام حرام کیے ہوئے اور آدمی۔"

"نہیں برادر! آپ نے جس محبت سے ہمیں اپنے ذاتی مہمان خانے میں جگہ دی ہے، ہم اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔" نیند کے غلبے سے بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے سالار قافلہ نے کہا۔

"برادر کیا آپ محمود بن فرج کو جانتے ہیں؟" ان میں سے ایک نے منصور سے پوچھا۔
"ان اطراف میں یہ روایت دشتِ کبیر کی طرف سے آئی ہے۔ وہاں محمود بن فرج نے اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا ہے۔ کچھ لوگ اس کے ساتھ ہیں اور وہ اپنے دین کی تبلیغ کے لیے کوہ و صحرا میں سرگرمِ عمل ہیں۔" منصور نے جواب دیا۔
"آپ نے اسے دیکھا ہے؟" پوچھا گیا۔
"نہیں، صرف حکایت سنی ہے۔ داستان جس کو رنگ آمیزی سے پُراسرار بنایا گیا ہے۔"
"جس نبی کا ہم تعاقب کر رہے ہیں، وہ فاسق اور دیوانہ ہے مگر اپنا مصحف رکھتا ہے۔"
"یعنی اپنا کلام جو اس نے حواشی اور زوائد کے ساتھ تاویلات اور تفسیر کے ساتھ اپنے اقوال و اعتقادات میں جمع کیا ہے۔" منصور نے پوچھا۔
"وہ شاعر ہے، لفظوں کو جوڑ کر ترتیب سے بات کہنے والا۔ کہتا ہے یہ اس کی شاعری ہے اور شاعری پیغمبری ہوتی ہے۔"
"ایران کی نصف آبادی پیغمبری کا دعویٰ کر سکتی ہے۔" منصور کو یہ باتیں دلچسپ معلوم ہوئیں۔ شاید پیغمبر بننا عام آدمی بنے رہنے سے زیادہ آسان ہو۔ اس نے سوچا۔
بیٹھے ہوئے لوگوں نے زور زور سے قہقہے لگائے اور ہنسی کا ایک دورہ سا ان پر پڑا۔
"کنارِ آب، شبِ ماہتاب" میرے اس مصرع کو کوئی پورا کر دے۔ اب وہ یونہی ترنگ میں آ گئے تھے۔
"کیا باقی دن یہاں گنوا دینے کا ارادہ ہے؟" ایک بڑی عمر کے آدمی نے پوچھا۔
"ہماری زندگی تگ و تاز تو ہے، مگر زہریلی ہوا میں اپنا وجود پارہ پارہ کرنے کی کیا ضرورت؟ طوفان تھم لے۔"
یہ سرزمین کب سے فتنوں کی آماجگاہ تھی۔ عباسیوں کی کمال آزادیٔ اظہار نے، خیالات کی گستاخی و بے باکی نے، فلسفے کی موشگافیوں نے ان فتنوں کو ہوا دی تھی۔ انہیں پنپنے کے لیے فضا کو سازگار بنایا تھا۔ یونان کے علمی خزانے تراجم کے ذریعے جیسے

جیسے عرب و عجم میں داخل ہوئے، ان کو سمجھنے اور روزمرہ زندگی پر انہیں آزمانے کے لیے اپنے مذہب سے روگردانی نہیں، مگر کچھ جسارتیں بھی عام ہو گئیں۔ خلیفہ علم دوست تھے، نئے نئے فنون کی سرپرستی کرتے تھے اور اقصائے عالم سے لوگ اس بے پناہ دربار کی طرف کھنچتے تھے۔

جب خلقِ قرآن اور صفات باری تعالیٰ کا غلغلہ اٹھا ہے تو معتزلہ جہاں اور فرقوں کے اور اسلام کے درمیان ایک فصیلِ آہن ثابت ہوئے وہاں انہوں نے ایک بھاری پتھر کی طرح عقائد کی تہہ میں بیٹھنا شروع کیا۔ اپنے کلام کے زور سے وہ ایک خلقت کی بربادی کا سبب بن گئے۔ شخصی آزاد روی نے خیالات میں انقلاب پیدا کیا اور یہ معتزلہ کے اثر و نفوذ کا نتیجہ تھا کہ معمولی آدمیوں نے نبی ہونے کا دعویٰ کرنا شروع کیا۔ محمود بن فرج کا بوڑھا ساتھی چالیس درے کھا کر تائب ہو گیا اور محمود کا انجام بھی کچھ کم نہیں ہوا۔ اس نے سو درے کھائے اور جان گنوادی مگر آزادیِ فکر کی بنا اور تاویلات کا جو ایک سلسلہ چلا تھا، وہ آگے چل کر مزید فتنوں کی پیدائش کی وجہ بنا۔

عیسائی اور یہودی اپنے بنیادی عقائد کے ہمراہ جو ان کی رگوں میں خون کے ساتھ تھے، اسلام میں داخل ہوئے تو ان کا خدا اسی طرح صلیب کے واسطے سے آسمانوں اور زمین کے درمیان اٹھالیے جانے اور دفنا دیئے جانے کے درمیان ابن مریم ہونے اور روح پھونکے جانے کے مسائل کی وجہ سے انہیں پریشان کرتا رہا۔ وہ اسلام پر اپنی ساری روح سے فدا ہونے اور اسے قبول کر لینے کے باوصف سوال کرنے والے دماغ اور جواب ڈھونڈنے کے لیے سرگرداں رہنے والے ذہن سے جو انہیں اندھیرے غاروں میں لے جاتا تھا، اپنا دامن نہ چھڑا سکے۔ اسلام کی رواداری نے انہیں جرأت سوال عطا کی تھی، مگر ماضی کی بھول بھلیوں اور عود کرنے والی کے باوجود بھلائے نہ جانے والی جسارتوں نے ایسی الجھنیں پیدا کیں جو بظاہر چمکدار دور رس نکتہ آفریں کیفیات تھیں، مگر اصل میں گمراہ کن اور بے جا تھیں اور تفریق کا باعث ہوئیں۔

جب طوفانِ گرد باد تھم گیا اور وہ سب جا چکے تو منصور نے شام کے لیے چراغوں میں تیل ڈالا اور غلام کے ساتھ مل کر درختوں کے خشک پتوں کو ایک جگہ جمع کر کے اس ڈھیر کو آگ لگائی۔ بڑی بڑی شاخوں کو جو ٹوٹ کر گری تھیں، علیحدہ رکھا اور

صحن میں بکھرے جانوروں کے چارے کو پھر ان ناندوں میں بھرا۔ دشتِ مُوس کی سرخ اور سیاہ اور زرد ریت کے انبار دریچوں کے آگے جمع ہو گئے تھے جیسے دستک دیتے دیتے تھک کر بیٹھ گئے ہوں۔ انہیں ہٹانے میں اس کے غلام نے بہت مستعدی دکھائی۔ حوض جو تنکوں اور گھاس سے بھر گیا تھا، خالی کر کے پھر سے لبریز کیا گیا۔ اور وہ تقریباً فارغ ہو چکے تھے جب مغرب کی اذان زندگی اور دنیا کو بلانے کے لیے ربِ قدیر کے جاہ و جلال، اس کی عظمت و حرمت پر گواہی دیتی ہوئی ہر سو ہر شے پر اندرون اور بیرون نہاں خانوں میں کھلی فضا میں گونجی۔

جو جُھوٹ ہے وہ خود مٹ جائے گا
اے شام اور صبح کے دشت میں پرواز کرتے سفیرو
جو جھوٹ ہے وہ خود مٹ جائے گا
اور سچ کیا ہے یہ بھی کسی کو کیا معلوم
کیا سچ وہ ہے جو تمہیں دکھائی دیتا ہے
اور جھوٹ وہ ہے جو دکھائی نہیں دیتا
یہ مسائل نہ تم حل کر سکو گے اور نہ میں
کیونکہ جو جھوٹ ہے وہ خود مٹ جائے گا

جب وہ نماز پڑھ کر سرائے میں دوبارہ داخل ہوئے ہیں تو بڑے دروازے کے باہر کوئی کھردری، کرخت تقریباً تلخ آواز عود کے تاروں کے ساتھ سنائی دیتی تھی۔ پچھلی صدی میں ان گیتوں کو نسطوری پادریوں نے لکھا تھا اور اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے اچھی سُر اور لَے میں بہترین سازوں کے ساتھ انہیں گایا جاتا تھا۔ گرجاؤں میں باجوں کے ساتھ یہ پڑھے جاتے تھے۔ بہت سی آوازیں مل کر جب انہیں دہراتیں تو گونج پیدا ہوتی تھی۔ سچ اور جھوٹ اور لاہوت کے کتنے مسائل تھے جو روزمرہ کے کاموں میں ہر ہر گھڑی پیدا ہوتے تھے مگر اس کے لیے مٹنے کا انتظار! منصور ہنسا۔ اس نے گانے والے کو تھوڑی دیر دیکھا، پھر جیب سے ایک دینار نکالا اور اس کے پاؤں کے قریب رکھ کر اندر آ گیا۔

تستر سے آنے والے مسافر نے جب آدھی رات کے قریب سرائے کا دروازہ

کھٹکھٹایا تو منصور ابھی نیم خوابیدگی کی حالت میں تھا۔ کتاب اس کے سامنے تھی اور ورق اسی جگہ کھلا تھا جہاں اس نے پڑھتے ہوئے اسے کھولا تھا، اس بیان میں کہ "ولایت کیا ہے؟"

"حسین نے یہ خط مجھے دیا ہے اور میں چونکہ اگلی منزل پر دن کے لیے ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ یہ خط آپ کو پہنچادوں۔ وہ خیریت سے ہے۔"

منصور نے کہا۔ "آدھی رات کے ستارے دُبِ اکبر سے پرے جھک گئے ہیں اور زیادہ روشن ہیں۔ صبح اب ہوا ہی چاہتی ہے۔ میری خوشی تو یہی ہے کہ آپ میرے پاس ٹھہریں۔ اگلی منزل زیادہ دور بھی نہیں۔ صبح کافی خوشگوار ہوتی ہے اور آپ دن گزارنے کے لیے وہاں تک آسانی سے پہنچ سکیں گے۔ پھر اس نے مسافر کے گھوڑے کی باگ پکڑلی اور اسے آہستہ چلاتا وہاں تک لایا جہاں اونٹ اور دوسرے جانور بندھتے تھے۔

قہوے کا فنجان لے کر اور قالین پر بیٹھتے ہوئے مسافر نے جس کا نام صادق بن صدیق تھا کہا، "حسین، آپ کا بیٹا، غیر معمولی طالب علم ہے۔ مکتب میں میرا بیٹا اس کا ہم سبق ہے مگر سارے دروس میں اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ حسین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ میں اس کے لیے آپ کو مبارک دیتا ہوں۔"

منصور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

صادق بن صدیق نے پھر کہا۔ "سہل بہت اچھے استاد ہیں۔ اگر وہ بغداد میں ہوں تو مدرسہ نظامیہ کی خوش قسمتی ہو مگر تستر بھی انہی کی وجہ سے آباد ہے اور بچوں کی سعادت ہے۔ اگر ایسے برگزیدہ بزرگ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کریں۔" جب منصور نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے کہا "کیا آپ خوش نہیں ہوئے؟" وہ حیران تھا۔

"میں اس بات کو تو اپنی اور حسین کی خوش بختی گردانتا ہوں کہ وہ سہل جیسے کامل استاد کے زیر سایہ تربیت پا رہا ہے مگر اس کے غیر معمولی ہونے سے میں خوش نہیں ہوں۔ زمانہ ایسی کسی بات کو برداشت نہیں کر سکتا جو غیر معمولی ہو۔ ذہانت یا ریاضت یا فصاحت بس عام ہونے میں ہی انسان کی فلاح ہے۔"

"آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں ابو حسین!" اس نے فنجان کو ایک سے دوسرے ہاتھ میں تھام لیا۔

"مجھے یہ دعویٰ تو نہیں کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، مگر برادرم آپ نے تجربہ کیا ہو گا کہ دنیا ہر اس شے کو جو اس کے پیمانے، اندازے اور عقل سے بلند ہو پسند نہیں کرتی!" منصور نے افسوس سے کہا۔

"میرے خیال میں دنیا عبارت ہی سب غیر معمولی لوگوں سے ہے ورنہ روئیدگی اور خس وخاشاک کیا شے ہے؟" اس نے ذرا تیزی سے کہا۔

"زمانہ اور دنیا دو بہت مختلف النوع خیال ہیں۔ گزرتا ہوا وقت اور اس کے ساتھ جو ہے، وہ تو دنیا ہے اور لوگ زمانہ ہیں اور زمانہ خدا ہے۔" منصور نے بہت نرمی سے کہا۔

"میں آپ کی ذو معنی باتیں سمجھ نہیں سکتا۔" صادق نے خالی فنجان قالین کے حاشیے پر رکھ دیا۔

"شاید میں ذرا ادق زبان استعمال کر رہا ہوں، اشاراتی طرزِ گفتگو۔" منصور نے پاس ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ باہر درخت کی شاخوں میں رات کا پرندہ زور سے چلّایا۔ تیزی سے پر پھڑپھڑا کر اڑا۔ عین اس کمرے کی چھت پر بیٹھا دریچے میں سے اس کی آواز بہت قریب سے آئی جیسے ویرانوں میں کوئی بھٹکی ہوئی روح چیخ اٹھے۔ صادق اور منصور دھیان سے دوسری چیخ کے منتظر رہے۔ پھر دوبارہ اڑنے اور پر پھڑپھڑانے سے معلوم ہوا کہ وہ چھت سے پھر کسی اور درخت کی شاخوں میں جا الجھا ہے۔ ایک لمحے کے توقف اور معنی خیز خاموشی کے بعد کہیں دور کے درختوں سے بلبل کی صدا سنائی دی۔ صبح کی خوشخبریاں گاتی ہوئی پھر چڑیاں بولنے لگیں۔ سورج کے لیے منتظر اور پرواز کے لیے اپنے اپنے آشیانوں میں بے تاب نیند سے تھک چہچہوں کی نغمگی سے سرشار بادِ صبا ہولے سے گنگناتی ہوئی چلی۔ دشتِ سوس سے پرلی طرف صبحِ صادق کے آسمان پر سیاہ دھندلکے میں ایک موہوم سی سفید لکیر مل گئی اور ریت کے لہریوں پر محبت کا تنفسِ تازہ پھیلتا چلا گیا۔

صادق نے سوار ہوتے ہوئے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑ کر کہا۔ "ابو حسین آپ

کی باتوں سے نئے دریچے کھلے ہیں مگر شک و شبہ کی ہوا جو اس سے آئی ہے، میں بھی سوچنے لگا ہوں کہ کہیں وہ ہی سب کچھ نہ ہو۔"

"نہیں شک و شبہ سے ماورا ہونا زندگی کے لیے بہت ضروری ہے ورنہ جینا تلخ ہو جائے۔ میں نے کوئی غیر معمولی بات نہیں کی، صرف یہی کہ زمانہ ان لوگوں کو معاف نہیں کرتا جو اس سے ایک قدم آگے سوچتے ہوں۔"

"شاید!" صادق نے دل گرفتگی سے کہا۔ پھر وہ سوار ہو گیا اور شاہراہ پر صبح کے ستارے کی روشنی میں اس کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز گونجتی رہی۔

حسین نے لکھا تھا:

"پدرِ محترم۔

استادِ محترم شب بیداری، فاقہ کشی کے عالم میں کرتے ہیں۔ ہمیشہ جَو کی روٹی سے روزہ افطار کرتے ہیں اور تین یا پانچ شبانہ روز کا روزہ رکھتے ہیں۔ نفس کو سخت سزائیں دیتے ہیں اور کڑی ریاضتیں کرتے ہیں۔ نہ دیوار سے ٹیک لگاتے ہیں، نہ پاؤں پھیلاتے ہیں اور نہ کبھی کسی غیر کے سوال کا جواب دیتے ہیں۔ میں ان کے رسائل کا مطالعہ اکثر کرتا ہوں، کیونکہ ان کی عدم موجودگی میں جب مجھے اپنا درس خوب یاد ہو جاتا ہے تو میں کچھ کام کرنے کی جگہ انہیں دیکھتا ہوں۔ عجیب باتیں ان میں لکھی ہیں جو ابھی تو میرے فہم وادراک سے بالا ہیں مگر شاید سمجھ آنے لگیں۔ دعا کیجئے میں استادِ محترم کی خدمت کر سکوں اور مدرسے کے لیے باعثِ فخر بنوں۔

استاد کبھی کبھار مجھے اتنی گہری نظر سے دیکھتے ہیں کہ میں گھبرا جاتا ہوں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں، ان کا مطلب کیا ہوگا۔ ان کی گہری سوچتی ہوئی میرے اندر تک دیکھتی ہوئی نگاہیں؟"

منصور، حسین کا خط لیے بیٹھا رہا، بیٹھا رہا۔ تُستر میں کم عمر اور سیمابی طبیعت رکھنے والا اس کا بیٹا کچھ خوش نہیں تھا۔ کیا مجوسی خون بغاوت پر آمادہ تھا؟ کیا تطہیر کا عمل ابھی مکمل نہیں ہوا تھا؟ خود اس نے محمّی کی زندگی میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ سید ھا اور

سادہ اور مجاہدے کا مذہب جس میں کبھی کسی آسرے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اس نے حسین کے پیدا ہونے سے بہت پہلے کلمۂ حق پڑھ لیا تھا۔ پھر وہ سوچا کرتا کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر دینِ محمدیؐ کی خدمت کرے۔ وہ خود اس محبت سے سرشار و سیراب تھا۔ اسے کتنی تمنا تھی کہ روضۂ رسولؐ کی زیارت کے لیے جائے اور پھر وہیں رہ جائے۔ اس در کے گداؤں میں ہو، اس شہرِ خوبی کی گلیوں میں ناصیہ فرسائی کرے، ان فضاؤں میں سانس لے، ان ہواؤں کو اپنے جسم سے مس ہوتا محسوس کرے جنھوں نے کبھی اس مولائے کل کے قدموں کو چھوا تھا۔ اس خاک کو آنکھوں میں لگائے۔ اس آسمان کو دیکھے جس کی طرف کبھی رسولؐ خدا نے دیکھا ہو گا۔ وہ مہک سے بھری گلیاں، وہ مکان، وہ مکین، کاش وہ جا سکتا، مگر سب کچھ اپنے اختیار میں کب ہوتا ہے۔ آدمی کے اپنے اختیار میں کچھ بھی نہیں، مگر جسے خدا چاہتا ہے، دیتا ہے۔

دعا سے کوئی گتھی سلجھ سکتی ہے؟

ہاں دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشنے والا اگر چاہے تو

اور وہ کیا چاہتا ہے، یہ کون جان سکتا ہے؟

سہل بن عبداللہ تستری کا مرتبہ اس کے خیال و خواب سے کہیں بلند تھا۔ وہ زاہدِ طریقت تھے۔ بے ریا اور بے عیب جو کچھ وہ پا چکے تھے۔ اس کا چرچا نہیں کرتے تھے، اس لیے کم گو تھے بلکہ بولتے ہی نہیں تھے۔ دروس میں بھی شریک ہوتے اور رواں رہنے والے شاگردوں کو سر کے اشارے سے صحیح اور غلط بتا دیتے، مگر وارفتگی، دیوانگی اور کم رہنے کی جگہ بیدار اور ہوشیار تھے۔ وہ ہوشیاری کی کونسی منزل پر تھے۔ کہاں سے گزرے تھے، اسے کیا معلوم تھا۔ وہ کم علم بے مایا تہی دست انسان تھے جسے اپنے شوقِ بے اختیار کے سوا کسی کا پتہ نہ تھا۔ اسے کبھی کبھار سینے کے اندر دل گھٹا ہوا محسوس ہوتا۔ اس کا جی چاہتا اس کے پر ہوتے، وہ ایک پرندہ ہوتا جو طویل مسافتیں اور لمبی اڑانیں کر سکتا۔ پھر وہ خاکِ پاکِ مدینہ دیکھ سکتا مگر وہ تو ایک ادنیٰ دنیادار تھا۔ ریشم بنتا اور خواب دیکھتا ہوا۔ اس کی تو خواب میں بھی کبھی وہ آرزو پوری نہ ہوئی تھی۔ وہ بری طرح دنیا سے بندھا ہوا تھا جس کی روح پابہ زنجیر قیدی کی طرح بس مقید تھی۔ کیا سہل اس کی رہنمائی کریں گے؟ کیا وہ اسے اپنے حلقۂ ارادت میں قبول کر لیں گے؟ اس نے فیصلہ

کیا کہ وہ سرائے اور ریشم بننے کے کاروبار کو اونے پونے بیچ کر تستر چلا جائے۔ اس نے اپنے جی سے یہ بات طے کرلی۔

اس نے اپنے طور پر تو یہ سوچ لیا تھا مگر حسین کا معاملہ ابھی اسی طرح تھا۔ خط سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ زیادہ دن وہاں نہیں رہے گا۔ وہ جہاں بھی پڑھنے کے لیے گیا جس مدرسے میں بھی رہا، کسی نہ کسی طور اسے اطمینان نہیں ہوا۔ اگر وہ تستر چلا بھی جائے اور وہاں رہائش پذیر ہو پھر بھی حسین کو روک کر رکھنے میں تو وہ کامیاب نہیں ہوگا۔ وہ عجیب بے چین روح تھا۔ سہل جو کڑی ریاضتیں کرتے تھے، اسے ان سے کیوں خوف آتا تھا۔ ہاں وہ خوفزدہ ہی تھا ورنہ ایک سال کے عرصے میں اس خط کا کیا مطلب۔ منصور کو اپنے بیٹے کو سمجھنے میں بھی دشواری پیش آرہی تھی۔ انسان ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکتے، وہ کیا کرے؟ وہ جو سوچا کرتا تھا مگر اس کی سوچ سے کیا بنتا ہے، اللہ جو چاہے گا۔ اس نے خط اٹھا کر پاس ہی پڑے چھوٹے صندوقچے میں رکھ دیا جس میں وہ نقدی رکھا کرتا تھا اور کتاب کو وہیں سے کھولا جہاں صادق کے آنے سے پہلے اس نے پڑھنا شروع کیا تھا۔

"اگر تمہارے پاس کوئی ہوا میں اڑتا ہوا آئے اور وہ شریعت پر عمل پیرا نہ ہو تو اس پر اعتبار نہ کرو۔"

اس نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ تحصیلِ علمِ دینی میں گزارا تھا۔ وہ باطن میں اترنے اور اسلاف سے سند پانے کو کسی قول کی صحت سمجھتا تھا۔ ہر وہ کام جو اسلاف نے کیا ہو اور جس طور اسے انجام دیا ہو۔ منصور کے لیے اس کا اتباع ضروری ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی عقل سے زیادہ اس رحمت کی تلاش میں رہتا تھا جو مدام خدائے تعالیٰ اپنے بندوں پر کرتا ہے جبکہ وہ خاص نہیں تھا۔ اسے سیرِ اسماء کا شوق تھا۔ گو اس کے مرشد نے اسے ان سارے بظاہر روشن اور دلفریب راستوں سے منع کیا تھا مگر اسے حیرت کے ساتھ ساتھ ایک لگن تھی کہ وہ ان راہوں سے گزرے، خود بھی وہ تجربات کرے۔ اسے اپنی کم مائیگی کا احساس تھا۔ وہ خلافِ شرع کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سیرِ اسماءِ خلافِ شرع ہے؟ اگر تختِ بلقیس کا حضرت سلیمان کے دربار میں لایا جانا ممکن تھا تو اور کیا بات ناممکن تھی۔ وہ اساطیر الاولین پر سارے یقین کے باوجود کبھی سخت متذبذب ہوتا۔ اس

کے مرشد ذکر اور مرقع پہننے کو اہم سمجھتے تھے مگر وہ باپ کی زندگی تک مرقع پہننے کی جرأت نہیں کر سکا۔ محمّی کے بعد زندگی کے کاموں نے اسے الجھائے رکھا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر روز روز کے فتنوں سے بچنے کی خاطر وہ اپنے مرشد کے زاویے میں ذکر کی محفلوں کا حصہ بن جائے۔ ہر شے سے بے نیاز اور بے پروا خود حسین سے بھی آزاد ہو جائے۔ اس کے لیے فکر مند نہ ہو۔ اسے وہی کرنے دے جو وہ چاہتا تھا۔ زندگی اور اس کے علائق جو ان چیزوں کی صورت میں اس کے گرد پھیلے تھے، وہ ان سے تو قطع تعلق کر سکتا تھا مگر حسین؟

کیا تُستر میں اس کے قریب رہنے سے وہ اپنے بیٹے پر کوئی فیصلہ مسلط کر سکتا ہے؟ خون میں حاصل کی ہوئی امانتوں سے کہیں بھی فرار نہیں۔ اب اسے محمی اکثر یاد آتا۔ سرائے میں اس کا اکیلا رہ جانا اور کاروبارِ حیات میں عدم دلچسپی کے باوجود چلتے جانا۔ آدمی جب تک زندہ ہے اسے اپنا سفر جاری رکھنا ہوتا ہے۔ یہ مجبوری ہے اور اس کو تقدیر کہہ لیجئے یا خدا کی مرضی۔ منصور نے معتزلہ کے مختلف فرقوں اور عقائد کا مطالعہ کیا تھا۔ خلفاء کی مجلسوں میں اب تک ان کو بار رہا تھا اور وہ خود سمجھتا تھا کہ جو کچھ وہ مباحث کی مجلسوں میں ثابت کر سکتے تھے اس سے کوئی خاص فرق عام زندگی پر نہیں پڑتا تھا۔ زندگی اپنی مجبوریوں مقہوریوں کے ساتھ رواں رہتی تھی اور فلسفے کی تاویلات کے باوصف ختم ہوتی تھی۔ کئی زندگیاں چراغ کی لو کی طرح گھٹتی بڑھتی اور کئی بھڑک کر بجھ جاتی تھیں۔ ایک نسل پچھلی نسل سے عقائد اور فلسفے خیالات اور مسائل ورثے میں لے کر اس پر اپنی طرف سے اضافے کر کے اپنے سے اگلی نسل کو دیتی تھی۔

اس نے حسین کو ایک بہتر صورتحال دی تھی۔ بت پرست سے آتش پرست اور پھر خدا پرست۔ فاصلہ زیادہ تو نہیں تھا اس لیے کہ بہر حال خدا پتھروں کو پیدا کرنے والا تھا، آتش کو بنانے والا تھا۔ وہ تو خود ہی تھا۔ اس نے ابلیس کو پیدا کیا تھا۔ مجرم مغرور سزا یافتہ آسمانوں کی بادشاہت سے نکلا ہوا راندۂ درگاہ۔ پتہ نہیں اس بادشاہت میں اپنی بے بضاعتی کو سمجھتے ہوئے وہ کس شے پر نازاں ہوا تھا۔ کیوں نازاں ہوا تھا۔ اسے یہ حوصلہ کس نے عطا کیا تھا؟

گہرے عقیق رنگ سحابِ شام چاروں طرف سے بستی اور باغوں پر جھکے ہوئے

تھے اور آسمان ایک الاؤ کی روشنی سے لپکتی آگ اور بھڑکتے شعلوں سے پُر تنور کی طرح تھا۔ جب عربی ناقہ پر سوار کوئی اونچے دروازے میں ذرا سا جھک کر اندر آیا۔

''میں ہندی سوداگر ہوں اور یہاں کی شہرت سن کر دور سے آیا ہوں۔ کیا عمدہ ریشم دستیاب ہو سکتا ہے؟''

منصور یونہی خالی الذہن اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جیسے بھول گیا ہو کہ وہ کپڑا بُننے والا بھی ہے اور اس کی شہرت بہر حال لوگ سن چکے ہیں۔

''خوش آمدید، خوش آمدید۔''منصور نے جھک کر کہا۔ ناقہ نے پہلے اپنے اگلے پاؤں موڑے اور تھوڑا سا جھکی پھر پشت کو جھکایا۔ اگلے پاؤں کو تھوڑا اور موڑا، ذرا جھومی اور پیٹ کو زمین کے ساتھ لگا دیا۔ ہندی سوداگر کود کر نیچے اترا۔ منصور کے ساتھ اندرونی کمرے کی طرف آ گیا۔

''آپ کا ورودِ مسعود کہاں سے ہوا ہے؟'' منصور نے قالین پر تکیے کے سہارے بٹھا کر آنے والے سے پوچھا۔

''میں بغداد سے آ رہا ہوں۔''اس نے ٹوپی اتاری تو لمبی چوٹی پیچھے لباس پر جا پڑی جسے اس نے ہاتھ سے سنوار کر برابر کیا۔ اس کا گھٹا ہوا سر پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور ٹوپی بھی گیلی تھی۔ لگتا تھا وہ منزلیں مارتا ہوا آیا ہے اور تھکا ہوا ہے۔

''آپ ِدز کے ساتھ پل سے اتر کر جو بستی ہے وہاں سے اب آپ نے کام تقریباً ختم کر دیا ہے کیا؟''اس نے پوچھا۔

''تقریباً۔''منصور نے تھوڑی دیر چپ رہ کر پھر کہا۔ ''آدمی بیک وقت دو جگہ تو نہیں رہ سکتا نا۔ پدرِ محترم کے بعد یہاں مجھے زیادہ کام رہتا ہے۔''

''میں نے تو سنا ہے آدمی بیک وقت کئی جگہ رہ سکتا ہے۔''اس نے ہنس کر کہا۔ ''آپ کے ہاں بھی ایسی روایتیں اور کہانیاں ہیں۔ بزرگوں کی کرامات اور ہمارے ہاں تو بہت کچھ ہے۔ عام زندگی میں اس پر عمل ہوتے دیکھا تو نہیں مگر پُراسرار باتیں اور ناممکن العمل کام بہر حال ہوتے ہیں۔ دنیا ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ابھی میں بغداد سے آیا ہوں۔ وہاں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا جو کسی طرح کم نہیں ہوتا۔'' وہ چپ ہو گیا۔

''کیا ہوا تھا؟'' منصور نے پوچھا۔

''دجلہ کا پانی تین دن تک اتنا زرد تھا جیسے کوہستان اس میں گھل کر بہہ رہے ہوں۔ اتنا گہرا تھا اور یہ دیکھئے، اس نے اپنے چغے کے دامن کو لہراتے ہوئے کہا۔ ''میں کشتی میں نیچے کی طرف جارہا تھا کہ یہ حصہ پانی سے بھیگ گیا۔ دھونے کے باوجود یہ رنگ چھٹتا نہیں۔''

بہت مضطرب ہو کر منصور نے پوچھا۔ ''لوگ کیا کہہ رہے تھے؟''

''اس لیے کہ خلیفۃ المسلمین متوکل نے معتزلہ کو دربار سے نکال دیا ہے اور ان پر ظلم و ستم روا رکھا۔''

''معتزلہ نے آج تک جو کچھ کیا ہے، دربار پر جس طرح قابض رہے ہیں، اپنے عقائد سے انہوں نے جس طرح اسلام میں رخنہ اندازی کی ہے، اس کا کوئی جواب نہیں۔'' منصور نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ایک گروہ اپنے نفع کی وجہ سے دوسرے کو شکست دیتا ہے اس میں شاید دربار کی سیاست ہی ہو۔'' ہندی نے پھر کہا۔

''نہیں یوں نہیں۔ اگر خلیفہ متوکل علی اللہ نے ان کو جلاوطن کیا ہے اور بغداد سے نکل جانے کا حکم دیا ہے ان کی املاک ضبط کی ہیں تو پھر بات سیاست سے کچھ آگے ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ عقائد میں جو تبدیلی ایک صدی میں آئی ہے اس کو بدل دیں اور شاید ایسا کرنا ناممکن ہو۔'' منصور نے بڑی مایوسی سے کہا۔

''ایک دم تبدیلی یکسر ناممکن ہے۔'' اس نے ہندی کو خاموش پا کر کہا۔

''آخر کیوں؟'' ہندی نے پوچھا۔

''اس لیے کہ جو دربار آج تک علماء اور امراء تک ان کے زیرِ اثر تھا اس میں ان کا اثر و نفوذ اس حد تک ہو گا کہ ایک دم ختم نہ ہو سکے۔ تم کسی چھوٹے پودے کو تو جڑوں سمیت اکھاڑ سکتے ہو، مگر درخت کو نہیں۔''

''یہ تو ہے، آپ نے ٹھیک فرمایا۔ مگر اس کا انجام کیا ہو گا؟'' ہندی تجار نے پوچھا۔

''یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔'' منصور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے لیے

کچھ کھانے پینے کا بندوبست کروں۔"

"روٹی اور دودھ آپ کو پسند ہے؟"

"بیشک، بیشک۔" اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں پہلے منہ ہاتھ دھونا چاہوں گا۔ اگر نبیذ بھی میسر آسکے تو---"

منصور جاتے ہوئے سوچتا جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے خواجہ حسن بصری کی مجلسِ علمی تھی اور واصل بن عطا نے اس میں سے اعتزال کیا تھا۔ وہ چند مسائل کے الجھاؤ کی وجہ سے ان سے الگ ہوئے تھے۔

"گناہِ کبیرہ کیا ہے؟"

پھر اس ایک سوال نے اور بہت سے سوال پیدا کیے۔ یونانی فلسفہ دین اور فلسفہ کی آویزش کلام پاک کے مزاج کے مطابق اس کو بنانے کی سعی، جہنم و جنت، قدر و جبر اور اتنے بہت سے الجھاؤ سے جو علماء کی مجلسوں میں بحث و مباحث کے دوران پیدا ہوتے تھے۔

مرتکبِ گناہِ کبیرہ کے لیے درمیانی منزل کا مسلک معتزلہ میں سب سے زیادہ اہم اور بنیادی مسلک تھا۔ یہی وہ بنیاد تھی جس پر یہ جماعت قائم رہی۔

پھر یہودیوں اور نصرانیوں سے معتزلہ نے اکتسابِ فیض کیا۔ نسطوری عیسائی جن کے سینوں میں مسلمانوں کے خلاف آتش سوزاں تھی۔ معبد الجہنی اور اس کا استاد یحییٰ دمشقی جو قدر کی نفی کرتا اور حریتِ ارادہ کا داعی تھا۔ اس کا بیٹا ابو فرّہ جو خلیفہ مامون الرشید کے حضور مجادلاتِ دینی برپا کرتے تھے۔ آخر معبد الجہنی کو حجاج نے عذاب دے کر سولی پر چڑھا دیا۔ پھر غیلانی دمشقی کے ہاتھ پاؤں قطع کیے گئے یا اسے زندہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ حریتِ ارادۂ انسان ان کا سب سے بڑا دعویٰ تھا جس کا یہ سب پرچار کرتے تھے۔ امویوں کے زمانے میں یہ بیدردی اور شقاوت سے قتل کر دیئے جاتے تھے۔ اس لیے اس پر پختہ اعتقاد رکھنے کے باوجود یہ اس کا اعلان کم از کم کرتے تھے۔

دربارِ بغداد میں خلفاء کے مزاج میں معتزلہ بہت پہلے دخیل ہو چکے تھے۔ منصور جب آلِ علی کی بجائے خلیفہ ہوا اور ابو مسلم خراسانی کی ساری کوششوں کا نتیجہ خلافت کے بنو عباس میں منتقل ہو جانے کی شکل میں نکلا۔ آلِ رسولؐ پر ظلم و ستم کا باب

کھلا۔ وہ جو اہلِ علم تھے اور اہلِ فضل تھے۔ عافیت کی خاطر نظروں سے پوشیدہ ہوئے۔ پھر کمتر لوگوں نے دربار خلافت تک رسائی حاصل کی۔ وہ برتر تو نہ تھے مگر ان کی مدد فلسفہ یونان نے کی اور یوں دین اور فلسفہ مل کر ایک نیا طرزِ خیال ترتیب دیا جانے لگا۔ علمی مجالس میں سعادتِ قلبی نہیں، اسراف ذہنی نے رواج پایا۔ آزاد خیالی بڑھی۔

آزاد خیالی، حریتِ خیال بجائے خود قابلِ نفرین نہیں تھی مگر اس کے نتائج لرزہ خیز تھے۔ ان کے لیے بھی جو اس میں یقین رکھتے تھے اور ان کے لیے بھی جو اس پر عمل کرتے تھے۔

علماء اور فقہاء کا ایک بڑا طبقہ گوشہ نشین ہونے کے باوجود خیالات پر کلی اختیار رکھتا تھا۔

ہندی تاجر کی نظر بہت گہری اور اس کا تجربہ وسیع تھا۔ ریشم کو دیکھتے ہوئے اس نے ریشم کے کیڑوں، ان کی خوراک، موسموں اور شدتوں، برف اور بارشوں اور خود پانی کی گرمی اور نیم سرد ہونے کے درجات تک پر اپنے مکمل علم اور معلومات۔ سے منصور کو بہت مرعوب کیا۔ اس نے جو حاضر اور تیار مال تھا، سب کا سب خرید لیا۔ قافلہ دشوار گزار پہاڑی راستوں سے جو ہندوستان سے قریب تر تھے اس کا سامان لے کر روانہ ہونے والا تھا۔ وہ کم عمر اور دلیر تھا اور آزاد خیال تھا مگر جتنے دنوں وہ سرائے میں ٹھہرا، اپنے سامان میں سے ایک بُت نکالتا اور اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر دعا کرتا اور پھر اسے سامان میں رکھ دیتا۔

منصور نے اس کے باوجود کہ کسی کے عقائد میں دخل اندازی پسند نہیں کرتا تھا سوچا کرتا کہ یہ اچھی بات ہے کہ اپنے خداؤں کو یہ لوگ یوں ہمراہ رکھتے ہیں۔ یہ ان کے تابع ہوتے ہیں کہ جب جی چاہا ان کو نکالا جھاڑ پونچھ کر سامنے سجالیا۔ دعا کی، ہاتھ جوڑے، مراقبے کی سی کیفیت میں رہے۔ پھر اپنی زندگی کو وہیں سے جوڑ لیا جہاں سے چلی تھی۔ ان کے نزدیک مذہب عام زندگی میں روزمرہ کے لیے کام آسکے بس اسی قدر کافی ہوتا ہے۔

"ہمارے ہاں مظاہرِ قدرت اتنے بہت ہوتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ پوجا کرتے ہیں۔" ہندی نے جس کا نام کرشن تھا، کہا "ہم ہوا کی دیوی کی پانی اور

بارش کے دیوتا کی پرستش کرتے ہیں اور انہیں خوش رکھنے کے لیے ان کی پوجا کرتے رہتے ہیں۔"

"پھر یہ بدھ مت کیا ہے جس کا چرچا چین اور جاپان تک ہے؟" منصور نے پوچھا۔

"وہ ایک الگ خیال ہے، شکتی پانے کا الگ طریقہ۔ رحم اور امن سے رہنے کا سلیقہ۔" کرشن نے کہا۔

"تمہارے ہاں سب سے دلآویز کونسی چیز ہے؟" منصور نے پوچھا۔

"ہمارے موسم اور ہماری عورتیں۔ موسم شدید اور دلآویز ہوتے ہیں۔ پاگل کر دینے والے دلفریب۔ راتیں سیاہ اور ستاروں بھری اور ہماری عورتیں بھی شدید چاہت سے لبریز دل رکھتی ہیں۔ پتی ورتا شوہر کے ساتھ جل مرنے والی ایسی عورتیں سارے جہان میں کہیں نہیں ہیں۔"

جب قافلہ جانے کے لیے تیار ہوا اونٹوں پر سامان بار کیا جا چکا۔ سالارِ کارواں نے سب سے اگلی ناقہ کی مہار پکڑلی تو منصور نے ہندی کو دعا دیتے ہوئے کہا۔

"خدا کرے تمہاری بیوی کو جلنا نہ پڑے، وہ اس اذیت سے کبھی نہ گزرے۔"

ہندی نے لپٹ کر منصور سے رخصت لی اور نیم شب کو زردی مائل نیلاہٹ میں جب آخری راتوں کا چاند ہولے ہولے افق پر طلوع ہو رہا تھا، وہ آبِ دڑ کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف چل دیا۔ دیر تک شاہراہ سے پرے اس کے اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹیں سنائی دیتی رہیں جیسے زندگی گزرنے کے بعد بھی آدمی ماضی میں دور تک گمشدہ آوازوں کو سنا کرتا ہے۔

تُستر اتابک کی وسیع سرزمین کے ایک سرے پر ہے۔ پُررونق اور شاداب نفیس اور اعلیٰ درجہ کے باغوں سے گھرا ہوا۔ نہرالارزق کا پانی گرمیوں میں نہایت ٹھنڈا اور شفاف اور گہرائی کی وجہ سے پُرلطف مسافروں کے داخلے کے لیے اس پر کشتیوں کا پل ہے۔ منصور نے پل کو عبور کیا ہے تو رات ہو چکی تھی۔ دو دن کی طویل مسافت کے

بعد وہ اپنی حالت درست کر کے اور اپنے حواس مجتمع کر کے مکتب میں جانا چاہتا تھا۔ گردِ سفر کو جھٹک کر اپنے آپ کو بیٹے کی ملاقات کے لیے تیار کر کے زاویہ جس میں وہ ٹھہرنا چاہتا تھا شہر کے وسط میں لاجواب بازاروں اور جاری پانی کے سوتوں اور نہایت عمدگی سے بنی مسجدوں کے عین مرکز میں تھا۔ رہٹوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ پانی پر سفید جھاگ ستاروں کی روشنی میں چاندی کے زیوروں کی طرح سطحِ آب پر رواں تھا۔

اس زاویئے پر درویش اور مسافر سب کو نہایت عمدہ کھانا دیا گیا۔ نماز کے بعد جن لوگوں کو ذکر کا شوق تھا وہ پاس کی مسجد میں چلے گئے۔ ہوا اس قدر پُر سکون تھی کہ نیند آنے لگی اور تسبیح ہاتھ میں لیے ہوئے منصور کو بھی جھپکی آ گئی۔ اس نے دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور لوگ جمع ہیں، سب چپ ہیں، ہر طرف خاموشی ہے سانس تک چلنے کی آواز نہیں آتی۔ پھر کچھ لوگوں کو پابجولاں لایا جا رہا ہے۔ وہ منہ چھپائے ہیں سر برہنہ ہیں اور ان کے گرد اژدھام ہے جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا ہے۔ پھر ایک تیز اور ہر شے پر چھا جانے والی صدا ہے جو سنتا ہے بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے۔ کسی کو ہوش نہیں رہتا۔ جن کے چہرے پوشیدہ تھے وہ کھل جاتے ہیں اور ایک چہرہ حسین کا ہے۔

منصور نہایت مضطرب ہو کر آگے بڑھنا چاہتا ہے مگر وہ چہرہ اس سے چھپا لیا جاتا ہے اور وہ حیران کھڑا ہے۔ پھر ایک جھٹکے سے وہ بیدار ہو گیا۔ اسے یہ نظارہ کیوں کروایا گیا تھا۔ حسین کیوں اس حالت میں تھا؟ منصور کا دل بہت ہی پریشان ہوا۔ باقی رات اس نے بیٹے کے لیے دعائیں کرتے اور خود حضورِ مرشد میں مناجاتیں کرتے گزاری۔

جب وہ پہاڑی کے اوپر سیڑھیاں طے کر کے پہنچا ہے تو حسین کو اپنا منتظر پایا۔ وہ اسے خانقاہ کے دروازے پر مل گیا۔ پدرِ محترم آپ اگر شام ہی تشریف لے آتے تو یہاں ہماری اقامت گاہ میں بھی مسافروں کے لیے خاطر خواہ انتظام ہے۔

منصور نے کوئی جواب دیئے بنا اسے گلے سے لگا لیا، دھڑکتے دل کے ساتھ۔ حسین نے اتنے دنوں میں خوب قد کیا تھا۔ وہ اس سے نکلتے ہوئے کندھے اور سر سے بلند تھا مگر نہایت دبلا، تقریباً لاغر جسم۔ منصور کو یاد آیا تستر میں تربیتِ دینی کے ساتھ تربیتِ نفس پر ساری توجہ صرف کی جاتی تھی۔ برگزیدہ بندوں اور زاہدوں کے سے

اطوار پر خصوصی توجہ صرف ہوتی تھی تاکہ نفس جاگتا رہے۔ ریاضتوں اور شبِ بیداری سے اس کی سرکشی دور ہو۔

حسین نے کہا "شیخ مدرسے میں تشریف رکھتے ہیں، آپ ان سے ملنا چاہیں گے نا؟ مگر آپ ان سے میرے خط کا ذکر نہیں کریں گے۔ میں نے جو دیکھا تھا وہ آپ کو لکھ دیا۔ میں ان کا اتباع کرنے کے لائق اپنے آپ کو نہیں پاتا اور منافقت میری فطرت میں نہیں۔" وہ بنا رُکے بول رہا تھا جیسے مدتوں بعد اس پر بولنے کا دورہ پڑا ہو وہ اداس ہو اور اپنے جی کی بات کسی سے کہنا چاہتا ہو۔

"جانِ پدر میرے نہ کہنے کے باوجود سہل جو شیخِ کامل ہیں، میرے دل کا حال جانتے ہیں اور تمہاری حالت بھی ان سے پوشیدہ نہیں ہوگی۔"

"خیر،" حسین نے اپنا سر جھٹک کر کہا۔ "آپ ان سے ذکر نہ کریں۔ اگر وہ از خود استفسار کریں تو مجبوری ہے۔"

"تم ایسا سوچتے کیوں ہو، ایسا کرتے کیوں ہو؟" منصور نے نہایت نرمی سے پوچھا۔

"میں قدم قدم نہیں چل سکتا اس میں ایک عمر صرف ہو جاتی ہے۔ میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے؟ اگر آپ میری بات پر ہمدردی سے غور کریں گے تو سب بات آپ پر واضح ہو جائے گی۔"

منصور کو صادق کی بات یاد آئی کہ "تمہارا بیٹا غیر معمولی ہے۔" وہ اب متذبذب کھڑا تھا۔ کیا وہ در پر سے لوٹ جائے اور شیخ کو ملے بنا چلا جائے؟

خانقاہ کے دروازے پر کسی نے اسے پکارا۔ "ابو حسین! آپ کو شیخ یاد فرماتے ہیں۔"

منصور حیران ہوا جیسے سہل بن عبداللہ آئینوں کے آر پار دیکھ رہے ہوں۔ وہ آئینہ خانے کے باہر کھڑا ہو یا شیخ خود آئینہ ہوں۔ انہیں سب دکھائی دے رہا ہو، ظاہر و باطن۔ وہ معمولی آدمی تھا اور اسے ان کی اس دسترسِ کامل سے بہت خوف محسوس ہوا۔ اسے لگا وجود تحلیل ہو رہا ہے، خیالات اور دل کوئی شے بھی اس کے اپنے اختیار میں نہ ہو۔

منصور سر جھکا کر اس پیغام لانے والے کے عقب میں شیخِ کامل کی نگاہ دور بین کا سامنا کرنے کے لیے چلا۔ حسین کی طرف دیکھے بنا جیسے وہ بیضا سے اسی لیے آیا ہو، یہی حاضری اس کی جان اور دل کی حاضری بہت ضروری ہو۔

طالب علموں کو رخصت کر کے جب شیخ اور منصور آمنے سامنے بیٹھے تو اس کی نگاہ اس جمال کا سامنا نہ کر سکتی تھی۔ ان کے جلال سے وہ از حد مرعوب تھا اور آنکھ اٹھا کر دیکھنے، بات کرنے کی جرأت اس میں نہ تھی۔ وہ سر جھکائے رہا۔

نہایت ملائمت سے اسے مخاطب کر کے انہوں نے کہا۔

"دعائیں مقدر بدل سکتی ہیں اور جب شفاعت ان کے ہاتھ میں ہو جو وجہ ِوجودِ کائنات ہیں۔ تم ہرگز پریشان نہ ہو۔ حسین خودسر تو ضرور ہے مگر بالآخر" اور وہ بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گئے۔ منصور کا دل بری طرح دھڑکا۔ آنے والے وقت سے، مقدر سے اور قبولیتِ دعا کے احساس سے ایک شعلہ سا اس کی جان کو چاٹ گیا جیسے وہ قبل از وقت ان سب باتوں کا مشاہدہ کر رہا ہو۔

اس نے دوزانو ہو کر شیخ کے سامنے کی زمین کو بوسہ دیا اور کہا، "خواب کی ہر بات اگر حرف بہ حرف پوری ہو گی تو---" وہ بھی آدھی بات کہہ کر چپ ہو گیا۔

"حسین کی رفتار بہت تیز ہے، وہ ضرورت سے زیادہ مضطرب ہے۔ اس کے اشواق شدید ہیں اور اس کے مقاصد جلیل، مگر وقت سے کون لڑ سکتا ہے؟ اسے چاہیے شرع کی حدود میں رہ کر ہر بات سوچے۔ مسلمان شرع پر ہے تو مسلمان ہے ورنہ پر شور آدمی کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔"

منصور نے سر جھکا لیا۔

"تم تُستر میں نہیں رہ سکو گے، اس لیے کہ تمہارا پیشہ اس کی اجازت نہیں دیتا اور حسین کے لیے احکام دوسری جگہوں کے ہیں۔" شیخ کی آواز نہایت صاف مگر مدھم تھی۔

"علائقِ دنیوی سے جان بچانا مشکل ہے۔" شیخ نے پھر کہا۔ "جو ہے جہاں ہے، اس پر قانع رہو۔" تسبیح کے دانے گردش کر رہے تھے اور ان کی انگلیوں سے بارش کے قطروں کی طرح پھسل رہے تھے۔ پتہ نہیں اب ان کے آئینے میں کیا منعکس ہو رہا تھا۔

اس کے خیال اور اس کے وسوسوں کی موہوم پر چھائیں۔ اس کے خواب میں دیکھی ہوئی قیامت اور پابجولاں منہ چھپائے ننگے سر لائے جانے والے لوگ۔

چوڑی سیڑھیاں اتر کر جب وہ آخری زینے پر پہنچا تو حسین نے کہا۔

"پدرِ محترم کیا آپ خوفزدہ ہو کر چلے آئے۔ آپ نے شیخ کامل سے کچھ پوچھا، انہوں نے کچھ بتایا؟"

"کیا آپ نے دیکھا ہے کہ شیخ کی حفاظت ایک مارِ سیاہ کرتا ہے۔"

منصور نے نہایت بے یقینی سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"اچھا تو وہ مارِ سیاہ آپ سے پوشیدہ رہا؟" پھر نہایت فکر مندی سے اس نے کہا۔

"شیخ کو ایسے پاسبانوں کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جانے کیا دکھانا چاہتے ہیں؟"

"سوال نہیں کرتے، یہ اصولِ خانقاہی کے خلاف ہے۔" منصور نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"میں آزاد روی کا قائل ہوں اور کسی اصول کی پابندی سوائے شرع کے ضروری نہیں ہے۔" وہ ذرا جوش میں تھا۔

منصور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "جانِ پدرِ ہر آزادی کی ایک پابندی ہے۔ خود یہ روش ایک طرح کی پابندی ہے۔ کبھی تم نے سوچا ہے؟"

"آہستہ روی کا یہ راستہ میرے لیے نہیں۔" حسین نے دل برداشتگی سے جواب دیا۔ "اور شیخ اس بات کو جانتے ہیں۔"

"جانتے ہوں گے مگر انہوں نے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ میں چاہتا تھا کہ کاروبار ختم کر کے تمہارے قریب تستر میں آ رہوں مگر —— " وہ چپ ہو گیا۔

"تستر ساری دنیا نہیں ہے اور آپ میرے پیچھے کب تک سرگرداں ہوں گے؟"

"تو حسین کو یہاں قرار نہیں ہوگا۔" منصور سوچتا ہوا حسین کی اقامت گاہ کی طرف گیا۔

"پدرِ محترم میں نہایت ہی عاجزی سے اپنی کم مائیگی کا اقرار تو کر سکتا ہوں۔ اپنے

ذرۂ ناچیز ہونے کا فنا کی زد میں ہونے کا، مگر میرا دل سیاحتِ عالم میں پڑا ہے اور شیخ تو سیرِ اسماء تک سے منع فرماتے ہیں۔ مجھے ان کے حکم سے سرتابی کی تو مجال نہیں۔ یہاں رہ کر میں یہ سب نہیں کر سکتا۔" منصور اپنے بیٹے کی بات سمجھتا تھا اور اس کی بے چینی کا بھی اسے کچھ انداز تھا۔

"اقصائے عالم میں ہواؤں کی طرح آزاد گھومنے کو میرا جی چاہتا ہے۔ ہواؤں پر حکمرانی کرنے کو بادلوں پر سوار ہونے کو۔ میں آپ کو کیا بتاؤں میں کیا کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ کبھی سوچتا ہوں، میرے بازو پھیلیں تو مشرق اور مغرب کو چھو لیں۔ برفانی چوٹیاں میرے قدموں میں ہوں۔ کوہسار میرے زیرِ نگیں ہوں۔ عرش کی نیلاہٹ ستاروں کی جگمگاہٹ کو چھو کر دیکھوں۔ دنیا میرے قدموں تلے سمٹ جائے۔ فاصلے ایک نکتے کی طرح ہوں۔"

منصور سحر زدہ سا بیٹے کی باتیں سنتا رہا جو اگر کوئی اور سنے جو اُسے سمجھتا نہ ہو تو جانے کیا کہے۔

"یہ سب انسان کی پہنچ سے باہر ہے۔" منصور نے کہا۔ "اور ایسے دیوانے خواب نہ دیکھا کرو۔ ناممکن الحصول خوابوں کے پیچھے مت گردش کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ تعلیم مکمل کر کے تم بیضا کی بستی میں اقامت گزیں ہو جاؤ۔"

"اور دادا کی سرائے کے دروازے کھول کر مسافروں کی خوشنودی حاصل کروں؟" حسین نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

اس کی توجہ ہٹانے کے لیے منصور نے کہا۔ "ایک ہندی تاجر جو ریشم کا خریدار تھا، سرائے میں آن کر ٹھہرا تھا۔ وہ نہایت عجیب و غریب رسم و رواج کا ذکر کرتا تھا۔ کیا تم اس بات پر یقین کر سکتے ہو کہ عورتیں اگر ان کا شوہر مر جائے تو زندہ ہی اس کے ساتھ جلائی جاتی ہیں؟"

حسین کو جیسے ایک جھٹکا لگا۔ وہ ایک دم سیدھا بیٹھ گیا۔

"ایک زندہ سانس لیتی ہوئی تندرست زنِ ہوش مند؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں بالکل۔"

"راہِ محبت میں یہ سب ممکن ہو سکتا ہو گا۔" اس نے جیسے اپنے آپ سے نہایت آہستگی سے کہا۔

"یہ راہِ محبت نہ بھی ہو تو بھی ان کے ہاں کا دستورِ زندگی ہے۔" منصور نے جواب دیا۔

حسین بہت دیر سوچتا رہا، سوچتا ہی رہا۔

"کیا اس ہندی سوداگر نے بتایا تھا کہ زنانِ سوختنی کو کیا پابجولاں اس آتش کی طرف لایا جاتا ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"یہ تو زبردستی ہو گی، وہ اپنی مرضی سے نہایت آزادی سے صبر و تحمل سے مرنے والے کے ساتھ جل جاتی ہے۔ ہے نا عجیب بات؟ اور وہ کہتا تھا ہمارے موسم اور ہماری عورتیں شدید ہیں۔"

"کمال باشد۔" حسین کے چہرے پر سے جیسے بادل ہٹ گئے۔ پھر وہ ہنسا، اس نے کمالِ ادب سے منصور کے ہاتھ کو چھو کر کہا۔ "میں سیرِ عالم میں اب ہندوستان کو بھی شامل کیے لیتا ہوں۔" اور اس نے گہری نگاہ سے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو عاشقِ زار باپ تھا اور اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ محبت آدمی کو کبھی کبھار ہمت اور حوصلہ عطا کرتی ہے اور کبھی نہایت بزدل اور بہت بیچارہ بنا دیتی ہے۔

حسین نے بتایا، "نہایت سخت احکامات دربارِ خلافت سے معتزلہ کے خلاف گردش کرائے گئے ہیں اور ہر وہ شخص جس پر معتزلہ ہونے کا شک ہے، اپنی جان چھپاتا پھرتا ہے۔ بیخ کنی کرنی اگر مقصود ہی ہے تو دربار سے شروع ہونی چاہیے۔ متوکل علی اللہ ایک عمدہ حاکم اور ایک سچا مسلمان ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"نسطوری عیسائی اور یہودی اور مجوسی سب کسی نہ کسی طور معتزلہ کے ہمدرد ہیں۔"

"جانِ پدر تم کچھ اور نہ سوچو، سوائے اس کے تمہیں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بیضا میں مدرسہ قائم کرنا ہے۔ ان علاقوں میں بہت ضرورت ہے۔"

حسین نے سر جھکا لیا اور منصور نے سوچا، شاید وہ اس کی بات پر غور کر رہا ہے۔

پھر وہ ریشم کے کاروبار کی اور ان کتابوں کی جو منصور کے زیرِ مطالعہ رہی تھیں اور نسبتی

کے باقی لوگوں کا ذکر کرتے رہے جو حسین کو کسی نہ کسی طور یاد کرتے تھے۔ اس کے ماموں کی بیٹیاں اب بڑی ہو گئی تھیں اور اسے پوچھتی تھیں۔ عام زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں۔ بیضا کے باغوں اور پھلوں اور دشتِ سوس کی آندھیوں کی باتیں کرتے کراتے دن ڈھل گیا۔ سائے لمبے ہو گئے۔ تستر کی کمال خوشگوار ہوا خوشبو سے پُر پانی کی نمی پر سے آتے ہوئے اذانوں کے شکوہ سے رُک رُک کران کی طرف بہنے لگی۔

خلیفہ متوکل علی اللہ نے جب نمازِ جمعہ کی امامت کے لیے سوار ہونا چاہا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ چل نہیں سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے اور پسینہ ہر بُن مُو سے نکل رہا تھا جو اس کی جان کو گھلا رہا تھا۔ غلام متوحش کھڑے تھے اور حکم کے منتظر تھے۔ پہلی اذانیں کب کی ہو چکی تھیں۔ تب فتح بن خاقان اور عبید اللہ بن یحییٰ، اس کے دونوں وزیروں نے کہا۔ "اے امیر المومنین آپ کے اہل بیعت میں سے بہت سے لوگ جمع ہیں اور داد کے طالب ہیں۔ امیر المومنین کو ضیقِ صدر اور حرارت کی شکایت ہے، اس لیے حکم دیں کہ معتز باللہ ولی عہد نماز پڑھائیں اور اس یومِ شریف سے شرف حاصل کریں۔"

معتز باللہ نماز کے بعد اس طرح کہ فتح بن خاقان اور عبید اللہ بن یحییٰ اس کے ساتھ ساتھ دائیں اور بائیں اور سارا عالم اس کے سامنے تھا، متوکل کے پاس واپس آئے۔ ان دونوں نے معتز کی تعریف کی کہ "نہ کوئی اس قدر اچھا تھا باعتبارِ حاجت روائی کے اور فی البدیہہ تقریر کرنے میں بلند آواز اور شیریں بیان اور اچھی نصیحت کرنے والا۔"

متوکل خوش ہوا اور کہا۔ "معتز باللہ اللہ تعالیٰ تمہیں خیر سنائے اور ہمیں تمہاری زندگی سے فائدہ مند کرے۔"

طبیب بختیشوع نے معجون کو پہلے خود چکھا اور پھر خلیفہ کو حلبی شیشے کی طشتری میں جس میں سونے کا چمچ تھا، نہایت نفاست سے پیش کیا۔ یہ ضیقِ صدر کا دوا تھا۔ متوکل نے نظر اٹھا کر اُسے دیکھا شہد رنگ طیلساں اور شہد رنگ عمامہ۔ "خوب!" اس

نے جی ہی جی میں کہا۔ ابھی کچھ دن پہلے اس کے ایک حکم میں کہا گیا تھا کہ ذمی اور مسلمان اپنے لباس سے پہچانے جائیں، ان کے گھروں پر بھی نشان ہوں۔ پھر اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ شہد رنگ عماموں کی کثرت اسے گھیرے تھی۔

وہ دجلہ کے کنارے کھلنے والے دریچے میں بیٹھ کر نظارہ کرتا تو جوق در جوق لوگ شاہراہوں پر سے گزر رہے ہوتے۔ ذمی غلام خچروں پر اور اپنے لباسوں پر سینے اور پشت کی طرف شہد رنگ کپڑوں کے پیوند لگائے تاکہ وہ نمایاں ہوں، ذمی عورتیں شہد رنگ چادروں میں ملبوس، ذمی جوانوں کے عمامے سواریوں سے بلندی پر ڈوبتے سورج کی سرخی کو پکڑتے ہوئے اور چمکتے ہوئے، ایک خلقت رواں دواں۔ لانبے قدوں والے ممتاز ہاشمی سہمے ہوئے جھکے ہوئے، جیسے اپنے آپ چھپانا چاہتے ہوں۔ عجمی دور دراز ملکوں سے آنے والے جو یہیں بس گئے تھے۔ یہودی جن کی وفاداریاں مشکوک تھیں، نسطوری بطریق جو اپنے مدرسوں کے لیے سامان خریدنے نکلتے تھے اور اقامت گاہوں میں رہنے والے طالب علموں کے اخراجات خود برداشت کرتے تھے۔ ترک جو دوستانہ اعانت کے لیے آئے تو دربار کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ مغربی جو سرزمین اندلس کے فسانوں میں سے زندہ ہو کر خوابوں کے کرداروں کی طرح اپنے مختلف لباسوں کی وجہ سے الگ دکھائی دیتے۔ دجلہ خود ہزاروں حسن پیدا کرتا ہوا جیسے چوکھٹے میں آئینہ لگا ہو۔ اس کی ہوا طرب و نشاط پیدا کرتی ہوئی، پھر باشندگانِ شہر عجب و نخوت سے سر بلند کیے ہوئے لباس کا دامن غرور سے زمین پر گھسیٹتے ہوئے۔

ایک میلہ سا اُس کے سامنے سے گزرتا۔

اس کے مشیروں کی طرح اس کے بیٹے بھی عزت وجاہ اور دولت کے دیوانے تھے۔ وہ اپنے ضمیر اور دماغ میں کسی مفاہمت کے قائل نہ تھے۔ بے خرد، بے بصر اور بے ضمیر۔ انہیں اپنے اجداد کی اس سلطنت کے لیے اٹھائی ہوئی سختیاں بھول چکی تھیں۔ وہ متوکل کے خلاف ساری ریشہ دوانیوں میں کسی نہ کسی طور شریک تھے۔ وہ اپنے دورِ حکومت میں مختلف مسائل میں الجھ کر ان کی تربیت حسبِ دلخواہ نہ کر سکا تھا، کہیں نہ کہیں کوئی غلطی رہ گئی تھی۔ کوئی کڑی گم ہو گئی تھی۔ اس نے استادوں کے انتخاب میں احتیاط سے کام نہیں لیا تھا اور ان میں سے بیشتر یہودی اور عیسائی تھے جنہوں

نے ان کے دل میں نفرتوں کے بیج بوئے تھے اور اس کے اپنے دل میں وسوسے تھے مگر نہایت نجی محفلوں میں بھی وہ انہیں دہرانے سے احتراز کرتا تھا۔ اس کے دوست تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔ عبیداللہ بن یحییٰ اور فتح بن خاقان نے کسی نہ کسی طور اسے حاصل کر لیا تھا، وہ ان کے قابو میں تھا۔ مگر ایسا تو پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔

اس کا جدِامجد مامون الرشید اس سے کہیں زیادہ جاہ و جلال اور ذہن و فراست کا مالک تھا مگر برامکہ اس پر غلبہ پا سکے تھے۔ برامکہ کے محل ان کی فراست، ان کی سخاوت اور ہر دلعزیزی نے اس کا چین و سکون تباہ کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ پیالے میں ایک قطرے کی گنجائش نہ رہ گئی اور وہ جعفر برمکی کے سر پر الٹ دیا گیا۔ مامون نے آخری گھڑی اُسے گلے سے لگایا تھا۔ وہ پُراعتماد، پُروقار یحییٰ برمکی کا بیٹا اور ماموں کا رضاعی بھائی تھا۔ وہ نہایت خوبصورت سر اس بوسے کی قیمت تھا جو خلیفہ نے اس پیشانی پر ثبت کیا تھا۔

وہ کانپ اٹھا۔

کیا وہ اس فتنے کو جو "معتزلہ" تھے بیخ و بُن سے اُکھیڑ سکتا ہے؟ اس میں اتنی قوتِ فیصلہ تو تھی مگر سلطنت کے رگ و پے میں وہ خون کی طرح تھے۔ اسے صحیح اعداد و شمار تو یاد نہ تھے مگر ہر شعبۂ زندگی پر وہ مسلط تھے جاری پانی کی طرح اور خود الحاد کی طرف مائل تھے۔ مامون کے وقتوں بلکہ اس سے بھی بہت پہلے یونانی فلسفے کے تراجم نے عرب و عجم کے اختلاط نے عقائد کی صورت کو بالکل بدل دیا تھا۔ رواداری ایک حد تک تو ایک دور دراز تک پھیلی ہوئی سلطنت کے لیے بہت ضروری تھی مگر پھر آندھی سی چلی جس میں پوری زندگی ریت کے ٹیلوں کی طرح یہاں وہاں منتقل ہو گئی تھی۔ آزادیِ رائے تو قابل قدر شے تھی مگر زیادہ آزادی بے راہ روی بن گئی تھی۔ نئے نئے فتنے یہاں وہاں بھڑکنے والی آگ کی طرح جلتے اور بجھتے رہتے۔ پھر آلِ علیؓ تھے جو خلافت کے مدعی تھے اور ان کے دعوات گاؤں گاؤں قریہ قریہ پھرتے، نامانوس راستوں سے سفر کرتے راتوں کو بستیوں میں وارد ہوتے اور اپنے معاونین کے گروہ ترتیب دے رہے تھے۔ ان کی دلائی ہوئی جسارتوں سے ہوشیار ہو کر کئی جھوٹے نبی پیدا ہو کر اسلام میں رخنہ اندازی کرتے تھے۔ اسلام ایک ایسی عمارت کی طرح ہو گیا تھا جس میں دریچے ہی

دریچے ہوں اور یوں دیوار کمزور ہو گئی ہو۔ حصن حصین کی حفاظت کی خاطر ان کھلے دریچوں کا وجود ان کے بند ہو جانے میں مضمر تھا۔

مگر اکیلا متوکل علی اللہ کیا کر سکتا تھا؟

مامون الرشید کے دربار میں جس کشتِ الحاد کی آبیاری کی گئی تھی وہ اس کو ویران کرنے کے درپے تھا۔ اسے معلوم تھا وہ اپنے کفن میں آخری کیل گاڑ رہا ہے۔ وہ اس ہجومِ پُرشور میں اکیلا تھا اور ان اقدامات کو عملی جامہ پہنا رہا تھا جن کا انجام بھی اسے معلوم تھا۔ وہ نہ صرف اپنی بلکہ مستحکم اور نہایت گراں قدر عباسی سلطنت کی شکست کے سامان پیدا کر رہا تھا۔ مگر سلطنتیں، قومیں آخر عروج سے زوال کی طرف اور زوال سے فنا کی طرف رواں رہتی ہیں۔ یہ سفر بہر طور جاری رہنا چاہیے۔ کبھی کبھار اسے محسوس ہوتا کہ اس کی کشتی نہایت تیزی سے عمیق سمندروں کی طرف بہتی جا رہی ہے اور آخر اُلٹ جائے گی۔

نجی محفلوں میں وہ نبیذ پیتا اور اپنی بیماری سے بے پروا رہتا۔ اسے خون کی بیماری تھی۔ سامرہ سے اس کا جی اکتا گیا تھا۔ اس لیے اس نے جعفریہ کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں اس شہر کو آباد دیکھنا چاہتا تھا اور اس کے لیے وہ ایسے سب لوگوں سے دولت اگلوانا چاہتا تھا جنہوں نے جائز اور ناجائز ذرائع سے سلطنت کے ہر شعبے کو تاراج کیا تھا۔ ایتاخ ابن الزیات، نجاح سب اس کے وزیروں کے ہاتھوں اپنے اپنے انجام کو پہنچے تھے اور جعفریہ کی بنیادوں میں ان کی دولت اور ان کا خون صرف ہو رہا تھا۔ اس کے اپنے بیٹے اس کی موت کے متمنی تھے اور معتز باللہ نے تو بختیشوع کے ساتھ مل کر ایک دوا تیار کروائی تھی جس کی خبر اسے پرچہ نویسوں نے دی تھی۔ ذمیوں پر سے اس کا رہا سہا اعتبار بھی اٹھ گیا تھا۔ وہ ہر چہرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا اور ہر بات کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بیماری میں کسی بھی دوا کے استعمال سے انکار کر دیا تھا۔

کیا اس طرح سے وہ حالات پر قابو پا سکتا ہے؟ اس نے طبیب کو پا بجولاں زنداں میں ڈال دیا تھا۔ اسے حیرت البتہ تھی۔

لوگ گروہوں میں بٹ گئے تھے اور قیاس آرائیاں کرتے تھے۔ پتہ نہیں اس کے جی میں کیا تھا؟

چاندنی رات میں بابِ بدر کے سامنے مجلسِ وعظ منعقد ہونے والی تھی۔ ایک خلقت جمع تھی۔ خلیفہ کے محل کا دروازہ کھلا تھا اور چلمنوں کے پیچھے خلیفہ اور اس کی ماں اور دوسری بیبیاں اور کنیزیں بیٹھی تھیں۔ امام نے اس مقام کی حرمت کی خاطر اپنے سر سے سیاہ چادر سرکائی اور منبر پر بیٹھا۔ اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے قاریوں نے قرأت شروع کی۔ یہ خوش الحان پڑھنے والے تھے کہ دل ان کی صداؤں سے اور اعجاز قرآن سے سینوں میں پانی ہوئے جاتے تھے۔ پھر شیخ نے متانت سے تفسیر وحدیث پر گفتگو کی۔ ہر طرف سے مسائل آنے لگے۔ پرچوں پر لکھے ہوئے سوالوں کو لے کر شیخ صاحب نے سب کی تسکین فرمائی۔ چشم وابرو سے کسی طرح کا انقباض ظاہر نہیں کیا۔ خیر وبرکت کی یہ مجلس اختتام کو پہنچی تو متحمل سے متحمل آدمی کے آنسو بھی رواں تھے۔ چاروں طرف سے توبہ کا شور بلند ہوا۔ خلیفہ نے بھی لوگوں کے ساتھ اپنی پیشانی کے بال ترشوائے اور حکم دیا کہ ایسی مجالس سلطنت کے طول وعرض میں اکثر بپا کی جایا کریں۔ کیا اس سے لوگوں کے قلوب کو بدلا جا سکتا ہے۔

ذمیوں، یہودیوں اور مجوسیوں کی بڑی تعداد سلطنت کی کلیدی جگہوں پر قابض تھی۔ معتزلہ جو بظاہر اسلام کے محافظ اور متکلمین تھے، وہ منصور کے زمانوں کو واپس لانے میں ناکام رہا تھا اور پھر قدرت بھی شاید اس کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔ سازشوں کو پنپنے کا موقع مل رہا تھا۔ ترک سردار پر اعتماد اور انہیں خوش رکھنا ان کے مطالبات ماننا، بکھرنے اور ٹوٹنے کی کیفیت سب طرح ظاہر تھی۔

آسمان صاف اور ستاروں سے بھرا تھا۔ ہوا خوشگوار تھی۔ جب پنج شنبہ کی رات کو یکایک فضا آوازوں اور چنگاریوں سے بھر گئی۔ ستارے ٹوٹتے اور زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی بکھر جاتے۔ راکھ کی بارش سی ہونے لگی۔ لوگوں نے مسجدوں میں اذانیں دینا شروع کر دی تھیں۔ توبہ واستغفار اور خدا کے قہر سے ڈرنے سب کی جانوں کو مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ منتصر اور اس کی ماں، جو ایک قبطی لونڈی تھی، اپنے محل میں ایک سازش کا نقشہ بنا رہے تھے۔

”متوکل کو خون کی بیماری نے لاغر اور دیوانہ کر دیا ہے۔“ اس کی ماں نے کہا۔

”طبیب بختیشوع کی دوا اسے تندرست کر دیتی جو پابجولاں بندی خانے میں

ہے۔" طبیب کے ذمی ساتھی نے کہا۔
وہ ہنسی جیسے بہت کچھ جانتی ہو۔
"اب اُسے معاملاتِ سلطنت میں دیر تک دخل اندازی کا بوجھ اٹھانا نہیں پڑے گا۔" منتصر کی ماں نے کہا۔
منتصر نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بہت بڑی اور واضح بات تو نہیں کہہ گئی۔
"رات کا اکثر حصہ وہ مے نوشی میں صرف کرتا ہے۔ دجلہ کی طرف کھلنے والے دریچوں کے سامنے بیٹھا رہتا۔ سوائے فتح بن خاقان کے اور عبید اللہ بن یحییٰ کے کوئی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ رات کے پچھلے حصے میں کبھی صرف فتح ہوتا ہے اور سدا پردوں کے پیچھے غلام اونگھتے رہتے ہیں۔"
"کیا غلاموں کو وہاں سے ہٹایا نہیں جاسکتا؟" ذمی نے پھر پوچھا۔
"یہ مشکل تو نہیں مگر فتح بن خاقان بہت ہوشیار اور نابینا دیانتدار اور باوفا ہے۔" منتصر نے کہا۔
آسمان ایک دم سیاہ ہو گیا جیسے ستاروں کے غبار سے ڈھک گیا ہو۔ ایک زبردست دھماکہ ہوا اور کوئی بھاری چیز چھت پر آن گری۔
وہ سب باہر کی طرف بھاگے اور وہ کاغذ اس رستخیز میں کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا۔ ٹوٹے ہوئے ستاروں کی قیامت سے اگلے دن جب مطلع صاف ہوا تو منتصر کو یاد آیا کہ بہت کچھ کھویا ہے۔
متوکل علی اللہ کے پاس منتصر کی طرف سے جب سفیر شالی رومال تحفے کے طور پر آیا تو وہ ہنسا اور اسے دیکھتا رہا۔ جیسے اب اور کسی شے کو نہیں دیکھے گا۔
"اس نے تلوار سے رومال کو دو ٹکڑے کر کے اسی طشت میں رکھ دیا۔ اس زہر آلود خوں آشام نہایت بے ضرر تحفۂ محبت کو پتہ نہیں کیوں متوکل علی اللہ نے بغیر ہاتھ سے چھوئے قبطی لونڈی کو جو اس کے دوسرے ولی عہد کی ماں نہایت خوبصورت اور بہت دانشمند تھی، اس کا تحفہ لوٹا دیا۔"
مؤید کے ساتھیوں نے کنارِ آب درختوں میں اپنی کشتیاں چھپا دیں اور خود

پیدل بارگاہِ خلافت کی طرف بڑھے۔ رات ہمیشہ سے زیادہ سیاہ تھی۔

جب تلواریں ان کے سر پر چمکیں تو فتح بن خاقان نے خلیفہ متوکل علی اللہ کو چھپالیا اور وہ دونوں زندگی کی طرح موت میں بھی ایک ہی تیر میں پروئے گئے۔

معتز، منتصر اور موید نے الگ الگ اپنے اپنے یہودی، قبطی، عیسائی اور ذمی دوستوں کی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے اس ایک آدمی کو ختم کر دیا جو ان کا باپ اور نئے خیالات رکھنے کی وجہ سے ناقابل قبول تھا۔ جو شراب کو ام الخبائث سمجھتا تھا مگر جو اپنے نہاں خانہ دل میں زندگی سے ناامید ہو کر ساتھیوں سے مایوس ہو کر اپنے ارادوں میں ناکام ہو کر اس کی صحبت میں اپنے آپ کو برباد کرنا چاہتا تھا۔ متوکل علی اللہ جو خلیفہ بننے سے پہلے جعفر بن معتصم تھا اور ترک بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا اور اپنے بھائی واثق سے ڈرتا تھا، اس کے مشیروں کی نظرِ کرم کا منتظر رہا کرتا تھا۔ خلیفہ بننے کے بعد خدا سے ڈرتا رہا اور اس نے وہ سب ناممکن کام کرنا چاہے جو اسے خدا اور رسولؐ خدا کی نظر کرم کے قابل بنادیں مگر ایں سعادت بزورِ بازوئے نیست۔

وعظ کی درہم برہم مجالس میں فقہاء اور شیخ ہر اس شخص کے نام کا خطبہ پڑھتے اور اس کے لیے دعا کرتے رہے جو امیر المومنین بن جاتا تھا اور ترکوں کی بادشاہ گری اور شعبدہ بازی سے بارگاہ خلافت پر قابض ہو جاتا تھا۔ سرحدیں دور تھیں۔ اندلس میں اموی سلطنت کب سے اپنے مضبوط قلعوں کی وجہ سے ناقابلِ تسخیر تھی اور اسماعیلی مصر پر قابض تھے۔ مشرق کی ریاستیں ایک ایک کر کے الگ الگ قلمروئیں بن گئی تھیں اور خلافتِ عباسیہ کو ان سب لوگوں کے الگ ہو جانے سے سخت نقصان پہنچا۔

طوائف الملوکی کے اس دور میں صومعہ نشینوں نے اپنی توجہ علم وفن کی طرف رکھی۔ یہ قرب قیامت کی نشانیاں تھیں اور شب زندہ دار خدا کے خوف سے لرزاں ترساں اپنے اشواق میں شدید ہوتے گئے۔ امام مہدی کے انتظار میں ان کی نگاہیں عرش کی طرف دیکھتیں اور دل اس موعودہ آمد کے لیے فرش راہ رہتے۔ اگر دنیا یہی تھی جو ایک کے بعد دوسرے خلیفہ کے قتل پر دم سادھے تھی تو اس دنیا پر تُف ہے۔

"سہل بن عبداللہ تستری تمہیں یاد فرماتے ہیں۔" اقامت گاہ میں اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے خطیب نے آخر اس گوشے میں جھانکا جہاں کبھی کبھار حسین

ساتھیوں سے چھپ کر جا بیٹھتا تھا۔ یہ اس کا اپنا گوشہ، اس کی دنیا، اس کا جہاں تھا۔ نہر جو زاویے میں سے ہو کر نکلتی اور اقامت گاہ کے حوض میں گرتی تھی، موڑ پر درختوں کے اس کنج میں اچانک سایوں میں گنگناتی ہوئی غائب ہو جاتی۔ شاخیں جھکی ہوئی اور پانی کو چھو کر جیسے آئینۂ آب میں اپنا عکس دیکھتی ہوں۔ مرداد کے آخری دنوں میں رنگ برنگ چڑیاں شور مچاتیں اور زمستان کو خوش آمدید کہنے لگتیں۔ ہوا خوشگوار جو سرد ہونے پر مائل ہو مگر سرد نہ ہو۔ اس اندھیرے موڑ پر پتوں کے جھولے میں جھولتی راہ تلاش کرتی اور یہیں پر حسین خیالوں میں منہمک۔

"شیخ خفا تھے کیا؟" اس نے خطیب سے باہر نکل کر اپنے کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"بس نہ خفا تھے اور نہ خوش۔ انہوں نے اپنے ذاتی صندوق کو دیکھا اور مجھے حکم فرمایا: حسین کو بلاؤ۔" پھر اس نے حسین کی طرف گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے کچھ چرایا ہے کیا؟"

"ہم یہاں علم حاصل کرنے آئے ہیں۔ کتابیں سب کی مشترکہ میراث ہیں۔" حسین نے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔

"مگر شیخ کامل سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے اور اگر کتاب بطور خاص ان کی ہو تو۔" خطیب نے کہا۔

"شیخ زیادہ سے زیادہ مجھے سزا کا مستحق قرار دیں گے۔" حسین نے کہا۔

"تمہیں خوف نہیں کہ وہ شاید خفا نہ ہوں مگر کوئی اور سزا دیں؟" خطیب اس کے آگے تھا۔

"زیادہ سے زیادہ یہی کہ بددعا کریں گے۔" حسین نے ایک کی بجائے دو دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے کہا۔

"تمہیں بددعا سے خوف نہیں آتا حسین؟" خطیب وہیں کھڑا ہو گیا۔

"آؤ جلد آؤ، سب کچھ کرنے والا تو خدا ہے جو ہر شے میں جاری و ساری، نفس زندگی کا مالک ہے۔" حسین نے خوشدلی سے جواب دیا۔

"یہ صحیح ہے کہ خدا سب کچھ ہے مگر بزرگوں کی دعائیں ان کی خوشنودی---"

خطیب خوفزدہ تھا۔

"میں شیخِ کامل کی خوشنودی اور دعائیں تو چاہتا ہوں مگر شخصی آزادی اور کتابوں پر اپنے تصرف کی قیمت پر نہیں۔"

"حسین تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں، کیا دیوانوں کی سی گفتگو ہے۔ اگر تم نے شیخ کی ذاتی کتابوں پر اپنے تصرف سے انہیں ناخوش کیا ہے تو وہ بہت ناخوش ہوں گے۔ بہت ہی۔" خطیب یوں سمجھ رہا تھا کہ غلطی اس سے ہوئی ہے۔

شیخ وہیں پر تشریف فرماتے جہاں درس کے دوران وہ ہمیشہ تھے۔ ان کی پیشانی پر سلوٹیں تھیں اور وہ بہت گہری سوچ میں تھے۔ وہ تنہا تھے۔

حسین کا سایہ دہلیز کے اندر پڑ رہا تھا۔ سورج اس کے دائیں کندھے کے قریب مغرب کی طرف جھکا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ سایہ اس کے پاؤں میں ہی لوٹ رہا ہے۔ ذرا سا بالکل نا قابلِ ذکر۔ شیخ نے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔ "حسین اندر آؤ۔" وہ نہ خفا تھے اور نہ ہی خوش۔

اس نے سر جھکا لیا اور تقریباً دوہرا ہوتا ہوا پاسِ ادب سے آہستہ چلتا ان سے دور ٹھہر گیا۔

"تمہیں معلوم ہے تمہاری طلبی کیوں ہوئی ہے؟" انہوں نے بہت نرمی سے پوچھا۔

اس نے گردن جھکا لی۔

"بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے ہاتھ سے اپنے سامنے کی زمین کی طرف اشارہ کیا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا حسین؟ یہ سب رسالے ابھی تمہاری فہم اور ادراک سے پرے ہیں، یہ تمہارے لیے نہیں ہیں۔۔۔"

"جی۔۔۔" اس نے کہا۔ "مگر میں انہیں سمجھنے کی کوشش تو کر سکتا ہوں۔"

اس دلیرانہ جواب سے اس نے ایک دم اوپر دیکھا۔ وہ حیران تھے، اس کو مدرسے میں آئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ ایک غیر معمولی طالب علم تھا۔ انہیں اس کا بھی معلوم تھا کہ مجوسی الاصل تھا اور اپنے باپ کی وجہ سے جو بہت عمدہ خصلتوں اور اچھے کردار کا مالک تھا، ان کے پاس آیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ علم

کی ایک بالکل انوکھی دوسروں سے الگ تڑپ اس کے دل میں تھی۔ ان کی نظروں سے یہ بھی پوشیدہ نہ تھا کہ وہ بہت تیز رفتار تھا، مگر ان رسائل تک اس کی رسائی اور پھر وہ کہتا تھا کہ انہیں سمجھنے کی کوشش کر سکتا ہے، وہ حیران تھے کہ اس رازِ درون خانہ کو وہ ذرا سا بچہ طفل مکتب کیا سمجھ سکے گا؟ وہ اسے کچھ سمجھانا بھی نہ چاہتے تھے۔

ایسے انکشافات تو صدیوں میں نہایت بانصیب لوگوں پر منکشف ہوتے ہیں۔

دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ شیخ جو متواضع، متوکل، حلیم اور حضور اکرمؐ کی ذات کامل سے عشق کرتے تھے، جو ہمیشہ باوضو رہتے تھے۔ حسین کم عمر، بے خبر اور اس لیے پُر غرور۔ اپنے فہم کی قوت سے نا آشنا اور اپنی ذات کے عشق میں گرفتار۔

شیخ نے کہا "میرے قریب آؤ۔" پہلی بار اس سارے وقت میں حسین کانپا۔ اس کی ہمت جیسے جواب دے رہی تھی مگر کمزوری کا اظہار کرنا بھی اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔ وہ ایک ایک انچ آگے بڑھا۔ محسوس ہوتا تھا جیسے صدیوں سے وہ اس خانقاہ میں اپنے شیخ کے سامنے ہے اور آگے بڑھنے کی کوشش میں ہے۔ مگر جب تک فضلِ خداوندی اس کے حال پر مہربان نہ ہو شیخ کی نگاہیں اس کی اعانت نہ کریں وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی عقل، اس کی قوتِ مدرکہ اس کی قوت نمو، قوت فیصلہ سب شیخ کی ایک نگاہِ محبت کے تابع فرمان ہیں۔ جب تک شیخ نظرِ کرم سے اس کو نہ دیکھیں گے، یہ فاصلہ کبھی طے نہیں کر سکے گا۔ ان تک اس کی رسائی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اس کی کوئی مرضی نہ تھی وہ کچھ نہ تھا۔ ایک ذرہ ناچیز جس کی تاریکی کو تابندگی کی ضرورت تھی۔ ذرے کو تپش کی خواہش تھی تاکہ وہ شمسِ حیات سے استفادہ کر سکے۔ تخلیقِ کائنات کرنے والے دنیاؤں کو پیدا کرنے والے کے سامنے وہ مضحکہ خیز تھا۔ نظر نہ آنے والا بے بضاعت وہ تو کہیں نہیں تھا۔ سب طرف شیخ کی نگاہوں کی روشنی تھی اور وہ ایک سیاہ نکتہ بھی نہیں تھا۔ اس کی علیحدہ ہستی کہاں تھی؟ زمانے اور دنیائیں، خزانے اور فرشِ زمین کی پہنائیاں، عرش بے ستون کے اور ساتوں درجے، جانے وہ کہاں تھا؟ کیا دیکھ رہا تھا؟ جنت اور جہنم، نظارے ہی نظارے حد نگاہ تک نور ہی نور۔ شیخ نے دیکھا اور اسے نگاہ کی نرمی سے چھوا۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ زمانوں، صحرا نوردی میں اپنے آپ کو بھلا رہا ہے اور

اب لوٹ رہا ہے۔ وہ بوڑھا ہے اور اس کی روح حیرت انگیز طور پر نوخیز ہے۔ وقت ٹھہرا ہوا ہے اور اس شیخ کی طرف بڑھتے ایک لمحہ بھی نہیں ہوا۔ لمحے کا ہزارواں حصہ بھی نہیں۔ اس نے ابھی صرف سوچا ہے کہ وہ شیخ سے عفو طلب کرے، آخر اسے ان کی ذاتی کتابوں اور رسائل کو دیکھنے کا تو حق نہ تھا۔

"جاؤ۔" شیخ نے کہا۔ "ہر شے کا وقت معیّن ہے۔ ازل سے جو مقدورات قائم ہو چکے ہیں اُن پر خوش رہو۔"

وہ سیڑھیوں کے نیچے کھڑا تھا حالانکہ اس نے انہیں طے نہیں کیا تھا۔ دھوپ اور سائے اور ہر شے اسی طرح تھی۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی اور اسے یہ بھی سمجھ آ گیا تھا کہ سب کچھ سمجھنے کی کوشش کرنا ممکن نہیں اور آدمی کی ذات عرش اور فرش ذرّہ بیک وقت ہے اور ممکناتِ ذات کا ادراک فہم سے نہیں ہو سکتا۔

ایک ایسی حالت پر جو سونے اور جاگنے کی درمیانی کیفیت تھی، حسین قائم رہا۔ وہ ایسی کشتی کی طرح تھا جو نہ ڈوبتی ہے اور نہ تیرتی ہے۔ جو محبت تھی بھی اور نہیں بھی۔ جو توفیق بھی تھی اور توفیق عشق نہیں بھی۔ اسے لگتا تھا وہ مکمل فنا ہو چکا ہے مگر کس میں، کس کے لیے؟ شیخ کی نظرِ کرم اسے چھو کر نکل بھی گئی تھی اور اس کا لمس وہ اپنے اندر کھوجتا تھا۔ وہ اپنی طبیعت کے ناقہ کو کشاں کشاں قطار کی طرف لا رہا تھا۔ مگر کس قطار کی طرف؟ جیسے تیز روشنی میں آنکھیں کچھ نہیں دیکھ سکتیں، ایک دم چکاچوند سے بند ہوئی جاتی ہیں۔ کھلی آنکھوں سے اس کے خواب کیا تھے؟

خطیب نے پوچھا "شیخ تم سے بہت ناخوش ہوئے ہوں گے؟"

"پتہ نہیں، وہ خوش ہوئے تھے یا ناخوش۔" حسین نے مبہم سا جواب دیا۔

"تم کسی شے سے ڈرتے نہیں ہو۔ شیخ کی خفگی تو بری ہوتی ہے۔" خطیب نے اسے سہادیا۔

"کیا شیخ تم سے کبھی ناراض ہوئے ہیں؟" اس نے کافی دیر چپ رہنے کے بعد پوچھا۔

"جب اشکال کا جواب دیں اور ہماری توجہ کسی اور طرف ہو تب۔" خطیب نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں کبھی اشکال کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہوئی؟"

"اچھا۔" حسین جانے کن مقامات پر تھا کہ اسے وہ گیت یاد آیا جو اس کا دادا اسے گا کر سنایا کرتا تھا۔

جینے والے، جانے والے اور سب آنے والے
آنے والے اس دنیا کے اور دنیاؤں کے
نیک اور پاک جوان اور بوڑھے مرد اور عورت سب
ہم تم کو جو نیکی ہو اور نیک فراوشی ہو
یاد ہیں کرتے اے گُن والو اُٹھو اُٹھو اُٹھو

وہ گیت بار بار اس بجلی کے لہریئے کی طرح جو بادلوں کی سیاہی کو لحظہ لحظہ روشن کرتی ہے، اسے کیوں یاد آ رہا تھا۔ اس کے دادا نے آگ کی پوجا کی تھی۔ آگ جو دکھائی دیتی ہے، لپکتی ہے، شعلہ بنتی ہے، جلاتی ہے۔

مگر اس کے جی کے اندر یہ آتشِ سوزاں کس کے لیے تھی؟

وہ کس سے کہے، کیسے بتائے؟

شیخ تو پہلے دنوں کی طرح دُور تھے اور سبق میں اس کے انہماک یا اس کی بے توجہی کسی حالت میں بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ وہ چاہتا تھا شوخ گستاخ اور بے پروا ہو کر پھر کسی دن بارگاہ میں طلب کیا جائے اور اسی طرح پھر اُس نگاہ سے چھوا جائے۔ وقت تھم جائے اور پھر وہ شیخ سے عفو طلب کرے۔ اُن کے قرب کے لیے، ان تک پہنچنے کے لیے۔ اس کے شوقِ شدید کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جب بے قراری بڑھ جاتی تو وہ سوچتا، کیا ہی اچھا ہوتا وہ ریشم کے کاروبار میں باپ کا شریک ہوتا۔ ریشم کے کیڑوں کی پرداخت، اُن کی زندگی، ان کی قسمیں اور ان کے زردی مائل کویوں سے وہ دھاگے کو الگ ہوتے دیکھتا۔ پھر تانے بانے میں نقش و نگار ابھرتے۔ فنکار کے خوابوں کی پرچھائیں سی اس میں بُنی جاتی۔ بافندگی کے اس پیشے میں وہ خوش رہتا اور اس کے اپنے خواب بھی گم نہ ہوتے مگر اب؟ اس کا جی چاہا وہ یہاں سے فرار ہو جائے۔

تُستر کُل دنیا تو نہیں؟

مگر کون سی زمین اس کو پناہ دے گی۔ یہ زمین خدا نے بنائی ہے، اُسے بھی اور

اس کو آزادی نہ تھی۔ اس کی روح اتنی بے چین کیوں ہو گئی تھی؟ وہ اس محبت میں اپنے آپ کو فنا کر دینا چاہتا تھا۔ کاش وہ نہ ہو۔ نماز میں کبھی کبھار اس کی یہ کیفیت بدل کر ایک کیف و سرور سا اس پر چھا جاتا۔ وہ اپنے آپ کو بھولنے لگتا۔ رکوع سے سجود اور سجود سے قیام تک بھول بھول جاتا۔ کھڑا رہتا اور ہم سبق کبھی اسے ٹھوکا دیتے، کبھی نماز کے بعد اس کا مذاق اڑاتے۔ وہ ان سب سے الگ کیوں ہو گیا؟ شیخ نے کہا تھا۔ "مقدرات پر خوش رہو۔"

مگر اس کے مقدّرات کیا تھے۔ ہر طرف سوال ہی سوال تھے۔ روشنی میں اور اندھیرے میں، دن میں اور رات میں، صبح اور شام میں، اپنے اس گوشے میں جو اس کی دنیا تھا، اب اُسے آرام نہیں ملتا تھا۔ وہ جا کر وہاں روپوش ہوتا تو لگتا ہر پتے پر آنکھ ہے اور اُسے دیکھ رہی ہے۔ ہر جھونکا جب اُسے چھو کر نکلتا تو مسکراتا، ہوا پکارتی حسین، حسین۔ پرندے چھپے ہوئے پکارتے حسین حسین۔ یہ کیا طلسم تھا کہ ہر شے اسے پکارتی تھی، وہ کہاں جائے؟

ان ساری آوازوں سے اپنے کان بند کرنے پر بھی کوئی مفر نہ تھا۔
تُستر سے اور آوازوں سے بچنے کے لیے وہ بصرہ بھاگ گیا۔

بصرہ اپنے زاویوں، دلدلوں، خانقاہوں اور شفیق استادوں کے لیے اقصائے عالم میں ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ اقامت گاہوں میں طالب علم آباد، مسجدوں کے حجروں میں درویش اور مسافر قافلوں کے لیے سرائیں اور بازاروں کی چہل پہل اس کی حیثیت ایک علمی چھاؤنی کی سی ہے۔ دریا اور بحر یہاں ہمکنار ہوتے تھے۔ ملّاحوں کی آبادیاں، مچھلی پکڑنے والوں کی بستیاں اور پھر بڑی بڑی کشتیوں پر سامان تجارت لادنے کے لیے مزدوروں کے قریے، روزی تلاش کرنے والوں کا مجمع جس میں بساند اور مدوجزر کا شور اور لہروں کے اوپر سے زمین پر برسنے والی نمی تھی اور ساحل پر اترتی ہوئی ریت بھی شامل رہتی تھی۔

اور یہاں کی علمی فضا جو بہت وقیع ہے، اصحابِ علم و فضل کے طائفے یہاں موجود ہیں اور یہ اسلام کے عہدِ خلافتِ راشدہ کا آباد کیا ہوا شہر بانسوں کے جنگلوں میں عرب راہزن رہتے ہیں اور قافلے سے بچھڑ جانے والوں کو لوٹ لیتے تھے مگر حسین کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ جب تستر سے نکلا تو عجیب دیوانگی اس پر مسلط تھی۔ زادِ راہ کے نام کچھ دینار تھے جو اس کے پاس باقی بچ گئے تھے۔ یوں بھی مدرسے کے سارے اخراجات سہل برداشت کرتے تھے۔ بظاہر ان کے پاس کوئی دنیاوی دولت نہ تھی مگر یہ دستِ غیب کا تصرف تھا کہ وہ اپنی حاجتوں کے لیے سوائے خدا کے کسی کے محتاج نہ تھے۔

رودِ کارون کے ساتھ شاہراہ پر اسے ایک قافلہ مل گیا جو نسطوری عیسائیوں کا تھا۔ وہ دشتِ لوط سے بھی پرے کسی دور دراز علاقے سے آئے تھے اور گردِ سفر اُن کے

چہروں پر تھی۔ لمبے چُغے پہنے سروں پر عجیب و غریب عمامے سجائے جن میں قوسِ قزح کے رنگوں کے پتھر ٹکے تھے۔ وہ پاؤں میں جوتا نہیں پہنتے تھے۔ لمبی تسبیح ہاتھ میں لیے مناجاتیں پڑھتے وہ بس چپ چاپ رواں رہتے۔ قافلہ ٹھہرتا وہ سر سے عمامے اتار کر ایک حلقہ میں بیٹھ جاتے اور مادرِ عیسیٰ کا ایک چھوٹا سا بُت درمیان میں رکھ لیتے۔ اس گروہ میں ملیح رنگ، تیکھے نقوش اور نیلی آنکھوں والی لڑکیاں اور عورتیں بھی تھیں۔ ان کے بال سنہرے لہراتے ہوئے اور ٹخنوں تک پہنچتے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہوں میں شوخی نہ تھی جیسے خوابوں میں گم ہوں۔ سوچتی ہوئیں، وہ اپنے لبادوں سے اپنے آپ کو لپیٹے رکھتیں۔ لگتا تھا ان کے سراپے اس سردی اور برف سے بنے ہیں۔ جن علاقوں میں ابتداء میں ان کی رہائش تھی۔

سالارِ کارواں نے اسے اپنے ساتھ شامل کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تم ابھی کمسن ہو اور کچھ تجربہ نہیں رکھتے۔ اس لیے تم ہمارے ساتھ تو چل سکتے ہو مگر سننے کے بعد بولنے کی مناہی ہے، دیکھنے کے بعد کہنے کی مناہی ہے، ٹوہ لینے اور راز جاننے کی مناہی ہے۔ ہم صرف اناج کھاتے ہیں، اس لیے تمہیں گوشت نہیں مل سکے گا۔ جہاں قافلہ اترے وہاں تم کو مزدوری کرنے کی اجازت ہے مگر ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تم کو اس کی ضرورت پیش نہ آئے گی کیونکہ تمہارے جسم پر لباس ٹھیک ہے اور اگر تم کچھ خریدنا چاہو تو کیا خریدنا پسند کرو گے؟"

حسین نے آنکھیں جھپکائیں مگر کچھ جواب نہ دیا۔

بطریق نے کہا۔ "مَیں نے یہ جاننا نہیں چاہا کہ تم کہاں سے آئے ہو مگر یہ قافلہ بصرہ جائے گا۔ یہ ایک لمبی مسافت ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارا معاملہ ایک خاندان سے کروا دیتا ہوں جس میں دو لڑکیاں ہیں اور ایک بیوہ عورت ہے۔ تم ان کے چھوٹے موٹے کام کر سکتے ہو۔"

حسین نے سر جھکا دیا اور اس بربط کی طرف دیکھنے لگا جو اونٹ کی پشت پر پیچھے کی طرف لٹک رہا تھا۔ پھر ہوا ان بنے ہوئے ریشم کے تاروں کو چھیڑنے لگی اور ان میں سے مدھم سی صدا آنے لگی جیسے وہ شاہین کے پنجے کے بنے ہوئے مضراب سے انہیں چھو رہی ہو۔

اس کے ذمے پانی کی فراہمی اور سواریوں کی دیکھ بھال تھی۔ وہ فارغ ہو کر جاری پانی کے کنارے بیٹھ جاتا اور قافلے کے بازاروں کی گہما گہمی، لوگوں کی چلت پھرت دیکھتا۔ پھر گہری رات میں اجنبی باجے بجتے جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ مناجاتیں اور گیت سنتا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والی دعائیں، ہر پڑاؤ پر اِدھر اُدھر سے کوئی آکر شریک ہو جاتا اور کوئی مانوس چہرہ غائب ہو جاتا۔ یہ تبادلے ہوتے رہتے، اس پر کوئی راز نہ کھلتا مگر وہ کسی انکشاف کی جستجو میں بھی نہیں تھا۔

"تم جانتے ہو، ہم کہاں جا رہے ہیں۔" ایک شام جب وہ چاند کو حوض کی تہہ میں لہروں کے ساتھ جھولا جھولتے دیکھ رہا تھا، اس سے اغول نے پوچھا۔

"نہیں۔" حسین نے بدستور پانی پر بنتی اور آگے بڑھتی ہوا کے ساتھ پیدا ہوتے لہریوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے ہمیں بصرہ کیوں لے جایا جا رہا ہے؟" وہ اپنے کُتے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔

"نہیں اور مجھے یہ جاننے کا ایسا شوق بھی نہیں۔" حسین نے اسے بے رُخی سے کہا۔

"تم انسانوں میں ذرا دلچسپی نہیں لیتے؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔ جب وہ ہنسی تو اس کے دانتوں کی سفیدی چاندنی میں بڑی دلآویز تھی۔

وہ چپ رہا تو اس نے کہا۔

"سب سے اعلیٰ مخلوق انسان ہے اور اگر خدا توفیق دے تو اس کو ضرور غور سے دیکھو۔ ہو سکتا ہے خدا کا جلوہ کسی طور کسی چہرے میں کسی سراپے میں تمہیں دکھائی دے۔"

حسین نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بال زردی مائل سنہرے تھے۔ جیسے چاندنی ان میں گندھی ہوئی ہو۔ چہرہ اور آنکھیں بخدا اس نے ایسا حسن پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا یا پھر یہ اس کی غریب الوطنی تھی۔ بے راحلہ ہونے کا احساس تھا۔ وہ احسان مند تھا۔ اس کی ماں سے مرعوب تھا جو بنا کہے اس کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ نسطوری قافلے سے اس کے مختلف ہونے کی وجہ تھی۔ کچھ تو تھا۔ ایک لمحے کے لیے

اسے دیکھتا ہی رہا۔ بنا پلکیں جھپکائے بنا نظریں ہٹائے۔

وہ دوبارہ ہنسی ہے تو حسین نے گھبرا کر اپنی نظریں جھکا لیں۔

"میں نے ان بے پناہ آنکھوں سے یوں دیکھنے کا نہیں کہا تھا۔ میں نے تو یونہی بات کی تھی۔ میری ذات تو ہونے نہ ہونے کے برابر ہے۔" وہ ایک دم اداس ہو گئی۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ بصرہ سے ہم بغداد کے لیے روانہ ہوں گے۔ مجھے کنیزوں کے سوداگروں کے پاس بیچ دیا جائے گا۔ پھر میں کسی حرم کی محل کی چار دیواری میں بند ہو جاؤں گی اور یہی میری زندگی ہو گی۔" وہ چپ ہو گئی۔

"شمع کے گرد پروانے کی سی نہایت مختصر زندگی" حسین نے دل میں سوچا مگر وہ چپ رہا۔

"مجھے اپنے آبائی وطن کے مرغزار اور چراگاہیں بہت یاد آئیں گی۔ کھلے آسمان تلے ہواؤں کی طرح بے پرواہ گزرا ہوا اپنا بچپن یاد آئے گا۔" پھر اس نے کندھے اچکا کر کہا "مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"تم انکار کر سکتی ہو۔" حسین نے بہت کچھ دکھ سے کہا۔

"ہمارے چہرے ہماری قسمت ہوتے ہیں۔ اگر میرے بال کم لمبے ہوتے اور میں کم رُو ہوتی تو شاید میرا مقدر کچھ اور ہوتا مگر قبیلے میں تو میں پھر بھی رہ نہ سکتی۔ اب میرا نصیب یہ ہو گا کہ میں خلیفہ کو پسند آ جاؤں۔ تمہیں پتہ ہے ہمیں اس لیے تربیت دی جاتی ہے کہ ہم نسطوری راہبائیں اسلام میں آنے والی نسلوں کی رگوں میں زہر بھر سکیں۔ ان کی رگوں میں ہمارا خون ہو گا تو وہ اپنے ایمان میں کمزور اور اپنے ارادوں میں ڈگمگاتے ہوئے اور نسطوری راہبوں کی ریشہ دوانیوں سے اغماض کر سکیں۔"

حسین حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"تمہاری ماں تمہاری مدد نہیں کر سکتی؟" بہت دیر کے بعد اس نے پوچھا۔

"نہیں، کوئی بھی نہیں، خدا بھی نہیں۔ اپنے مقدر سے بھاگ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے؟ کوئی ہماری مدد نہیں کر سکتا۔" وہ اپنے کتے کے بالوں میں منہ دے کر بیٹھی

تھی، شاید وہ رو رہی تھی۔

"یہ تو ایک طرح کی قربانی ہے۔" حسین نے کہا۔

"ہاں ہم اپنے مذہبی جنون کے لیے مسلمانوں کو برباد کرنے کے لیے، دنیاوی زندگی کے لیے یہ قربانیاں دیتے آئے ہیں۔" اس نے آنسوؤں سے بوجھل آواز میں جواب دیا۔

"مگر تم سب مجھے کیوں بتا رہی ہو؟" حسین نے پوچھا۔

"تاکہ آئندہ زندگی میں آنے والے دنوں میں کبھی تم مجھے یاد کر سکو، میرے لیے دعا کر سکو۔ مجھے بھلا نہ سکو۔" وہ بہت آہستہ بول رہی تھی۔ بالکل سرگوشی کرنے والوں کی طرح۔

اور حسین کو یاد آیا، اس کے شیخ نے کہا تھا۔ "مقدرات جو ہیں، ان پر خوش رہو۔"

کیا انسان کا مقدر اس کی مجبوری تھا۔ آسمان حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا بلند عظیم پُر شوکت تھا۔ زمین جاہ و جلال سے بھری ہوئی۔ درختوں اور سبزے کوہ صحرا سے مزین، دریاؤں اور سمندروں کو اپنے اندر سمیٹے تھی اور اس پر اگر ایک انسان بھی بے بس مجبور تھا، قربان کیا جا رہا تھا، مقید تھا تو خوشی کہاں تھی، آزادی کہاں تھی؟ اس مجبوری سے رہائی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔ مقدر سے لڑنا چاہیے۔ جو جی میں ہے، اسے کہنے کی تو آزادی آدمی کو ہو۔ خدا کی بادشاہی میں بھلا انسان اتنا مقہور و مجبور کیوں ہو؟ اغول مجبور کیوں ہو، حسین مجبور کیوں ہو، کوئی ذی روح بھی مجبور کیوں ہو۔ ہاں، کیوں؟ کیوں؟ آخر کیوں؟

بصرہ میں یک بیک حسین نے اپنے نہاں خانۂ دل میں ایک دوسرے حسین کو بے تاب محسوس کیا جس کے سینے میں طوفان بحرِ محیط کے ساتھ گھٹتے اور بڑھتے تھے۔ ابلتے تھے، اس کی ہستی پر دور تک ساحل کے ساتھ ٹکرا کر اس پر چڑھ دوڑنے والی لہروں کی طرح پھیل جاتے۔ اس کی پسلیوں میں آگ بھڑکتی اور وجود شعلوں کی لپیٹ میں ہوتا۔ کیا وہ اغول کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ مٹھیاں بھینچ کر بیٹھ جاتا اور بیٹھا رہتا۔ خون کی روانی اس کی رگوں میں ٹھہرنے لگتی۔ غبار سا اس کی آنکھوں کے سامنے

چھا جاتا۔ بس ایک رات اور اس کا ایک پہر، نہیں پہر کا ذرا سا حصہ اس کی ساری کائنات تھا۔ پھر وہ کائنات پھیلتی اور اس کی ہستی پر بادلوں کی سیاہی بن کر محیط ہو جاتی۔ بجلی کے لہریئے بن کر لفظ اس کے ذہن کو روشن کرتے، تاریک کرتے۔ اپنی گرج سے دہلاتے۔ اس پر یورش کرتے، اس پر گرتے اس کے خرمن ہوش و خرد کو جلاتے۔

ہجر کا خوف میرے دل میں وسوسے ڈالتا ہے۔
کاش چاند ان آسمانوں پر دکھائی نہ دیتے۔
اُس چقماق سے کوئی چنگاری شعلہ بننے کے لیے نہ جھڑتی۔
ساربان آہستہ چل کہ میری پسلیوں میں آگ ہے۔
ہجر کی گھڑی میرے آنسو خشک ہیں۔
اور کوئی آنکھ جدائی کے غم میں نہیں روتی۔
لہریا ریت میری موت کی وادی کے راستے پر ہے
جاری پانیوں کے قریب وہ ہیں جنہیں میرا دل محبت سے یاد کرتا ہے
انہیں پکارو کون ایک نیم سوختہ جوان کی مدد کرے گا
غم نے اسے گہرے غاروں میں تباہی کی تاریکی میں پھینک دیا ہے
یادوں کے چراغ جلاؤ کہ یہاں اندھیرا ہے
النقا اور لعلہ کے درمیان جہاں خوشبودار گھاس والی چراگاہیں ہیں
ہجر کا خوف میرے دل میں وسوسے ڈالتا ہے
کیا وہ اغول کو بھلانا چاہے گا؟ بُھلا سکے گا؟ وہ اس کے لیے کیا دعا کرے؟
اور اس کی اپنی منزل کہاں تھی؟

وہ اغول کو ایک نظر دیکھنے کے لیے اپنا آپ لٹانے کے لیے تیار تھا۔ اس کی جانِ پُر سوز دلِ بے تاب، اس کی خواہشیں، کیا وہ دیوانہ ہو گیا تھا؟

وہ نہ سوتا تھا اور نہ جاگتا تھا۔ دروس میں شریک ہونے کے لیے جو توجہ ضروری تھی، وہ کہاں سے لائے۔ وہ دوسرے طالب علموں کو دیکھتا، زاویئے کے دالان در دالان صحنوں میں بیٹھے ہیں۔ خوش گپیوں میں مصروف ایک دوسرے سے اشکال کی وضاحت میں منہمک اسباق مین دل و جان سے لگے ہوئے، جھکے ہوئے۔ کتابوں کے اوراق کو

حرزِ جان بنائے ہوئے۔ آموختہ دہراتے ہوئے، فلسفے کی گتھیاں سلجھانے میں غور و غوض کرتے ہوئے، قدم قدم جیسے پایاب پانیوں میں اُتر رہے ہوں۔ پیشانیوں پر سلوٹیں آنکھیں سوچتی ہوئیں، الجھنوں کو سلجھانے میں لگے ہوئے اور اس کے ذہن کے افق پر ایک تپش تھی۔ وہ چہرہ لو دیتا ہوا چاروں طرف سے اسے گھیرے ہوئے، وہ اس سے بھاگ کر کہاں جائے؟

نسطوری راہبوں کا وہ قافلہ جب پانی لے کر روانہ ہوا تھا تو صبح قریب تھی۔ زنجیوں کے کسی آوارہ گروہ نے جو ان دنوں ملک کے طول و عرض میں اور بالخصوص بصرہ کے گرد و نواح میں بہت سرگرم تھے، اس پر حملہ کر دیا۔ ایک بھگدڑ مچ گئی۔ اونٹوں نے اچھلنا شروع کر دیا۔ گھوڑے بے قابو ہو گئے۔ شفق کی لہو رنگ سرخی میں یہ تماشا اور بھی خونیں ہو گیا۔ مردوں میں سے جنہوں نے مزاحمت کی، انہیں قتل کر دیا گیا۔ لڑکیوں کو انہوں نے اپنے گھوڑوں پر رکھ لیا جیسے قندیلوں کی روشنی میں فاتح فوج کا جلوس ہو۔

اغول نے کہا تھا "ہمارے چہرے ہماری قسمت ہیں۔ پتہ نہیں وہ کن پانیوں میں اپنے نصیب کی کشتی پر سوار تھی اور اس کا رخ کدھر تھا؟ اس رستخیز کی گھڑی میں وہ اسے دیکھ بھی نہ سکا تھا۔ ایک آخری الوداعی نظر بھی نہیں، دنیا ایک دم قیامت کے ہنگامے میں گرفتار ہو گئی تھی۔

راہزنوں نے اس سے تعرض نہیں کیا تھا، اسے آزاد کر دیا تھا۔ اجازت دی تھی کہ وہ جہاں چاہے چلا جائے، یہ کیسی آزادی تھی؟

غبار اور دھندلکا اس کے اور اغول کے درمیان اوٹ کی طرح حائل ہو جاتا۔ وہ آنکھوں کو ملتا، انہیں جھپکاتا تاکہ دور تک دیکھ سکے۔ حدِ نگاہ تک اس ایک چہرے کو جو آئینوں سے گھرے ہوئے اس کے وجودِ خاکی کو گھیرے تھا۔

ایک رات اور اس کا ایک پہر، پہر کا ذرا سا لمحہ اس کی کل کائنات تھا۔ پھر وہ کائنات پھیلتی اور اس کی ہستی پر بادلوں کی سیاہی بن کر محیط ہو جاتی۔ لفظ سیاہ بوندوں کی طرح بڑے بڑے قطروں کی طرح تیز بوچھاڑ بن کر اس کے گرد برستے، لولوئے لالہ کی چادر بن کر اسے ڈھانپ لیتے، کبھی سفید پروں کی طرح فضا ان سے بھر جاتی، وہ اسے کیا کہنا چاہتے تھے۔ لفظ اسے کیوں اپنے تنگ گھیرے میں مقید کیے تھے؟

اُن کی ممکنات کیا تھی؟

تہہ در تہہ پرے باندھے جیسے فوج اپنے سالارِ اعلیٰ کے سامنے سلامی دینے کے لیے کھڑی ہو اور شام کی آخری سرخی میں ان کے تیروں کی اَنیاں چمک پکڑ کر لہو رنگ ہو رہی ہوں۔ جاہ و جلال، شان و شوکت، ہیبت و سطوت سے اسے مرعوب کرتے ہوئے۔

وہ ان کا کیا کرے؟

لفظ اپنی بہترین صورتوں میں اس کے سامنے جلوہ گر ہوتے، غم و اندوہ کے مارے سر جھکائے ہوئے۔ آنسوؤں کا بوجھ گھٹاؤں کی طرح سمیٹے ہوئے۔ سنجیدہ، پُر وقار، سوزِ درون سے لپکتے ہوئے آگ پکڑنے کو تیار خس و خاشاک کا ڈھیر۔ زاویئے اور مسجد کی دیواریں اس شہرِ پناہ کا ایک حصہ تھیں جو زنجیوں کے حملوں سے بچنے کے لیے بصرہ کے گرد تعمیر کی گئی تھیں۔ اس سے پرے بانس کے جنگل تھے جو دلدلوں کے درمیان جزیروں کی طرح تھے اور نہایت پُراسرار اور بھیدوں بھرے۔ عرب لٹیروں کے گروہ ان میں پوشیدہ رہتے۔ درختوں پر رہنے والے پرندوں کی چہکار صبح کے وقت اور شام کی سرخی میں سنائی دیتی اور نیلے دھوئیں کی طرح کی دھند میں ہاؤ ہو کی صدائیں کبھی آتیں۔ پھر دلدلوں پر کی بساند اور پھولوں کی خوشبو کو ساتھ لیتی جب تیز ہوا چلتی تو جنگلوں میں ارغنوں سے بج اُٹھتے۔ سازوں کے لہریوں پر کائنات اپنے گیت سناتے ہوئے نے نواز کے گرد نثار ہوتی۔ حسین کی جان بے تاب ہو جاتی۔ شیخ صومعہ سہل بن عبداللہ تستری کے درس سے آئے ہوئے اس طالب علم کو اپنی گہری نظروں سے دیکھتے انہوں نے ابھی اس کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کی تھی کیونکہ وہ دروس کے دوران جانے کہاں ہوتا تھا مگر جب آموختہ سنانے اور اشکال پر بحث کرنے کا وقت آتا تو عجیب و غریب دلائل سے وہ اپنا مطلب سُلجھانے کی کوشش کرتا اور اپنا نقطہ نظر واضح کر ہی لیتا۔ ابہام اور اغلاط کا شکار قطعاً نہ ہوتا۔ جو سمجھ نہ سکتا بلا جھجک اس کی وضاحت چاہتا۔ اکثر چپ رہتا۔ دوسروں سے الگ تھلگ اور اپنی رنگت کی زردی کی وجہ سے اپنے لاغر تن کی وجہ سے سب سے الگ پہچانا جاتا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت تنہائی اور کرب تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر دکھ کا شدید احساس ہوتا۔ اس کی جانِ بے تاب کو کیا تھا؟ بے قرار۔

ان تک یہ بات بھی شدہ شدہ پہنچی کہ وہ شب بیدار ہے اور نمازیوں کے جانے کے بعد مسجد میں آتا اور بہت طویل سجدوں میں ناصیہ فرسائی کرتا ہے۔ اس کم عمری میں اس کا طرزِ عمل حیران کن تھا۔ انہوں نے ایک زمانہ دیکھا تھا اور لوگوں کی تربیت کی تھی، اپنی جوانی یہاں لگائی تھی۔ ملکوں ملکوں گھومے تھے۔ درباروں سے منسلک رہے تھے۔ شورشوں اور عقائد کے طوفان میں سے نکلے تھے۔ روزگار کے اتنے نادر تماشے دیکھ چکے تھے۔ دلیر، بزدل سب طرح کے انسانوں کو گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ بادشاہتیں بدلیں اور تخت گردِ زمین ہوئے تھے، دیوانوں اور فرزانوں کو دنیاداری میں گم ہوتے پایا تھا۔ کاروان سالاروں کو پسِ کارواں رہتے اور بھٹکتے دیکھا تھا۔ شرق و غرب کو پھیلتے اور سکڑتے اور خوانین کو خاک نشین بنتے اور بے نام لوگوں کے طالع کو طلوع ہوتے دیکھا تھا۔ فقیر ان کے سامنے اوجِ ثریا پر پہنچے تھے اور راہ ہدایت کو چھوڑ کر بڑے عمدہ دنیادار بنے تھے مگر انہیں حسین کو سمجھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ نہایت بیدار اور بے حد لاپروا تھا اور ان سے کسی معاملے میں کبھی اعانت کا طالب نہیں ہوا تھا۔ اپنی عبادات میں غلو کے باوجود اس نے کبھی ان سے راستے کی دشواریوں کا گلہ نہیں کیا تھا۔ ان کی راہبری سے استفادہ نہیں کیا تھا۔

حسین نے لفظوں کے اس طوفان میں فنا ہونے سے بچنے کے لیے قلم کا سہارا لیا۔ لفظ رنگین اور بے کیف اس کے گرد پھیلے تھے۔ لفظوں کے اس صحرا میں اس نے جس حوض کے کنارے اپنے آپ کو آبِ حیات سے سیراب ہوتے پایا، وہ شاعری تھی۔

ان کی بستیاں ویران ہو گئیں
مگر ان کی خواہش میرے دل کو ویرانہ نہیں بننے دیتی
میرے آنسو ویران بستیوں پر نوحہ خواں ہیں
میری روح پگھل کر ان کی یاد میں رواں ہوتی ہے
ان کے کارواں کے تعاقب میں مَیں نے ساربان کو پکارا
"حسن کے دربار میں ایک گدا حاضر ہے"
مَیں نے خاک پر اپنے جذبۂ شوق کے لیے پیشانی رکھی
تمہیں محبت کا واسطہ مجھے نااُمید نہ لوٹاؤ

تم جو آتشِ شوق بھڑکاتے ہو
اُس میں سے اپنا خراج تو وصول کر لو۔

پُر شور رودِ کوہسار کی طرح لفظ اس کے جذبوں کو بہائے لیے جاتے تھے اور وہ جذبوں کا قیدی تھا۔ اس کی محبت ایک رہوارِ شوق پر سوار تھی اور اس کی طبیعت کی باگیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ طبلِ جنگ بج چکا تھا۔ نقارے پر چوٹ پڑ چکی تھی۔ خیالوں کے تیروں کی تیز دھار پر اسے رکھے وہ ان ویرانوں میں دوڑایا جا رہا تھا جہاں ہر طرف گرد تھی۔ خاک اڑتی تھی اور زمین زیادہ پکے ہوئے پھل کی طرح جگہ جگہ سے چٹخ گئی تھی۔

جب بالآخر منصور اسے جگہ جگہ ڈھونڈ تا منزلیں مارتا تھکا ہارا بصرہ پہنچا ہے تو حسین دفتر کے دفتر سیاہ کر چکا تھا۔ ویران بستیوں کے نوحے، زردی مائل چاندنی، سنہرے بالوں پر اترتی ہوئی گیتوں میں ڈھلتی ہوئی قافلہ سالاروں اور حدی خوانوں کے نغمے۔ صحرا میں اترتی گرد میں چھپ جانے والے حسین چہرے، دل کی طرف رواں ہو کر اسے بھول جانے والے خون کی سرد مہری اور پھر مجبور دوشیزاؤں کے نوحے جو وطن کو بھلا نہ سکیں گی۔

ان سرزمینوں کے فسانے جو خواب میں دیکھی گئی تھیں اور جوشِ جنون سے دیوانہ بنے ہوئے اس انسان کی حالتوں کا بیان جو ایک لمحے میں اپنا آپ لٹا بیٹھا بھلا بیٹھا۔ شکست خوردہ نوجوان کی تمناؤں کی آگ نے اس کا سینہ جلا ڈالا تھا۔

جب ہوا چلتی اور بانس کے جنگل نے نواز کے نغموں کی طرح پُراسرار آوازوں سے پُر ہو جاتے تو وہ صومعہ کی دیوار پر سے اس کی طرف دیکھتا۔ جنگل کا اسرار ان دیکھی پوشیدہ زمین دوشیزہ کی طرح ہریالی اور اندھیرے کے پردے میں چھپی ہوئی۔

وہ کتنا بے بس تھا جو صرف اپنے حصے کے دکھ کو محسوس کر سکتا تھا۔ کیا کبھی اسے یاد کیا جاتا ہوگا؟

نیزے کی انّی کی طرح یہ نوک اس کے سینے کے آر پار ہو جاتی۔

آنے والا زمانہ کتنے اندھیرے میں تھا۔ آوارہ گردوں کے گروہ نے اسے کہیں نہ کہیں فروخت کر دیا ہوگا۔ کن زمینوں، کن دیواروں، کن محل سراؤں میں وہ ہوگی۔

اس کا جی چاہتا سینہ کوبی کرے، شدت غم سے نڈھال آنے والی گھڑی کی بے یقینی اور ناامیدی نے مل کر اسے روئی کی طرح دھنک دیا۔ پارہ پارہ وہ اپنے ذرّوں کو لفظوں میں سمیٹنے میں لگا رہتا مگر کہاں تک؟

منصور نے ایک عاشق زار باپ کی طرح حسین کے دل کا ڈوبنا محسوس کیا۔ اس کی زمانہ شناس نگاہوں نے اس مرض کو بھی شناخت کر لیا۔ اپنے بچے کے چہرے پر بکھری زردی اور ناامیدی نے اس کی اپنی غم آشنا روح کو نہایت مضطرب کیا۔ اس کی کھوئی ہوئی اداس نگاہیں ویران تھیں۔ وہ کس طرح اپنے بیٹے کے دکھ میں شریک ہو۔ زخم خوردہ معصومیت کو کس طرح یقین دلائے کہ دنیا میں ابھی بہت کچھ باقی ہے اور یہی زندگی کا آخر نہیں تھا۔

تستر اور بصرہ کے درمیان جو کچھ ہوا ہوگا، اپنی ژرف نگاہی سے اس نے سمجھ تو لیا تھا مگر حسین اگر اسے بتاے تو شاید اس کے جی کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ وہ اپنے نورِ نظر کا غم بانٹنا چاہتا تھا مگر وہ اتنا دور اور تقریباً اجنبی لگتا تھا، اس سے آنکھ ملا کر بات نہ کرتا۔

''حسین کیا تم کچھ دنوں کے لیے واپس بیضا چلو گے؟'' منصور نے ایک دن اس سے پوچھا۔

''قافلے لٹ جاتے ہیں پدرِ محترم اور زنجیوں کی شورش سے کہاں امان ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہر کارواں نہیں لٹتا حسین اور اب تو خلیفۂ وقت نے راستوں کی حفاظت کے لیے کچھ بندوبست کیا ہے۔''

منصور کی بات سن کر وہ کچھ دیر چپ رہا اور پھر دروس میں شریک ہونے کے لیے جاتے ہوئے اس نے کہا۔

''نہیں ہر کارواں نہیں لٹتا، ہر کارواں کہاں لٹ سکتا ہے پدرِ محترم؟''

اس کے جانے کے بعد دیر تک منصور سوچتا رہا۔ پھر اٹھ کر اس نے یونہی کتابیں دیکھنے کے لیے کھولیں تو اس نے وہ گنج شائیگاں دیکھا جسے حسین نے ہر فانی نگاہ سے چھپا کر بالکل محفوظ رکھا تھا۔ محبت کا گہرا اور مندمل نہ ہونے والا زخم اس کے بیٹے کو لگ کیسے گیا؟ وہ سوچتا رہا۔

شام کو جب چراغ جلے اور ہوا میں خنکی بڑھی تو وہ اس کے شیخ سے رخصت طلب کرنے کے لیے مسجد کے اس حجرے میں گیا جہاں وہ نماز عشاء سے صبح تک تشریف فرما ہوتے تھے۔ وہ ان سے حسین کے لیے دعا کا طالب بھی ہوا۔

شیخ بہت متردد تھے یا خفا، انہوں نے ہاتھ نہیں اٹھائے حالانکہ وہ ضرور طالب دعا کی تسلی کے لیے عام روش اختیار کرتے تھے۔ منصور بیٹھا رہا۔ لوگوں کا مجمع کم ہو گیا تو شیخ نے کہا۔

"ابو حسین تمہارے بیٹے کو چاہیے کہ اپنے لیے خود دعا کرے۔"

"یا شیخ وہ آپ کے حضور حاضر ہے۔ آپ کی خاکِ پا ہے۔" منصور دو زانو ہونے کے باوجود جھکا اور اپنا سر ان کے قدموں سے لگا دیا۔

شیخ نے سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ "ابو حسین اسے چاہیئے اپنے لیے خود دعا کرے مگر ابھی اسے دعاؤں کی حاجت بھی نہیں۔"

منصور جھکا رہا، پتہ نہیں شیخ کیوں یہ کہہ رہے تھے؟ حسین نادان تھا، کم عمر تھا اور شدید جذبات کا شکار تھا۔ شاید اسے پرستش کی عادت اپنے اجداد سے ورثے میں ملی تھی؟ اس کی طبیعت شروع سے جمال پسند تھی۔ ظاہری اور دنیوی محبتوں کا خود بھی تجربہ رکھتا تھا۔ اوائلِ جوانی میں اسے بھی اپنی بنت عم سے شدید لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا حسن و جمال اس کا رخِ روشن، اس کا سراپا سب منصور کے دل میں ہلچل مچا دیتے تھے۔ مہینوں فرازے کا خیال سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے اس کی روح کو رنج والم سے بھر دیا کرتا تھا۔ محّمی سے اس نے کچھ نہ کہا کیونکہ فرازے کو اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ عجیب گم سُم لڑکی تھی جسے نہ اپنے حسن سے آگاہی تھی اور نہ ہی دوسروں کے دلوں میں لپکتی آتشِ شوق کی پروا اور پھر منصور کو اس سے بس اتنا ہی انس تھا کہ وہ اس کو اپنی ملکیت بنانا چاہتا تھا۔ عام معمولی لڑکی کی طرح وہ اس کے گھر کی زینت بن جائے۔ ایسا چراغ جس سے وہ اپنی زندگی میں روشنی اور سکون پا سکے۔ جب بالآخر وہ اسے پا چکا تو اس گونہ تسلی اور طمانیت کے ساتھ ایک ناامیدی بھی ہوئی۔ اس میں زندگی کی گرمجوشی پیدا نہ ہوئی۔ وہ خوشی اور ولولۂ شوق مفقود ہی رہا۔ یہاں تک کہ حسین پیدا ہوا اور وہ اسی طرح گم سُم اس کی زندگی سے نکل گئی۔

حسین کی پلکیں اُسے سوختہ لگتی تھیں۔ جیسے تیز آنچ اور تپش سے جھلس گئی ہوں۔ سرخ و سفید رنگت سیاہ پڑ گئی تھی اور زردی مائل خشک جلد کے اندر سے یوں حدّت چھلکتی تھی جیسے پردوں کے پیچھے کوئی الاؤ جل رہا ہو۔ وہ رات دیر تک صومعہ کے دالان میں الگ تھلگ مدھم سے چراغ کے سامنے لکھتا رہتا یا سوچ میں ڈوبا مراقبے کی حالت میں اپنے آپ سے گم دکھائی دیتا۔

درختوں کی زمردیں شاخیں نئے شگوفوں، نئی کونپلوں سے پُر بہار تھیں۔ صومعہ کی عمارت میں تازگی اور ندرت کیف تھی۔ دریا، پہاڑوں پر برف پگھلنے کی وجہ سے کناروں سے چھلکے پڑتے تھے اور انہیں دیکھنے سے آنکھوں میں ٹھنڈک اترتی تھی۔ کشتیاں فصیلِ شہر کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں سے بھری ہوئی زنجیوں کی شورشوں کو فرو کرنے والے ترکوں اور کبھی کبھار کُرد سپاہیوں سے پُر ہوتیں جو ان نامساعد حالات میں بھی جب کہیں لنگر انداز ہوتے تو گیت گاتے۔ ان کے پڑاؤ کی روشنیاں دیواروں پر پڑتیں اور بربط نواز کرخت آوازوں سے جو کہتے، وہ کبھی سمجھ میں آتا اور کبھی نہیں مگر سازوں کو سن کر دماغ ہلکا ہو جاتا جیسے عناصر کہیں یکجا ہو کر دعا گو ہیں۔ چاہتوں اور محبتوں کے ارمان جی میں جاگتے۔

آدمی کی زندگی کا کیا اعتبار ہے۔ یہ جو دو گھڑی ہنس بول رہے ہیں، جانے کل ہوں گے کہ نہیں دل ان کی چلت پھرت سے وسوسوں میں ڈوب جاتا۔ ہوا چلتی تو ان کی سمجھ میں نہ آنے والی باتوں کا شور سنائی دیتا۔ جیسے جیسے ستاروں کے قافلے اپنے سفر پر جھکتے سناٹا گہرا ہوتا جاتا۔ صرف پہرہ دینے والوں کی آوازیں ہی آتی رہتیں مگر حسین سب سے بے نیاز دالانوں میں کاغذوں پر جُھکا رہتا۔

"شیخ نے کہا تھا حسین کو چاہیے، وہ اپنے لیے خود دعا کرے۔"

"حسین تم اپنے لیے خود دعا کرو۔" ایک دن منصور نے اس سے کہا۔

"میں اپنی کونسی التجا لے کر اس کے حضور حاضر ہوں۔" "پدرِ محترم کہ خدا تمہیں صحت دے۔" منصور کو سوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

حسین نے ہنس کر اوپر دیکھا۔ "مگر میں بیمار نہیں ہوں۔ میری صحت تو اچھی ہے۔"

منصور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "حسین میرا حاصلِ زندگی تم ہو۔"

"پدرِ محترم، آپ کو حاصل سے اتنا لگاؤ کیوں ہے؟اور پھر ہر حاصل آخر کہیں نہ کہیں مصرف میں لایا جاتا ہے۔" حسین نے ایک ایسی بے نیازی سے کہا جو منصور کے دل کے آرپار ہو گئی۔

"حسین میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ چلو۔ کاروبار میں میرے شریک بنو میں اپنی ہڈیوں میں درد محسوس کرتا ہوں۔ تمہارے دادا کے بعد سے یہاں (اس نے دل کی طرف اشارہ کیا) ایک خلا سا ہو گیا ہے جسے نہ مطالعہ اور نہ ہی مصروفیت کچھ پُر کر نہیں سکتا اور پھر تمہارے ماموں کی لڑکیاں تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں۔" منصور نے بہت گہری نظروں سے بیٹے کی آنکھوں میں ملتجی نگاہوں سے دیکھا۔

"ماموں کی لڑکیاں جب میں گھر لوٹوں گا، مجھے ضرور دیکھ لیں گی مگر آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ کسی اچھے طبیب کا علاج ہونا چاہیے۔" وہ قلم وہیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ "ہمارے صومعہ کے پاس ایک نہایت عمدہ اور تجربہ کار یہودی طبیب ہے۔ چلیے اسے ملتے ہیں۔"

"تم کبھی اس کے پاس گئے ہو؟" منصور نے کہا۔

"کس لیے پدرِ محترم؟"

"تم نے محسوس نہیں کیا کہ تم کتنے لاغر ہو گئے ہو۔ تمہاری رنگت زردی مائل سیاہ ہو گئی ہے اور ہاتھوں کی ہڈیاں پتلی کھال میں سے صاف دکھائی دیتی ہیں۔" منصور نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

حسین نے بہت غور سے الٹ پلٹ کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔

"تم نے محبتوں کی طرح اپنا آپ گھلانا کیوں شروع کر دیا ہے؟ کیا کسی لیلیٰ کی نظر میں آگئے ہو؟" منصور نے آخر وہ بات کہہ ہی دی جس کے بھاری بوجھ کو اٹھانا اب اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔

"کیا میں آپ کو دیوانہ لگتا ہوں؟ مجنوں کو تو خود پر لیلیٰ کا گمان ہونے لگا تھا۔ وہ تو خود لیلیٰ بن گیا تھا اور میں تو حسین بن منصور ہوں۔ بخدا پدرِ محترم آپ کو کیونکر ایسا محسوس ہوا ہے؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے باپ کے پاؤں پکڑ لیے۔ "میں آپ کی زندگی میں دیوانہ ہونے کی گستاخی نہیں کر سکتا۔"

منصور نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ''شاعری ایک اذیت ناک پرُالم تجربہ ہے، بے چین اور کربناک اور انجام کار روح اس سے سیراب نہیں ہو سکتی۔ تم کلامِ پاک میں اپنی سعادت تلاش کرو!''

حسین کو ایک جھٹکا لگا جیسے اس کی جان نکلنے والی ہو اور اس کا وجود ایک دم سرد ہو گیا۔ وہ پسینے میں نہا گیا تھا۔

تُو لیلیٰ کی یاد کو چھوڑ دے

اور اپنے غم و افکار دور کرنے کے لیے

ایک مضبوط قد آور اونٹنی کے ذریعے سفر کر۔

جو سوار کے پیچھے سوار کو لے کر تیرے فکر کی تیزی سے دوڑے

منصور کے ذہن میں زمانہ جاہلیت کی عربی شاعری کے نمونے اشعار اور لفظ تیز آندھیوں کی سرسراہٹ پیدا کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔

''تم تُستر چلے جاؤ۔'' منصور نے لمبی خاموشی کو توڑنے کے لیے کہا۔

''نہیں۔'' حسین نے زمانوں کے بعد اپنے آپ میں لوٹتے ہوئے گویا کہا۔ ''اگر آپ پسند نہیں کرتے تو میں شاعری تلف کر دوں گا۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے؟'' منصور نے نہایت وقار سے کہا۔ ''اگر تمہیں بصرہ میں قیام کرنا ہی ہے تو میری کوئی شرط نہیں سوائے اس کے کہ تم کلام اللہ سے محبت کرو۔ یہ ابتدا اور انتہا ہے۔ محبت کرنا سیکھو اور دل میں وسعت پیدا کرو۔ دنیاوی محبتیں بھی گو توفیق کے بغیر نہیں اور دل کو گرم رکھتی ہیں۔ دن گزارنے کے بہانے ہیں اور اولیں مقام یہی ہے مگر جن پر رحمت خداوندی ہو، وہ ثابت و سالم یہاں سے گزر جاتے ہیں۔''

''جی پدرِ محترم!'' اس کی آواز نہایت پست تھی اور سینے میں سے گویا گُھٹ گُھٹ کر نکل رہی تھی۔

اگر غور سے دیکھو تو سارے چہرے ایک سے ہوتے ہیں۔ لیلیٰ اور سلمیٰ اور عذرا۔ ان سب کو غرّہ ہوتا ہے کہ لوگ ان کی محبت کے قتیل ہیں اور ان کے اشارہ پر ناچتے ہیں اور ان کی محبت سے کنارہ کش نہیں ہوتے۔

حسین نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''میں دو حرقہ جانا چاہتا ہوں اپنی تربیتِ

نفس کے لیے۔"

صومعہ میں درخت پھولوں سے سفید ہو رہے تھے جیسے برفباری کے بعد پہلی دھوپ میں دکھائی دیں اور ہوا خوشبو سے بھری تھی۔ جب منصور نے شیخ سے حسین کے لیے رخصت طلب کرنے کے بعد رختِ سفر باندھا۔ شیخ نے حسین سے کہا تھا۔ "جو توفیق تمہیں نصیب ہوئی ہے وہ دہلیز ہے۔ اس کو پار کر کے جو کچھ پا سکو گے، وہ تمہارے مقدر سے بہت زیادہ ہو گا بہت زیادہ۔"

پھر وہ دونوں اس پُر آشوب شہر اور پُر سکون مسجد اور مدرسہ کو چھوڑ کر دو حرقہ جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو گئے اور بصرہ بانسوں کے گھنے جنگلوں، دلدلوں اور پُر شکوہ مدرسوں پُر جلال مسجدوں سرسبز کنجوں سمیت بہت پیچھے رہ گیا۔

اے ساربان آہستہ چل
کہ میری پسلیوں میں آگ ہے

رات آہستہ چلنے والے ستاروں کے ہم رکاب غم و اندوہ کے صحرا میں اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ زنجی پیغمبر نے اپنے ساتھیوں سے جو شورہ نکالنے والے زنگی اور حبشی، فوج سے بھاگے ہوئے سپاہی، مجرم اور سزا یافتہ بدکردار تھے، کہا تھا کہ اگر وہ بغداد پر قبضہ کر سکا تو ان سب کی زندگیاں بدل جائیں گی۔ وہ انہیں آسودگی اور رہنے کے عمدہ ٹھکانے دے گا۔ وہ ان کے لیے اپنی جان تک لڑا دے گا۔ اسے اپنے لیے کسی شے کی ضرورت نہیں۔ وہ ان کے لیے ہی سرگرداں ہے۔ بصرہ کے گرد و نواح میں ان کی شورشوں سے زندگی ایک دم پریشان ہو گئی تھی جیسے کوئی پھلوں سے بھرا ٹوکرہ زمین پر الٹ دے۔ قافلے جو شاہراہوں پر انتہائے مشرق سے مغرب اقصیٰ کو جاتے ہوئے اپنی حفاظت کا پورا انتظام کرنے کے باوصف خوفزدہ ہوتے تھے اور کرائے کے لوگوں کو پاسبانی کے لیے رکھتے تھے۔ مسلح سوار جو ہر طرف سے گھیر کر چلتے۔ موسم بدلنے کی وجہ سے سفر ممکن تھا۔ اس لیے کوچ کا نقارہ صبح صادق کے وقت بجایا جاتا۔ راتیں سخت سرد ہو چلی تھیں مگر زنجیوں کے ڈر سے آگ کو سرِ شام ہی بجھا دیا جاتا تھا۔ سناٹے اور خوف

سے گھبرائے ہوئے کاروان بھاگے رہتے۔ مائیں بچوں کو سلاتے ہوئے لوریاں نہ گاتیں۔ ٹانگیں پھیلا کر چین سے سونے کو تو خواب سمجھا جانے لگا تھا۔

دو حرقہ پہنچ کر منصور نے کہا۔ "حسین سوچ لو یہ نسطوری عیسائیوں کا قریہ ہے۔ کلیساؤں کے سوا صرف ایک شہری انتظام کا مدرسہ ہے جس میں کلام اللہ پڑھایا جاتا ہے۔ اس کی تفسیر اور حدیث کی تعلیم دی تو جاتی ہے مگر تمہارے حسب منشا شاید نہ ہو۔"

حسین نے کہا "میں اسی مدرسے میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ ستاروں اور مقدر کے فیصلے کیا کہیں گے؟"

منصور اسے دیکھتا رہا۔ یہ بے چین روح آخر چاہتی کیا ہے؟ کس شے کی طالب ہے؟ یا شاید محض تجسّس اسے ایک سے دوسری جگہ لیے پھرتا ہے۔ وہ کب تک اس کے تعاقب میں یونہی سرگرداں رہے گا؟ وہ اس پر اپنی مرضی مسلط بھی نہیں کر سکتا۔ کر سکتا ہے کیا؟ جوان اولاد آزمائش ہوتی ہے۔ آپ انہیں کسی کام پر مجبور نہیں کر سکتے۔ سوال تو کر سکتے ہیں مگر جواب کی امید کے بغیر۔ ان کی اور ہماری سوچ میں کتنا فاصلہ ہے۔ وہ یونہی چیزوں کو توڑنے اور جوڑنے اور تربیت دینے کے مراحل کس آسانی سے طے کر لیتے ہیں اور ہم کسی ٹوٹی ہوئی شے کے تصور سے بھی لرزاں ہیں۔ چہ جائیکہ کسی زندگی کے؟ ایک ایسی سواری کی طرح جو کارواں سے بچھڑ گئی ہو اور صحرا میں بے نام و نشان مسافتوں کے باوجود راہ تلاش کرنے میں ناکام رہی ہو۔ وہ کیا کرے؟ حسین نے اسے کتنا بے بس کر دیا تھا۔ ایک غلام کی طرح وہ اس کے پیچھے کھنچا چلا آتا تھا۔ آرام کی زندگی خواب ہو گئی تھی۔ تستر سے حسین کے بغیر اطلاع دیئے چلے آنے کے بعد وہ پورے علاقے کے ایک ایک صومعہ کو چھانتا پھرا تھا اور اس کے اپنے وقت کی تنگیٔ داماں کے باوجود ارادے۔ وہ کیا کر سکتا ہے؟ اسے حسین کو مقدر کے حوالے کر دینا چاہیے۔ آخر مقدر کے سوا وہ کس شے کا سہارا لے سکتا ہے؟

حسین نے پھر کہا۔ "پدرِ محترم زاویئے کی زندگی تن آسانی ہے۔ صرف اور محض تن آسانی۔ مَیں نے کسی جگہ پڑھا ہے کہ بھکشو اور برہمن اپنا گزارہ اس خیرات پر کرتے ہیں جو انہیں گھر گھر جا کر لانی پڑتی ہے۔ "بھکشا" کے ناطے اور صومعہ نشینوں کی زندگی

بھی کچھ اسی طرز کی ہوتی ہے۔ آدمی کو پہلے اچھا دنیادار بننا ضروری ہے۔ ان المناکیوں اور مصیبتوں کو جھیلنا جو ایک عام آدمی جھیلتا ہے اور پھر خدا اس پر اپنی عنایت کرے تو ہر شے جب اس کی بنائی ہے تو اس سے اجتناب کیوں؟ ساری صورت گری جب اس کی ہے تو بھاگنا کیسا؟"

منصور کو یک بیک یہ تاویل کچھ عجیب سی لگی۔ جیسے اس نے ٹھوکر کھائی ہو مگر اس نے حسین کو ٹوکا نہیں۔ "کیا آپ بہت ناخوش ہیں؟" حسین نے منصور کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

منصور کو لگا وہ خود اور اس کے وسوسے سب تحلیل ہو گئے ہیں۔ حسین اگر تجربہ کرنا، ایک اور طرح کی زندگی گزارنا اور اچھا دنیادار بننا چاہتا ہے تو اسے کیا اعتراض؟ صرف اسے اس کا سفر، اس کی منزلیں معلوم ہوں تاکہ وہ نامعلوم کے خلا میں بھٹکتا نہ پھرے۔

دو حرقہ کا مدرسہ ایک بڑی درسگاہ تھی جس میں داخلے کی شرط صرف عمر اور کمال فنِ حرب کے لیے شوق وافر تھی۔ یہاں سے بہترین تربیت یافتہ لوگ حکومت کے نظم و نسق میں معاون بنائے جاتے تھے۔ بہادری اور تلواروں سے کھیلنے کا حوصلہ رکھنے والے نوجوان یہاں عزت پاتے تھے۔ دیانت، شرافت اور حوصلہ مندی کو بے تعصبی سے پرکھا جاتا تھا۔ ذہانت اور معاملہ فہمی ضروری تھی۔ خوددار اور غیور لوگ یہاں کا سرمایہ تھے۔ ذاتی وجاہت لازم تھی کہ عوام سے رابطہ کے لیے یہ فخر و مباہات کے بغیر اپنا اثر رکھتی تھی۔ خوش خلقی اور خوش اطواری سے جو دل جیتے جائیں، وہ تلواروں سے بھی ناممکن ہوتے تھے۔ آگے بڑھتے رہنے کا عزم و حوصلہ اور نامساعد حالات میں بھی شکست خوردگی سے بچنے کے لیے کوئی راہ تلاش کرنے والے پسندیدہ ہوتے تھے۔ کوئی کام بھی ناممکن نہیں، یہاں کا نعرہ تھا۔ خلیفۂ وقت سے عقیدت و محبت تمغۂ امتیاز تھا۔

حسین نے منصور کو الوداع کہتے وقت نہایت خوشدلی سے کہا "پدرِ محترم آپ حسین کو کسی کے عقب میں نہیں پائیں گے۔" وہ ہنس رہا تھا اور لمبی دوڑ کے بعد اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ سپاہیانہ لباس اس پر خوب سج رہا تھا۔ ان چند دنوں میں ہی اس کی

پژمردگی اور خاموشی، خوشی اور مسکراہٹ میں بدل گئی تھی مگر اس کی طبیعت کا خاصا غلو تو موجود ہی تھا۔ دوسروں پر سبقت لے جانے کے لیے وہ محنت اور مزید محنت کرتا تھا۔

"پدرِ محترم یہ تربیتِ نفس کے لیے عمدہ جگہ ہے۔ میں معین وقت پر یہاں پہنچا ہوں۔" اس نے باپ کے سامنے جھکتے ہوئے کہا۔ اس کے پسینے کی خوشبو نے جو مشقت اور صحت یابی سے مل کر پیدا ہوئی تھی، منصور کو اگلی ملاقات تک مدہوش رکھا۔ منصور نے سوچا، وہ یہودی اطباء کی اس شہادت پر اعتبار کر سکتا ہے کہ پسینے کی خوشبو انسان کی کیفیات کی سفیر ہوتی ہے۔ وہ ہجر کی اذیتوں کی شاعری اور المناک جدائیوں کے نوحے کسی اور حسین کے قلم سے نکلے تھے جو اپنی ساری شدت کے باوجود نرم و نازک اور ریشمی جذبات سے بنے ہوئے تھے۔ ادھورے اور ناتجربہ کار سے لفظ جن میں نبضوں پر گزرے ہونے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ ہو سکتا ہے وہ محض ایک عارضی کیفیت ہو۔ اب اسے حسین کی طرف سے سکون تھا اور وہ مضطرب لمحے ایک گزرے ہوئے دکھ کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ شاہراہ پر ٹھوکر کھا کر وہ سنبھل گیا تھا؟

تند و تیز دورِ حیات جیسے گرداب میں گرفتار کشتی ہو۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ایک نوجوان کے ضمیر کو نئے سرے سے گوندھا اور بنایا جاتا تھا۔ بظاہر یہ کسی قدر ناممکن تھا مگر اس مدرسے کی روایات ایسی ہی تھیں۔ سپاہی کا کام صرف اور محض احکام پر آنکھ بند کر کے چلنا تھا۔ حسین نے آج تک کتابوں اور نمازوں اور مراقبوں اور ضبط نفس کی تربیت حاصل کی تھی۔ وہ بھی اس کے اپنے خیالات کے مطابق ایک صورتحال تھی جسے اس نے اپنے لیے خود پسند کیا تھا۔ اس پر کاربند رہا۔ یہاں تک کہ وہ دو حرقہ آیا اور سرفروشوں کے جذبے سے اس مدرسہ میں شامل ہو گیا۔ دو حرقہ نے بڑے بڑے سالار اور دلاور حکمران پیدا کیے تھے کیونکہ جب کوئی نوجوان یہاں پر شامل ہوتا تو اس کی نس نس کو کڑی آزمائشوں اور مشقتوں سے چور چور کیا جاتا تھا اور پھر کسی قسم کی ہمدردی اور شفقت روا نہیں رکھی جاتی تھی۔

حسین نہایت نازک اور تقریباً بیمار تھا۔ جب وہ یہاں آیا ہے مگر پہاڑی نالوں کو پھلانگنے اور ڈھلوانوں کو بِنارُ کے معینہ وقت میں عبور کرنے میں اس سے کوئی رعایت نہیں برتی گئی۔ سخت جان اور مضبوط بنانے کے لیے یہ بہت ضروری تھا کہ طبیعت کو

رواں رکھنے کی عادت ڈالی جائے۔ کڑے مجاہدے کی یہ زندگی ریاضت اور محنت سے عبارت تھی۔ جسم و جان کو ایک کرنا ہر گرمی اور سردی کو برداشت کرنا، میلوں پیدل چلنا، آدمی کو اپنے ساتھ اکیلے ہونے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ عبادت میں جو لذت ہوتی ہے، نفس کے ساتھ جنگ کی حالت میں رہنے سے جو ایک گونہ بے خودی حاصل ہوتی ہے، وہ کہاں تھی؟ خواب و خیال، ماضی کی عیش کوشی تھی۔ جاگنے اور سونے کے وقفوں میں اپنے ذاتی اور ضروری کاموں کے لیے بھی مشکل سے کوئی پل نصیب ہوتا۔ تھکے ہوئے جسم کو آرام نہیں سختی کا عادی بنایا جاتا تھا تاکہ ایک کبھی نہ شرمندہ ہونے والی روح کی پناہ گاہ بن سکے۔

ان مشقتوں اور مشقوں نے اعصاب پر بھی عمدہ اثر ڈالا اور حسین کی نظر تیز اور عقل چالاک ہو گئی۔ جب اسے ہوش آیا اور امتحان ہو چکا تو آذر گزر چکا تھا۔ سارے پہاڑ برف سے ڈھک چکے تھے اور تیز سرد ہواؤں میں فرات کے پانیوں کی بہتی ہوئی تندی اور نیلاہٹ تھی۔ وہی فرات جس کے کناروں پر نواسۂ رسولؐ نے دم توڑا اور اس کے کناروں پر وہ خونیں جنگ لڑی گئی جس کو وقت کبھی بھلا نہ سکے گا۔ فرات بیچارگی اور تشنگی اور موت ہے اور دنیا میں ساری جنگیں کسی نہ کسی طور استبداد اور زیادتی ظلم اور ستم کے خلاف جہاد ہیں۔ حسین نے سوچا، میں جو خلیفہ وقت کی عزتوں کا امانت دار ہوں۔ میں پتہ نہیں کس فوج میں شریک ہوں۔ حسین ابنِ علی کے مخالفوں کی صفوں میں یا ان کی معاونت کرنے والوں میں مگر حسین ابن علی کی معاونت کے لیے کون پہنچا تھا؟ صحرا کی تند و ظالم آندھیاں، پانی جو سامنے تھا، مگر سراب تھا کہ ان پر بند کر دیا گیا تھا اور وہ خلیفہ وقت کا تمغہ امتیاز اپنے سینے پر سجائے پھرتا تھا۔ خلیفۂ وقت! حسین بن منصور نے سوچا، اگر اہلِ بیت کی دعوت آج کامیاب ہو تو وقت کے دامن سے خون کے دھبے مٹائے جا سکتے ہیں۔ بتول کی کھیتی ہری ہو سکتی ہے تو خاکِ کربلا بھی دھل سکتی ہے۔ نواحِ کاظمہ کی ریت مثلِ پریاں نرم ہو سکتی ہے تو کنارِ فرات کی ریت تو ملائمت میں کوئی نظیر نہیں رکھتی۔

مگر کیا ابنِ علی عمدہ سپاہی نہ تھے؟ اس کی سوچ یونہی کبھی کبھار اسے پریشان کرتی تھی۔

حسین ابن علی کاروانِ حجاز کے قافلہ سالار کربلا کے شاہِ شہیداں۔ وہ سر جو کبھی دوشِ رسولؐ کی زینت تھا اور پھر خاک کربلا اس سے سرفراز ہوئی۔ وہ سر جو فخرِ جہاں تھا، کیوں شکست سے دوچار ہوا؟

آلِ عباس نے کیا آلِ علی کا حق غصب کیا تھا؟

بنو امیہ نے کیا آلِ رسولؐ کو پیچھے دھکیلا تھا؟

ایسے میں ایک سپاہی کا منصب کیا ہے۔ اس کی فراست اسے کیا کرنے کی اجازت دیتی ہے؟

ایک عام آدمی جب سوچتا ہے کہ دریا سراب بن گئے تو وہ ان کی بے بسی پر روتا ہے جو سرابوں کو دریا بنانے کا حوصلہ رکھتے تھے، وہ جن کی نگاہوں سے تقدیریں بدل سکتی تھیں۔ کس وعدے کو نبھانے کی خاطر کس چراغ کو فروزاں کرنے کے لیے کربلا میں تیروں کا نشانہ بنے۔ پانی کے لیے پریشان ہوئے اور ایک بڑی فوج کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔ ایک ایک کر کے نوخیز اور جوان کٹ کٹ کر گرتے رہے۔ کب بارگاہِ خداوندی میں طوفان نہ آیا؟

کیا عرش ہل نہ گیا؟

رسول خداؐ کی نگران نگاہوں نے دیکھا کہ فاطمہ کے درِ یتیم کوفہ کی طرف کوچ کرتے ہوئے گھیر لیے گئے۔ زندگی اتنی اہم کہاں ہے؟

زندگی کیا ہے کہ حسین ابنِ علی کو بچایا نہ گیا اور حسین اپنے کس وعدے کو نبھا رہے تھے۔ ان کو یہ قربانی بہر حال دینا تھی تاکہ قربانیوں اور سرفروشیوں کا مذہب رواج پا سکے۔ مذہب عشق کی تبلیغ اس سے سوا آخر کیسے ہوتی؟ اگر کوئی کمتر شخص دستِ کربلا میں کنارِ فرات اپنے خاندان کی حفاظت کرتا ہوا مارا جاتا تو اس کے اتباع کے لیے کون نکلتا؟

اہلِ بیت گو پوری زندگی کے اضطراب کے بالواسطہ یا بلاواسطہ باعث تھے کہ ان کی وجہ سے فرقے اور خیال اور تفریقیں معرضِ وجود میں آئیں مگر وہ تو علم و مذہب کی ترقی کے لیے مزاج خانقاہی میں پختہ ہو گئے۔ رقصِ زندگی میں ان کا حصہ کم تھا۔ سیاست کے کھیل میں وہ چوگان بازی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ فضیلتیں ان پر قربان اور وجاہتیں

ان پر نثار تھیں۔ وہ سارے واسطوں سے اس سلطنت کے رکن رکین تھے مگر دنیا کو اپنی ٹھوکر پر سمجھتے تھے۔ وہ اس کے حصول کے لیے ہرگز سرگرداں نہ تھے مگر جب کبھی جور و ظلم زیادتی اور استبداد نے پاؤں پھیلائے انہوں نے اپنی تلوار نیام سے باہر نکالی۔ ان کا نام اور لوگوں نے سرِ منبر سجا کر مقصد حاصل کیے اور ابو مسلم خراسانی نے آل عباس کے لیے راہ استوار کی۔ پھر خود دعویٰ خدائی کیا اور مارا گیا۔

واقعات کا سمجھ میں نہ آنے والا ایک بحر محیط تھا۔ سیاہ اور بے موج اندھیروں سے عبارت جو روشنی کے ساحلوں کو کہیں چھو جاتا تھا۔ وہ سوچتا رہتا "کیا آلِ عباس حق پر ہیں؟" "کیا وہ خلیفہ وقت کا تمغہ امتیاز اپنے کندھے پر سجائے ہوئے وفاداری کا ثبوت دے رہا ہے۔ دو حرقہ نے اسے بے سوال وفاداری کا سبق سکھایا تھا۔ اسے اتباز گیدا توڑا مروڑا اور ایک نئے شخص میں تبدیل کر دیا تھا مگر اس کا دماغ اب بھی سوچتا تھا، غلط یا صحیح مگر سوچتا تھا، وہ کیا کرے؟

اسے وہ شعر یاد آئے۔

پھر مجھے میرے بھائی نے آواز دی اور یہ اس وقت جب
شہسوار میرے اور اس کے درمیان حائل ہو چکے تھے۔ اس
کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جب میں اس کے پاس پہنچا تو
نیزے اس کے بدن میں اس طرح پیوست ہو چکے تھے جیسے
جولاہے کے آہنی کنگھے بُنے جانے والے پھیلائے ہوئے
کپڑے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔

ملک کے طول و عرض میں بغاوتیں پھیلی تھیں اور دو حرقہ کے نواح میں قرمطی اپنے عقائد اور ایمان کی وجہ سے امن وامان کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے۔ یہ فتنہ اس فتنے کے سوا تھا جو بصرہ کے نواح بحرین اور خلیج کی ریاستوں میں پھیلا تھا۔ اس وسیع سلطنت کے لیے ایک نہایت باہوش اور بلند حوصلہ خلیفہ کی جو فراست، سیاست اور تدبر میں ارفع اور اعلیٰ ہو، ضرورت تھی۔ خود دربار بنی ہوئی وفاداریوں اور دولت کی لپیٹ میں تھا۔ ایسے میں کسی کی وفاداری ضروری تھی۔ سپاہی جب حق کے لیے لڑے تو بے تیغ بھی لڑ سکتا ہے، مگر حق کس طرف تھا؟

ایسے وقت میں تلوار سب سے زیادہ بے نیام ہوتی تھی جب اسے نیام میں رہنے کی ضرورت تھی!

قرمطی اپنی دعوت اتنی سرعت سے پھیلا رہے تھے کہ گمان ہوتا تھا ایک نیا دین یورش کر کے آیا ہے اور اسلام کو صرف بغداد کے نواح میں محدود کر دے گا۔ حاجیوں کے قافلے لوٹ لیے جاتے تھے۔ یہ قرامطہ کون تھے؟

عیسائیوں اور یہودیوں کی مشترکہ کوششیں تھیں کہ اسلام میں رخنہ اندازی کی جائے۔ وہ صحرانشینوں، بدویوں اور سادہ دلوں پر اگر کسی عظمت کو مسلّط کر دیں جو بظاہر اسلام سے میل رکھتی ہو مگر اصل میں اس سے جدا ہو تو لوگوں کے دلوں کو پھیرا جا سکتا ہے۔ ان سازشوں نے نئے مذاہب ایزاد کیے تھے۔ نئے پیغمبر نئے راستے۔

"قحطائیت، عدنانیت، علوئیت، بکریت، ہاشمیت، امویت، عربیت اور قومیت کی آگ مسلمانوں میں کوہِ آتش فشاں کے لاوے کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی جو حکام کی سیاست اور نظامِ حکومت کے لحاظ سے ہلکی اور تیز ہوتی رہتی تھی اور اس ساری تگ و دو کا مطلب قیادت اور امامت تھا۔ جو شخص زمانۂ جاہلیت میں سردار تھا، وہ اسلام میں بھی سردار بننا چاہتا تھا۔"

سرداری کی اس آرزو نے نئی راہیں کھولیں۔ پھیلی ہوئی سلطنت جیسے دریا کا پانی منبع پر تو شفاف اور میٹھا ہوتا ہے مگر اور ندیوں نالوں کے ملنے سے جیسے گدلا ہوتا چلا گیا اور تیسری صدی ہجری تک تو اس کی غلاظت کیچڑ کے مشابہ تھی جس میں نہ گھاس اُگتی ہے، نہ پھول کھلتے ہیں۔

جب معتضد بڑے بڑے فوجی مدرسوں کا معائنہ کر چکا تو دوحرقہ کی باری بھی آئی۔ خلیفہ بنفسِ نفیس کسی درسگاہ کا معائنہ کرے، یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ نسطوریوں نے اپنی خانقاہوں میں خلیفہ کی درازی عمر کے لیے خصوصی دعائیں کروائیں اور اس بہادر، دلیر اور دانا حکمران کے لیے جو سپاہیانہ اوصاف رکھتا تھا، دوحرقہ کے مدرسے میں آمد پر سخت اضطراب اور چہل پہل تھی۔ قریے کو آراستہ کیا گیا تھا اور اس کے لیے جو سفاح ثانی کہلاتا اور عباسیوں کی نشاۃ ثانیہ کا باعث ہوا تھا، بہت گرمجوشی کا مظاہرہ کیا گیا۔

حسین کو یہاں آئے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ طلبہ چھوٹے چھوٹے

دستوں میں بٹے تھے۔ پیشوائی کے لیے تیار، ضبط و نظم سے بہترین قطاروں میں ایستادہ جوانوں کے چہرے صبح کی تیز دھوپ میں تمتمائے ہوئے اور تلواروں کی طرح چمک رہے تھے جو ان کے ہاتھوں میں بے نیام تھیں۔ خلیفہ کا گھوڑا بڑے دروازے کے سامنے ٹھہر گیا۔ یہ ایک بہترین عربی شہسوار کا مرکب تھا۔ سدھایا ہوا پتلی کمر والا شیر کی طرح پُر غرور چتون جنگ میں بجلی کی طرح دشمن کی صفوں کو چیرنے والا۔ سارے سپاہی خلیفہ کے سامنے سے گزرتے رہے۔ حسین بھی گزر ہی جاتا مگر معتضد نے اسے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔

"کیا تم اس گھوڑے پر سوار ہو سکتے ہو؟" اس نے باگیں اس کے ہاتھ میں دینے کا حکم دیا۔

حسین نے دائیں بائیں دیکھا کہ وہ کیا کرے؟

خلیفہ نے پھر حکم دیا۔ "اس پر سوار ہو کر اقامت گاہ اور مدرسے کا ایک چکر لگاؤ۔"

پتہ نہیں ایسا عجیب و غریب حکم کیوں دیا گیا تھا۔ حسین نے ابھی گھڑ سواری کی وہ تربیت حاصل نہیں کی تھی مگر نہ ہی کوئی مدرس اور نہ ہی کوئی تربیت دینے والا اس کی کوئی مدد کر سکتا تھا۔ وہ اس کی کمزوری کو جانتے تھے۔

حسین نے ایک لمحہ کے لیے آنکھیں بند کیں اور اسے تستر میں سہل بن عبداللہ کے درس میں گزارا وقت یاد آیا۔ اسے اپنی گستاخی یاد آئی اور وہ وسائل جن کو سمجھنے کی کوشش اس نے کی تھی۔ مخفی رازوں کے وہ حروف یاد آئے اور ان کے درپردہ قوتیں اس پر تجلی کی طرح منکشف ہوئیں۔ ان سارے اسموں میں وہ اسم اعظم جو لڑکپن کی وجہ سے اس کے ذہن سے پھسل گیا تھا اور گھوڑے نے اس کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ اس کی سرکشی غائب ہو گئی۔ بھیڑ کے بچے کی طرح نرم خو بن کر اس نے حسین کو اپنے پر سواری کی اجازت دی اور اقامت گاہ مدرسہ سب بیک وقت اس کا ایک قدم تھے۔ وہ سنہری ایال پکڑ کر اترا اور خلیفہ کے سامنے زمین بوس ہونے کے لیے جھکا ہی تھا کہ معتضد نے اپنے ہاتھ سے اسے اپنے سامنے کھڑا کر لیا اور حیرت سے اس کی ان بے پناہ آنکھوں میں دیکھا جن میں دیکھنے سے لگتا تھا کہ آدمی ان میں ڈوب رہا ہے۔ سحر کرتی

ہوئی مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ بہت کچھ جانتی ہوئی اور پھر بھی دھلی دھلی معصوم نگاہیں۔

"کیا تم اس سے پہلے ایسے گھوڑے پر سوار ہوئے ہو؟" اس نے سنہری ایال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"امیر المومنین یہ اس درسگاہ میں میرا پہلا سال ہے۔" حسین نے ادب سے سر جھکا کر جواب دیا۔

معتضد حیران ہوا۔

"کیا تم کسی اور گھوڑے پر سوار ہو سکتے ہو؟" اس کی آنکھوں میں دلیری کے لیے تحسین تھی اور تجسس بھی۔

حسین نے سرخم کیا تو یہ اس کا امتحان تھا۔ آزمائش۔ تستر میں گزرے ہوئے ماہ و سال شیخ کامل کی نظرِ کرم سب اس کے ساتھیوں کی طرح جمع ہو گئے۔ ہمت بندھاتے ہوئے، بلند و بالا اور سرکش گھوڑا لایا گیا۔ ساری نگاہیں حسین پر مرکوز تھیں اور حسین کی نگاہ کسی اور پر تھی۔ ملتجی بھی نہیں صرف منتظر۔ وہ امیدوار اور یقینِ کامل کے ساتھ کھڑا تھا۔ جیسے کھلنڈرے لڑکوں کی ٹولی میں آن پھنسا ہو۔ اس کی پیشانی پر شکن تک نہ تھی۔ وہ خوفزدہ نہ تھا اور آنے والوں کو یہی بات پریشان کر رہی تھی۔ مدرس دل ہی دل میں اس کے لیے دعا کر رہے تھے۔

پھر سارا راستہ ایک قدم ساری نگاہیں دم بخود اور غضبناک جانور پالتو کتّے کی طرح جو خانہ بدوشوں کے قافلوں کے عقب میں دم دبائے چلتے ہیں، اس کے سامنے بے ضرر تھا اور حسین نہ ہی پُر غرور اور نہ ہی فاتح، صرف خدا کے احسان کا پروردہ ناظر۔ وہ اسمِ اعظم بار بار اس کی رگوں میں خون کی روانی کے ساتھ اس کی رگِ جاں، جان کی روشنی روح میں اَن سنے نغمے کی طرح تھا۔ الست بربّکم قالو بلیٰ۔

محبت کا کبھی نہ ختم ہونے والا نغمہ جو عرش فرش اردگرد ایستادہ لوگوں کے دلوں پر مادی اور غیر مادی شے میں جاری و ساری تھا۔ محبت جو فاتح عالم ہے اور دنیا جو بس ایک قدم ہے۔ ایک جست، دنیادار بننے کی مشقت کتنی مضحکہ خیز ہے۔ کیا اس کی تربیتِ نفس ہو چکی تھی؟ خلافتیں، بادشاہتیں، شورشیں، جدوجہد اس سب کی ماہیت کیا تھی؟ خالقِ کُل نے کتنے تماشے بنائے تھے۔ سب سے بڑا تماشا تو انسان تھا کہ یزدان کو کمند

میں لانا چاہتا تھا۔ ہمتِ مردانہ مضحکہ خیز!

مگر اغول مضحکہ نہ تھی۔ وہ تو تھی کہ اس کی ہستی کو تہس نہس کرے۔ اس کے انہماک کو درہم برہم کرے۔ اس کے اندر روشن آگ کو لپکتے ہوئے شعلوں میں بدل دے۔ محبت کا نغمہ اس کی وجہ سے تھا۔ اسم اعظم کا ساز اس کے اندر منجمد تھا۔ جیسے برف باری میں ہر شے جہاں ہے، وہاں پر ہوتی ہے۔ پھر وہ نام اسے طوفان سے آشنا کرتا۔ موت کی مانند زبردست شور قیامت بنا اور سیاہ گھٹاؤں کے اندھیرے کی طرح اس پر چھا گیا۔ وہ ایک لمحہ جب اس کی آنکھوں نے ان آنکھوں میں جھانکا تھا۔ گزری اور آنے والی قیامتوں کی تفسیر بنا۔

مرغزاروں کی قمریو
میں اُس بوجھ تلے اسیر ہوں جو تم نے مجھ پر رکھا
عشق کے عذاب کو برداشت کرنا نوشتۂ تقدیر کو مٹانا
کون کر سکتا ہے
غمِ عشق اور سوز نہاں دینے والے
اے کاش تیماردار بھی ہوتے
اس کی بے رخی نے میرا دل پارہ پارہ کر دیا
ہاں مرغزاروں کی قمریو
میں عشق کا اسیر ہوں

اس کے دل کی مسیحائی کون کرے گا کہ وہ اس مکمل محبت کی گھڑی میں پھر اس کے دل میں در آئی تھی۔ وہ کبھی اس پر فتح نہ پا سکے گا۔ کبھی اپنی اسیری سے رہائی کی طرف ایک جست ایک قدم میں جا نہ سکے گا۔ کیا اسے تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہیں تو ہو گی۔ اپنے باطن کی دھندلائی ہوئی آنکھ سے وہ اسے ڈھونڈے گا۔ کمزور بینائی والی اس کے اندرون کی آنکھ۔

معتضد نے ایک لمبی خاموشی کے بعد جو ہزاروں سالوں پر محیط تھی، کہا "میں چاہتا ہوں، اس نوجوان کو دربار خلافت میں کوئی نہایت عمدہ عہدہ دیا جائے۔ اسے ہمارے قریب رکھا جائے۔ اس کے فرائض کا ہم پھر تعین کریں گے۔"

وہ جانے کے لیے مڑا، رُکا، پھر چلا، پھر حسین کی طرف آیا۔

تم پر خدا کی خاص رحمت ہے۔ میں اس کے لیے تمہیں مبارک دیتا ہوں۔

حسین نے سر جھکا لیا۔

نسطوری عیسائیوں کے قریے دوحرقہ میں جہاں کلیساؤں کی تعداد زیادہ تھی، خصوصی عبادت کی گئی۔ شادیانے بجائے گئے۔ اس قریے کی خوش بختی تھی کہ وہاں رہنے والا ایک نوجوان خلیفۂ وقت کا پسندیدہ تھا۔ انہوں نے مدرسہ میں اپنا نہایت قیمتی وقت گزارا تھا۔ اپنا خاص گھوڑا اس کو سواری کے لیے عنایت کیا تھا، وہ کتنے مہربان تھے۔

دوحرقہ کے مدرسہ کو امیر المومنین کے حکم سے ایک بڑی فوجی چھاؤنی میں تبدیل کرنے کے احکامات صادر کردیئے گئے اور مدرس اعلیٰ کو اس کا سربراہ بنادیا گیا۔

حسین پر خود اپنا راز آشکارا ہو رہا تھا۔ جیسے صبح کاذب میں سفیدی کی ایک موہوم لکیر دن کے آنے کی خبر دے۔

دو حرقہ سے وہ منصور کے ہمراہ بیضا آیا تھا۔ وہ ساری مانوس چیزیں جو سرائے کے ضمن میں اس نے اپنے بچپن میں دیکھی تھیں، ابھی تک وہیں تھیں۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وقت ٹھہرا ہوا تھا اور بستی کی آوازوں، خوشبوؤں میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بہمن کے ان دنوں میں پرندے ایسے چہچہاتے تھے جیسے احسان کا بوجھ اتار رہے ہوں۔ نیند سے بوجھل دبی دبی آوازیں خوشی کی چہکاروں کی جگہ ڈال ڈال پُھدکنا اور مل کر شور مچانا جیسے جھگڑالو قبیلہ ہو موقوف۔ دشتِ سُوس کی طرف سے بچ کرنے والی ہوائیں چلتی ہیں اور گاہ گاہ برف گرتی ہے۔ اس انتہائی شدید موسم میں آگ بہت مزہ دیتی ہے۔ درمیان کے کمرے میں الاؤ کے سے ڈھیر جلتے ہوئے مظہرِ زندگی، راحت بخش سکون اور طمانیت، قابل پرستش بستی کے لوگ اس سے ملنے، دیکھنے کے لیے آرہے تھے۔ اس کے ماموں کی بیٹیاں چھوٹی اور بڑی نہایت خوش گھوم رہی تھیں۔ ایک تقریب کا سا سماں تھا۔ محبت کی گہما گہمی اور شوخی۔ باتیں اور حالات اور ذرا ذرا سے واقعے، المیے اور مسرتیں وہ سب کے لیے باعث فخر تھا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ دارالخلافہ روانہ ہونے والا تھا۔ ہو سکتا ہے وہاں جا کر وہ سب کو بھول جائے۔ دربار، بڑا شہر، اخلاق عادات، آداب رکھ رکھاؤ۔ منصور اس اعزاز پر مسرور ضرور تھا مگر ایک خوشی وہ بھی تو ہوتی ہے جو آدمی کے جی کے اندر سے نکلتی ہے۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ ایسے مکمل وقت میں اس کو کیا چاہیے تھا؟

جب رات بھیگ گئی، مہمان سو گئے۔ روشنیاں بجھا دی گئیں تو حسین نے پوچھا "میں دادا کے اس آتش کدے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں دادا کی خوشبو اپنے گرد

محسوس کرتا ہوں۔"

منصور نے کمرے میں قالینوں کے نقش و نگار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "جانِ پدر! اب رات گہری ہو گئی ہے، پھر کسی وقت چلے جانا۔"

حسین نے کہا "نہیں، مَیں ابھی اسی وقت وہاں جانا چاہتا ہوں۔ آدمی کے پاس ہوتا ہی کیا ہے سوائے خوشبو کے۔" منصور دل گرفتہ سا بجھے ہوئے الاؤ کے پاس بیٹھا رہا جس میں کوئی چنگاری سفید راکھ کا پردہ اٹھا کر جھانکتی۔ بجھی ہوئی آگ میں سے صرف یہی راکھ کا دل رکھنے کو مسکراتی۔ مسکراہٹ اور خوشبو، مخّی کی موجودگی کو صرف حسین نے کیوں محسوس کیا۔ اس نے کیوں یہ نہیں جانا کہ ایک عمر گزارنے کے بعد روحیں کبھی کبھار اپنے مسکنوں کو دیکھنے آیا کرتی ہیں۔ مکینوں کو چاہتیں بانٹتی ہیں۔ یاد کے لہریئے میں رنگ بھرتی ہیں۔ جو زندہ ہیں، وہ گزر رہے ہیں، جو گزر گئے ہیں، وہ اب کہیں نہیں جائیں گے۔ موت ان کے لیے اب نہیں ہے۔ اپنی افادیت کھو چکی ہے۔ ایک قدم اور جیسے پہاڑے کی اوٹ سے ایک موڑ سے نکلو تو دور تک پھیلی وادیاں ہوں۔ سرسبز اور گنگناتے چشموں سے سیراب ہوتی ہوئیں۔ اب ان کے لیے خوف کی کیفیت اور حزب سب کچھ ختم ہو گیا۔ وہ نظروں سے اوجھل تو ہیں مگر اس بیکراں کائنات کا حصہ ہیں۔ وقت پر اور فاصلے پر ان کا تصرف ہے اور اس کے جی میں موت کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ مقید سے بیکراں بننے کی فضا میں آزاد گھومنے کی۔ موت کی زندگی بخش خواہش لا متناہی لاثانی عظیم خواہش۔

حسین واپس آکر قالین کے حاشیے پر بیٹھ گیا۔ کچھ کہے بنا، خاموش افسردہ۔ اچانک وہ لمحہ کہیں سے آن دھمکا تھا وہ اور منصور گاڑی لے کر واپس آئے تو مخّی نہیں تھا۔ وہ گاڑی جو کسی ہندی سوداگر سے خریدی گئی تھی، بیلوں اور پردوں والا رتھ اور صورتیں جو ابھی نکل کر باہر آئیں گی، پھر کرشن کہیں سے کسی کنج میں سے برآمد ہوں گے۔ نیلے بدن والے مرلی کی تان والے کنہیا اور وہ ان گوپیوں کے ساتھ راس رچائیں گے۔ کاہنا کی مُرلی کی تان پر ساری دنیا ناچتی ہے۔ اس دھن کو سن کر مدہوشی طاری ہوتی ہے اور اس اندر کے کمرے میں جہاں کبھی آتش فروزاں رہتی تھی، اب مکمل اندھیرا تھا۔ جیسے اس پر بھی مدہوشی طاری ہو۔ دادا کی یاد میں اسے ہمیشہ جلائے رکھنا چاہیے تھا۔ یاد

جہنم ہی نہیں جنّت بھی ہے۔

''تمہیں دادا یاد آ رہے ہوں گے؟'' منصور نے بالآخر پوچھا۔

''آپ نے تو ان کی یاد کو مٹا دیا ہے۔ رہنے ہی کہاں دیا ہے؟'' حسین نے آہستہ آہستہ کہا۔

منصور بڑی پھیکی ہنسی ہنسا۔ ''یاد تو یہاں ہوتی ہے۔'' اس نے سینے کی طرف اشارہ کیا۔

''چیزوں کی اپنی عصمت ہوتی ہے۔'' حسین نے کہا۔

''جب میں ایک یقین سے دستبردار ہو گیا ہوں تو اس کو برقرار رکھنا بھی نہیں چاہتا۔'' منصور نے کہا۔

''میں اس قطعیت کے خلاف ہوں، وہ دادا کا مسلک تھا۔ یہ سرائے ان کی ہے۔ یہ ان کا مسلک و مولد ہے۔ آثار مٹا دینے سے چیزیں مٹ نہیں جایا کرتیں۔ دلوں میں زندہ رہتی ہیں۔ ہم اپنے خون کو اپنی رگوں سے کیسے الٹ دیں گے۔ ہم ان امانتوں کو بہتر صورت تو دے سکتے ہیں، جھٹلا نہیں سکتے۔'' وہ سانس لینے کو رکا۔ ''سارے مذاہب خدا کی عظمت و بزرگی پر دلالت کرتے اور گواہی دیتے ہیں۔ آگ خدا کی ایک عظمت ہے مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنی ذرا سی فروگزاشت کا اتنا بُرا منالو گے۔'' منصور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''پدرِ محترم! میں بُرا ماننے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ صرف اس بات سے مجھے تکلیف پہنچی ہے۔'' وہ بھی اٹھا۔ ''چلو اس آتش کو تمہارے دادا کی یاد میں پھر فروزاں کریں۔'' منصور نے بیٹے کا ہاتھ پکڑا۔ ''برزِ سواہ وہاں ہے۔'' حسین نے سر جھکا کر کہا۔

منصور دیر تک اپنے بیٹے کی طرف دیکھتا رہا جو اس کے لیے ایک معمّہ سے کم نہیں تھا۔ جسے کلامِ پاک سے عشق تھا جو اپنی عبادتوں، ریاضتوں، مجاہدوں میں غلو کرتا تھا۔ جو نہایت نیک دل اور پاک باز تھا اور جس کی شاعری لو دیتے ہوئے جذبات لاوے کی طرح آگ پھینکتے ہوئے خیالات اور نغمے سے عبارت تھی۔

رات ایک پہر باقی رہی ہو گی جب سرائے کا بڑا دروازہ زور زور سے پیٹا گیا۔ منصور نوافل میں مصروف اور اپنے پروردگار کے حضور جھکا ہوا اپنی جان کی ساری

پکاروں سے اپنی خاکساری کی ساری طاقتوں سے اپنے جذبوں کی ساری شدت سے اپنی سوچ کی ساری عظمتوں سے اپنی جبینِ نیاز کے پر شوق سجدوں سے ایک سجدے کی قبولیت کی دعا کر رہا تھا۔ اس بے پناہ خاموشی میں اس کا دل بیدار اور آنکھیں دجلہ و فرات تھیں۔ بارِ الٰہی میری خاموشی کو زبان دے۔ میری عاجزی کو میری دعا کو سن۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والا مکالمہ جو اس کی جان کو کبھی کبھار عطا ہوتا تھا۔ قوتِ گویائی کے بنا لفظوں کے الٹ پھیر سے ماوراً وہ منتظر رہتا تھا۔

حبشی غلام نے پٹ کھولا تو طوفان کے طاقتور جھونکنے کے ساتھ سردی اور دشتِ سُوس کا خشک غبار اور آبِ ذر کی نمی سے بھری جھاڑیوں اور روئیدگی اور بستی کے باغوں برف اور صحن میں سرِ شام ختم ہونے والی دعوت کی بہاری خوشبو ایک ساتھ در آئے۔

آقائے رازی کنیزوں کے ایک غول کے ساتھ اُترے ہیں۔

منصور نے کردستانی اُون کا نرم جبّہ اپنے گرد لپیٹا اور دالان میں نکلا۔ اسے آقائے رازی سے ملے زمانہ ہو گیا تھا۔

منصور نے خوش آمدید کہہ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ اس سے لپٹ گیا۔

کنیزیں، محّمی کی آتش فروزاں سے فیض یاب ہونے کے لیے جب نیچے جا چکیں تو وہ دونوں دالان میں ہو بیٹھے۔ تندی و تیزی شوریدہ سری اور ہڈیوں کا گودا جما دینے والی برف بار ہوا کا زور کچھ کم ہوا تھا۔ قہوے کے فنجان میں سے خوشگوار بھاپ نکل کر بنا جھکے اور روشنی میں بنا دائیں بائیں لرزے اور کانپے سیدھی اُٹھ رہی تھی۔

"دنیا کی شاہراہوں پر گھومتے ہوئے مزرع گلاب تک آپ پہنچ ہی گئے۔" منصور نے سادگی سے کہا۔

آقائے رازی نے قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا۔ "آپ کیا سمجھے ہیں؟"

"یہی کہ آخر آپ کی تلاش بار آور ہوئی۔" منصور نے جیسے اسے یاد دلایا۔

"برادرم تلاش کا ایک عجیب فلسفہ ہے اور یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ آپ ایک شے تک پہنچتے ہیں کہ اس سے آگے کی منزل کا شوق آپ کو اُچک لیتا ہے۔ آگے

اور آگے رواں دواں بھاگتے رہنا جیسے سرابوں کی طرف بڑھتے رہنا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟'' آقائے رازی ایک دم خاموش ہو گیا۔

دونوں چپ چاپ فنجانوں میں سے جُرعہ جُرعہ قہوہ پیتے رہے۔ پھر اذانیں سنائی دیں۔ عرش و فرش کو بیک وقت چھوتی ہوئی صدا مکان وزمان سے بلند۔

دلوں کے دروازوں کو ہولے ہولے دھکیلتی ہوئی۔

دماغ کو سکون بخشتی ہوئی بیدار کرتی ہوئی۔

روحوں کو میثاقِ ازل کا فراموش عہد یاد دلاتی ہوئی۔

انسانوں سے اس کی محبت کا ثبوت کہ وہ اولادِ آدم کو اب بھی یاد رکھے ہوئے ہے اور سمجھتا ہے کہ جن ناتواں ذرّوں کو اس نے خود حسن جاودانی عطا کیا ہے، اس کی چمک ماند نہ پڑنے پائے۔

نماز کے بعد آقائے رازی نے کہا ''برادرم! میری تلاش ابھی جاری ہے۔ گو مصر میں رقصاں درویشوں کی دعوت نے جو نتائج پیدا کیے ہیں، وہ آلِ عباس کے لیے نیک فال نہیں ہیں اور آلِ عباس کا دائرہ اختیار اب سکڑ رہا ہے۔ اندلس کی مغربی خلافت شہنشاہیت بن گئی ہے جو یورپ کے بحرِ ظلمات کے لیے نور کا مینارہ ہے اور خود ہمارے آس پاس بادشاہتیں ریگستان میں برف باری کے بعد کی روئیدگی کی طرح اُگ آئی ہیں۔ میری اپنی آرزو ایک مضبوط مرکز کی ہے اور میری ساری دعائیں اور دل کی تمنائیں خلیفہ معتضد کے ساتھ ہیں۔ اگر خلافت کا مردِ بیمار اب صحت کی طرف لوٹ آئے تو آئندہ کے لیے اسلام کو استحکام نصیب ہو گا۔''

منصور نے کہا ''خلیفہ نہایت پُرجوش اور دانشمند ہے۔ جوہر شناس ہے۔''

''صرف یہی سب کافی نہیں، اس کو بے پناہ طاقت اور مضبوط ارادے کے ساتھ اچھے مشیروں اور بے لوث دوستوں کی بھی ضرورت ہے جو اسے میسّر نہیں ہیں۔'' رازی نے کہا۔

''قحط الرجال تو نہیں ہے۔'' منصور نے کہا۔

''ایک طرح سے تو ہے کیونکہ خلیفہ کے گرد ترکوں کا گھیرا ہے جن کا دربار پر اثر ورسوخ یہودی اور نصرانی طبیبوں اور فلسفیوں کی وجہ سے ہے۔ ہاشمی جن کو خلافت سے

ہمدردی ہو سکتی ہے، راندۂ درگاہ ہیں اور اب ان کا اجتماع مغرب میں ہو رہا ہے جہاں فاطمی حکومت قائم ہو کر رہے گی اور وہ مذہباً اسماعیلی ہیں۔ میں ایرانی نژاد ہوں اور متعصب بھی نہیں، مگر دعا کرتا ہوں کہ عربی النسل لوگ دربار میں مضبوط ہوں تاکہ اپنے مفاد کی وجہ سے وہ سلطنت کو بکھیرنے نہ دیں۔" وہ چپ ہو گیا اور دیر تک سوچتا ہوا خاموش رہا۔

"اصل بات عرب و عجم کی نہیں، آقائے رازی" منصور نے کہا۔ "میرا خیال ہے اسلام سے محبت اور رسولِ خدا کی ذات سے عشق کافی ہے۔"

"مگر ہر داعی یہ کہتا ہے کہ وہ اپنے عشق میں استوار ہے اور ہر خود مختار صوبے کا حاکم روحِ اسلام کا امین بنتا ہے۔ اس سے انفرادی طور پر تو طاقت ہے مگر اجتماعی زور گھٹتا ہے۔ جیسے آپ رودِ کارواں کو پُر آب اور وسیع و عریض نہروں میں تقسیم کر دیں۔" رازی نے بات ختم کی۔

"منبع تو پھر بھی رودِ کاروں ہی رہے گا۔ نہروں کی آبیاری تو وہیں سے ہو گی۔" منصور پُر امید تھا۔

"نہیں بخدا نہیں، یہی تو سب سے بڑا خطرہ اور عذاب ہے۔" رازی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"آپ بہت مضطرب ہیں، کیا کسی بڑے طوفان کی آمد آمد ہے؟" منصور نے پوچھا۔

باہر سورج دبیز بادلوں کے کناروں کو رنگ دے رہا تھا اور ہوا اپنی چادر کو جھٹکتی سرخی کے ذرّوں کو آفتابوں کی طرح چمکا رہی تھی۔ برف پر قدم دھرتی وہ رقص کے چکروں میں گھومتی بجلی کا لہریا کوڑا لہراتی اپنی کمر کو لچکاتی اور سر کو جھکا کر اسے دوبارہ بلند کرتی درباری رقاصہ کی طرح اس کے پاؤں بے آواز ہی دائرے بدل دیتے۔

حسین کو دیکھ کر آقائے رازی اسے دیکھتا رہ گیا۔

یہ جوان رعنا منصور کا بیٹا محمی کا پوتا تھا۔ اس کے لو دیتے ہوئے سراپے میں کیا تھا کہ دل اسے دیکھ کر بے اختیار ہو گیا۔ محبت سے بھر گیا۔ جیسے نرم جھونکوں کی خوشبو مشامِ جان کو معطر کرے۔ مؤدب دو زانو قالین کے حاشیے پر بیٹھے اس جوان ہوتے

لڑکے کی نگاہ میں مسخر کرنے کی قوت یقیناً ہوگی کہ وہ اس کے لیے دعا گو تھا اور اس سے مخاطب ہونا چاہتا تھا۔

منصور نے دو حرقہ کا چھاؤنی بننے اور حسین کے دربار کے لیے منتخب کیے جانے کا مختصر واقعہ سنایا۔ رازی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ اظہارِ خوشی نہ مبارک باد کا ایک لفظ۔

منتظر اور افسردہ منصور نے بالآخر کہا۔ ''آقائے رازی میں مہمانوں کی خیریت دریافت کروں۔'' اور وہ اندرونی دالانوں کی طرف نکل گیا۔

بہت دیر کے بعد آقائے رازی نے کہا۔ ''برخوردار! کیا تم دربار سے منسلک ہونا پسند کرتے ہو؟ دربار ایک الگ دنیا ہے۔ ایک تاریک سمندر جہاں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہیں۔ سیاست کی بساط پر نووارد کے لیے شکست کا امکان زیادہ اور جیت کے مواقع کم ہوتے ہیں، بہت ہی کم۔ اسلام کے سوا وہاں سب کچھ ہے۔''

''کیا تقدیریں بدلی نہیں جا سکتیں۔'' حسین نے بڑے ادب سے کہا۔

رازی نے بہت غور سے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اس میں جان کا زیاں ہوتا ہے اور وقت کا بھی۔''

''کیا حالات اتنے مخدوش ہیں؟'' حسین نے پھر پوچھا۔

''بظاہر سب ٹھیک ہے، ہوتا ہے، رہے گا مگر درونِ خانہ اتنی بہت سازشیں اور ریشہ دوانیاں ہیں۔ لوگوں کے اپنے مفاد، دولت کی دوڑ، پہلی خلافتوں کی سیاسی غلطیاں، داد و دہش کی زیادتی یا کمی، آزادروی، شراب و شعر سے محبت، راگ رنگ، شخصی اختیارات کی افزائش، اتنے بڑے جال میں یہ سب گرفتار ہیں کہ مجھے اس کے خیال سے ہی خوف آتا ہے۔'' رازی پھر پریشان ہو رہا تھا۔ ''آپ خود سیاست میں شریک کیوں نہیں ہوتے؟''

''مَیں مُشک نافوں اور ریشم کا سوداگر ہوں۔ ملک ملک گھومتا اور سیر کرتا ہوں۔ مختلف لوگوں سے ملنا اور سیاست میرا موضوعِ سخن رہتا ہے مگر اس سیرِ دنیا کو مَیں کسی شے کے بدلے دینا نہیں چاہتا۔ اس سے ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا۔ اتنی حسین اور بے پناہ

چیزیں کائنات میں ہیں کہ ان نارسائیوں کی جو دربار کا شیوہ ہے، میری زندگی میں کہاں گنجائش ہے۔"

"بظاہر دربار میں ترقی کے مواقع ہوتے ہیں، اس لیے بہتری اور نیکی کے بھی زیادہ امکان ہیں۔" حسین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"دریا میں منافع تو بے شمار ہوتا ہے مگر عافیت کنارے پر ہے۔" رازی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جان کازیاں" حسین نے سوچا اور جی ہی جی میں ہنسا۔

جب تمہیں سلامِ محبت پہنچے تو
محبت کے سلام کا جواب تو دو
اور سلامِ محبت کا جواب ملنا چاہیے
ان کے کارواں نے رختِ سفر باندھا جب رات نے اپنے سارے پردے گرا دیئے
مجھ پر نظرِ التفات کرو

وہ ہنسی اور بجلی کے لہریئے کی سی دانتوں کی چمک نے میرے غم کے نہاں خانے میں جھانکا۔ اسے روشن کیا۔ میں اس کے دل میں ہوں، یہ کافی نہیں کہ وہ مجھے دیکھ لیتا ہے۔

اغول کو وہ کبھی نہیں بھلا سکے گا۔ دربار میں ٹھہرنا اور منتظر رہنا۔ سفر کرتے رہنے اور ہر لحظہ ناممکن سے ناقابل حصول سے ملنے کے امکانات۔ سفر کرنا اور ہواؤں کی طرح دنیا کے کناروں تک گھومنا۔ سوداگر بننے میں سود و زیاں ہے۔ حاصل سے محبت ہے۔ سب کچھ لٹا دینے اور بدلے میں کچھ نہ چاہنے میں کتنا مزہ ہے۔ کبھی کبھار یہ دل جو جل اٹھتا ہے جیسے خس و خاشاک کو شعلے کا قرب حاصل ہو جائے۔ آخر یہ کیا ہے۔ وہ کیوں اغول کو بھلا نہیں سکتا؟ جب وہ سونے کے لیے لیٹتا تو سنہری بالوں کا دھارا جس میں زرد چاندنی گندھی ہوتی اس پر گرنے لگتا۔ یہاں تک کہ وہ بحرِ ذخار کی طرح اسے ڈھانپ لیتا۔ موجیں اور لہریں اسے ایک تنکے کی طرح پٹختیں، اٹھاتیں، کبھی جھولا جھلاتیں، یہاں تک کہ چھوٹے کتے کے بالوں میں سسکیاں لیتی رات مدہوش ہو جاتی اور وہ سو جاتا۔

وہ آزاد ہونا چاہتا تھا۔

قافلے ایک جگہ سے دوسری جگہ رواں رہتے تھے۔

لُٹے ہوئے کاروانوں کا مالِ غنیمت بھی کہیں بکتا تھا۔

حسین نے سوچا وہ کیوں نہ سفر کرے اور اپنا نصیب آزمائے۔

منصور اور آقائے رازی دونوں واپس آئے تو اسے ایک قالین کے پاس دوزانو پایا۔ مستعد اور ہوشیار۔

برادرم میَں نے ان کے لیے جو دیا ہے، سو دیا ہے اور چونکہ یہ راہبائیں ہیں، میں چاہتا ہوں انہیں نصیبین پہنچادوں اور خود اپنے راہ جاؤں۔ کیا کوئی کارواں یہاں سے نصیبین جانے والا نہیں ہوگا؟

"آج کل شاہراہیں خاموش ہیں۔ قافلے کم ہی کم ایسے راستوں پر چلتے ہیں جہاں انہیں دوسرے قافلوں سے ملنے کا امکان نہ ہو۔ ہو سکتا ہے ایک دو روز میں کوئی بڑا کارواں آہی جائے۔" منصور نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

بادل دھوئیں کے مرغولے چکروں میں اوپر ہی اوپر چڑھ رہے تھے۔ رات کی برفباری کے بعد سورج نکلا اور پھر بوندیں پڑنے لگیں۔ آسمان نظروں سے پوشیدہ ہو گیا اور اندھیرے کے ساتھ جو مارِ سیاہ کی صورت بستی کے باغوں پر جھکا ہوا تھا، گھروں میں رات ہو گئی۔ پرندے بے چین ہو کر اپنی لمبی اڑانوں سے واپس پلٹنے کی کوئی صورت نہ پا کر چیختے چلاتے پتوں میں چھپنے لگے اور زور زور سے بولنے لگے جیسے کوئی آفت آنے والی ہو۔ ایک دم بوندیں اور اولے چاروں طرف یورش کر کے آنے والی فوجوں کی طرح برسنے لگے۔

آقائے رازی نے کہا "ہماری بدقسمتی، اب راستے نہریں بن جائیں گے اور روانگی نہایت مشکل ہو جائے گی۔ آپ یہاں پر امن و حفاظت سے ہیں۔ یہ آپ کا گھر ہے۔" منصور نے محبت سے جواب دیا۔

"نہیں برادرم! میں تو اپنی منزل کا سوچ رہا ہوں۔ سردی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اگر برفباری اور طوفان یونہی رہے تو راستے بند ہو جائیں گے۔" رازی نے بے صبری سے بارش کو دیکھتے اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ حسین نے نہایت دلچسپی اور

آنکھوں میں ہنسی لیے اس سوداگر کو دیکھا جو سیرِ جہاں پر فخر کرتا تھا مگر خطرات سے گھبراتا تھا۔ دلیر تو تھا مگر حوصلہ مند نہیں تھا۔ یقیناً اس نے برف کا طوفان اور بارش پہلی بار تو نہیں دیکھے ہوں گے۔ ایک راستہ آدمی اپنے لیے منتخب کرتا ہے۔ پھر اس کی دشواریوں سے گھبرانا کیسا؟ آدمی کی ممکنات اور برداشت کا اسے خود کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ اتنا کم عمر تو نہیں تھا مگر اس نے پرامن وقت گزارا تھا۔ صومعہ اور اسباق، دو حرقہ اور تھکا دینے والی مشقتیں۔ اب تک اس نے ایک گنبد میں رہ کر لڑکپن سے جوانی کا سفر کیا تھا اور اسے اپنے آپ کی آزمائش کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ اپنی آزمائش بہر حال ضروری تھی۔ اپنے ساتھ مصالحت سے تو وقت گزرا تھا، اب جنگ بھی ہونا چاہیے۔

اغول کی یاد اور اس کا عشق بھی اپنے ساتھ محبت کی دلیل تھا۔ ایک چہرے کی یاد جو دیکھنے پر اچھا لگا اور ذہن پر نقش ہو گیا۔ ہو سکتا ہے اگر اغول اس چاندنی رات میں حوض کے کنارے اسے نہ ملتی، اسے یہ نہ کہتی کہ دوسروں کو دیکھا کرو۔ اگر اسے یہ نہ کہتی کہ "مجھے بھلا نہ سکو۔" اگر وہ مجبور نہ ہوتی اور اپنے مقدر کی بات نہ کرتی تو یہ چاہت جو اس کی جان کو بیماری کی طرح لگ گئی ہے، نہ لگتی۔ سفر کے دوران اس نے اغول کو دیکھا ہی کہاں تھا؟

اسے اپنے آپ سے شدید محبت تھی اور اب بھی اسے اپنے آپ سے محبت تھی۔ اپنا دل اور اپنی جان ہی عزیز تھی۔ اغول کی آخری بات سن کر اس نے ہتھیار پھینک دیئے تھے۔ وہ ایک لبادہ لیے کھڑا تھا اور اغول اس کے خوابوں میں اتر آئی تھی۔ عشق کا "اسیر" اس کا جی چاہا اپنا مضحکہ اڑائے۔ اغول نے اس سے کب کہا تھا کہ وہ اسے چاہے۔ اس کی یاد میں سرگرداں رہے۔ اغول نے تو کچھ چاہا ہی نہیں تھا۔ یہ یکطرفہ غمِ جاناں بے کار۔ اصل میں اسے اس عیش کوشی کی عادت سی ہو گئی تھی۔ غم کی مئے ناب اسے پلائی گئی تھی اور ایک جُرعہ ہی اسے مدہوش کر گیا تھا تو میرا ظرف اتنا کم ہے؟ اُتھلا؟ نہ گہرا نہ پھیلا ہوا بس ایسے ہی جیسے چیونٹی کے لیے ایک پیالہ دریا ہوتا ہے۔

پانی پر حبابوں کے قافلے رواں تھے، خالی پیالے اوندھے۔

تواب اس کا دل بھی اغول کی یاد کے بنا یوں ہوگا، خالی۔ خالی۔

کیا وہ اس ویران دل کو برداشت کر سکے گا۔ اسے لگا جیسے وہ ایک کھنڈر کے کنارے کھڑا شاعر ہے اور محبوب کی بستی کے پاس کھڑا رو رہا ہے۔

"اے رفیقو ٹھہرو تاکہ ہم دخول و حمول کے درمیان سقط اللّویٰ میں اپنے محبوب اور اس کے مکان کی یاد میں رولیں۔"

اسے امراؤالقیس کے قصیدے کا مطلع یاد آیا۔

اور پھر ابنِ معتز کے اشعار

میری آنکھ کو کیا ہو گیا ہے کہ دیکھنے سے چندھیا جاتی ہے
میرے بعد چاندنی بھی اسے نہیں بھاتی

یا

تیز بارش کے بعد اس باغ کے آذریوں پھول ایسے معلوم ہو رہے ہیں جیسے سونے کی تیل رکھنے کی کٹوریاں جن کی تہہ میں خوشبودار مسالے کا گاد بیٹھا ہوا ہو۔

خلیفہ معتضد کا دربار جہاں ابن الرومی کی شاعری میں فکری گہرائی اور تخیل کی برتری یکجا تھی اور جسے بدخواہ اور خونخوار وزیر ابوالحسین قاسم بن عبداللہ نے زہر دے کر مار ڈالا تھا۔ یہ ایسی ریشہ دوانیوں کی سرزمین تھی۔ کیا وہ خوش رہ سکتا تھا؟ سیاست اس کا مزاج نہ تھی اور اب وہ دربار کے آداب واخلاق سیکھنے کے لیے بہت سی عمر گزار چکا تھا۔ دربار کی زندگی جیسے آدمی دریا کے کنارے بیٹھا ہو اور کشتیوں میں سوار لوگوں کو دیکھ رہا ہو جو طمع اور لالچ کے مارے حصولِ زر کے لیے بے قناعت' بے صبر عہدوں اور دولت اور خلیفہ کی نظر کرم کے منتظر ہوں۔ خلافت خود طوفان کی راہ پر تھی۔ طوائف الملوکی اور بدنظمی۔ اس کے باوجود کہ معتضد نے اسے استحکام بخشا تھا مگر رعایا انقلاب چاہتی تھی۔ آل عباس کی بدخواہی میں نہیں اور نہ ہی اہلِ بیت کی محبت میں' بس یونہی۔ یہ سارے نئے فرقوں کے تماشے جو ہو رہے تھے' ان میں سب سے بڑا فتنہ قرمطی تھے جن کی طاقت مجتمع اور ارادے بلند تھے۔ وہ مسلمانوں کے لیے مصیبت کا باعث تھے اور فسق و فجور پھیلانے کا سبب تھے۔

اس نے سوچا آدمی ایک ہی بار پیدا ہوتا ہے۔ ایک ہی بار اپنی پوری قوتوں اور جذبوں کے ساتھ عشق کرتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ وہ عشق سے اور تمناؤں سے اور جاہ کی خواہش سے بلند بھی ہو سکتا ہے۔ گزر سکتا ہے۔

"اغول" اس کے دل میں کسی نے پکارا۔

اغول' اوہ خدا وہ اپنا کیا کرے؟ اس دیوانے جذبے کا کیا کرے۔ اس ایک لمحے کا کیا کرے جس نے اسے گرفتارِ بلا کیا تھا۔ وہ پھر دل ہی دل میں ہنسا۔

میں اپنے مقابلے میں کیسا کمزور ہوں اور کتنا بے بس۔ ہاں وہ خود ہی تو تھا' کوئی دوسرا کہاں تھا۔ دوسرا کبھی کوئی نہیں ہوتا۔ ہاں دشمن جاں تو خود حسین تھا۔ حسین بن منصور جسے خلیفہ وقت نے اپنے حضور طلب کیا تھا۔ جو اپنا دوست نہیں بن سکتا تھا' وہ بھلا کسی اور کا دوست کیسے بن سکے گا۔

بوڑھے قصّہ گو نے سنبانہ کو درست کیا اور اسے کندھے سے لگایا۔ آنکھیں بند کیں اور گایا

جو جاگتا ہے اسے نیند آجاتی ہے
جو بنتا ہے اسے بگڑنا ہوتا ہے
بستیوں کے مقدر میں کھنڈر بننا
اور آدمیوں کے مقدر میں موت ہے
یہ الم کی بات نہیں' کون ہمیشہ رہا ہے

صرف قصے باقی رہ جاتے ہیں اور داستان سننے اور سنانے والوں کے لیے عبرت کی کہانیاں۔

جو جاگتا ہے' اسے نیند آجاتی ہے۔ کون زندہ جاوید ہے سوائے اس کے جسے نہ نیند ہے اور نہ اُونگھ۔

وہ اس گیت کو بار بار دہراتا رہا۔ خود اس کی لَے میں کھویا ہوا' حالانکہ یہ قصّے کا آغاز تھا۔ زرتشتی مغنی محمی کا دوست تھا اور اس کے گزر جانے کے بعد سے کبھی کبھار منصور کے پاس آنکلتا۔ دنوں سرائے میں رہتا۔ برزِ سواہ کو فروزاں کرتا۔ اپنی عاقبت کے لیے دست بدعا ہوتا۔ اس کے پپوٹے آنکھوں پر ڈھلکے ہوئے اور گھنی سفید

بھنویں پپوٹوں کو ڈھانپے تھیں۔ چہرہ جھریوں کے باوجود بہت شاداب تھا جیسے اندرون میں کوئی روشنی اسے چمک عطا کرتی ہو۔ سفید مونچھیں داڑھی سے ملی ہوئیں۔ ہالے کی طرح اس چہرے کو گویا گھیرے میں لیے تھیں۔ ہاتھوں میں رعشہ نہیں تھا اور آواز حیرت انگیز طور پر بلند تھی اور پُرجوش۔ اسے بات کہنے کا سلیقہ تھا جو اس کے سارے سراپے سے مترشح ہوتا تھا۔

حسین نے گیت کے اختتام پر سنبانہ اس کے ہاتھ سے لے کر قریب پڑے ہوئے چھوٹے سے تخت پر رکھ دیا کیونکہ آقائے رازی اور مہمان قالین پر بیٹھے تھے۔ بستی کے بیشتر لوگ قصّہ سننے کے لیے بھیڑ کیے ہوئے تھے۔ گرجتے بادلوں کی وجہ سے لہریئے کے سیاہی کو چیرنے اور کڑک کی وجہ سے جیسے بجلی کہیں نہ کہیں زمین پر گر رہی ہو۔ دل رہ رہ کر کانپ جاتے۔

سیمرغ کے پالے ہوئے سام کے سفید بالوں اور سرخ رنگت والے بیٹے زال کے لیے رودابہ کے دراز گیسوؤں نے یہ سارا ہنگامہ کیا تھا۔ یہ قصّہ آپ سب لوگوں کی توجہ کا طالب ہے۔

کونوں میں چراغ روشن تھے اور دالان کبھی محل بن جاتا جس میں رودابہ تھی۔ سیاہ رات میں زلفوں کی ریشمی سیڑھی۔ اس کے لمبے سیاہ بالوں کا دھارا سا اس کے کندھے سے بہنے لگتا جس کے سہارے وہ پیل تن روئیں وژ پہلوان اپنے مقدر کے لکھے تک پہنچا۔ داستان طراز بوڑھا کبھی روتا اور کبھی ہنستا۔ کبھی گرجتا اور کبھی سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگتا۔ کبھی بال نوچتا اور کبھی اکڑ کر بیٹھ جاتا اور گردن دائیں بائیں گھما کر فخر و مباہات سے اپنے چاروں طرف نظر کرتا اور پھر جھک جاتا اور سینہ کوبی کرتا۔

سننے والے اس داستان طراز کے سحر میں گرفتار تھے۔ جذبات اور خیالات' حالات و واقعات کے منجدھار میں۔ حسین اپنا سر جھٹکتا' کبھی آنکھیں ملتا۔ کچھ اور سوچنے کی کوشش کرتا مگر وہ گرجدار آواز اسے واپس بلاتی' اسے مجمعے میں شامل کر لیتی۔ وہ بے چین ہو کر جیسے بھاگنے کے لیے تیار ہو۔ قصّہ گو نے ایک لمحہ توقف کیا' اس کی طرف بہت گہری نظروں سے دیکھا۔

”محّی کے پوتے حسین دراز زلفوں والی دوشیزاؤں سے بچ کر رہنا۔“

آقائے رازی کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔ لوگ ہنسنے لگے۔ حسین جھینپ کر خاموش اور ساکت بیٹھ گیا۔ دوزانو ہو کر اس نے سر جھکا لیا جیسے ہمہ تن گوش ہو۔

قصّہ گو نے پھر کہا۔ ”وہ ہوش و خرد چھین لینے والیاں تمہاری راہوں سے بھی گزریں گی۔“ وہ بھی آقائے رازی کی طرح ہنسنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کا سفید سر ہنسی کی شدت سے چک پھیریاں کھانے والی گیند کی طرح گھومتا ہوا لگا۔

منصور نے کہا ”محترم عم اس کے لیے اچھی دعا کیجئے۔ کیا عورتیں ہمارے لیے قابلِ عزت نہیں ہوتیں؟“

قصہ گو نے ہنسی روک لی۔ ”کیا عورت کی چاہت اس کی بے عزتی ہے؟ کوئی گھٹیا بات ہے؟ کوئی کمتر شے ہے محّی کے بیٹے؟ جس سیمیں تن کے لیے دل جاگتا ہے' جس کی محبت پسلیوں میں آگ بھرتی ہے جس کی تمنا میں تم اپنا آپ قربان کرتے اور بھول جاتے ہو۔ وہ تمہیں بیدار رکھتی ہے۔ تم اس کے لیے آنسو بہاتے ہو۔ دنیا کی ساری رنگینی' ساری خوشبو اسی ایک جذبے کے دم سے تو ہے۔ محبت کو کبھی کمتر نہ سمجھو بھتیجے۔“

منصور نے کوئی جواب نہ دیا۔ لوگ اس دلچسپ گفتگو کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔ باہر ایک دم شور ہوا۔ دالان گھوم گیا جیسے زلزلہ آیا ہو۔ رعد کی کڑک نے دل دہلا دیئے۔ پھر جانوروں کے ہنگامے' کتوں کے رونے اور اونٹوں کے بلبلانے' گدھوں اور خچروں کے زور زور سے بولنے کی آوازوں سے دالان بھر گیا۔ بجلی صحن کے سب سے سایہ دار شجر کو جلاتی ہوئی عرش سے فرش کو خبر دار کرتی ہوئی کسی اور طرف نکل گئی تھی۔ صاعقہ قہرِ بلا کے بعد قیامت بپا تھی۔ محفل درہم برہم ہو گئی۔

آقائے رازی کے رخصت ہونے کے وقت حسین، سیاوش قصّہ گو کے ساتھ اس کمرے میں تھا جہاں آگ کی چنگاریاں مدھم مدھم بس دکھائی دے رہی تھیں اور برزِ سواہ کے پاس ان دونوں کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔

سیاوش نے کہا ”مَیں نے اس دن جو بات کہی تھی' تم نے اس کا بُرا تو نہیں مانا حسین؟“

"نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔
"تمہیں معلوم ہے جب پھول کھلتا ہے تو اسے دھوپ کے بوسوں کی تپش پہنچتی ہے۔" بوڑھے نے سرگوشی میں کہا۔
"جی۔" حسین نے سر جھکا کر کہا۔
"آدمی کے دل کے پھول کے لیے محبت بھی ایسا شہد آگیں بوسہ ہے۔"
"اگر میسر آجائے تو۔" حسین نے بہت ہولے کہا۔ "آدمی کوشش سے کبھی کسی پر فدا نہیں ہوا۔ آدمی محض اپنی کوشش اور طلب سے خدا سے بھی محبت نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر خدا اس پر اپنی رحمت کرے۔ اپنا یہ بہت بڑا راز اس پر آشکار کرے۔ اسے اپنی طرف بلائے۔ اس کے جی میں اپنی چاہت جگائے۔ عشق اول در دل معشوق پیدا مے شود۔"
سیاوش بغیر کوئی جواب دیے اس کی طرف دیکھتا رہا۔
"تم دربارِ خلافت میں جا رہے ہو؟ میرا مطلب ہے اس اعزاز اور سرفرازی کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہے ہو؟" اس نے بالآخر پوچھا۔
حسین چپ رہا تو اس نے پھر کہا۔ "دربار 'ریشہ دوانیوں' پُراسرار قوتوں 'زمین دوز تحریکوں اور در پردہ سازشوں کی جگہ ہے۔ پھر وہاں طالع آزماؤں کا ہجوم رہتا ہے۔"
"آپ کا خیال ہے مجھے انکار کر دینا چاہیے۔ دربار کی حاضری بالکل غیر ضروری ہے؟" حسین نے سادگی سے پوچھا۔
"نہیں نہیں پوتے! تمہاری طبیعت کی تلوار کو اس سان پر چڑھنا ہی چاہیے۔ اسے صیقل ہونا ہی چاہیے۔"
"کیوں؟" حسین نے بے صبری سے پوچھا۔
"اس لیے کہ تم مقدر کے لکھے کو پورا کر سکو۔" سیاوش نے تقریباً بڑبڑاتے ہوئے کہا۔
"مقدر کا لکھا کیا ہے دادا؟" اس نے جھک کر قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

''وقت سب بھیدوں کو جاننے والا اور انہیں کھولنے والا ہے۔ تم اور میں اور ہم سب یہ ساری کائنات اسی کے تابع ہیں اور پھر بھی آدمی کبھی کبھار صدیوں میں ایک بار وقت سے آگے نکل جاتا ہے۔ وقت پیچھے رہ جاتا ہے۔ وقت اور آدمی آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔''

''کیسے؟'' حسین نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

''کہیں دنیا کے کسی خطے میں کسی گوشے میں پہاڑوں کی بلندیوں سے پرے وادیوں کے گھیرے میں ایک آدمی پیدا ہوتا ہے جو اس وقت کے بہتے دھارے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔'' سیاوش حسین سے زیادہ اپنے آپ سے بات کر رہا تھا۔ ''دھارے کو روک دیتا ہے۔ وقت تھم جاتا ہے۔''

''عجیب بات ہے۔'' حسین نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''پھر کیا ہوتا ہے؟ کیا سب چیزیں ٹھہری رہتی ہیں؟ رک جاتی ہیں؟ سورج اور چاند اور ستارے ان کا کیا ہوتا ہے؟ کیا آدمی خدا سے بھی بڑا ہوتا ہے؟''

''آدمی خدا سے بڑا کہاں ہوتا ہے؟ نہیں پوتے، بس وہ ایسا ہو جاتا ہے۔'' سیاوش کو جیسے ہوش آ گیا ہو۔ ''تم کچھ خیال نہ کرنا بچے، میں بہک جایا کرتا ہوں۔ ایسی باتیں جو سراپردۂ اسرار سے وقت آنے پر ظاہر ہونے والی ہوتی ہیں، مجھے ان کی بھلا کیا خبر ہو سکتی ہے۔'' بڈھے ذہن کی لاف زنی، بہکاوے۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ سر ہلتا ہوا اور جسم مرتعش۔

''دادا آپ مجھے یوں ٹال نہیں سکتے۔ مجھے بتائیں، آخر کون ہے جو وقت کے سیل کو تھام لیتا ہے؟''

''کوئی بھی، کوئی بھی۔'' سیاوش نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ''اتنی بڑی کائنات ہے، کہیں کوئی بھی۔'' حسین نے بجھتی ہوئی دم توڑتی آگ پر پتلی پتلی لکڑیوں کا ایک اور ڈھیر لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ کو تو معلوم ہو جائے گا نا۔ آپ تو اسے جان لیں گے دادا۔ جب ایسا ہو تو مجھے خبردار کر دیجئے گا۔'' سیاوش نے ڈھلکے ہوئے پپوٹوں تلے نیلی جھیلوں کی سی شفاف آنکھوں سے حسین کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ بنا پلکیں جھپکائے، بنا نظریں ہٹائے۔

پتہ نہیں وہ کیا دیکھ رہا تھا' کہاں دیکھ رہا تھا؟ گھبرا کر حسین ہنس پڑا۔

سیاوش نے سوچا' اس کی ہنسی میں کتنی دلکشی ہے۔ دلبرائی کی یہ صفت جس پر اس سے پہلے اس نے غور نہیں کیا تھا۔

یہ ہنسی حسین کو محّمی سے ورثے میں ملی تھی۔ منصور کو اس نے کبھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ عجیب طرح کی نیاز مندی سے گھلتا اور پگھلتا ہوا وہ سراپا۔ سنجیدہ خدا پرست غمناکی کا بوجھ اٹھائے ہوئے نئے مذہب کی روح کو پکڑنے کی کوشش میں تھکا ہوا آتش پرست۔ جو گئے وقتوں کی تلافی کی خاطر اپنی جان کو اذیتیں دیتا تھا۔ نیکی خوشی اور حسن کو سمجھ کے پردوں میں چھپانا جانتا تھا اور اس لیے ان سے ورے رہتا تھا۔ اپنی عبادات کی طاقت سے ان مسائل کو حل کرنا چاہتا تھا جن کو صرف فضلِ ربانی سے پایا جا سکتا ہے۔ پتہ نہیں اسے کیوں یہ معلوم نہیں تھا کہ نیکی اپنے لیے کی جائے تو خود غرضی' دوسروں کے لیے کی جائے تو خدمت خلق اور خدا کی خوشنودی کے لیے کی جائے تو کبھی کبھار ریاکاری کہلاتی ہے اور خوشی بھی ایک ماورائی کیفیت ہے' بدلتی رہتی ہے اور دنیا ایک حالت پر قائم نہیں رہتی اور حسن تو ہر شے میں ہے۔ صرف دیکھنے والی آنکھ چاہیے جو اس کی بے پناہی کو احاطہ کر سکے اور آنکھ سب کچھ احاطہ کہاں کر سکتی ہے؟

آہورا مزدا حسین کی حفاظت کرے۔ سیاوش نے اس کے لیے اپنے جی میں بے کنار محبت محسوس کی اور حسین آگ کی طرف دیکھ رہا تھا جو خوشبو کے مرغولوں میں سرخی میں لپک اور تیزی میں بے مثال تھی۔ جس کی طاقت سمیٹنے' راکھ کرنے' مٹانے میں ان مٹ تھی۔ یہ شعلے لکڑیوں کا شوق بے پروا تھے۔ خوشبو کی طرح اس کے اندر پوشیدہ اور اس کے لپکتے شعلوں کو دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ بھڑکتے ہوئے الاؤ جس کا نشان اس کے ماتھے پر تھا۔ اس نے نشان پر انگلیاں پھیریں' نشان دلربائی جو اسے آگ نے عطا کیا تھا' اسے آگ اگلتے ہوئے پہاڑوں کا تصور دلفریب لگتا تھا۔ بہتا ہوا لاوا۔ اسے آگ سے عشق تھا اور اس لیے اپنے اندر جلتی ہوئی ہر جذبے کو بھسم کرتی ہوئی آتش شوق کو بھی بجھانا نہیں چاہتا تھا۔ کیا کوئی آگ بجھ سکتی ہے؟

"تم بغداد کے لیے کب روانہ ہو رہے ہو حسین؟" سیاوش نے پوچھا۔ "وہاں

بے ہنر آدمی کی کوئی جگہ نہیں۔ گو اب زمانہ بدل گیا ہے اور علوم و فنون کا وہ چرچا نہیں رہا، پھر بھی دربار میں اس کی رسائی آسان ہے جو اپنے اندر قدر دانی کے لیے اوصاف پیدا کرے۔ ذاتی وجاہت اور امیر المومنین کی دعائیں ہی کافی نہیں ہوتیں۔ تم نے اپنے آپ کو کن ہتھیاروں سے مسلح کیا ہے؟"

"میں اپنی تربیت کر رہا ہوں۔ ایسے علوم جو امیر المومنین کی نگاہوں میں قابلِ احترام ہیں۔"

بات کاٹ کر سیاوش نے کہا۔

"پوتے علوم اپنی عزت آپ ہیں' صرف انہیں اپنی نبضوں پر آزمانا اور ان میں دسترس حاصل کرنا' سیاق و سباق سے ان پر نگاہ رکھنا آدمی کو عزت بخشتا ہے۔ ہر مکتبۂ خیال کے آدمی دربار میں جمع ہیں' اس لیے مذاہب کا تقابلی مطالعہ جو مباحث میں تمہارے کام آسکے' تمہیں ان میں طاق ہونا چاہیے۔"

"یہ سب اپنی جگہ مگر میں تو ایک سپاہی کی حیثیت سے جا رہا ہوں۔ خلیفۂ وقت کی علمی صحبتوں میں مَیں صرف ان کے عقب میں کھڑا ہونے والا ہو سکتا ہوں۔ ہاں مجھے سننے' دیکھنے اور سمجھنے کی قوتوں کو سنوارنا چاہیے۔ جیسے گھوڑے کے ایال۔"

"تم ترک سپاہیوں کا مقابلہ کہاں کر سکو گے؟ اپنی ساری دعاؤں کے باوجود تمہارا مستقبل دربار میں مخدوش ہی دکھائی دیتا ہے۔ تم نے دربار کی ایک جھلک تک تو کبھی دیکھی نہیں تھی۔ کیا معلوم ہے سیاست کی بساط پر کون مہرے رکھتا ہے' کون اٹھاتا ہے' کون پٹتا ہے' کون پیٹا جاتا ہے۔ یہ سب ایک بڑے راز کی طرح ہے جسے کوئی نہیں سمجھ پاتا۔ جاہ کی دوڑ اور خلیفہ کے گرد دولت سمیٹنے والوں کا گھیرا تنگ ہے۔ تمہیں معلوم نہیں پوتے تم کیسے سمندر میں اپنی کشتی کھینے جا رہے ہو۔ جہاں ہر طرف بلاؤں کا ڈیرہ ہے۔ میں اس کے باوجود چاہتا ہوں کہ تم وہاں جاؤ۔ دل سے یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم نہ جاؤ۔ تمہاری جوانی بے داغ رہے۔"

سیاوش یک لخت چپ ہو گیا۔

"میرے لیے دعا کیجئے اب کہ مَیں نے وہاں کے بلاوے میں اپنا دل الجھا لیا ہے۔

میرا خیال ہے زیادہ خوفزدہ ہونا بیکار ہے۔" حسین نے مسکراتے ہوئے سیاوش کی طرف دیکھا۔

"دیکھو دیکھو پوتے! تم مجھے غلط سمجھے ہو۔ میں ہرگز تمہیں خوفزدہ نہیں کر رہا مگر تمہارے سیاہ بالوں کے مقابلے میں میرا سفید سر ان سب تفصیلات کا متقاضی تھا۔ میں نے جو دیکھا ہے، تم نے نہیں دیکھا۔ تم خواب دیکھ رہے ہو اور میں خواب بسر کر چکا ہوں، مگر کوئی کسی کے تجربے سے فائدہ نہیں اٹھایا کرتا۔" سیاوش نے سر جھکا لیا۔

"دادا بُرا نہ منائیں۔" حسین نے عاجزی سے کہا۔

سیاوش نے سنبانہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

حسین نے باجا اٹھا کر اسے اپنے قبا کے دامن سے صاف کیا اور جھک کر سیاوش کو پیش کر دیا۔

معبدِ ناہید کے پاس کھنڈروں میں سورج کی روشنی سے دُھلے سفید مرمر کے بُت ہیں۔

میں ستاروں کا پرستار معبد کا متولی اور بہار میں رنگین چراگاہوں کا رکھوالا ہوں۔

صحرا کے غزالوں کا چرواہا منجم اور موبد ہوں۔

میرے تینوں محبوب یکجان ہیں۔

مجھ سے خفا نہ ہوا اے دوست۔ اگر میں بتوں کے گرد گھومنے والے غزالوں کے گیت گاتا ہوں۔

کیونکہ غزال کی گردن، سورج کا چہرہ اور بتوں کے سفید سینے استعارے ہیں۔

اور مسکراتے ہونٹوں کی ہنسی روشنی ہے۔

میں معبدِ ناہید کے پاس روشنی سے دھلے سفید مرمر کے بتوں کا پجاری ہوں۔

"حسین تم یہاں ہو۔" منصور کی آواز سیڑھیوں کے سرے پر سے سنائی دی۔

"جی پدرِ محترم!" حسین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ کو میری ضرورت ہے؟"

"گھوڑوں کا سوداگر آیا ہے۔ میرا خیال تھا تم اپنے لیے پسند کرو تو سواری کے لائق جانور خرید لو۔"

"جاؤ جاؤ" سیاوش نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "مگر دیکھو عربی النسل گھوڑا موزوں رہے گا۔" پھر گھٹنوں پر زور دے کر وہ اٹھا اور حسین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا بھاری پن سے سیڑھیاں چڑھا۔ سرائے کا صحن گھوڑوں کی ہنہناہٹوں' ان کے چمکدار' جوان' مضطرب بے چین جسموں سے بھرا تھا۔

جب قافلہ روانہ ہوا' آغازِ بہار کے دن تھے۔ زمین گھاس اور پھولوں اور ہریالی سے بہشت بنی ہوئی تھی۔ دشتِ سُوس کے نخلستانوں کی ہوا خوشبو سے بھری تھی جس میں خشک ریت کی مہک سی تھی اور سیاہ اور زرد مٹی کا ہلکا سا غبار کبھی کبھار اڑ کر بگولوں میں شامل ہو جاتا جو دشت کے رنگ میں اپنا رقص دکھا رہے تھے۔ چکروں میں گھومتے ہوئے پھولے ہوئے جبّوں کو پہنے جیسے رقصاں درویشوں کا ایک الگ گروہ۔

گھوڑے شروع ہونے والے سفر کی وجہ سے مضطرب تھے اور کھنچی ہوئی باگوں کے باوجود گول گول گھوم رہے تھے۔ یہ چاہتے ہوئے کہ انہیں آزادی ہو اور وہ خون گرم کرنے والی دوڑ میں شریک ہوں۔ ان کے جسم پسینے سے بھیگے ہوں اور وہ اپنی نمائش کریں۔ اونٹوں پر ہودے کسے جا رہے تھے اور خرام کے لیے تیار تھے۔ لمبی گردنوں کو ایک اندازِ جنون سے آگے پیچھے گھماتے ہوئے اپنے گلوں میں پڑی گھنٹیوں کی آواز سنتے ہوئے۔ خچریں اور گدھے بار کیے جانے کی وجہ سے چپ چاپ کھڑے تھے اور سر ہلا کر اپنے چوڑے نتھنوں سے سانس نکالتے اور اندر کھینچتے تھے۔ قافلے کا بازار سمیٹا جا رہا تھا اور بستی کے لوگ جلد جلد دودھ' مکھن' گھی' مرغیاں اور روزمرہ ضرورت کی چیزیں بیچ رہے تھے۔

منصور کا سر جھکا ہوا تھا۔ غلام، حسین کے سیاہ عربی گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ چھوٹی' نتھنے کھلے' گردن دراز' پچھلی ٹانگوں کے پٹھے چوڑے اور لمبے تھے اور فاصلہ طے کرنے کے لیے اس سے موزوں جانور کوئی نہ تھا۔ خود حسین کی کمر میں تیغ اور دائیں ہاتھ میں نیزہ تھا۔ بائیں میں ڈھال اور کمان کمر سے آویزاں تھی۔

وہ ایک جنگجو سپاہی کی شان سے اپنی دو حرقہ میں سیکھی مشقوں کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ تقریباً زرد لبادے میں وہ دوسروں سے نمایاں تھا۔ وہ اپنا آپ آزمانا چاہتا تھا۔

کوچ کا طبل بج گیا۔ منصور نے بیٹے کو سینے سے لگایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تو نہیں' ان کی چمک تھی۔ سیاوش نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''پوتے آہورامزدا تمہاری حفاظت کرے۔ فرامش تمہارا ساتھ دیں۔ بیضا کے لیے تم عزت کا باعث بنو۔ منصور کے لیے فخر اور میرے لیے خوشی کا۔''

حسین نے خوشی سے کہا۔ ''دادا آپ جیسا کہیں گے' ویسا ہی ہو گا۔''

پھر قافلہ پُر شور آوازوں کو سمیٹتا ہوا دلدلوں سے ہٹ کر پہاڑوں کے تنگ دروں کی طرف کوچ کر گیا جہاں سے وہ تقریباً غیر آباد اور بہت کم قابل استعمال چھوٹی چھوٹی شاہراہوں کو چھوتے ہوئے بستوں اور قریوں میں ذرا ذرا ٹھہرتے سامانِ رسد اور ضرورت کی چیزیں خریدتے کنارِ دجلہ نکلیں گے۔ یہ راستہ کم آباد مگر طویل نہیں تھا اور موسم اگر خوشگوار رہے' دن کے وقت سفر کیا جا سکے۔ راہ میں پانی کی قلت نہ ہو تو ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں انہیں بغداد میں ہونا چاہیے۔ اگر راہ میں کہیں قرمطیوں سے آمنا سامنا نہ ہو جائے تو۔

قرمطیوں نے مکتفی باللہ اور خلیفہ معتمد کے وقت میں ایک نہایت زبردست دشمن قوت کے طور پر ابھرنا شروع کیا تھا۔ یہ لوگ شدت سے حملہ کرتے اور امان دینے کے باوجود بچوں اور عورتوں کو بلا تخصیص قتل کر دیتے تھے۔ انہوں نے بستیاں ویران کر دی تھیں اور موت کی آواز بن کر شام اور عراق میں غارت گری کرتے تھے۔ لوگ سفر پر کم نکلتے تھے۔ بڑے بڑے کارواں بنا کر چلتے تھے۔ یوں کاروانِ حیات خوفِ حیات کے باوصف چلتا ہی رہتا ہے۔

معتضد کا جاہ و جلال' عدل و انصاف اور زیرکی رُعب و ہیبتِ عباسی سلطنت کے استحکام کا باعث تھے۔ وہ سفاح کی طرح اپنی بات منوانا اور اپنی سلطنت کی نشاۃ ثانی کرنا چاہتا تھا۔ وہ مصیبت کی پکار سننے والا حاکم اور غیرت و حمیت میں بے مثال تھا۔ دور دراز قلعوں کی کشود اس کے لیے ایک کھیل تھی۔ وہ ناممکن مہموں میں فوج کی قیادت کرتا اور بے مثال جرأت سے فتوحات میں منہمک ہو جاتا۔ وہ جوہر شناس اور نہایت مدبر تھا۔

اس کی ہیبت سے لرزاں رہنے کے باوجود بغداد اقصائے عالم سے آنے والوں کا مرجع تھا۔ ہر رنگ و نسل کے لوگوں کا مجمع دربار میں باریابی کا منتظر رہتا۔ کاروان سراؤں میں رونق رہتی۔ ایک دنیا وہاں جمع ہوتی۔

بغداد کی طرف رواں اس قافلے میں سوداگر تھے جو اپنا مال بغداد کے بازاروں کی شہرت سن کر لیے جاتے تھے۔ انہوں نے دنیا میں گھوم کر تجربہ اور دولت حاصل کی تھی۔ شاہراہوں کے رازدان اور قریوں کی شہرتوں سے واقف تھے۔ مختلف موسموں' زمینوں اور آب و ہوا سے انہیں سب آگاہی رہتی تھی۔ نہایت پر اعتماد اور بے خوف تھے۔ مزاج آشنا اور مشکلوں کا مقابلہ کرنے میں دلیر تھے۔ مطلب بر آری کے لیے فیاض بھی ہو سکتے تھے مگر درہم و دینار کی انہیں بہت فکر رہتی تھی۔

پھر ان کے ہمراہ غلام تھے جو بظاہر خوش مگر دراصل رنجیدہ ہوتے تھے۔ انہیں صرف آزاد ہونے کی شدید آرزو تھی اور یہی خیال ان کی زندگی کا محور تھا۔ وہ خواب لیتے ہوئے، جاگتے ہوئے بے ہوش لوگ تھے۔ ان میں بعض نہایت ہوشیار اور بہت عقلمند تھے۔ اپنے مالک کی خوشنودی کے لیے وہ سامنے کی زمین تک چاٹنے کو تیار تھے۔ مذہب و ملت سے علیحدہ' ان سے اچھا سلوک کیا جاتا تھا مگر اس سے وہ کبھی اندرون دل خوش نہیں ہو سکتے تھے۔

چند خواتین نجفِ اشرف اور کربلائے معلیٰ کی زیارت کے لیے جا رہی تھیں۔ پھر ان کا ارادہ امراء کے گھروں میں ملازمت اختیار کرنے کا بھی تھا۔ یہ جنوبی کوہستان سے آئی تھیں اور ان کی باتوں کو کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا۔ وہ نقابوں سے چہرے چھپائے اکثر لمبی تسبیح پر کچھ پڑھتی تھیں۔ ان کے ہودے آرام دہ اور اونٹ تند اور تیز تھے۔ قافلے میں کچھ معززین خواتین بھی تھیں۔ کسی حاکم کی بیوہ اور بہن تھیں اور جو اپنی جاگیر کی بازیابی کے لیے خلیفۂ وقت سے ملنا ضروری سمجھتی تھیں۔

حکیم' شعبدہ باز' معلم' مبلّغ' قصّہ گو' منجم' لکڑی کا کام کرنے والے' کشتی بان' باورچی سبھی قسم کے لوگوں کا مجمع تھا۔ فوجی سپاہی قسمت آزمائی کے لیے دارالحکومت جا رہے تھے۔ یہ خوابوں کی پرچھائیں میں چلنے والا کارواں تھا جس کا کاروان سالار ایک عجمی یہودی تھا۔

رات کے پہلے پہر کوچ سے قبل مغنی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دور کے ٹیلوں پر محفل جماتا اور گاتا۔ اس کے گلے میں تاثیر تھی اور اس کی آواز بلند تھی اور وہ درباری مغنی بننے کے خواب دیکھ رہا تھا اور ابھی سے اپنے آپ کو تقریباً اسحٰق موصلی کا ہمعصر سمجھتا تھا۔ کہتا تھا کہ مَیں نے کئی راگ ایجاد کیے ہیں مگر جب تک کسی دربار میں ان کی نمائش نہ کر لوں، کسی عام آدمی کو نہیں سناؤں گا۔ سند ملنے کی شرط ہے۔ پھر محفل آرائی ہوگی۔ وہ چلتا تو لباس کے دامن پیچھے گھسٹتے تھے۔ داستان کے شہزادوں کی طرح بننے سنورنے میں لگا رہتا۔ اس کی جیب میں آئینہ ہوتا اور گرد سفر کو اپنے چہرے سے بار بار ایک ریشمی رومال سے جو شاید محبوبہ کا تحفہ ہو، صاف کرتا۔ اس کے ساتھی کمتر اور خوشامد میں لگے رہنے والے آدمی تھے جو اس کے ساتھ دربار میں باریاب ہونے کی سوچ میں تھے۔ یہ سب لوگ دوسروں سے الگ تھلگ رہتے۔ ان کی سواریوں کے ٹٹو بار برداری کے جانوروں کی طرح کمزور اور بدصورت تھے مگر وہ انہیں رستم کا رخش سمجھتے۔

مبلغ کی آواز نہایت پست اور خرخراتی ہوئی تھی جیسے اس کا حلق اندر سے کسی مہلک بیماری کی وجہ سے بند ہو رہا ہو۔ وہ خود بھی نحیف و نزار تھا۔ اپنی تسبیح کے دانے شمار کرتا تھا۔ مذہب کو دوسروں کے دل میں اتارنے والوں کو ظاہری زیبائش سے تو نہیں مگر خستگی سے بچنا چاہیے۔ مذہب کی سطوت و ہیبت اس کے تقدس اور اس کے احترام کا نمائندہ تو ہونا چاہیے۔

راستے میں کاروان سرائیں اس موسم میں بھی تقریباً خالی تھیں اور جب دلدلوں کو پار کر کے وہ الشرقیہ میں پہنچے ہیں تو سب طرف ویرانی تھی۔ کوئی ذی روح تک نہیں تھا۔ لٹیرے ایک دن پہلے اس قریے کو لوٹ کر قتلِ عام کر کے جا چکے تھے۔ بے گور و کفن لاشے کھلے دروازوں سے دکھائی دیتے تھے اور مسجد جہاں پر شاید نمازیوں کا ہجوم یا پناہ لینے چھپنے والوں کا گروہ ہوگا، بُری طرح برباد کی گئی تھی۔ شاید صاحب الزنج کے حبشی غلاموں نے یہاں سے گزر کیا تھا یا فرج بن عثمان کے داعی اسے مثیلِ مسیح اور روح القدس سمجھنے والے اپنا پیغام لائے تھے اور دعوتِ مذہب دے کر گئے تھے۔

پھیل کر چلنے والا کارواں اب سمٹ کر چل رہا تھا۔

کچھ لوگ باری باری پہرہ دیتے تھے۔ دور تک آگے آگے چلتے تاکہ خطرے سے آگاہ کر سکیں۔ خواتین جو شروع میں نہایت کم آمیز تھیں' اب باقی مسافروں سے گھل مل کر بات کرتیں اور خوف نے ان کے ظاہری رکھ رکھاؤ کو عام روش میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان پر ہی کیا منحصر ہے۔ سب چہروں پر ہر وقت خوف وہراس کا سایہ ہوتا۔ اگر جنگلی جانور بھی راستہ کاٹ کر نکل جاتے تو لوگوں کے چہرے زرد ہو جاتے۔

حسین نے منجم سے کہا ''کیا تم اپنے ستاروں کے حساب سے بتا نہیں سکتے کہ کل کیا ہونے والا ہے؟''

''کل تو وہی ہوگا جو مقدر ہوگا۔'' اس نے اپنے اصطرلاب کو کپڑے میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

''تو پھر ستاروں کا علم کیا شے ہے اور تم کس بات کے منجم ہو؟ اگر بات مقدر پر آکر ہی ٹھہرتی ہے تو کسی علم کے بنا بھی وہی ہوگا اور اسے جان لینے سے فائدہ؟'' حسین نے نرمی سے کہا۔

''صاحبزادے مقدر کو بدلنے والا علم ابھی کہیں دریافت نہیں ہوا۔ صرف بزرگوں کی نگاہوں میں یہ طاقت ہوتی ہے۔ کوئی خدا شناس' فطرت شناس' رمز شناس۔''

''تمہیں دعا میں تو یقین ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''پھر؟'' حسین نے کہا۔

''ہر دکھ اور مصیبت سے صرف دعا ہی بچا سکتی ہے۔'' منجم نے مختصراً کہا۔

''یہ کیا ہے؟'' اضطراب اور زائچے وغیرہ کو کپڑے کے باہر سے چھو کر حسین نے کہا۔

''یہ روزی کا بہانہ ہے۔ آدمی کا رزق عمل میں رکھا گیا ہے۔ کچھ نہ کچھ کرنے میں کرتے رہنے میں اور پھر سارے علوم ایک جگہ آکر ختم ہو جاتے ہیں اور وہاں سے روح کی اقلیم شروع ہوتی ہے۔ جیسے ستاروں کی اپنی الگ اقلیم ہے۔ بحر و بر کی اقلیمیں جدا جدا ہیں۔ اتنے بہت سے علوم ہیں اور انسان کی رسائی بس ایک حد سے آگے نہیں۔'' وہ چپ ہو گیا۔

حسین کم عمر تھا اور منجم تقریباً آدھی زندگی گزار چکا تھا۔ ایک بنیادی نیکی اور خوبصورتی اس میں تھی جو اس سے بات کرنے میں ظاہر ہوتی تھی۔ پھر اسے داستانیں سنانے کا ڈھنگ آتا تھا۔ سادہ سے واقعے کو رنگین اور قابل یقین بنا دینا تو اس کے لیے مشکل نہ تھا۔ ہر واقعہ کی فضا باندھنا غم اور خوشی کی کیفیات کو بیان کرنا۔

جب پہاڑی دروں کا دشوار گزار راستہ ختم ہو گیا اور چھدرے جنگلوں میں سے نکل کر قافلہ کھلے شاہراہ پر آیا ہے تو راستوں کے کنارے پھول گرمی کی تیزی سے مرجھا رہے تھے۔ پانی کے حوض اور تالاب تین چوتھائی پانی سے خالی تھے اور بارشوں کا موسم گزر چکا تھا۔ لوگ بستوں کے گرد حفاظت کے لیے کانٹے دار جھاڑیوں کے قلعے سے تعمیر کر رہے تھے۔ سادہ لوگ انہیں شاید سفاکی سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ دشمن نہایت زور اور شدت سے حملہ کرتا ہے۔ وہ غیر مسلح بستیوں پر اس لیے حملہ آور ہوتا ہے کہ عام بے چینی پھیلے۔ مدافعات کی کمی کی وجہ سے لوگ حکومت کے خلاف ہوں۔ انتشار اور پریشانی سے حکومت کے کارندے آگاہ ہوں تو خوفزدہ ہوں اور ان کے راستے صاف ہوں۔ ظاہر ہے خلافت کی فوجیں اور دستے ہر جگہ تو نہیں پہنچ سکتے۔

دجلہ کے ساتھ شاہراہ پر بصرہ کی طرف سے اور قافلے بھی تھے جو بغداد جا رہے تھے اور نہروں میں کشتیوں کے بیڑے کھڑے تھے۔ کھجور کے درختوں کے جھنڈوں میں شام کی سرخیاں چھپنے کی کوشش میں ناکام ہو جاتیں تو پانی میں اُتر آتیں۔ ان جنگی کشتیوں میں نیلا دھواں آسمان کی طرف دستِ دعا کی طرح اٹھتا۔ فوجی گرمی کے باوجود سر سے پاؤں تک وردیوں میں ملبوس ہوتے۔ شاہراہوں اور آبی راستوں کی حفاظت ہو رہی تھی۔

کشتی بنانے والے کی معلومات نہایت وسیع تھیں۔ وہ ہر کشتی کی شکل و صورت' اس کی تعمیر میں استعمال کی گئی لکڑی اور رال اور روغنِ قیر کا حساب و کتاب جانتا تھا۔ پرانے زمانے میں ایرانی کشتیوں کی ساخت کا اندازہ اور زمانہ حال کی تبدیلیوں سے بخوبی آشنا تھا۔ اپنے ہُنر میں یکتا دکھائی دیتا تھا اور دیوانوں کی طرح کشتیوں کی باتیں کرتا تھا جیسے اس کی زبان کسی چکر سے نکل آئی ہو اور اب رُکے گی نہیں۔

مغنّی نے بے حوصلہ ہو کر ایک دن کہا "استادِ ذی شان کیا تمہارے فن کے کوئی

قدر دان تمہارے اپنے شہر میں نہیں رہے؟" وہ زور زور سے ہنسا اور اس کے ساتھ اس کے ساتھی بھی ہنسے۔

"یہی سوال میں تم سے پوچھ رہا ہوں' تم کیوں بغداد جا رہے ہو؟"

"گانے اور شاعری کے قدر دان سوائے درباروں کے اور کہیں نہیں ہوتے محترم۔" مغنّی نے کہا۔

"کشتیاں جو مَیں بنا سکتا ہوں' ان کے قدر دان بھی سوائے امراء اور بڑے بڑے سپہ سالاروں کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔"

وہ سب پھر ہنسے اور ترک سرداروں کے نام گنوانے لگے جو اس کی مہارت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ پھر ترکوں اور دربار پر ان کے اثر کی عام لوگوں کی بے وقعتی کی باتیں ہونے لگیں۔ خلافت راشدہ کے زمانوں میں کیا ہوتا تھا' خود ہارون اور مامون کے عہد میں عباسی خلفاء کے جاہ جلال کی کہانیاں جواب خواب و خیال بن گئی تھیں اور معتز کا دردناک قصہ جو اپنی ماں کی وجہ سے دربار سے باہر گھسیٹا اور مارا گیا تھا اور جس کی نصرانی ماں کا خزانہ خلفا کے خزانے سے بھی بڑا تھا۔ پھر نصرانی عورتوں اور لونڈیوں کے اثر و نفوذ کا دربار کی زندگی پر ان کے اثر کا تذکرہ ہونے لگا۔ ہر زبان پر شکایت تھی اور ہر دل تلخی سے لبریز تھا۔ اسلام میں دوسرے ملکوں کی عورتوں نے جو ریشہ دوانیاں کیں' ان پر تبصرہ ہوا۔ لوگ سوائے خواتین کے تقریباً حالات کو سنسنی خیز بتاتے تھے اور نئے خلیفہ کی سختی کو پسند کرتے تھے۔

نئے مذاہب کی بات پر مبلغ نے کہا۔ "مذاہب کو پیش کرنے کا طریقہ اگر صحیح ہو تو سچائی دور نہیں ہوتی؟"

"تم کیا قرمطی نقیب ہو؟" کسی نے پوچھا۔

"نہیں' نہیں' بخدا نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے جیسے اپنے آپ کو بچا رہا ہو۔

مغنی اور اس کے ساتھی جو مذاق اڑاتے اور ہر بات کو پکڑتے تھے' اس کی حالت سے خوب محظوظ ہوئے۔

جو بستیاں محفوظ تھیں' ان میں قافلہ کے پڑاؤ پر خوب رونق ہو جاتی۔ ضرورت

کی چیزیں خریدی جاتیں۔ اگر کوئی جانور بیمار یا کمزور ہوتا اور سفر کرنے کے ناقابل ہوتا تو دوسرا خریدا جاتا۔ جانوروں کے طبیب، مسجدوں کے مؤذن، چھوٹے چھوٹے دکاندار ایک بھیڑ لگ جاتی۔ چراغوں کی قطاریں ہنسی اور داستان طرازی سحر سے ایک ایسی گہما گہمی پیدا ہو جاتی جس کی یاد بستی والوں کو آئندہ کے لیے منتظر رکھتی۔ چاندنی میں میدانوں میں بکھرے ہوئے کہیں کہیں مدھم جلتے چراغ اِکّادُکّا اکیلے گھروں کی خبر دیتے۔ جانوروں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کا بجنا عجیب خوابناک ہوتا اور زرد چاندنی کا دھارا حسین کو اغول کی یاد دلاتا۔ جانے وہ کہاں ہو گی۔ وہ دو ذرّوں کی طرح غبار میں اڑتے اڑتے ایک دوسرے سے ملے اور مخالف سمتوں میں اپنا سفر جاری رکھنے کے لیے جدا ہو گئے۔ کیا ہوتا اگر وہ صرف ایک ذرّہ ہوتا اور اغول کے دامن سے لپٹ سکتا۔ اس کے بالوں کے سنہرے میں کہیں اٹک سکتا۔ اس کی پلکوں کے سرے پر آنسو بن کر کپکپا سکتا۔ اس نے اپنے جی کو کیسے کیسے سمجھایا تھا کہ اغول ایک خواب تھی اور جلدی میں دیکھے ہوئے بس آنکھ بند کر کے خیالوں کے سوتے جاگتے لہریوں پر جھولتے خواب کوئی خواب نہیں ہوتے۔ ذہن کے کھلتے ہوئے ہولے ہولے دراز ہوتے خیالوں کے گیسو ہوتے ہیں۔ رود آبہ کے گیسوؤں کی طرح جس کی سیڑھی پر قدم قدم آدمی چھت کے جھروکوں تک پہنچ سکتا ہے مگر وہاں پر ضروری نہیں کہ اغول ہو، مل سکے۔ اغول اس کا ایک وہم تھی اور آدمی کے جی میں چاہت کہاں سے آن بستی ہے، ٹھہر جاتی ہے۔ ٹھہری رہتی ہے کہاں سے؟ وہ اکیلا بیٹھ کر غور کرتا۔ مقدر نے اس کے لیے کیا حکم دیا ہے؟ میں اپنے لیے کیا دعا کروں؟ اغول کو ملنے کی دعا؟ اُسے ڈھونڈ لینے کی دعا؟

پھر وہ رات آخری رات، آخری گھڑی اسے یاد آجاتی۔ دو حرقہ میں مشقوں کے درمیان وہ اسے یاد رہتی۔ وہ اس کی رگوں میں، اس کے خون میں، اس کی سانس میں رچ بس گئی تھی۔ وہ اسے بھلا نہیں سکے گا، کبھی بھی نہیں۔ آدمی بھلاتا تو اسے ہے جسے یاد کیا جائے اور اغول اس کی یاد کہاں تھی، وہ تو حسین تھی یا حسین خود اغول تھا۔ ہاں وہ حسین تھی وہ اغول کہاں تھی۔ جب اس کی ہستی اس سے الگ اس سے پرے کوئی دوسری نہ تھی تو پھر اور کچھ نہیں تھا۔ وہ آج تک اپنے آپ سے برسرِپیکار رہا تھا، اپنے آپ سے۔

اور اسے ایک گونہ طمانیت ہوئی۔ اب اس کی تلاش کہیں اور نہیں تھی، اپنے اندر تھی مگر ایسا تو اس نے کئی بار سوچا تھا۔ اس کی جنگیں اپنے اندر جاری رہتیں۔ وہ ہنسا۔

منجم نے کہا "حسین کیا تم دیوانے ہو کہ ہنستے ہو؟"۔ "مجھے اپنے آپ سے عشق ہے، بے پناہ محبت۔ شدید جذبات میرا سانس روکتے ہیں اور میں ان سے بچنے کے لیے ہنستا ہوں۔" حسین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کسی اور سے یہ بات نہ کہنا، لوگ تمہیں دیوانہ سمجھ لیں گے۔" پھر ذرا توقف کے بعد اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے میں تمہارا زائچہ بناؤں اور ستاروں کے حساب سے بھی تمہارا مستقبل معلوم کروں۔"

"ہو گا تو وہی جو مقدّر ہو گا۔" حسین نے اس کی بات دہرائی۔

"ہاں ہاں نیک فرجام ہو گا تو وہی مگر معلوم ہو جائے تو شاید تمہیں قرار آ جائے۔" اس نے سرائے میں اپنی کوٹھڑی میں جاتے ہوئے کہا۔

حسین کو اس زائچے کا انتظار نہیں تھا مگر منجم کا یوں آنکھوں سے اوجھل ہو جانا اسے اچھا نہ لگا۔ سرائے سے باہر اس نے قصّہ گو کے پاس بیٹھنے کی کوشش کی۔ قصّہ گو اپنی لوچ دار اور بلند آواز میں بادشاہ کی مصیبت کا واقعہ بیان کر رہا تھا۔ لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ درختوں کے سائے رات میں اندھے سایوں کی طرح تھے کہ سارے رازوں کو سمیٹے ہوئے تھے اور کچھ کھلتا نہیں تھا۔ اس کی طبیعت بہت بدمزہ ہو رہی تھی۔ کیا وہ آنے والے وقت سے خائف تھا۔ اسے سیاوش یاد آ رہا تھا۔ دادا سیاوش۔

اس کا اپنا دادا محی۔ آخری گھڑی، آدمی کو موت بس الگ کر دیتی ہے۔ پر تو سے اصل کی طرف لے جاتی ہے۔ موت کیا ہے؟ جب کائنات میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ ایک سے نہ ہزاروں سے، نہ قوموں سے نہ ملکوں سے اور خدا نے آدم کو تخلیق کیا تھا۔ اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا تھا اور اتنا بے بضاعت بنایا تھا؟ خدا جب خود حد ادراک سے ماورا ہے تو اسے آدم کو بھی عظیم بنانا چاہیے تھا قابلِ تخلیق۔ یہ روتے آہ و زاری کرتے انسان کیا تھے؟ خدا کو انسان اپنے شایان شان بنانا چاہیے تھا جو اس کی طرح تو نہیں مگر کسی شے پر تو قادر ہو جو اگر اس کی حمد کرے تو اسے پکارے تو اس کی صدا جواب کے

لائق تو ہو۔ کائنات کے در و بست میں اس کی کوئی اہمیت تو ہو۔ وہ بھی کسی شے پر قادر تو ہو، اپنے بگاڑنے پر ہی سہی۔

پھر یک بیک وہ کانپ اٹھا۔ وہ کتنا گستاخ تھا۔ اس کی سوچ بے لگام تھی۔ وہ ایک ذرّہ ناچیز کس دیدہ دلیری سے سوچ رہا تھا۔ کیوں؟ اس کے ذہن میں یہ ساری تپش کون بھر رہا تھا؟ کون؟

اس نے کہا، میں اب سوچوں گا نہیں اور وہ قصّہ گو کی محفل میں سروں پر سے پھلانگتا ہوا اس کے قریب ہونے کے لیے لوگوں کی بڑبڑاہٹ کی پروا کیے بنا بیٹھ گیا۔

"طلسمی گھوڑا چکر لگا کر نیچے اترا تو شہزادے نے دیکھا کہ وہ کسی اور اقلیم میں ہے۔ کسی اور بادشاہت میں اور یہ ساتویں اور سب سے آخری اقلیم تھی جہاں چاروں طرف برف تھی اور اندھیرا تھا۔ کوئی روشنی ہی نہ تھی۔ وہاں نہ برودت تھی اور نہ ہی حدت۔ پھر جب اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ درخت برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ گھر برف سے بنے تھے۔ اچانک افق پر ایک سپیدہ نمودار ہوا جو نہ پھیلا نہ بڑھا مگر ہزاروں پرندوں کی چہکاروں سے فضا ایک دم گونجنے لگی۔ یہ سورج شاید ان چڑیوں اور برف کے صحرا کے پرندوں کے خون میں طلوع ہوا تھا۔ اس شہر برف کے باسیوں کے لباس بھی برف کے تھے اور ہر شے برف کی تھی۔ بحر محیط حد نظر تک پھیلا برف کا میدان تھا جس کو کہیں کہیں سے کاٹ کر نیچے کے پانی تک رسائی حاصل کی گئی تھی۔ حسین نے اپنے خون میں کپکپی محسوس کی جیسے وہ بھی شہزادے کے ساتھ برفستان اور ساتویں اقلیم میں جا اُترا اور باہر نکلنے کی ساری راہوں پر پہرے ہوں۔

قصّہ گو نے یہ سب حالت بیان کر کے آہستہ آہستہ سورج طلوع کیا جو اگر ایک دم چڑھتا تو لوگ اندھے ہو جاتے اور چمک نگاہوں کو خیرہ کر دیتی۔ داستان طرازی تو اس پر بس ختم تھی۔ حسین بھی قصے میں ڈوب گیا۔ جب منجم نے اسے پکارا۔

"حسین، حسین۔"

اسے ایک دم جیسے ہوش آ گیا تو یہ اس کے ستاروں کا احوال تھا جسے لکھنے کے لیے اسے پکارا جا رہا تھا۔ شہزادے کے ستارں سے وہ ہاتھ اٹھا کر اپنے مقدر کی طرف

گیا۔ چاروں طرف اندھیرا ہے۔ بالکل۔ منجم اس نے اس کے پاس آ کر کہا۔
حسین حیران تھا کہ وہ تو داستان گو کی بات نہیں سن رہا تھا' پھر اسے کیسے پتہ چلا کہ برف کے اس ویرانے میں چاروں طرف اندھیرا ہے۔ وہ اس کے سر کے سفید بالوں میں گھلتی ہوئی چاندنی کو دیکھتا رہا۔
نوجوان میں کیا کہہ سکتا ہوں' تم پریشان نہ ہونا۔ ستارے بھی کبھی کبھار کائنات میں کسی نئی تخلیق کی وجہ سے ہیجان میں ہوتے ہیں اور حساب ٹھیک نہیں بیٹھتا۔
''میں سمجھا نہیں۔'' حسین نے کہا۔
''پسرم تمہارے ستاروں کے گرد کوئی روشنی نہیں' کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ سب طرف اندھیرا ہے۔'' اس نے الگ الگ ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ ادا کیا۔
''کیا'' حسین نے حیرت سے کہا۔ ''تمہیں ستاروں کے حساب سے شناسائی بھی ہے؟ کسی بھی انسان کے ستارے کسی طرح مکمل اندھیرے میں ہو سکتے ہیں؟ ٹھہرے ہوئے جیسے وہاں نہ ہوں ناممکن۔'' اس نے سر کو دائیں بائیں جھٹکا۔
''تم بھی صحیح سمجھتے ہو اور میں بھی حیران ہوں تم زندگی سے پُر تندرست سلامت سانس لیتے ہوئے ہو اور ایک خاص وقت کے بعد تمہارے لیے بھلا روشنی کیوں نہ ہو گی جب زندگی ہے۔'' اس نے رک رک کر کہا۔ ''کچھ تو ہونا چاہیے کچھ تو!''
''یہ روشنی کتنے برسوں تک رہے گی؟'' حسین نے عام بات کی طرح پوچھا۔
''ہمارے ہاں وقت اس طرح شمار نہیں ہوتا جیسے عام زندگی میں پلوں' دنوں' ہفتوں اور مہینوں' سالوں کے حساب سے۔'' منجم نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔
''پھر بھی۔''
''یہی ایک اُترتے ہوئے ذرّے کی طرح روشنی دس بیس سال کا شمار ہوا کرتی ہے۔'' اس نے افسوس سے جواب دیا۔ ''ایک لحظہ ایک پل بھی روشن ہو تو بہت ہوتا ہے اور یہ تو دس بیس سال ہیں۔ اگرچہ اس پر اب بھی میرا یقین نہیں ہے۔ آئیں برفستان میں شہزادے کا قصّہ سنیں۔'' اور وہ دونوں پھر اس محفل میں جا شامل ہوئے۔
ستاروں کے غبار سے بنا کہکشاں کا رستہ روشن تھا اور کوچ کا نقارہ جب بجا ہے تو

چاندنی پہلی راتوں کے چاند کے ساتھ رخصت ہو چکی تھی۔ بستی کے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں برابر آرہی تھیں کیونکہ وہ گدھوں کے رینگنے سے خبردار ہو گئے تھے اور ہوا میں جانوروں کے موت اور گوبر کی بُو سونگھ کر ان کی حسیّں تیز ہو گئی تھیں۔ چراغوں کی لوئیں بھڑک رہی تھیں۔ روشنی اور اندھیرا آنکھ مچولی کھیل رہے تھے یا جیسے کرمکِ شب تاب اِکّادُکّا راہ بھول کر بستی کی طرف لوٹ رہے ہوں۔

حسین نے جی میں کہا۔ روشنی ہے تو سہی، بس یہی کافی ہے۔ منجّم نے تو مجھے گھبرانا چاہا تھا مگر میں گھبرانے والا کہاں ہوں۔ وہ جی ہی جی میں ہنسا۔

قافلہ دوسری منزل کے لیے روانہ ہوا۔

بجھت آباد اپنی آب و ہوا کی عمدگی اور دریاؤں کے سنگھم پر ہونے کی وجہ سے دجلہ کے کنارے اناج اور پھل ریشم اور چینی دیبا کی بہت بڑی منڈی تھی۔ یہاں کے لوگ نرم خو، بااخلاق، پرمذاق اور خوش لباس تھے۔ شہر کے اندر سے نہریں گزرتی تھیں اور پانی اتنا شیریں تھا کہ باغوں سے گھرے ہونے کی وجہ سے اس بستی پر بہشت کا گمان ہوتا تھا۔

مغنی نے اپنے سازندوں کو لے کر ایک باغ میں پڑاؤ ڈالا۔ اس کی لاثانی دھنیں فضا کو نغمے اور موسیقی سے خوابناک بنا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ معمار نے جو اس کے پراعتماد رویئے سے چڑ تا تھا، جھوم جھوم کر رقص کیا۔

معمار بھی دیوانہ آدمی تھا۔ ہر عمارت کو جو راہ میں دکھائی دیتی تھی، نہایت غور سے دیکھتا اور اس کی عمر کا اندازہ لگاتا۔ اس میں جو لکڑی اور مصالحہ صرف ہوا تھا، اس کا حساب لگاتا۔ انگلیوں پر شمار کرتا یہاں تک کہ کھنڈروں میں گھُس کر غائب ہو گیا۔ جب ہم چوبی پل کو پار کر کے دوسری طرف نینوا دیکھنے گئے، یہ ایوان اور دربار کے بڑے بڑے دالان در دالان کمرے اور پتلی غلام گردشوں والے محلات تھے جن پر زمانے کی گرد نے اپنی تہیں جمالی تھیں۔ ستونوں کے جنگلوں پر چھتیں گر گئی تھیں۔ اونچی بنیادوں میں سے اینٹیں اور مصالحہ جھڑ گیا تھا اور تہہ خانوں میں چمگادڑوں نے مسکن بنا رکھے تھے۔ جگہ جگہ جھاڑیوں نے سر نکالا تھا۔ رقص گاہوں میں اب ہوائیں ریت کے ساتھ آوارہ بگولوں کے جلو میں رقص کرتی تھیں۔ جہاں بادشاہوں کی حضوری میں شہزادیاں رقص

کناں ہو کر اپنی مراد کو پہنچتی تھیں۔ بنیوں کے سروں کو اس لیے گردن سے جدا کیا جاتا تھا کہ ان نارسا بوسوں میں موت اور خون اور بربادی کا ذائقہ چکھا جا سکے۔ وہ سر جو فخر اور عاجزی کا مرقع تھے' خاک میں لوٹائے جانے سے پہلے لوٹے جائیں۔ وہ آنکھیں جو جہان کو دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھتی تھیں' ان پر چھائے ہوئے پپوٹوں کو عشق کے ناپید کنار بے محابہ اور نارسا ہونے کی سزا دی جائے۔ تھال میں سجائے اس سر کی قیمت سانچے میں ڈھلے سراپے کی دیوانگی ٹھہرے۔ خدا اپنے بندوں کو یوں رسوا کیوں کرتا ہے؟ اپنی محبت کا مذاق کیوں اڑواتا ہے۔ وہ کسی آزمائش سے اپنے دوستوں کو دوچار کرتا ہے۔ ایفائے عہد کرنے کے اس کے عجیب ڈھنگ ہیں اور وہ سرفروشی کی قیمت بھی کیا دلواتا ہے۔ سر جو کندھوں کے لیے بار ہو جاتے ہیں تاکہ رسوا کیے جائیں۔ بڑے بڑے تاج سروں پر سجائے حسین و جمیل کنیزوں کے جلو میں ملکائیں' ہوا کی سی نازک شہزادیاں کنجوں میں معطر جھونکوں میں عشق کے گیت گاتے مغنی۔ دربار میں حاضر بھاری زریں پہنے اور خود سجائے سپہ سالار' روشنیاں اور خوشیاں اور یلغار کرتی فوجیں اور آخر سب کو نیند آجاتی ہے اور کوئی معمار انگلیوں پر اس کا حساب شمار نہیں کر سکتا کہ کتنے سر بنیادوں میں دفن ہوئے ہیں اور کون بتا سکتا ہے کہ چنائی میں استعمال ہونے والی اینٹیں جس مٹی سے بنائی گئی تھیں' وہاں کتنے بدن پیوند خاک ہوئے تھے اور یہ محفلِ جانانہ جو آباد ہوئی تھی تو کس خون سے اس کی آبیاری کی گئی تھی؟ حساب لگانے کا اختیار کسی کو نہیں دیا گیا اور نہ ہی دنیا کی عمر کا اندازہ کوئی لگا سکتا ہے۔ سلطنتوں کے الٹ پھیر زمانے کی شکست و ریخت' شاہوں کی بیچارگی سب ہوا کی راہ گزر میں ہے۔

مبلغ نے جب بغداد قریب آ رہا تھا اور منزل در منزل سفر باقی تھا' ایک دن حسین سے کہا۔

"برخوردار! تم کیا حصولِ زر اور تلاشِ معاش کے لیے خلیفۂ وقت کے روبرو باریابی چاہو گے؟ کیا تمہارا کوئی دوست وہاں ہے؟ میں کئی دن سے دیکھ رہا ہوں کہ تم منجم اور مغنی کے زیادہ قریب ہو رہے ہو۔ ان کی صحبت تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ یہ سب بیکار لوگ ہیں۔ شیطان کے شاگرد۔ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ منجم کیا ہے' گپ باز اور ستاروں کے جھوٹے سچے حساب اور

زائچے بنانے والا اور وہ مغنی خدا اس سے محفوظ رکھے' فسق و فجور پھیلانے والا' گندگی کا کیڑا۔"

حسین حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"اگر تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہو' دربار تک رسائی حاصل کرنا چاہو، تو میں محلّہ کرخ میں اپنے دوستوں سے کہہ کر تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ بغداد میں میرے بہت سے جاننے والے ہیں اور دربار تو' خیر ہر کلیدی عہدے پر میرے خیر خواہ ہیں۔"

وہ چپ ہوا تو حسین نے کہا۔

"مگر مجھے تو امیر المومنین نے خود دربار میں طلب کیا ہے۔"

"کیا کیا؟" مبلغ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"یہ کہ مجھے بلایا گیا ہے' میں طلب کیا ہوا آیا ہوں اور میرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہو گی۔" حسین نے نہایت قطعیت سے کہا۔

مبلغ جس کا نام زبیر تھا' اپنی تسبیح بھول کر اس کی طرف بنا پلکیں جھپکائے دیکھتا رہا۔ حیرت سے اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ کافی دیر بعد اس نے کہا

"اس صورت میں تم دربار کے علماء تک پہنچنے میں میری مدد کرو! مجھے تبلیغ کے مختلف کاموں اور اداروں کے لیے زرکثیر کی ضرورت ہے اور اگر کوئی دوست دربار میں ہو تو آسانی رہتی ہے۔"

اس کی بات کاٹ کر حسین نے کہا "آپ کے وہ دوست جو کلیدی عہدوں پر ہیں؟"

"وہ سب ٹھیک ہے۔" زبیر نے چکنی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا۔ "مگر تم جوان ہو اور خلیفۂ وقت کے منظورِ نظر ہو گے۔ تم تو سب پر سبقت لے جاؤ گے۔"

حسین بنا جواب دیئے اپنا گھوڑا بڑھا کر قصّہ گو کے ساتھ ہو لیا۔ چونکہ وہ جب قصہ سنا رہا ہوتا تھا تو خواب دیکھتا لگتا تھا اور جب خاموش ہوتا تھا تو خواب بُنتا ہوا محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی کے پھیلے ہوئے کرگھے پر اس نے پرچھائیں سے مرقعے اور فسانے بُن رکھے ہوں اور انہیں غور سے دیکھ رہا ہو۔ ان کی بہتر صورت کے لیے ہر وقت

فکر مند ہو' سوچ میں ڈوبا ہوا۔

ہندی سوداگر جو بجہت آباد سے آکر کارواں میں شامل ہوا تھا' بہت ہنس مکھ اور لطیفہ گو تھا۔ ہر خوف کی گھڑی میں ہی مذاق ڈھونڈ لیتا جبکہ لوگ اس کی ٹانگوں کے اندر سے پیچھے کی طرف اڑے ہوئے جُبّے کو دیکھ کر ہنستے تھے مگر معلوم ہوتا ہے اسے کسی کی پروانہ تھی۔ سیاہ آنکھیں کسی نہ کسی خیال سے چمکتیں جیسے کوئی نہایت اچھی بات سوجھی ہو۔ خود ہی ہنستا مگر دیوانہ نہیں تھا۔ اس کے آنے سے ایک دم فضا بدل سی گئی تھی۔ اپنے روزمرہ کے کاموں کے علاوہ خواتین کے کام بھی انجام دیتا۔ کسی کو ذرا سی تکلیف ہوتی' اسے معلوم رہتا اور اسی لیے بغداد جب دو دن کے فاصلے پر تھا تو طبیب کی طبیعت ایک دم مالش کرنے لگی تو اس نے ہندوستانی طریقۂ علاج سے جڑی بوٹیوں کو اونٹا کر اسے پلایا تو وہ تندرست ہو گیا۔ وہ نیلے کوہستانوں اور نہایت بلند برف سے ڈھکے کوہساروں کی باتیں کرتا تھا اور یہ بھی سناتا تھا کہ سمندروں کے سے بڑے ذخائر دریا ان پہاڑوں سے نیچے میدانوں میں آتے ہیں اور ایک دریا تو سیدھا بہشت سے ایک دیوتا کی جٹاؤں میں گرتا ہے اور پھر وہاں سے چوٹیوں' بلندیوں وادیوں میں سے ہوتا ہوا نیچے اترتا ہے۔

''کیا وہ دجلہ سے بھی بڑا ہے؟'' حسین نے پوچھا۔

ہنس کر ہندی نے کہا'' دجلہ تو اس کے سامنے ایک آبِ جُو ہے اور پھر اس میں ڈبکی لگانے سے آدمی ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسے پیدا ہونے کے وقت تھا۔''

''ہر آدمی کا کام اس کا عمل اس کی زندگی اسے پاک یا ناپاک بناتی ہے۔ کوئی پانی بھی انسان کے گناہوں کی سیاہی کو نہیں دھو سکتا۔'' حسین نے کہا۔

''معلوم ہوتا ہے تم خوابوں اور مفروضوں اور خوبصورتیوں میں یقین نہیں رکھتے۔'' اس نے حسین سے کہا۔

''شاید مَیں اچھے مفروضوں سے اور خواب کی رعنائیوں سے تھک گیا ہوں۔'' حسین نے جواب دیا۔

''تم ابھی بیس برس کے تو ہوئے نہیں ہو گے۔ جیسا کہ تمہیں دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا ہے اور تم ایسے میں تھکن کی باتیں کر رہے ہو۔ اب جبکہ تمہارے لیے سورج

طلوع ہوگا' تم زندگی اور رعنائی اور حسن سے دوچار ہوگے۔ تمہارے دل میں نئی
دنیائیں' نئی ممکنات کے ساتھ ظاہر ہوں گی۔ تم کنول کے پھول ہو' جو آج تک کیچ
میں رہا ہے۔ گلابی پنکھڑیوں کو کھول کر اب لبریز تالاب پر تیرنے کا تمہارا وقت آیا ہے
اور مجھے یہ کہنے میں ڈر نہیں کہ تم اپنے عشق میں بری طرح مبتلا ہو۔ دربار میں تو تمہیں
اپنے ساتھ اکیلے ہونے کا وقت ہی نہیں ملے گا۔ برخوردار! سخت عمل میں مصروف رہو
ورنہ مایوسی تمہیں یوں نگل لے گی جیسے آگ لکڑیوں کو۔"

نغمۂ شوق

یہ عروس البلاد بغداد ہے۔ بالآخر بالآخر ایک زمانے کے بعد وہ آن پہنچا ہے۔

حسین نے سوچا اس سارے کاروبارِ حیات اور بے پناہ ہجوم میں آدمی کی حیثیت کیا ہوگی۔ عرب کے بطن سے ایک نور ہویدا ہوا۔ قیصر و کسریٰ کی بے بضاعتی پر صاعقۂ قہر بلا بن کر گرا اور شرق و غرب کی ساری سلطنتیں اس روشنی سے منور ہوئیں۔ بنوامیہ کے زمانوں کی بدویت آل عباس کے وقتوں میں جمی جمائی شہری زندگی میں بدلی۔ مزاج بدلے' سادگی کی جگہ پرکاری نے لی' عمارتوں میں جاہ و جلال شان و شوکت اپنے انتہائے کمال کو پہنچے۔ علم و فضل کے بحرِ ذخار یونان اور روما کے علوم سے لولوئے لالہ سے پُر ہوئے۔ ہیبت و سطوت میں' شرافت و نجابت میں' سخاوت و دولت میں ساری دنیا کم تر تھی اور بغداد اپنے مدرسوں' خانقاہوں' مسجدوں میں پھیلی ہوئی بھول بھلیوں جیسی گلیوں بازاروں اور شاہراہوں کے سبب دنیا کو سمیٹے ہوئے تھا۔

شہد رنگ طیلساں پہنے نصرانی اور یہودی' ترک اور تاتاری' ہندی اور چینی علماء اور حکماء کے لیے بغداد ایک مقناطیس تھا کہ لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ دربار زندگی کا محور تھا اور اس تک رسائی مشکل نہ ہونے کے باوجود تقریباً ناممکن تھی۔ جیسے حجاب اندر حجاب دیوار در دیوار احاطے ہوں' سیاست کے اپنے اصول ہیں اور انہی کا کھیل تھا کہ عام لوگوں کی پہنچ سے حاکم اور حاکم کی رسائی عام لوگوں تک محال ہو' تاکہ اصل واقعات کا ناخوشگواریوں کا علم نہ حاکم کو ہو سکے اور نہ ہی عوام اپنی داد رسی تک پہنچیں۔ اگر عام آدمی اپنے حاکم کی محفل میں جا پہنچے اور یا شیخ کہہ کر اسے مخاطب

کر سکے تو پھر وہ لوگ جو واسطہ بننے سے ہی زندہ رہتے ہیں ان کی جگہ زیرِ آسمان کہاں ہو۔

پریشانی، تنگی، دلآزاری کا کاروبار بھی ہے جو حاجت روائیوں، فراخیوں اور دل داریوں کی تمنا سے فروغ پاتا ہے اور حاشیہ نشینوں کی زندگی اسی کے دم سے ہوتی ہے۔ ہر زمانہ اس سے عبارت ہے اور ہر دنیاوی شخصی حکومت ایسی ہے سوائے خلفائے راشدین کے وقتوں سے یا ان خلفائے بنو عباس سے جو خدا کے خوف سے لرزاں ترساں رہتے تھے اور عام لوگوں کی دادرسی خود کرتے تھے۔

حبشی غلاموں کے دورویہ پرے اپنے بہترین لباسوں اور ہتھیاروں سے سجے اس راہ پر تھے جو خلیفہ کے محل سے بارگاہ تک جاتا ہے۔ حسین کی باریابی کا دن جب آیا ہے تو معتضد ابھی فوجوں کے معائنے سے واپس آیا تھا، اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ بے چین گھوڑے سے اتر کر اس نے حسین کی طرف دیکھا جو فوجی لباس میں اور بھی کمسن معلوم ہوتا تھا۔ سر سے پاؤں تک اس نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا:

''آج سہ پہر کی محفل میں اسے پھر حاضر کیا جائے۔'' اس نے اپنے غلام بدر سے کہا۔ ''اس نوجوان کی نہایت زیرکی اور بہادری کی وجہ سے ہم نے اسے اپنے خاص الخاص ملازموں میں شامل کیا ہے۔''

بدر نے سر خم کیا اور خلیفہ بارگاہِ خاص کی طرف چلا گیا۔ ترک سپاہیوں اور حبشی غلاموں اور سرداروں نے جو مقربینِ بارگاہ بننے کے زمانوں سے خواب دیکھ کر نہایت کوشش سے یہاں تک پہنچے تھے اسے عجیب نظروں سے گھورا جیسے خوبی اور بہادری کسی تمغے کی طرح اس کے لباس پر ٹکی ہو اور انہیں معلوم ہو سکے کہ اس انتخاب کی وجہ دراصل کیا ہے؟

معتضد مردم شناس خلیفہ تھا اور اپنے دربار میں فن کاروں، مصوروں، شاعروں کا ہجوم اس کے عباسی دربار صفات و کمالات کا قلعہ بنا تھا۔ سرفروشوں اور وفاداروں کا قدردان تھا اور مخالفوں کو معاف کر دینا اس کی سب سے بڑی بہادری تھی، مگر جب دشمن جوشِ غضب میں مسجدوں کو برباد کرتے یا کسی عبادت گاہ کو منہدم کر دیتے تو وہ

اپنی فطرت کے خلاف ان کی جانوں کو تلف کر دیتا۔

اس کے باپ معتمد کے وقتوں سے ہی زنجی اور قرمطی مختلف علاقوں میں زور پکڑ رہے تھے۔ علوی بھی جہاں مدافعت کمزور پاتے یا ان کے داعی ان کے لیے راہ ہموار کر دیتے وہاں نمودار ہوتے اور فساد میں جہان کو مبتلا کر دیتے۔ راستے ان سے محفوظ نہ تھے اور خود آلِ علی میں سے الحسین کے بیٹوں محمد و علی نے مدینۂ رسول میں خراج کا مطالبہ کیا اور چار جمعوں تک نہ مسجد نبویؐ میں نماز ہو سکی اور نہ ہی لوگ وہاں تک پہنچ سکے۔ پھر سرحدیں تھیں اور پھیلی ہوئی سلطنت میں فتنے سر اٹھاتے رہتے تھے۔ خود بغداد میں عوام اور سرداروں میں فوج کے سپاہیوں اور سالاروں میں ٹھن جاتی تھی اور خلیفہ اور خلیفہ وقت امیر المومنین کو اتنی فرصت نہ ہوتی کہ اپنے جھروکوں میں بیٹھ کر دریا کا نظارہ کرے۔ کارِ جہاں بانی کتنا مشکل تھا۔

حسین یہ سب سنتا' دیکھتا اور سمجھتا اور اس کی وحشتِ دل بڑھتی۔ وہ منصور کو جو خط لکھتا ان میں اپنے آرام سے ہونے کا ذکر کرتا کیونکہ وہ دارالبصرہ کے ایک خوبصورت مکان میں جس کے دریچے دریا کی طرف کھلتے تھے رہتا تھا اور یہ مکان چھاؤنی سے ملحق تھا۔ مگر اسے معلوم تھا کہ یہ اس کے مزاج کے خلاف ہے اور وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رہے گا۔ اس کی طبیعت یوں بھی بے چین تھی۔ وہ ایک شعلۂ مستعجل تھا ایک ستارے کی طرح جو محض اس لیے فضا میں ٹوٹ کر بکھرتا ہے کہ آسمانوں پر محو سفر رہنے کا اس میں حوصلہ نہیں ہوتا۔ خرام ناز سے تو یہی بہتر ہے کہ بجھ جایا جائے۔

دجلہ کے ساتھ ساتھ حسین کی نگاہوں کے سامنے زندگی کا دریا رواں رہتا۔ حسین و جمیل شہزادے بہترین عربی گھوڑوں پر سوار' محملوں میں کنیزیں اور خواتین جن کے چہرے کی تابانی چاند سے زیادہ تھی۔ حبشی غلام اپنے پر نازاں اور اپنی طاقت کے بوجھ سے عاجز' ساقی اور سرور و سوز کی محفلوں میں جاتے ہوئے لوگ۔ بازار جواہرات سے بھرے ہوئے فروخت کرنے والے غلاموں نے نہایت عمدہ دیبا و حریر کے لباس زیبِ تن کیے ہوئے۔ اور دنیا کے کونوں سے عجائبات کے ڈھیر جو لا کر یہاں سجائے گئے تھے۔

علم وادب کی محفلوں اور مسجدوں میں لوگوں کا مجمع مباحث اور وعظ کی محفلیں' فلسفے کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے لوگ اور صوفیا کے مسالک کا مختلف النوع چرچا۔

چھاؤنیوں میں تیار ہوتے ہوئے لڑتے مرتے جاں نثار کرنے والے سپاہی اور وفادار اور ان میں سے وہ بھی ایک تھا۔ پھر وہ معتضد کو دیکھتا کہ بے چین ہے مصروف ہے، جنگوں میں اپنی جان کھپاتا ہے۔ بغاوتیں اور شورشیں فرو کرتا ہے اس کا فائدہ۔

دجلہ کی لہروں میں سامان سے لیس کشتیاں کھڑی رہتیں' محبت ہو یا نفرت' دنیا پر کبھی کوئی حکومت کر سکتا ہے' حکومتیں اس لیے قائم ہوتی ہیں کہ وہ بدلیں۔ سب طرف فنا کا طبل بجتا ہے۔ زندگی اور موت ہر آن برسرِ پیکار رہتی ہیں اور آخر میں فتح فنا کی ہوتی ہے۔

خلیفۂ وقت کے گرد اس کے قریب جو بھیڑ رہتی تھی' اس میں وہ بھی تھا' حسین بن منصور اور وہ بھی عام آدمیوں کی طرح ترقی کر جائے یہ ہو سکتا ہے عمر بن لیث کی طرح کبھی صاحبِ شرطہ بن جائے یا پھر دربار میں ایک خاص مقام حاصل کر لے تو اس کا حاصل؟ وہ اپنے سے سوال کرتا حاصل؟

شرقی غربی دجلہ کو ملانے والے پلوں پر روز لوگوں کو لٹکایا جاتا تھا۔ ان کو سزا دی جاتی تھی اور یوں وہ اپنے انجام کو پہنچتے تھے۔ یہ بھی کوئی انجام تھا۔

پتہ نہیں باغیوں کو کیوں معلوم نہیں ہوتا کہ اگر کامیاب نہ ہوئے تو ان کا انجام یہ ہوگا۔ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے۔ ان کو دار پر کھینچا جائے گا اور ان کے بے جان جسم دجلے کے باب البصر کے سامنے ہوا میں جھولتے رہیں گے تاکہ لوگ عبرت پکڑیں۔

اس کے ساتھ اس مکان میں ایک اور لڑکا بھی رہتا تھا۔ حامد کو حسین کا کھویا کھویا انداز اور کم گوئی پسند نہ تھی۔ وہ بہزاد کی حسین عورتوں کا شیدائی اور ظاہری تکلفات پر دم دیتا تھا۔ مسقّف بازاروں میں وہ کنیزوں کا پیچھا کرتا اور ان سے کہیں نہ کہیں ملنے میں بھی کامیاب ہو جاتا۔ یہ افسانے سننے کے لیے اس نے حسین کو کبھی بھی تیار نہیں پایا۔

"واللہ قبیحہ کا حسن جہاں سوز ہے۔" حامد نے ایک دن کہا۔

''مگر میں اپنے آپ کو جلانے کے حق میں نہیں ہوں۔'' حسین نے جواب دیا۔
''اگر اس گھر میں وہ آ سکے تو آفتاب کی ضرورت نہیں۔''
''ساری کنیزیں وہ قبیحہ ہوں یا عذرا' سلمٰی ہوں یا ہندہ' عربی ہوں یا عجمی' آفتاب ہوتی ہیں۔'' حسین نے کہا۔
''تم اتنے بدمذاق ہو۔ مجھے معلوم نہیں۔'' حامد نے جل کر کہا۔
''اور یہ تمہاری بدمذاقی ہے کہ قبیحہ پر دم دیئے دیتے ہو۔'' حسین نے تیزی سے کہا۔
''وہ کوئی عام لونڈی نہیں خلیفۂ وقت کے گھر میں خادمہ ہے۔''
''اس سے تو اور بھی مشکل ہے تم خیانت کے لیے کیسی محفوظ ہستی کو تلاش کر سکے ہو۔''
''تمہاری طرف کبھی کسی نے توجہ ہی نہیں دی ہوگی۔'' حامد نے چڑ کر کہا۔
''ٹھیک کہتے ہو۔ میرے پاس کبھی اتنا وقت ہی نہیں رہا۔ سچ کہنا' کیا وقت ہوتا ہے؟'' حسین نے ہولے سے پوچھا۔
''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ عجیب دیوانے آدمی ہو۔'' حامد نے منہ پھیر لیا۔ ''مجھے تم سے خوف آتا ہے۔ کہیں تم یہ سب باتیں کسی سے کہہ نہ دو۔''
''نہیں۔ میری طرف سے مطمئن رہو۔ ہاں اپنے آپ سے خوفزدہ رہو اور ہر آدمی کو اپنے آپ سے ڈرنا چاہیے۔''
''مجھ میں وہ جنون نہیں جو تم میں ہے۔'' حامد نے کہا۔ ''اور اس لیے میں لباس ظاہری سے آزاد ہو کر دیوانہ نہیں ہو سکتا۔''
''مقدر کی بات ہے۔'' حسین نے کہا۔

مگر اس کے بعد حامد اور حسین کے درمیان ایک عجیب سی سردمہری نے جگہ لے لی جو دشمنی تو نہ تھی مگر دوستی بھی نہ تھی۔ فارغ اوقات میں حامد مضطرب رہتا اور انتظار کرتا رہتا کہ حسین باہر جائے۔ حسین کی شامیں جب اسے دربار سے فراغت ہوتی تو فن حرب کی نمائشوں میں یا باغوں اور ڈھکے ہوئے راستوں والے بازاروں سے ہو کر مسجدوں میں گزرتیں۔ مسجدیں جو فنِ تعمیر اور ذوق و شوق کی انتہا تھیں جن میں

قوتِ ایمان اور جذبہ ٔعشق کار فرما تھے‘ عشق جو سراپا دوام ہے جس میں رفت و بود نہیں ہے‘ عشق جس کے مضراب سے تارِ حیات میں نغمے فروغ پاتے ہیں۔ نغمہ جو عرش سے فرش تک ہر شے میں جاری و ساری ہے۔ یہ آہنگ جس کو سننے کے لیے کوئی سامع چاہیے۔اس زیر و بم کی صدا برق فنا ہے۔

یہ تماشوں سے بھرا شہر تھا۔ جہاں حسین تھا۔ایک مکمل دنیادار دھوکہ دہی اور فریب کے سبق سیکھتا ہے۔ دربار کی بھیڑ میں لوگ ایک دوسرے کو پھلانگ کر کس طرح بڑھتے تھے‘ پاؤں میں روندتے ہوئے۔ یہاں کوئی جذبہ‘ کوئی خیال‘ کوئی بات بھی اصل نہ تھی۔ پر غرور‘ پر نخوت بغداد کے باشندے جن کو سچ سے دشمنی تھی اور جو اپنے شہر کو سارے جہان سے اعلیٰ اور اپنے آداب کو عمدہ جانتے تھے‘ اجنبیوں کو پسند نہیں کرتے تھے مگر چونکہ یہاں اجنبیوں کی زیادہ بھیڑ تھی‘ اس لیے ان سے نفرت کرتے تھے۔

معتضد نے قصّہ گو اور مغنّی اور آوارہ گرد اور فال نکالنے والوں کی طرف متوجہ ہونا چھوڑ دیا تھا۔ باقی امراء بھی امیر المومنین کا مزاج سمجھتے ہوئے اپنے اطوار بدل رہے تھے۔

دریا کے کنارے حسین اور مغنّی میں ملاقات ہو گئی۔

”کیا دربار میں ہماری رسائی نہیں ہو سکتی۔ تم ہمارے ہم سفر رہے ہو‘ ہماری کوئی مدد کرو۔“ مغنی نے کہا۔

”امیر المومنین کو آرام کا وقت نہیں ملتا وہ اکثر بغداد سے باہر رہتے ہیں۔“ حسین نے کہا۔

”فوجوں کے ہوتے انہیں اتنی تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔“ مغنی نے پوچھا۔

”کسی ملک کی حفاظت فوجوں کے ساتھ ساتھ خلفاء بھی تو کرتے ہیں۔ یہی سمجھ لو جیسے سب سے بڑا راگ جب تک تم خود شریک نہ ہو‘ سازندے نہیں گا سکتے۔“ حسین نے جواب دیا۔

مغنی اپنی وہی پُر شوق ہنسی ہنسا۔

”بہت خوب۔ راگ کا اور فوجوں کا تعلق؟“

”یہی تعلق تو ہے کہ حکومت ایک بہت بڑی راگنی ہے جیسے کائنات۔“ حسین نے شرقی پُل کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

”مجھے تمہاری باتیں سمجھ نہیں آتیں۔“ مغنی نے حیرت سے کہا۔

”جس دن میری یہ بات سمجھ لو گے کسی جگہ بھی رسائی مشکل نہیں رہے گی۔ نہایت معمولی سی بات ہے اور کوئی نکتہ نہیں کہ جس طرح راگ میں لفظوں اور آوازوں اور زیر و بم کی درستی ضروری ہے۔ بعینہٖ ہر شے ہر کام توازن کا طلب گار ہے۔“

مغنی سوچنے لگا۔

حسین نے اس سے رخصت لی اور پل کی سیڑھیاں عبور کر کے سوق الثلاثا میں داخل ہو گیا جس کے وسط میں مدرسہ نظامیہ تھا اور جس کی شہرت اقصائے عالم میں تھی۔

اس ایک سال کے عرصے میں حسین نے بغداد کی زندگی کا مزہ چکھا تھا اور دربار سے اس کی وابستگی کی وجہ سے کوئی جگہ بھی اس کے لیے ناقابلِ حصول نہ تھی۔ لوگ اس کی ذاتی وجاہت اور نفاست طبع کی وجہ سے اسے دوسروں سے الگ پہچانتے تھے کہ اس نے کبھی کسی سے کوئی چیز مفت طلب نہ کی تھی اور نہ ہی فخر و مباہات کا مظاہرہ کیا تھا جو دربار سے منسلک لوگوں کا خاصہ ہے۔ زر نگار قبائیں پہنے ننگی تلواروں کے پہرے میں عمائدین سلطنت اکثر شرقی حصے سے غربی حصے کو جاتے جہاں باغوں کی بہتات تھی۔ قبرستان اور اولیاء اور صالحین کے مزارات تھے اور وہ وہاں شاید عبرت کے لیے جاتے ہوں مگر زندوں نے مردوں سے کب عبرت حاصل کی ہے؟ جو زمین کے نیچے ہے وہ زمین پر چلنے والوں کو کوئی سبق نہیں سکھا سکتا کہ سیکھنے والوں کے سر اٹھے ہوئے اور نگاہیں عرش کی طرف ہوتی ہیں۔

انہی دنوں یومِ صد و بیست کی بادِ صرصر چلنی شروع ہو گئی تھی۔ جب عصر کے وقت افق پر غبار اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے بغداد پر چھا گیا۔ شمال کی طرف سے برف بار ہوا چلی اور موسلادھار بارش نے اسے چاروں طرف پھیلا دیا۔ یہاں تک کہ برودت اور

شدید ٹھنڈک نے لوگوں کو باہر جانے سے روک دیا۔ راستے مسدود ہو گئے جو جہاں تھا وہیں رک گیا۔ حسین کو بھی مدرسہ میں رکنا پڑا۔

قاری الحانِ طرب کے ساتھ قرأت میں مشغول ہو گئے کہ ان کے انفاس کی برکت سے یہ زمین عذاب آسمانی سے محفوظ رہے۔ دو یا تین آدمی مل کر ایک آواز میں قرأت شروع کرتے۔ ایک آیت کے ختم پر دوسرے قاری فوراً شروع کر دیتے تھے۔ اس ترتیب سے آیات متشابہات پڑھنے کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ سننے والوں کے چہروں پر انفعال اور ندامت کے آثار نمایاں تھے۔ سب کے دل ہولِ قیامت سے خائف و ترساں تھے۔ نفسوں پر کچھ ایسی حالت طاری ہوئی کہ سب کی زبان پر بے اختیار توبہ جاری تھی۔

دل اب کہاں ہے شوق نے اسے پگھلا دیا
قلب اب کہاں ہے جدائی نے اسے کھو دیا
اے ہمدم تجھے خدا کی قسم اور تجھ پر جان قربان
ان کے ذکر سے میرے سوز و گداز کو بڑھا

پڑھنے والے نے ان اشعار کی اتنی بار تکرار کی کہ ہر آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ خوف سے ہر دل کانپتا تھا اور آہ و بکا کی آوازوں سے دل بیقرار تھے۔ حسین پر وجد و کیف کا ایک عالم طاری تھا یہاں تک کہ گرمیٔ شوق اور تپش دل نے اس کی جان کو گداز کر دیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

باب البصرہ اور محلّہ شارع کے درمیان سوق المارستان تھا جس میں شفاخانہ کی عالی شان عمارت دجلہ کے کنارے تھی۔ اس کے اندر جہاں شاہانہ آرائش کا سامان تھا' انہوں نے حسین کو ایک ایسے مکان میں ٹھہرایا جس کی کھڑکیاں اونچی اور کشادہ تھیں اور دجلہ کی نم ہوا' اگر مریض چاہے تو اس تک پہنچ سکتی تھی۔ پھر دوسری طرف کے دریچے محلّہ عشابیہ میں کھلتے تھے' جہاں ریشم اور مختلف قسم کے سوتوں کو ملا کر کپڑا تیار کیا جاتا تھا اور کرگھوں کا مدھم مدھم شور جیسے ساز بج رہے ہوں' سنا جا سکتا تھا اور فرات کی وہ شاخ جو دجلہ میں گرتی تھی اس کے قریب سے گزرتی تھی۔

مدرسہ نظامیہ سے اس قیامت خیز بارش میں جب قبروں کے منہ کھل گئے

تھے اور دفن شدہ مردے گلیوں میں تیرتے پھرتے تھے' حسین کو لایا گیا۔ اس پر سخت بے ہوشی طاری تھی اور اس کے باوجود کہ طبیب اس کے گرد کھڑے ہر تدبیر کر رہے تھے' اسے ہوش میں لانے کے لیے کافی مصیبت اٹھانا پڑی۔ ہاتھ اور پاؤں بے جان تھے۔ رنگ زرد تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ صدمے نے اس کے حواس پر اپنا پنجہ مارا ہے۔

دو نگران دائیں بائیں نہایت تاکید سے بٹھائے گئے اور طبیب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ شاید خداوند تعالیٰ اپنے بندے کو ہوش و خرد عطا کرنے والا اس شخص کو بھی بچالے۔ بجلی کا لہریا ایک ایک لحظہ کے بعد دستک دیتا تھا اور رعد کا شور کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتا تھا جیسے عناصر کسی قید سے آزاد ہو کر زور آزمائی کر رہے ہوں۔ گلیاں رواں نہروں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

یہ کیسی بے ہوشی تھی اور کوئی یہ بتانے والا بھی نہ تھا کہ آخر ہوا کیا تھا۔

پانی بنارُ کے پڑ رہا تھا گویا طوفان نوح ہر خشک و تر کو ڈھانپ لے گا۔

المارستان کے شفاخانے میں مریض اور طبیب سوچ رہے تھے شاید قیامت آ گئی تھی اور گناہوں سے معافی اور توبہ کرنے کی یہی گھڑی تھی۔

حضرت عثمان مکی اپنی خانقاہ سے نکل کر جو بغداد کے محلّہ حربیہ میں تھی شفاخانہ کی طرف آئے۔ ان کے عزیز ابو ایوب اقطع بیمار تھے۔ کئی اطباء کے زیر علاج رہنے کے باوجود انہیں ابھی صحت نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہفتے کی مسلسل بارشوں سے ذرائع آمدورفت تقریباً ناپید ہوگئے تھے۔ شاہراہوں پر کشتیاں چل رہی تھیں۔ گھروں میں پانی گھس آیا تھا اور افراتفری کا عالم قیامت کا نمونہ تھا۔ ایسے میں بغداد کے دیہات سے قریب کوئی بھی معالج کہاں جا سکتا تھا۔ ابو ایوب کی حالت بگڑ گئی تھی۔

شفاخانے میں بہترین طبیب جمع ہوتے تھے جو جمعرات اور سوموار کو مریضوں کو ملاحظہ کرنے آتے تھے' اس لیے حضرت عثمان مکی نے بہتر سمجھا وہ خود تشریف لائیں اور ایوب اقطع کے لیے کسی کو زحمت دیں۔

لوگ ملے جلے خوف اور تجسس سے سب طرف یہ ذکر کر رہے تھے کہ بارش میں ایک چبوترہ کھلا ہے اور اس میں سے سات قبریں کھل گئی ہیں اور سات جسد خاکی

اس میں ظاہر ہوئے ہیں یوں کہ فضا ان کی قبروں کے کھلنے سے خوشبو دار ہو گئی ہے اور ان صورتوں پر نظر نہیں ٹھہرتی۔ ہر چہرہ محو خواب آفتاب ہے' چمک دمک میں بے مثال اور جلالت آبی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر۔ شفاخانے کے ہجوم میں سن کے لوگ اللہ سبحانہ' کی حمد و ثنا کر رہے تھے۔ موت اور زندگی سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ اعمال کی پاکی' اور رحمت خداوندی کے بنا ایسا انجام قطعاً ناممکن تھا۔ خدا جانے وہ لوگ کس زمانے کے تھے کس مذہب سے ان کا تعلق تھا' نورانی صورتوں والے جوان رعنا جن کی موت پر سے پردہ اٹھا تھا اور خوشبو۔ لوگ صالحہ اور عمدہ اعمال کا ذکر کرتے رہے۔ ہر شخص جسے اپنی باری کا انتظار تھا' ایسی موت کا طلب گار تھا۔ دولت دنیا اور دولت دین۔

طبیب نے حضرت عثمان کو دیکھا تو ادب سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ وہ ان کی شان اور مقام سے واقف نہ ہونے کے باوجود ان کی بزرگانہ وضع قطع سے بہت متاثر ہوا تھا۔

"آپ نے کسی کو بھجوا دیا ہوتا میں خود حاضر ہو جاتا۔"

"مریض میں نہیں میرا ایک عزیز ہے۔" انہوں نے نہایت نرمی سے کہا۔

حسین نے اس آواز کو سنا تو نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ کپکپی سے اس کی جان کو جھٹکا لگا اور بدن کانپا۔ سر سے لے کر پاؤں کی ایڑیوں تک اسے سردی کی لہر اپنے اندر محسوس ہوئی۔

دوسری طرف بیٹھے ایک شخص نے بڑھ کر دست بوسی کے بعد کہا:

"حضور۔ میں یہ مسئلہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا انسانی جسم ہزاروں سال تک دفن رہنے کے بعد بھی تر و تازہ اور خوشبودار ہو سکتا ہے۔"

سب لوگ متوجہ ہونے لگے تو حضرت عثمان مکی نے کہا:

"یہ خدا کے اپنے راز ہیں اور ان کی کوئی توجیہہ نہیں ہو سکتی جو ہوا وہ یقیناً ممکن ہو گا ہی اور یہ فنا ہونے والا وقت ہماری تقویم میں ہے۔ ایک وقت اس سے باہر ہے جس سے ہم شناسا نہیں ہیں۔"

حسین نے پھر سردی کی شدید لہر اپنی ہڈیوں میں محسوس کی اور اوپر دیکھا۔

حضرت عثمان مکی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حسین پھر کانپا اور غبار سا اس کی

آنکھوں کے سامنے چھا گیا جیسے تیز حدت سے بھری ہوا اس کے سر میں گھوم رہی ہو۔ اس نے اپنے سامنے ہاتھ پھیلائے تو اسے محسوس ہوا سہل بن عبداللہ تستری نے اسے سہارا دیا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑا ہے۔ اس کی آنکھوں پر اپنی انگلی پھیری ہے۔ بھاری پپوٹوں کی نیند غائب ہو گئی۔ چکراتا ہوا ذہن قائم ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر پھر اوپر دیکھا' بخار کی کیفیت' سردی کی کپکپاہٹ سب رخصت ہو چکے تھے۔ اس نے مسکرا کر دیکھا حضرت عثمان مکی نہایت شفقت سے اس کی طرف نگاہ کیے ہوئے تھے۔

طبیب کے ہمراہ شفاخانے سے جاتے ہوئے انہوں نے حسین سے کہا:

"عزیزم' تم محلّہ حربیہ کی خانقاہ میں آؤ۔"

اس نے سر جھکا دیا۔

سات قبروں کا ایک چبوترے کے شق ہونے سے ظاہر ہونا اور ان کی وجہ سے پورے علاقے کا خوشبو سے معطر ہو جانا حسین کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا۔ وہ اعمال و افعال کی نیکی اور خلوص کو سمجھتا تھا' راست بازی کو ریاکاری سے الگ جانتا تھا مگر عمل کی اس جہت سے ناآشنا تھا۔ اسے کس شے سے شناسائی تھی؟

آدمی آتش و آب و خاک و باد سے مل کر بنا ہے اور وہ ایک طرح سے مُغ بچہ تھا۔ آتش پرستی اس کے خون میں رچی بسی تھی اور یہ آگ وہ نہیں تھی جس کو ہم دیکھتے تھے بلکہ یہ وہ آگ تھی جس کے اندر آتش و آب و خاک و باد تھی اور یہ حرارت' حرارتِ عشق تھی اور اس کی حرکت سے لو نکلتی تھی اور وہ عشق حقیقی کی لو تھی۔ حسین نے اپنی ممکنات پر کب غور کیا تھا۔ یہ اس کے اندر کب در آئی تھی۔ یہ لو دیتا ہوا وجود وہ سارے کا سارا آگ کیوں بن گیا تھا اور پھر اس نگاہ در نگاہ سے جس میں نہ زمانوں کی دوری نہ مکان کی دوری مانع تھی۔ وہ تحلیل ہو کر پھر یکجا ہوا تھا۔

عناصر اس کے اندر یہ کیا کھیل کھیل رہے تھے۔ وہ فانی ہو رہا تھا۔ باقی ہو رہا تھا۔

حضرت عثمان مکی نے خانقاہ میں حسین کو دیکھ کر کہا:

"تم عدم و وجود کے کھیل میں غیر جانبدار ہو۔ اپنی پوری توجہ صرف کرو گے تو یہ گتھیاں سُلجھیں گی۔"

وہ سر جھکائے بیٹھا رہا جیسے تُستر میں شیخ کے سامنے دو زانو بیٹھا کرتا تھا۔

"تم اپنے اشواق کی شدت کو کبھی محسوس اور کبھی معدوم سمجھتے ہو۔ تہذیبِ نفس ضروری ہے تم ان مجالس میں وقتاً فوقتاً آکر بیٹھ سکتے ہو مگر سالکِ راہِ شوق اور سیر الی اللہ کے لیے اپنے آپ کو جب تک تیار نہ کر لو' یہاں آنا تقریباً کوئی نفع نہ دے گا۔" حضرت عمر بن عثمان اپنے مسالک میں اصول کی پابندی ضروری سمجھتے تھے۔

حسین نے زخمی نگاہ سے ان کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر سوئے ادب کے خیال سے نظر اٹھ نہ سکی۔

"تُستر سے تم کیوں بھاگ آئے تھے۔" انہوں نے پوچھا تو حسین نے چونک کر اوپر دیکھا۔ ان کی تادیب کرتی نگاہوں کی وہ تاب نہ لا سکا۔

"دربار خلافت میں بھی تہذیبِ نفس ہو سکتی ہے بشرطیکہ رحمتِ خداوندی شاملِ حال ہو۔" وہ اس کے حال کی طرف خوب متوجہ تھے۔

"میں دربار کو چھوڑ دوں گا۔ آپ مجھے اپنے سائے میں رہنے کی اجازت دیں۔"

اس کی عاجزی دیدنی تھی۔ اس کا سارا وجود پانی بن کر' خاک بن کر' ہوا بن کر ان کے قدموں میں تھا۔

حضرت سوچتے رہے سوچتے رہے یہاں تک کہ غرفہ کھلا اور کسی نے کہا:

"عِم بزرگوار' والد کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے۔"

حسین چونکا۔ یہ اغول کی آواز تھی کیا؟

اس کا سارا وجود پھر لو دینے لگا جیسے الاؤ جل اٹھا ہو۔ اونچے شعلوں سے خانقاہ کا صحن بھر گیا ہو۔ اس سے اس کی ذات سے ہر شے لبریز ہو گئی۔ سب طرف وہ تھا۔ آنچ بھی اور جلن بھی' تپش بھی اور شعلہ بھی' یا سب طرف آگ تھی اور وہ کہیں نہیں تھا' وہ اغول تھا اور اغول اس میں سما گئی تھی۔ عجیب سا تجربہ تھا اور مشاہدہ تھا۔

اس کے اندر پھر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی۔ کشمکش کہ کون رہے اور کون مٹ جائے ___ دُوئی کو مٹ جانا ___ یہ آسیب کا سا نام تھا۔ ہاں بس نام ہی تھا۔ اس نے

اسے دیکھا کب تھا ـــــ؟

کیا دیکھنے کے لیے دو آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے؟

مگر خیال سے عشق کیا نہیں جا سکتا اور اس میں اپنا آپ تج دینے کی بھول جانے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ وہ کس سے عشق کرے کدھر جائے۔

لگا زمانے گزر گئے ہیں۔

"حسین تم دروس میں شریک ہو سکتے ہو۔"

"جی۔" اس نے ان کی نگاہوں کی نرمی کو محسوس کیا جیسے بیمار جان کو کہیں سے شربتِ شفا پلایا جا رہا ہو۔

"مگر اس سلسلے کو سمجھنے کے لیے اور اس میں ایک مرید کی طرح شریک ہونے کے لیے وقت کی ضرورت ہو گی۔ تم میری بات سمجھتے ہو؟"

"جی۔"

اس نے رخصت لی اور جب حضرت اٹھ کر اقطع کے گھر کی طرف اس غرفے میں سے پار ہوئے ہیں تو ان کی پشت پر سے اس کی نگاہ اٹھی اور اس نے ایوب اقطع کی بیٹی کو دیکھا۔ عجیب سوختہ چہرہ تھا۔ سیاہ رنگ' افسردہ' بے رونق' باپ کی بیماری سے پریشان' کتنے تضادات اس ایک چہرے میں جمع تھے۔ آواز کی نغمگی اور چہرے کی کرختگی' جیسے کوئی مصفا چشمہ خس و خاشاک کے اندر سے پھوٹ بہے۔

حسین جب محلّہ قرافہ میں جہاں دجلہ کے کنارے قافلوں کا پڑاؤ ہے پہنچا تو اسے ہندی سوداگر مل گیا۔ وہ دیارِ بکر اور تکریت کے شہر سے لوٹا تھا اور حمام کی طرف جا رہا تھا۔ اس حصہ بغداد میں نہایت عالی شان اور بڑے بڑے حمام ہیں جن پر سیاہ روغن کو اس طرح جمایا ہوا تھا گویا سنگِ سیاہ سے تعمیر کیے گئے ہوں۔ فراواں گرم اور سرد آب فراہم اور نہانے والے کو پوری خلوت میسّر۔

"تم یہیں پر میرا انتظار کرو اگر تمہیں کوئی اور نہایت ضروری کام نہ ہو تو ـــــ"

اس نے حسین سے کہا۔

حسین نے سر کے اشارے سے ٹھہرنے کا اقرار کیا اور دجلہ پر بڑی بڑی کشتیوں اور خلقت کے ہجوم کو اوپر سے اوپر آتے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ ان محلات کے

اندر رہتا تھا اور آج جب وہ انہیں باہر سے ذرا فاصلے سے دیکھ رہا تھا تو ایک دم ان کی شان و شوکت اس پر عیاں ہوئی۔ خلفاء نے بدویت سے شہریت کا اور عوام نے سادگی سے پُرکاری کا راہ طے کیا تھا۔ یہ عمارتیں سنگ میل تھے۔ مدرسے اور خانقاہیں' شفاخانے اور ستاروں کے مطالعے کے لیے دوربینیں۔ سائنس کے مطالعے کے لیے بڑے بڑے جامعے اور سیرگاہیں' باغات اور جاری نہریں' عالی شان محلات اور دنیا کا سارا جاہ و جلال رونق اور خوبصورتی' شاہی خدام اور حبشی خواجہ سرا ننگی تلواروں کے حلقے میں چلتے ہوئے جلوس میں ترکی اور ویلمی افسر' دجلہ کی سیر کرتی ہوئی رونق بچے اور خواتین ــــ یہ زندگی کا کارواں رواں تھا اور بے خبر کہ اگلی گھڑی کیا ہونے والا ہے۔ وسیع بازار' بے شمار باشندے مدرسے اور وہاں جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا' وسیع و معمور باب البصیلہ نظر آتا تھا۔

سوداگر نے کہا: "سال سے زیادہ عرصہ ہوا جب میں نے اور تم نے اکٹھے سفر کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک تم میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ آرام نے اور خلافت کی ملازمت نے البتہ تم کو نکھار دیا ہے۔ تم نے ذرا سا قد نکالا ہے۔ لباس بھی عمدہ ہے۔ مگر تم کچھ خوش نہیں دکھائی دیتے۔ کیا بات ہے؟"

حسین اور وہ کشتیوں اور لوگوں کے درمیان چلتے رہے۔ خوشگوار ہوا میں سیر کرتے چہرے پُربہار تھے۔ دریا کے ساتھ ساتھ شاہراہ پر جہاں سواریاں نہیں آسکتیں' پیدل چلنے والوں کا ہجوم تھا۔ بچے کاغذ کی خوش رنگ پتنگیں اڑا رہے تھے۔ گانے والوں کی ٹولیاں باغوں میں سبزے پر محوِ خوش الحانی تھیں اور اس کے باوجود کہ خلیفہ نے سب آوارہ گردوں' فال نکالنے والوں اور تماشہ بینوں کو شہر بدر کر دیا تھا۔ بغداد کی آبادی میں اور خوش دلی میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔

"تم کچھ کہتے نہیں ہو حسین۔ چپ کیوں ہو۔ کیا عشق میں گرفتار ہو گئے ہو۔" سوداگر نے ازراہِ مذاق کہا۔

"تم تو دنیا میں گھوم کر آئے ہو۔ تماشوں اور سیر اور واقعات سے پُر ہو گے۔ تم ہی کچھ کہو۔ میں نہ عشق میں گرفتار ہوں اور نہ ہی ناخوش۔" حسین نے ہنس کر اس کی طرف دیکھا۔

"اس خطہ زمین میں تماشے اور سب جگہ سے زیادہ ہوتے ہیں۔" سوداگر نے کہا۔

"کیا یہ اقلیم باقی جہان سے زیادہ مہیب ہے۔ تمہارے ہاں تو دریا چٹانوں سے نکلتے ہیں اس کی کچھ کہو۔" حسین نے خوش دلی سے کہا۔

"وہاں تو صرف دریا ہی ایسے ہوتے ہیں تمہارے یہاں تو اور ہی تماشا ہے' کسی نیک اور بزرگ کو خدا رسیدہ اور معصوم سمجھو تو وہ کسی نہ کسی مذہب کا داعی' حکومت کا باغی' کسی اور مذہب کا مبلغ ہوتا ہے۔ سفر کے دوران تقریباً ہر گام پر مجھے ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے جن کی آنکھیں اندر دیکھتی ہوئی' شکلیں سادہ مگر کردار نہایت خوفناک تھا۔ قتل اور غارت گری ان کا پیشہ ہے۔ ہر قدم پر دھوکہ فریب' سلطنت کے خواب لیتے ہوئے آدمی' رقص کرتے ہوئے خدا شناس درویش اور خلافت کے نہایت شدید دشمن۔ آل علی کا نام لے کر علم کی آڑ میں ظلم و تشدد کرنے والے۔ مجھے کم از کم بیس سال اس گرد و نواح میں گھومتے ہو گئے ہیں۔ مگر اس زمانے سے زیادہ پریشان زمانہ میں نے نہیں دیکھا۔ راستے غیر محفوظ' شاہراہیں پر خطر اور ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی خوف گھات میں ـــــ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے کہ تمہارے مذہب میں اتنے مختلف خیالوں کے لوگ جمع ہیں اور ایک دوسرے کا گلہ کاٹنے اور جان سے مارنے کے درپے ہیں۔"

"کیا تمہارے ہاں چین ہی چین ہے۔ کوئی مذہب کے نام پر قتل و غارت نہیں کرتا۔" حسین نے پوچھا۔

"ہم نے اپنی سرحدوں کو بند رکھا ہے۔ ہمارے پہاڑ برف سے ڈھکے ہوئے اور عبور کیے جانے کے قابل نہیں۔ فوجوں کو کوئی سیدھا راستہ نہیں مل سکتا۔ اونچے درّے ہیں جہاں سے ایک وقت میں بہت کم لوگ گزر سکتے ہیں اور پھر ہماری آب و ہوا سخت ہے۔ گرمی میں بہت گرم۔ زیادہ بارشیں' شدید سردی' ہم نئے خیالوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں دیتے کچھوے کی طرح ہم خطرے کے وقت اپنے عقائد اور مذہب سمیت وہاں چھپ جاتے ہیں۔ ہمارے ظاہری وجود کو چاہے آپ کسی شے سے بھی کاٹیں مگر اندرونی طور پر ہم کسی سے اثر قبول نہیں کرتے۔"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔" حسین حیران تھا۔

"ہمارے ہاں اوتار آتے ہیں جو سمجھ لو مذہب کو دھو کر نئے سرے سے جھاڑ پونچھ کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ سب سے بڑے اوتار کرشن کنہیا ہیں۔" سوداگر نے کہا۔

"کیا وہ زندہ ہیں۔" حسین نے پوچھا۔

"نہیں زندہ تو نہیں ہیں مگر ہر زمانے میں ان کی پوجا ہوتی ہے۔ ہر رنگ میں وہی ایک مرلی منوہر۔۔۔"

"تم لوگ بحیثیت قوم ایک تو نہیں ہو۔ تمہارے ہاں بھی بدھ ہیں اور کتنے اوتار ہیں۔ ان کی اپنی الگ الگ تعلیمات ہیں۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ میرے دادا مجوسی تھے۔ میری رگوں میں آگ کو پوجنے والی نسلوں کا خون ہے بلکہ میری رگوں میں آگ ہے۔" اس نے ہنس کر بات ختم کی۔

"اور تم۔۔۔ تم تو شاید اسلام کے والہ وشیدا ہو۔" سوداگر نے کہا۔

"سمجھ لو میں ایک درخت ہوں جس میں آگ ہے اور آگ درختِ طور میں ظاہر ہو سکتی ہے اور خدا کی وحدانیت پر گواہی دے سکتی ہے۔ تم نے شاید وہ قصّہ نہیں سنا۔" حسین نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔

حضرت موسیٰ نے جب خدا سے مکالمہ بہت کیا تو انہیں دوست کو دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ انہوں نے کہا: "ربِّ ارنی"۔۔۔ اے میرے رب' میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور خدا نے کہا' تم میرا جلوہ دیکھ نہیں سکو گے۔ موسیٰ پھر بھی بضد رہے۔ آخر اللہ نے کہا' پھر اس درخت کی طرف دیکھو اور درختِ طور میں سے آواز آئی۔ "میں خدا ہوں۔"

"کیا وہ درخت خدا بن گیا تھا۔" سوداگر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں درخت خدا نہیں بنا تھا۔ خدا جس شے میں جلوہ گر ہو وہ اس کے پرتو سے خدا بن جاتی ہے۔" حسین نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "مگر جلوہ تو خدا کا ہوتا ہے۔ نور تو وہی ہوتا ہے۔ شے کی اپنی ہستی فنا نہیں ہوتی۔"

"چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں۔" حسین نے دجلہ کی ہوا میں اپنے رومال کے

پھڑ پھڑاتے پلوؤں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" سوداگر نے کہا۔

"چیزوں کی ہستی خدا سے الگ ہے ___ ہے نا۔" حسین نے سوداگر کے سوچتے ہوئے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔

"ہاں۔" بہت دیر کے بعد جواب ملا۔

"خدا کا جلوہ چیزوں کو اپنا نور اپنی جہت عطا کرتا ہے مگر وہ خدا نہیں ہو جاتیں۔" اس نے ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اسی طرح جیسے ہمارے ہاں بھگوان ہر شے میں ہوتا ہے اور چیزیں الگ ہوتی ہیں۔" سوداگر نے کہا۔ "تو پھر ہماری سوچ بھی وہی ہے۔ برہما' بھگوان 'ایشور' نرنکار۔ اتنے نام ہیں۔ سب ایک اس کے ہیں جسے تم خدا کہتے ہو۔ سنو حسین! ہر آدمی کو ہر اجالے کو ہر اندھیرے کو اسی نے پیدا کیا ہے۔ سب کچھ ایک ہے۔ اسی کی ایکتا پر' ساری دنیا کے' مشرق کے' مغرب کے مذہب کھڑے ہیں تو پھر جھگڑا کا ہے کا ہے۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا جیسے اس نے کوئی بڑی بات کہہ دی ہو۔

حسین نے کہا: "چلو یہ الجھاوے بہت ہیں اور طویل ہیں۔ آؤ میں تمہیں دجلہ کی خاص مچھلی کھلاؤں۔ مگر ___" پھر اس نے مڑ کر سوداگر کی طرف دیکھا۔

"کوئی بات نہیں دوست۔ جب سے میں عرب ممالک میں آتا جاتا ہوں میں نے مچھلی کو بہت لذیذ پایا ہے۔ مجھے تمہاری دعوت منظور ہے۔"

وہ ہاتھوں میں ہاتھ دیئے جنوب کی طرف روانہ ہو گئے جہاں شاہراہوں کے آخر میں مطبخ تھے اور لوگ لکڑی کی نشستوں پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ دونوں بھی ایک نشست پر بیٹھے تھے اور سامنے دیہات کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نینوا کے کھنڈرات اور اس سے پہلے نجف اشرف کربلائے معلیٰ' عراق اپنے دریاؤں' نہروں' باشندوں کی وجہ سے مشہور تھا اور اپنی فضیلتوں کی وجہ سے ایک عرش تھا۔ سوداگر نے ٹھیک ہی تو کہا تھا: "اسلام میں وجۂ نزاع صرف اور صرف اسلام تھا۔" حسین کی سوچ بہت دور نکل گئی تھی۔

خاکِ پاکِ مدینہ جہاں پر رسولؐ تھے۔ وہ افضل کیوں تھے؟ اس لیے کہ وہ وجہ

وجود کائنات تھے۔ عرش سے پہلے ہر شے سے پہلے اللہ نے انہیں تخلیق کیا تھا۔ اس نور کو اور پھر آفتابوں اور ستاروں کو اور دنیا کو اور آخر میں آدم کو۔ اور وہ نور آدم کی پیشانی میں جگمگاتا تھا اور شیطان تھا جس نے انکار کیا تھا۔ اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا گویا اس نور کو جو اس پیشانی میں رکھا گیا تھا' وہ پہچان نہیں پایا تھا۔ اس نے اپنی عبادات سے اپنے مراقبوں سے کیا سیکھا تھا؟ اسے وہ آنکھ عطا نہیں ہوئی تھی جو دیکھ سکتی اور اسے اپنی عبادت کا غرور تھا۔ اسے اپنے کچھ دکھائی نہ دینے پر سوائے ایک کے ناز تھا اور وہ ناز اسے لے ڈوبا۔ اسے عرش کے سب راز جانتے ہوئے بھی وہاں سے نکال دیا گیا۔

"سنو۔ تمہارے ہاں کوئی ایسا ہے جو آدمی کو بہکاتا ہے اسے نیکی سے بدی کی طرف بلاتا ہے۔" حسین نے پوچھا۔

"اب نیکی اور بدی کو چھوڑو۔ یہ بحث بعد میں کرلیں گے۔ مُغ' بچے اور کنیزیں' گرو ترسا یہودی اور نصرانی' ہندوستانی اور عجیب عجیب لباس پہنے لوگ گھوم رہے ہیں اور بھگوان کے لیے تو آدمی کسی وقت بھی سوچ سکتا ہے۔"

دکاندار نے دریا کے ساتھ مٹی کے حوضوں میں سے ایک میں ہاتھ ڈال کر ایک مچھلی پکڑی اور انہیں دکھائی۔

"آپ کے لیے یہ کافی رہے گی۔" اس نے ان کی طرف دیکھے بنا کہا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" سوداگر نے تڑپتی مچھلی کی آنکھیں دیکھیں جو ان کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ پھر اچھلی ہے تو اس کا سفید چمکتا ہوا پیٹ نمایاں ہوا۔

حسین ایک مسحور کرنے والی آنکھ میں دیکھ رہا تھا۔ تڑپ کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش میں اس پر پھر کپکپی طاری ہو گئی۔ اندر سے کوئی شے تھی جو ہل رہی تھی۔ لرزاں ترساں جیسے مقتل میں لے جانے سے پہلے کوئی پابجولاں قیدی اپنے انجام سے باخبر ہونے کے باوجود لرزاں وترساں ہو۔ رہائی کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔

کشتیاں سطحِ آب پر رواں تھیں۔ سامان سے بھری ہوئی' بڑی بڑی' دل کو فرحت بخش سیر دریا سے بہلانے والے لوگ۔ پرنخوت حبشی اور ترک اور جھروکوں میں سے جھانکتی عورتیں' کشتیوں کے مکانوں میں سے سر نکال کر ادھر ادھر نظر دوڑاتی ہوئیں۔

انہیں وہیں لکڑی کے ایک میز پر بھاپ اڑاتی مچھلی اور تنور کی گرم روٹی دی گئی۔ ریزہ ریزہ الگ تھا اور مزے میں آج تک کی نوش جان کی گئی سب عمدہ ترکیبوں سے پکائی گئی مچھلی سے سوا۔ لوگ باری کا انتظار کر رہے تھے اور یہ سلسلہ جاری تھا اور ستارے گہرے نیلے آسمان کی پہنائیوں میں سے نیچے جھانک رہے تھے۔ لوگ سفرِ موت میں خراماں خراماں لگے ہوئے مست' سرود کی آواز کہیں قریب سے آئی اور پھر گانے والے نے گایا۔

لوگوں نے پوچھا کیا تم خوش ہو
اس ایک سے محبت کر کے جس کے دانتوں میں ریخیں ہیں
میں نے کہا ایسے چشموں سے سیرابی جنہیں دوسروں نے چھوڑ دیا
خس و خاشاک سے ڈھکے
جہاں لوگ پانی کے لیے جمع ہوتے ہیں!

سننے والے سن رہے تھے۔ یہ بد صورتی کی خوب اچھی توجیہہ تھی۔

سوداگر نے کہا: ''حسن کے تو سب دیوانے ہوتے ہیں۔ کوئی بد صورتی کو چاہے' اس کی طرف کشاں کشاں کھنچا چلا جائے۔''

''ایسا بہت ممکن ہے مگر زشت کے قلب میں تو کچھ ہوتا ہے جو خوب ہوتا ہے اور یہ لبادے تو ظاہری ہیں۔''

حسین نے ہاتھ پانی سے دھو کر رومال سے صاف کیے جو دکاندار لیے کھڑا تھا۔

''کوئی بھی نوجوان بد صورت دوشیزہ کو پسند نہیں کر سکتا۔'' سوداگر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایسا ہو سکتا ہے۔ ہو جایا کرتا ہے۔'' حسین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تو یہ دیوانگی ہوگی۔''

''کبھی کبھار آدمی دیوانہ ہونا پسند کرتے ہیں۔'' حسین کی خوش دلی کو سوداگر نے مذاق سمجھا۔

کھڑے ہو کر انہوں نے دریا پر نظر کی۔ کشتیوں کی روشنیاں' ستاروں کا عکس'

لہروں کی چمک' سب ایک حسین تصویر کی طرح تھے۔ ایک خواب جو جاگنے پر بھول جائے گا۔ ہوا میں کیف بھرا تھا۔ نیند لانے والی فرحت انگیز نے نواز گھاس کے تختوں پر بیٹھے تھے اور گانے والے اپنی اپنی زبانوں میں گا رہے تھے۔ یہ رات اصل نہیں لگتی تھی کسی اور شے کا دھندلا پر تو تھی۔ زنجیوں اور قرمطیوں کے فتنوں سے الگ یہ تو سب سے بڑا اور سچا پیغام لاتی ہوئی رات تھی کہ سب فنا کی راہ میں ہے۔

اپنے پڑاؤ پر جدا ہوتے ہوئے سوداگر نے کہا: "حسین! تم بدصورتی کی تعریف میں آج بہت چمکے۔ کیا تم سنجیدہ تھے۔"

"بالکل بالکل۔" حسین نے کہا۔

"اچھا خدا تمہیں تمہاری بدصورتی کے ساتھ سلامت رکھے۔" اس نے ہنستے ہنستے کہا اور پھر وہ پڑاؤ کی طرف چلنے کے لیے الوداع کہنے لگا کیونکہ اس کا قافلہ اگر کوئی معقول وجہ نہ ہوئی تو روانہ ہو جائے گا۔

سب قافلے رواں ہو جاتے ہیں اور حیات کا بھی۔ حیات جو فنا کی زد میں ہے۔ کیا فنا سے بڑی کوئی حقیقت ہے؟ حسین نے سوچا ـــــ جب زشت و خوب کی اصل ایک ہے فنا و بقا بھی ایک ہے۔ نیند اور خواب جاگنا بھی ایک ہے۔ ہر شے کا اصل ایک ہے تو وہ اس صورت کو ڈھونڈنے کے لیے کہاں تک سرگرداں رہے جبکہ سب صورتیں ایک ہیں۔

حسین نے اپنے جی میں دو فیصلے کیے کہ وہ حضرت عمر بن عثمان مکی کے دروس میں شریک ہو گا اور یہ کہ وہ امیر المومنین کی ملازمت چھوڑ دے گا۔ دونوں کام اتنے آسان نہ تھے۔ اس کے باوجود کہ حضرت عثمان مکی نے اسے درس میں بیٹھنے اور استفادہ کرنے کی اجازت دے دی تھی وہ اسے اپنے سلسلے میں لینے کو تیار نہ تھے۔ یہ مغائرت کی دیوار تھی کہ اس کا منہدم کرنا اس کے نزدیک بہت ضروری تھا' اس کا مقدر یہ کیوں تھا کہ وہ مکتب اور استاد اور اسباق بدلتا رہے' خوار و سرگرداں اور بے قرار رہے۔

یہ سال بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ اس نے دربارِ خلافت میں زشت و خوب کی دید اور اس کے قرب میں صرف کیے تھے۔ اس عرصے میں ان بہار سے خزاں اور حدت و برودت کے موسموں میں اس نے اپنی جگہ سے سرمو ادھر ادھر ترقی اور تنزل نہیں کیا تھا گویا کہ یہاں وہ محض کھڑا ہوا تھا' اس کے جی میں کبھی نہ ہی حصولِ زر کی نہ ہی حصولِ جاہ کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اس نے بہت دوست بھی نہیں بنائے تھے اور بارگاہِ خلافت سے اندر اور باہر قہرمانہ اور خواصیں اور لونڈیوں اور کنیزوں کے پرے تھے۔ کسی طرف بھی اس نے کبھی نظر التفات سے نہیں دیکھا تھا۔ بارونق محلات اس کے لیے بس تھے۔ اس نے بلاچون و چراں بلاسوال کیے اطاعت کرنا سیکھا تھا۔ کیا یہ تربیتِ نفس تھی؟ اور اب وہ گھبرا گیا تھا۔ ایک تماشے کو اپنی نگاہوں کے سامنے زندہ دیکھنا اور ستون کی طرح سراپردوں کے ساتھ کھڑے رہنا' وہ تو اس تمثیل میں ایک ستون بھی نہیں تھا۔ تو وہ کیا تھا؟

پریشان لوگ تحریکوں میں الجھے اجنبی دنیا کی یہ ایک چھوٹی سی رنگین عکاسی تھی۔ ایک مرقع۔ بھلا وہ اس مرقعے میں کہاں تھا۔ کہیں بھی نہیں۔ یہ کارواں جو اس کی نگاہوں کے سامنے نکلا چلا جاتا تھا۔ گزرتے وقت کی پرچھائیں میں دھندلا سا دکھائی دیتا بھی تھا اور نہیں بھی۔ غربی بغداد میں وسیع قبرستان تھے اور بنوامیہ کی قبریں کھود ڈالی گئی تھیں۔ غصے اور تعصب اور قاتلانہ جذبوں سے بھرے یہ عربی النسل لوگ جن پر شرافت کو ناز تھا' ہاشمی اور عباسی اور ہاشمیوں کی پُراسرار زندگیاں اور علوی اور معتزلہ۔ سوچتے سوچتے وہ شل ہو جاتا' تھک جاتا۔ اگر کسی وقت اس سے پوچھا جائے کہ وہ کس کا ساتھ دے گا تو وہ کس طرف ہو؟ وہ عباسی خلفاء کا ملازم تھا مگر اس کی ہمدردیاں ہاشمیوں کے ساتھ تھیں جو بغداد میں کم ہی دکھائی دیتے تھے۔ ایران میں اکثر ان کی بغاوتیں ہوتیں اور انہیں فرو کرنے کے لیے خلیفہ اکثر دارالخلافہ سے باہر رہتا۔ وہ اپنی جان کی پروانہ کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ ان دنوں یہ بات ہر خاص و عام کی زبان پر تھی کہ جب ایک قلعہ کا محاصرہ کئے مہینوں گزر گئے تو خلیفہ نے جان کو خطرات میں ڈال کر فصیل پر چڑھنا پسند کیا۔ محصورین نے جب اسے دیکھا اور پہچانا تو مارے دہشت کے وہ ہتھیار پھینک کر مطیع ہو گئے۔ وہ عجیب حاکم تھا جو بیک وقت ماضی اور مستقبل کے ملتے

ہوئے وقت کے نکتے پر کھڑا تھا اور بہت زیادہ نمایاں تھا۔۔۔ حسین کو فخر تھا کہ اس کو یہاں طلب کیا گیا تھا مگر اب وہ فخر بھی اسے بہت ہی سطحی اور کم ظرفی کی طرح کا جذبہ دکھائی دیتا تھا۔ سینکڑوں لوگوں کا دارومدار خلیفہ کی نظر کرم پر تھا۔ وہ کس بات پر نازاں تھا؟

ہر وقت کے سوالوں اور اپنے ساتھ جنگ کی حالت کو آخر عارضی معاہدے میں ختم کرنے کے لیے اس نے بغداد میں رہ جانے اور ابو یعقوب اقطع کی لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

بہت دنوں وہ اقطع کے گھر کے اس غرفے کی طرف دیکھتا اور اس آواز کو سننے کا منتظر رہا۔ پتہ نہیں آواز کا کون سا لہر یا حلق میں سے نکلتے بول کا کون ساز یرو بم دل کو دھڑکانے والا کیا لفظ تھا جو اسے بے خود کر دیتا تھا۔ وہ اس دلدل میں نہایت تیزی سے دھنستا جا رہا تھا۔ لجلجہ کیچڑ کی سطح سے نیچے کھنچا چلا جا رہا تھا۔ کثافت۔ کثافت!

منصور جب بغداد میں وارد ہوا تو اپنی توقع کے خلاف اس نے حسین کو خانقاہ میں معتکف پایا۔ وہ تستر کی طرح ریاضتوں میں ڈوبا ہوا تو نہیں تھا اور نہ ہی اس کی شکل پر وہ جلن تھی مگر وہ خانقاہ سے بہت کم باہر نکلتا اور یوں محسوس ہوتا گویا وہ اپنی ساری جان سے ہر وقت منتظر ہے۔ بس منتظر جیسے فضا میں سے کسی بلاوے کا منتظر ہے۔ غیب سے کسی آواز کا' عرش سے کسی اشارے کا' ہوا میں سے کسی نغمے کا۔ اس کے اعصاب میں ایک عجیب سا تناؤ ہوتا جسے منصور کبھی نہایت شدت سے محسوس کرتا اور کبھی یہ سمجھتا کہ یہ اس کے بیٹے کی ایک عارضی کیفیت ہے۔ وہ خود ہی سنبھل جائے گا۔ کسی راہ کی جو تلاش اسے ہے اسے پا لے گا۔ وہ بھی تماشائی بننا چاہتا تھا۔ غیروں کی طرح محض باہر سے دیکھنے والا۔ مگر یہ بات اس کے اختیار سے باہر تھی۔

وہ کتنی امیدیں لے کر بغداد آیا تھا۔ دربار اور عمائدین اور مصاحب اور زندگی کا ایک مختلف نقشہ مگر یہاں اس کے آنے سے پہلے بساط الٹ چکی تھی۔ اسے زیادہ ناامیدی بھی نہیں ہوئی۔ وہ راضی برضا تھا۔ یہ زندگی جو خدا نے حسین کو دی تھی اس کی اپنی تھی اور عزت و ذلت دینے والا بھی وہی تھا۔ پھر وہ کس بات کا جھگڑا اپنے سے کرے اور اپنے بیٹے سے کیا کہے؟

ہاں جب حسین نے اس سے اپنا ارادہ بیان کیا اور اسے اقطع سے بات کرنے کی گزارش کی تو وہ اس کی طرف دیکھتا رہا اور اس نے اس معاملے میں اس کی کوئی بھی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔

"تمہیں معلوم ہے حسین' کب سے میں چاہتا رہا ہوں کہ تمہارے ماموں کی لڑکیوں میں سے ایک میری بہو بنے اور پھر تم خانقاہ میں مقیم ہو۔ تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ تم اسے کہاں رکھو گے' خانقاہ میں تو تمہیں رہنے کی اجازت اس کے بعد نہیں ملے گی۔"

"میں کوئی راہ سوچ لوں گا۔" اس نے نہایت کمزور آواز میں کہا۔

"تم حضرت عمر بن عثمان مکی سے کیوں نہیں کہتے۔ شاید وہ اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد کر سکیں۔" منصور نے دوستوں کی طرح بات کی۔

"نہیں ہرگز نہیں۔ وہ کسی علائق دنیوی میں لگے نوجوان کو وہ سارے اسباق اور مجاہدے نہیں سمجھائیں گے جو میں سمجھنا چاہتا ہوں۔" حسین نے سوچتے ہوئے کہا۔

"تو پھر یہ بات تقریباً ناممکن ہی سمجھو۔ وہ اقطع کے دوست ہیں اور تمہارے مہربان ہیں۔ جب وہ اس بات سے خوش نہ ہوں تو ایسا قدم اٹھانے کا فائدہ۔" منصور نے مشورہ دیا۔

"میں کوئی راہ سوچ لوں گا۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔" حسین نے بات ختم کر دی اور منصور نے بھی سوچ لیا کہ اس سے اور بحث بیکار ہے۔

منصور ریشم کے سوداگروں سے ملتا رہا۔ وہ پہلی بار بغداد آیا تھا اور یہاں کی شان و شوکت نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ افراطِ تماشا اور فرحت و انبساط خوشگوار ہوا' کنارِ آب کشتیاں اور تحفظ کے احساس کے ساتھ شاہراہوں پر چلتے لوگوں کا ریلا۔ شاندار محلات اور شرق و غرب میں پھیلا ہوا شہر۔ خوب صورت مسجدیں اور بازاروں کی آبادی دکانوں کی بہتات۔ زر و جواہر اور زرنگار لباس اور خوبصورت نازنین عورتیں' خچروں پر چڑھ کر خرید و فروخت کرتی لونڈیاں۔ ریشمی جھلملاتے لباسوں میں اپنے سپاہیوں کے حلقے میں سواریوں پر نکلتے سردار' محفے اور محمل اور اونٹوں کی قطاریں کھجور کے درختوں کے جھنڈوں میں سے دکھائی دیتے مسجدوں کے مینار' بزرگوں کے

مقابر اور خانقاہیں اور زاویے اور صومعے کارواں' سرائیں اور بھیڑ میں اپنا راستہ بناتے ہوئے لوگ۔ ایسی رونقیں جو صرف یہاں کے لیے مخصوص تھیں۔ اس نے ایران کی برتری اور سلطنت کا مصرف بزرگوں کی زبانی سنا تھا' عربوں نے جب سے ایران پر قبضہ کیا تھا اور بغداد مرکز بنا تھا دنیا کی ساری رونقیں یہاں آگئی تھیں۔ داریوش اور گشتاسپ اور کسخرو اور لہراسپ اور معبدِ ناہید سب پر ایک مردنی چھا گئی تھی۔ گو کسی عبادت گاہ کو منہدم کرنے کا سرکاری حکم کبھی دیا نہیں گیا' امن وامان سے اپنے اپنے طریقوں پر چلتے رہنے سے کبھی لوگ روکے نہیں گئے مگر وہی بات کہ حاکمِ وقت کا مذہب دلچسپی اور کشش کا باعث ہوتا ہے۔ پھر اس کی سچائیاں' اس کی ہمہ گیری' اس کی معجزاتی فتوحات' رسمِ سرفروشی جسے وہ شہادت کا نام دیتے تھے اور دشت و کوہ میں ایک ہی صدا گونجتی تھی۔ پرانے مذاہب کی ساری خوبیاں جب اس میں تھیں اور آسان راہ تھی بہشت اور دوزخ میں سے جو سستا سودا تھا وہ لوگوں نے خرید لیا تھا۔ خود منصور نے نہایت سادگی اور پاکیزگی کو سمجھ کر اسلام کو اپنے لیے چن لیا تھا۔ کاش محمی کو پتہ چل سکتا۔ وہ آتش پرست سادہ دل محبت کرنے والا اس کا باپ جان سکتا تھا کہ اس کے بیٹے نے اس راہ کو کیوں چنا تھا؟ مگر اب وہ کسے بتائے۔ باپ اور بیٹوں کی راہیں اکثر جدا ہو جایا کرتی ہیں۔ اس نے حسین کا سوچا۔

اس کے بعد منصور کے اور حسین کے درمیان کبھی اقطع کے گھر کی بات نہیں چلی۔ یہاں تک کہ منصور کے رخصت کا زمانہ قریب آ گیا۔

"کیا تم بیضا واپس نہیں چلتے۔" اس نے بیٹے سے کہا۔

"نہیں پدرِ محترم۔ میرے لیے یہی جگہ مناسب ہے۔ مجھے اپنے اسباق ابھی حضرت عثمان مکی کے ہاں سیکھنے ہیں مگر یہ تعجب کی بات ہے مجھے مرید بنانے سے انہوں نے انکار کر دیا ہے۔ اشکال کی وضاحت وہ کرتے ہیں مگر میرا دل بے حضوری میں بھٹکتا رہتا ہے۔ کاش مجھ پر ان کی وہی توجہ ہو سکے جو ایک زمانے میں تستر میں عنایت کی نظر مجھ پر تھی۔"

تم تستر واپس کیوں نہیں چلے جاتے۔ ان میں درگزر اور عفو کی بہت طاقت ہے۔ ذکر کی محفلوں میں جب مرشد کی توجہ تمہاری طرف نہ ہو تو تم کامیاب ہو گے۔"

منصور نے بہت مایوسی سے کہا۔

''کبھی کبھی میں سمجھتا ہوں یا مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرشد کی ضرورت مجھے نہیں ہے۔'' حسین نے دبے لفظوں میں بہت سہم کر کہا۔

منصور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو حسین۔ کیا بغیر استاد کے 'بغیر مرشد کے کسی نے یہ جان جوکھوں کا سفر طے کیا ہے۔ کبھی تم نے دیکھا ہے کہ کوئی کشتی بغیر ملاح کے بحر محیط پر رواں ہو سکتی ہے۔ ذکر کا اذن بھی جب تک اپنے مرشد سے نہیں ملتا اس میں کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکو گے۔''

''مگر پدر محترم میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ مجھے مرید بنانے سے انکاری نہیں ہیں مگر ہمیشہ نہایت عمدگی سے ٹال دیتے ہیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر جنگل تاریک ہو اور راہ بتانے والا ایک کنارے پر کھڑا ہو تو بہر حال کوئی منزل تو کھوٹی نہیں کرتا۔ سفر جاری رہتا ہے۔'' حسین نے بات ختم کی۔

''جب سالار کارواں کے بنا چلو گے' تنہا چلو گے تو کسی منزل پر نہیں پہنچ پاؤ گے' نہ سلوک کی اور نہ طریقت کی۔'' منصور نے نہایت تلخی سے کہا۔

''کچھ خزانے ہیں جو ہاتھ لگ جائیں تو بہت ہوتے ہیں۔ اپنا سفر آسانی سے طے کیا جا سکتا ہے۔'' حسین نے مبہم سا جواب دیا۔

''تم یہ کیوں معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ وہ تمہاری طرف اتنے ملتفت کیوں نہیں ہوتے۔'' منصور نے کہا۔

''جس طرح آپ کسی کو زبردستی اپنے ساتھ محبت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے اسی طرح سے آپ کسی خدا کے نیک' برتر اور خود آشنا انسان کو بھی محبت پر مجبور نہیں کر سکتے۔ یہ بھی باہمی کشش ہوتی ہے۔ پدر محترم' اور عمر بن عثمان مکی میرے لیے وہ کشش نہیں پاتے۔ میں بھی مجبور ہوں۔''

''عجلت سے کام نہ لینا۔ حضرت جنید بغدادی یہیں ہیں۔ ان کے پاس زانوئے تلمذ تہہ کرو۔ ہمیشہ سے تم نے اپنے معاملات اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ اور تم' کیا

تمہارے لیے اچھا ہے بہتر سمجھتے ہو' میرے پاس تمہارے لیے صرف دعائیں ہیں اور یہ تمنا کہ تم بیضا آ سکو۔"

رمضان المبارک کی شب بیداریاں اور عبادات' خانقاہ میں ہجوم عاشقاں اور ذکر و فکر کی محفلوں میں شوریدہ سر لوگوں کا حلقہ۔ وہ رونق بھری راتیں جب شقی و سعید سب خدا کے خوف اور خلق کی شرم سے آباد مسجدوں میں قیام کرتے دیوانے اور دیوانے ہوتے۔ سرشاری و محبت کی راتیں بے خودی اور سرور کی' نغمۂ صبح گاہی سے ملتا ہوا نالۂ نیم شبی۔ سحر کی خبر لاتی ہوئی شبیں اور شب کی سیاہی کو چاک کرتی ہوئی اذانیں اور اپنی جان کو ہلاکت سے ملاتے ہوئے نمازی اور محبت رسولؐ میں سینہ چاک کرتے ہوئے ساز سرمدی پر نثار ہوتے آدمی گرم دلوں پاک نگاہوں اور بے تاب جانوں کے ساتھ ناممکن کی تمنا کرتے انسان۔ غیب و شہود کے فرق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ناسمجھ اور مرغ بسمل کی طرح پھڑکتے ہوئے عاشق زار اور حیرت سے نیم بیہوش حسین۔

یہ وجود کیا ہے؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا'

یہ شہود کیا ہے؟ وہ اپنے آپ سے پوچھتا۔

اس کی رگِ جاں کے قریب دھڑک کر کوئی کہتا: "تمہاری پہنچ سے باہر' تمہاری سمجھ سے ماورا۔ اور تمہیں بتانے والا کوئی نہیں۔ تم ایک ایسا تار ہو جو کسی ساز پر بھی' کسی طنبور پر' کسی بربط پر کسی سنبالہ پر کبھی آزمائے نہیں جاؤ گے کہ کسی نغمے میں مل سکو۔ تمہاری آواز الگ اور تنہا اور سب سے دور یونہی دشتِ زندگی میں بھٹکتی رہے گی۔"

عمر بن عثمان مکی اس کا خیال رکھتے۔ اس کی سحر و افطار کی خبر گیری کی جاتی۔ اس کی ضروریات کا یوں خیال کیا جاتا جیسے وہ کوئی نہایت ہی نادر شے یا کوئی بیش بہا تحفہ یا کوئی عزیز ترین مہمان ہو۔ تراویح میں جب مستقل قیام اور نوافل سے پاؤں پر ورم آ جاتا تو وہ بڑی محبت سے اس کی طرف دیکھتے۔ وہ کیسے اپنی جان گھلا رہا تھا۔

وہ پتہ نہیں کہاں پہنچنا چاہتا تھا۔

جیسے آفتاب کی زد میں رہنے سے آئینے کا صیقل دھندلا جاتا ہے' جیسے

آئینوں کی زد میں آدمی کی شکل سنولا جاتی ہے جیسے تیز روشنی سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور نظر پھٹ جاتی ہے حسین بھی آئینوں کی، روشنیوں اور آفتابوں کی روشنی کے سنگم پر تھا اور وہ اپنا آپ معدوم کر رہا تھا۔ وہ اتنی لمبی جست کیوں لگانا چاہتا تھا؟ اسے اپنے بال و پر کی قوت اور اپنی ممکنات کا صحیح ادراک کیوں نہیں تھا؟ ـــ کبھی کبھار وہ سوچنے لگتے مگر ان کی نگاہ میں وہ سب تھا جو وہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پردوں سے پرے جدِادراک تک ان کے نظر نے خود دیکھ لیا تھا جو دیکھ لیا تھا اور وہ رمضان المبارک کے اختتام پر اس سے یہ سب کہنا چاہتے تھے۔ وہ اسے اس بے راہرو دیوانگی سے باز رکھنا چاہتے تھے۔

وہ طہارت خانے کی طرف گئے اور پھر وضو کرتے ہوئے ایک طالب علم سے باتیں کرنے لگے جو ایک اشکال پر کسی ساتھی سے گفتگو کر رہا تھا۔ وضو کی اہمیت اور پاکی اور مختلف اوقات کے لیے احکامات اور قضا نمازوں سے متعلق احادیث، مختلف مکاتیبِ خیال اور قرمطہ کا ہر واجب غسل مقام پر بھی صرف وضو سے کام چلا لینا اور یہ طرفہ تماشا جو ان کے مذہب کی عوام میں مقبولیت کا سبب ہوا، اس لیے کہ عام آدمی سہل پسند تھے اور عمر بن عثمان مکی وضاحت کی خاطر کافی ویران لوگوں کے درمیان رہے۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ درس دیتے رہے اور دیر تک بے تاب جانیں اپنی محرومی اور غفلت پر خون کے آنسو رویا کیں۔ حضرت خود بھی بہت پریشان ہوئے۔ نالہ و شیون اور آنسوؤں کے درمیان توبہ واستغفار کا جہاد ہوتا رہا۔ انہوں نے ایک نظر دیکھا۔ پھر دوبار دیکھا۔ ادھر ادھر نظر کی۔ حسین کہیں نہیں تھا۔ اور حضرت کو اس کی رونے والی آنکھ ساری آنکھوں سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ بے پناہ آنکھیں بغیر نالہ و بکا کے یوں بہا کرتی تھیں جیسے دو دریا رواں ہوں۔ انہیں اس کا رونا بہت پسند تھا۔ خدا کے خوف سے جان کی ساری بے تابی سے الحاح وزاری سے عاجزی سے، آج محفل کی رونق جی کو نہیں لگی تو انہوں نے پاس ہی بیٹھے ایک حبشی زادے سے کہا:

"حسین کہاں ہے۔"

"حسین کہاں ہے۔" حلقے میں بیٹھے لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

زاویے کے گوشوں میں' خانقاہ کے دالانوں میں' مسجد کے حجروں میں ہر جگہ تلاش کیا گیا۔

کیا وہ بیمار ہو گیا تھا؟

پریشان لوگوں نے حضرت عثمان مکی کی تسلی کی خاطر اسے ہر جگہ ڈھونڈا۔ اس جگہ جہاں اس کا بستر اور کتابیں اور دو جوڑے کپڑے رکھے رہتے تھے' سب چیزیں موجود تھیں۔

نماز کے بعد بھی وہ نہیں تھا۔ حضرت نے باقی لوگوں کو تاکید کی کہ جب حسین آئے تو فوراً انہیں اطلاع کی جائے۔

نماز ظہر کے بعد جب حضرت جائے نماز پر تھوڑی استراحت کی خاطر گھڑی دو گھڑی لیٹ جاتے تھے' لیٹے ہیں تو انہیں بے چینی محسوس ہوئی اور لیٹا نہ گیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ توجہ ہٹانے کی خاطر انہوں نے جائے نماز الٹا جہاں پر گنج نامہ رکھا رہتا تھا اور جس کو وہ کسی قیمتی راز کی طرح یہاں رکھتے تھے اور جو اکثر ان کے زیر مطالعہ رہتا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر جائے نماز الٹ دی۔ اس کو جھٹکا۔ ادھر ادھر دیکھا مگر گنج نامہ کہیں نہیں تھا۔ روح کا گنجِ شائیگاں رازوں کا گنج گرانمایہ۔ جو اسرار و رموزِ الٰہی سے واقف نہ ہوں' ان کے لیے سراسر ہلاکت اور جو جانتے ہوں ان کے لیے نہایت نازک مقامات تک بغیر راہ نما کے بیکار اور جو ان رازوں سے پردہ اٹھائے گا اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں گے۔ اور اس کو دار پر کھینچا جائے گا۔ اس کا جسم باب الحجر پر جھولے گا۔ بغداد کی ساری ذلتیں اس کا نصیب ہوں گی۔ گنج نامہ کوئی معمولی راز نہ تھا۔ اس پر بے فیض کی دسترس اس کے لیے جان کازیاں۔ .

ابو ایوب اقطع کی بیٹی زینب سے حسین کا عقد ایک الگ داستان ہے۔ اقطع کی طبیعت' زمانوں سے خراب تھی۔ کبھی وہ بہت ہی بیمار ہو جاتے اور اہلِ خانہ کے نالہ و شیون سے ہمسایوں کو بھی پریشانی لاحق ہو جاتی اور پھر یک بیک وہ سنبھل جاتے جیسے مرض الموت انہیں چھو کر نکل گیا ہو۔ طبیبوں کا خیال تھا کہ انہیں ضیق النفس کی بیماری ہے اور اپنے طور پر وہ بہترین دواؤں سے انہیں بچانے کی کوشش کرتے رہتے۔

حسین وہاں سے گزرا تو اس نے باہر دروازے پر اقطع کے سب سے چھوٹے

بیٹے کو روتے اور سسکتے پایا۔ تسلی دینے اور سبب پوچھنے کے بعد وہ اس کے ساتھ ہی دو ایک مزاج پرسی کرنے جانے والوں کے ساتھ اندرون خانہ چلا گیا۔ اقطع پر عجیب تشنج کی سی کیفیت طاری تھی اور اس میں جب جب انہیں ہوش آتا تو کہتے:

"یہ میرا آخری سانس ہے۔ اے کاش میں زینب کے فرض سے سبکدوش ہو کر جاتا۔"

گھبرا کر بغیر سوچے حسین نے کہا: "میں حاضر ہوں، عم بزرگوار، میں حاضر ہوں۔"

اقطع نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ خوش ہو گئے۔ اسی وقت قاضی بلائے گئے۔ نہایت خاموشی، رازداری اور بے انتہا سادگی سے انہیں دو گواہوں کی موجودگی میں زینب بنت اقطع کا نکاح حسین بن منصور سے ہو گیا۔

وہ دن بھی عجیب دن تھا۔ گرد آلود، اداس، روشنی اور اندھیرے کے درمیان کہیں بھٹکتا ہوا ساریت جیسے دشتِ سُوس سے محض حسین کی تنہائی دور کرنے اور اس کی دلداری کے لیے زرد اور سرخ اور سیاہ لہریوں میں آ آ کر برس رہی تھی۔ چیلیں اپنے کو ہوا کے سپرد کیے نہ اڑتیں اور نہ بولتیں نہ چھتوں اور منڈیروں پر منڈلاتیں اور نہ ہی جھپٹتیں۔ بے خودی کے عالم میں انہوں نے طوفان کے بہاؤ پر اپنے آپ کو چھوڑ رکھا تھا اور لہروں کے ساتھ تنکوں کی طرح بہی چلی جاتیں۔ بے کیفی کی کیفیت سے یوں ہی دل سینوں میں سکڑے جاتے تھے۔ بوجھل طبیعت اور تقریباً جاتے ہوئے اقطع۔ جب سانس اکھڑنے کی کیفیت ہوئی اور موت کی آخری گھڑی کی بے سکونی شروع ہوئی تو حسین ان کے قریب ہو بیٹھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ان کے سینے پر رکھا اور دعائیں پڑھنے لگا۔ جان کنی کی شدت میں وہ کانپے اور انہیں لگا جیسے کسی نے ٹھہرتے ہوئے تڑپتے اور گھبراتے دل پر مرہم رکھ دیا ہو۔ انہیں سکون آ گیا۔ دل کی دھڑکنوں میں جیسے روانی پیدا ہوئی۔ موت کی زردی میں خون کی سرخی ملنے لگی۔ بے قراری دور ہوئی تو انہوں نے بیوی اور بچی اور حسین کو دیکھا۔ بیمار پرسی کے لیے آنے والے چہروں پر طمانیت دیکھی۔ چھوٹے بیٹے کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ گو نہ تسلی سے ان پر تھکن کے بعد کی کمزور نیند چھا گئی۔

حسین نے زینب کو دیکھا۔ عجیب سوختہ چہرہ جس پر خوشی تھی اور نہ ہی کوئی جذبہ۔ ایک اجنبی کے لیے کیا محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دکھ اور مصیبت کی طویل شب بیداری کے بعد ایک زلزلے اور انہدام سے بچ جانے کی حیرت جو معجزہ تھی۔ موت کی دہلیز کو پار کرنے کے بعد وہ پلٹ آئے تھے۔ حسین نے ہلاکت کے متوقع خوف کی وجہ سے اپنے آپ کو اس میں جھونک دیا تھا۔ اس کا ذاتی فیصلہ اس تعجیل سے اپنے آپ کو زندگی میں گرفتار کرنے کا نہیں تھا۔ منصور کے خواب؟

خوف اور موت کی بے پناہی سے بچے ہوئے قافلے کے مسافروں کی طرح ان سب کو اس گھڑی ایک دوسرے کے وجود کا احساس ہوا تھا۔ اقطع کی بیوی نے سوچا اس عجلت کو لوگ کیا کہیں گے؟ خلقت کا بے جا خوف جس سے انسان کبھی آزاد نہیں ہوسکتا۔ اقطع بھی بیدار ہوں گے تو سوچیں گے وہ اسے بس واجبی ہی جانتے تھے کہ وہ عمر بن عثمان مکی کے دروس میں شریک رہتا تھا اور خانقاہ میں مقیم تھا۔

وہ سر جھکائے بیٹھا رہا جیسے اپنے انجام سے خوفزدہ ہو۔ کیا اس کی آرزو پوری ہو گئی تھی۔

اور باہر زرد غبار درختوں اور چھتوں' گھروں اور دریا کے گرجتے دھارے پر گرتا رہا۔

اقطع اٹھے تو عثمان مکی کا فرستادہ ایک حبشی زادہ ان کی طبیعت دریافت کرنے آیا۔ اقطع نحیف و نزار مگر روبصحت تھے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مسکرا کر اسے خیریت کا بتایا مگر بولے کچھ نہیں۔ انہوں نے اپنے سامنے بیٹھے حسین کو دیکھا اور خواب کی دیکھی صورت حال ان پر روشن ہوئی۔

انہوں نے اس سے پوچھا:

''تم کہاں کے رہنے والے ہو عزیزم۔''

''میں بیضا کا باشندہ ہوں۔ میرا باپ منصور ریشمی کپڑا بُنتا اور بیچتا ہے۔ میرا دادا محّمی مجوسی تھا۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

''اور تمہارا والد۔'' انہوں نے استفسار کیا۔

''وہ اور میں دونوں مدینۂ رسول کے ذرات خاک ہیں۔ میں ایک سال

دربارِ خلافت میں حاضر رہا ہوں اور اب حضرت عمر بن عثمان کے دروس میں شامل ہوتا ہوں۔ گو ان کے سلسلے سے منسلک نہیں۔"

اقطع خاموش رہے۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ نمازِ عصر کے وقت سے ذرا پہلے خود شیخ خانقاہ تشریف لائے۔ بیمار پرسی کے بعد اقطع سے کہنے لگے۔

"میں نے آج دروس میں حسین کو غیر حاضر پا کر اسے یہاں وہاں پوچھوایا تھا۔"

"میں نے زینب کا عقد اس سے کر دیا ہے۔" اقطع نے معمولی روزمرہ کی بات کی طرح ان سے بیان کیا۔

حضرت عثمان مکی بیٹھے سے کھڑے ہو گئے۔ "یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ ناممکن۔ آخر کیوں؟"

"مگر صاحبِ سلوک' یہ ہو چکا ہے۔" اور انہوں نے واقعہ سنایا۔ وجہ بتائی۔

"اس کو اب بھی پھیرا جا سکتا ہے۔" حضرت نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" حسین نے سر اونچا اٹھائے بنا جواب دیا۔ "جو ہو چکا' سو ہو چکا۔"

"مگر برخوردار۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ مطلب یہ ہے زندگی میں خوشیوں اور عجلتوں سے اور چیزیں افضل ہیں۔" وہ نہایت حیران تھے۔

"یہ مقدر کا لکھا ہے اور اَن مٹ ہے۔" حسین نے کہا۔

"تمہیں مقدر کا کیا معلوم ہے۔ یہاں تقریباً اجنبی ہو۔ تمہارا ٹھکانہ نہیں ہے۔ کوئی ذریعۂ روزگار نہیں ہے۔"

حسین نے نہایت ادب سے جھک کر کہا:

"میرا مقدر یہی ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ اب میرا ٹھکانہ اقطع کا گھر ہے اور روزی رساں خدا ہے۔"

حضرت عمر بن عثمان چپ چاپ اس کی طرف دیکھتے رہے جیسے کہنے کو کچھ باقی نہ رہا ہو۔

ان کے ماتھے کی لکیریں گہری فکر مندی کی حامل تھیں اور وہ درس کے دوران

رُک جاتے۔ گنج نامہ اپنی جگہ پر تھا اور انہیں واپس مل گیا تھا مگر کون اتنا جرأت مند دلیر اور بے پرواہ تھا کہ اس نے ایک مخفی راز کو چرایا۔ انہیں یاد آتا۔ یونانی دیوتاؤں کی کہانیوں میں انہوں نے پڑھا تھا کہ آسمان سے آگ چرانے والے دیوتا کو زنجیروں سے باندھ کر سزا دی گئی تھی۔ اسے چٹان سے لڑھکایا جاتا۔

حسین اب ان کے دروس میں شریک ہوتا مگر مغائرت کی دیوار اب ان کے درمیان زیادہ اونچی ہو گئی تھی۔ اسے لگتا وہ دھند میں لپٹا چلا جاتا ہے اور راہوں پر کانٹے بکھرتے جاتے ہیں۔ اسباق کے اور اس کے درمیان مرشد کی دعا نہیں تھی اور وہ میدان کارزار میں اکیلا سپاہی تھا کیونکہ اقطع اور حضرت کے تعلقات بھی تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ نفرت کی بنیادیں اونچی ہونے لگیں اور اس کی طرف توجہ کم سے کم تر ہوتی گئی۔

وہ زاویہ میں بیٹھ کر غور وخوض کرتا۔ اشکال کی توجیہہ کرنا چاہتا اور اس انکار کے بعد اب اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ ان کی وضاحت کے لیے شیخ کی طرف رجوع کرے۔ وہ اوراد و وظائف میں لگتا مگر دل اڑتا رہتا۔ منصور نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ مرشد کی دعا کے بغیر وہ کہیں نہیں پہنچ سکتا۔ وہ جب کسی سے دعا کا طالب نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنی مشکل میں مدد کی درخواست نہیں کر سکتا تھا۔ شیخ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے تو وہ کیا کرے؟

گنج نامے کے مضامین میں لکھا تھا کہ فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا' ابلیس نے انکار کر دیا۔

فرشتوں کا اقرار ان کے ناواقف ہونے کی وجہ سے تھا اور ابلیس کا انکار محرمِ اسرار ہونے کی وجہ سے اور اس کے مردود ہونے کی بھی یہی وجہ ہے۔

زمین کے مخفی خزانوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور ابلیس ان کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ خزانہ پانے والے کا تو سر قلم کر دیا جائے گا اور تجھے کاذب سمجھ کر لوگ تیری باتوں کا یقین نہیں کریں گے جو شخص جمالِ کعبہ کا مشاہدہ کرنا چاہے تو نفس کو شق کرنے سے قبل ایسا کرنا ممکن نہیں۔ قربِ الٰہی کا خواہاں شخص روح کو شق کیے بنا قرب حاصل نہیں کر سکتا' مگر اس راستے میں دو ہزار آگ کے پہاڑ اور ایک ہزار

ہلاکت خیز بحرِ بیکراں ہیں جوان دونوں سے خائف ہوئے بغیر راستہ طے کرنا چاہے وہی اس میں قدم رکھے۔

زمین کے مخفی خزانے اور ان کے اسرار ابلیس کے انکارِ سجدہ کا اسرار۔ فرشتوں کے سجدہ کا اسرار۔ روح کے شق کا اسرار۔ قرب الٰہی کا اسرار۔ نفس کے شق کا اسرار۔ اسے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ اسرار ہیں مگر وہ کیا ہیں اس کی خبر اسے نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے گنج نامہ کے سارے مطالب نقل کر لیے تھے مگر ان پر قادر ہونا' یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔

زینب اسے دیکھتی اور اپنی ازدواجی زندگی کی بے بضاعتی پر غور کرتی۔ اس کے جی میں کتنے طوفان تھے اور حسین اس سے کتنا دور تھا۔ طبعاً وہ خاموش تھی اور سوال کرنا اس کی عادت نہ تھی۔ وہ اپنے والد کے گھر میں تھی اس لیے ضروریات زندگی کے لیے بھی وہ محتاج نہ تھی مگر جس زندگی کا تصور اس نے کیا تھا وہ کہاں تھی۔ کس گوشے میں۔ کس قریے میں۔ کس ملک میں۔ کہاں کہاں؟ کیا یہ زندگی تھی کہ وہ جو اس کا ساتھی تھا اپنی عبادت میں منہمک رہے۔ زاویے میں مشقیں کرے اور وہ محض حاشیہ نشین کی طرح اس کے آزار جان سے بے خبر اس کی حالت تباہ کو دیکھ کر اس کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ وہ جب اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتی' بولتی تو اس کی آواز سن کر حسین پر کپکپی طاری ہو جاتی اور لگتا اسے لرزے سے بخار چڑھ رہا ہے۔ کیا اس کی آواز اتنی ناگوار تھی۔ اس نے بات کرنا بھی تقریباً ختم کر دیا اور وہ دیکھتی کہ حسین کو پروا نہیں تھی۔ اس نے آخر کیوں اس کے باپ پر رحم کھا کر محض عقد کیا تھا۔ اگر اقطع نہ رہتے تو کیا وہ جی نہ سکتی تھی۔ اسے والد سے شکایت تھی مگر اب وہ وقت گزر چکا تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ حسین کی ریاضتوں' اس کی عبادات' اس کا کھویا کھویا ہونا' کھانے سے بے رغبتی' لباس کی طرف سے بے پرواہی' یہ سب اس لڑکی کی آنکھوں کے سامنے دن رات ایک تماشے کی طرح ہوتا تھا۔ وہ کیا کرے؟

عقد سے پہلے عم بزرگوار عمر بن عثمان اس کے سر پر دستِ شفقت رکھتے تھے مگر اب وہ بھی ان کے ہاں نہیں آتے تھے۔ وہ کس سے کہے اور اس نے اس جینے سے کیا پایا تھا۔ وہ کس سے کہے کہ اس جینے سے تو موت اچھی تھی۔ یہ ہر گھڑی کی جلن تھی۔ وہ

بے فکری' آزادی' ہجولیوں کے ساتھ کھیل اور خوش گپیاں کسی دوسری دنیا کی باتیں تھیں وہ جاگی ہے تو یہ ایک جہانِ نو تھا۔ وہ اکیلی تھی اور چاروں طرف گرجتے ہوئے طوفان تھے۔ وہ جو اس کا ساتھی تھا اسے اکثر یوں بیٹھے بیٹھے ہنسی آتی۔ وہ بھلا اس کا ساتھی تھا ہی کہاں۔ اجنبی کسی اور سر زمین سے یہاں پر وارد ہوا اور اس گھڑی اس کے اپنے مقدر پر مُہر لگ گئی تھی۔ عمر بن عثمان ٹھیک ہی کہتے تھے یہ نباہ کہاں ہو سکتا تھا۔ وہ بے قرار روح کی طرح تڑپتا ہوا' بے پناہ آنکھوں والی بے چین نگاہوں سے ہر طرف متلاشی اور گم کردہ راہ بھی۔ وہ شکایت کس سے کرے۔ یہ نوجوان تو خود اتنا بے بس اور تنہا لگتا تھا کہ اسے اس پر رحم آنے لگتا۔ پھر اسے اس کی چھٹی حس نے خبردار کرنا شروع کیا کہ اس کی آواز میں کچھ تھا۔ کسی بیتے ہوئے وقت کا پرتو' کسی بھولی ہوئی راگنی کا لہریا' جو اسے کپکپا دیتا تھا۔ وہ کون تھی؟

ایک دن اسے بلوایا گیا۔ حضرت شیخ سخت جوش میں تھے اور وہ کئی دن سے دروس میں شریک ہونے کی بجائے زاویے کے الگ گوشے میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔ عجیب بات تھی جب حسین غیر حاضر ہوتا تو شیخ الجھ جاتے۔ اس کی توجہ کے وہ عادی ہو چکے تھے۔ ان کے سلسلے میں وہ داخل ہونا اس کے مقدر میں نہیں تھا۔ اس کی پیشانی پر لو کی طرح سلگتی ہوئی روشنی جو انہیں دکھائی دیتی تھی' اس بات کی مقتضی تھی کہ وہ جذب و سلوک کی منزلیں از خود طے کرلے گا۔ وہ آج کل کیا لکھ رہا تھا' وہ یہ جاننا چاہتے تھے۔ وہ اس عقد سے بھی خوش نہ تھے۔ ان کے اور اقطع کے درمیان اس کی وجہ سے خلیج حائل ہو گئی تھی۔ مگر وہ بہر حال ان کی امان میں تھا اور اس کی ترقی کے مدارج میں جب وہ زندگی حائل نہیں ہوئی تو انہوں نے اس کی طرف توجہ کی۔

''حسین تم دروس میں شریک نہیں ہوتے۔ کیا وجہ ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''شیخ۔ میں چند اشکال کے مطالب جاننا چاہتا ہوں اور انہیں حل کرنے میں لگا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا ایسی اشکال کا جواب تم خود تلاش کر سکتے ہو۔'' انہوں نے پوچھا۔

ہولے ہولے بہت دکھ سے اس نے سر بلند کیا جیسے تڑپتے ہوئے کسی وجود کو بالآخر اس کی تڑپ کا پوچھا گیا ہو۔

"کیا روح کے شق ہونے کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ روح اور دل کیونکر شق ہوتے ہیں۔"

شیخ عمر بن عثمان کے سارے وجود کو ایک جھٹکا لگا جیسے زلزلہ ان کے پورے جسم میں سے بجلی کا لہریا ان کے پاؤں سے سر کی طرف نکل گیا ہو۔ وہ اپنی پوری آنکھیں کھول کر حیرت زدہ اس کی طرف دیکھتے رہے۔

تو یہ حسین بن منصور تھا۔ گنج نامہ کو لے جانے اور پھر لوٹا دینے والا۔

وہ جانے کن نگاہوں سے کب تک دیکھتے رہے کہ حسین پر غشی طاری ہو گئی اور وہ زخمی پرندے کی طرح وہیں ان کے قدموں میں گر گیا۔

حضرت جنید بغدادی مدرسہ نظامیہ کے استادِ اعلیٰ' عالمِ بے بدل اور بغداد کی روح رواں تھے۔ انہیں علم و عمل کا سرچشمہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ بحرِ طریقت و شریعت کے شناور انوارِ الٰہی کا مخزن اور مکمل علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ وہ شیخ الشیوخ' زاہد کامل اور سلطان المحققین تھے۔

حسین نے عمر بن عثمان کے دروس سے مراجعت کی اور اقطع سے مشورہ کر کے حضرت جنید کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے لیے حاضر ہوا۔

غشی کا اثر اس پر اب بھی تھا۔ اڑی ہوئی رنگت' بہکی بہکی نگاہیں' سرمستی و بے خودی طاری جیسے بہت پیے ہوئے ہو۔

شیخ الشیوخ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: "یہ کیا ہے؟"

حسین نے اپنے جھومتے ہوئے سر کو سنبھالنے کی کوشش میں کہا: "میں ذاتِ الٰہی میں فنا ہونا چاہتا ہوں۔ نظارگی میں میری ہوشیاری اور سرمستی حائل ہے۔"

شیخ دیر تک مسکراتے رہے جیسے بہت محظوظ ہو رہے ہوں۔

"تم نے ہوشیاری اور سرمستی کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ کتنی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو۔ یہ سب تم نے کہاں سے سیکھا ہے۔ جب تک اپنی نبضوں پر آزمانہ لو کچھ مت کہو۔ یہ نمود و نمائش ہے جس میں تم گرفتار ہو۔ تم لوگوں سے کیا منوانا چاہتے ہو۔" وہ اب خفا تھے۔

حسین نے سہم کر ان کی طرف دیکھا۔ اسے لگا اس کے حواس واپس آرہے ہیں۔ اسے اپنی حالت پر بہت شرم محسوس ہوئی مگر اپنی غلطی مان لینے کے لیے جو حوصلہ

چاہیے وہ اس میں نہیں تھا۔ آزادیٔ اظہار کسی سلسلے سے منسلک ہونا یہ اس کے الجھاوے نہ تھے۔ گنج نامہ سے اس نے جو پایا تھا وہ سمجھتا تھا جیسا کہ پہلے اس نے سمجھا تھا کہ اس کے لیے کافی ہے اور اسے کسی استاد کی ضرورت نہیں نہ شیخ کی نہ مرشد کی۔ عجیب سوچ تھی اس کی۔

جنید نے پھر کہا:

''تم جن منزلوں کا ذکر کرتے ہو۔ جن پر ہونے کا تمہیں دعویٰ ہے ابھی تم کو ان راستوں پر چلنے والوں کی گرد راہ تک کی خبر نہیں' بہروپئے بن کر خلق خدا کو گمراہ مت کرنا' پہلی شرط تمہاری تربیت ہے۔''

حسین نے کہا۔

''میں تو آپ کے حضور عقیدت مندی سے حاضر ہوا ہوں' سرزنش کے لیے نہیں۔''

''میرا کام بھٹکے ہوئے لوگوں کی راہ نمائی کرنا اور کم از کم راہ کی نشاندہی کرنا ہے۔ تم راہِ حق کے مسافر ہو تو عقیدت مندی کے لیے دل کو فراغ رکھو۔ خدا جو مبداء فیاض مالک حقیقی ہے جو سب کی جانوں کا مالک اور میثاق ازل کی رو سے ہم سب کا رب ہے کیا اس کی راہ اتنی آسان ہے کہ تم کتاب پڑھ لو' مناجاتیں سیکھ لو اور پہنچ جاؤ گے۔۔۔۔ یہ جان جوکھوں کا کام ہے اور ان میں سخت محنت ہے۔ سمجھ لو کہ جب تک اس کا اذن شاملِ حال نہ ہو' کہیں پہنچ نہیں سکو گے۔ کیا یہ بچوں کا کھیل ہے۔''

حسین کے اندر کے سپاہی نے اس کے جامے میں چھپے دربار دار نے سر اٹھایا۔

''میں ریاکار نہیں راہِ طلبِ حق کا مسافر ہوں۔''

جنید پھر ہنسے اور دیر تک ہنستے رہے۔

''یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچہ کہے کہ میں افلاطون ہوں۔ داؤد ہوں۔ مسیحا ہوں۔ مہدی ہوں۔ پیغمبر ہوں۔ کعبۂ حق ہوں۔ درخت طور ہوں۔''

''جب یہ ساری خدائی بنائی گئی اور انسان کو اشرف المخلوقات سمجھا گیا' ابلیس سے اسے سجدہ کروایا گیا تو پھر یہ سب باتیں آدمی سے پرے کہاں ہیں۔'' وہ بحث کرنے پر اتر آیا۔

شیخ الشیوخ نے کہا:

"تمہیں ابھی تربیتِ نفس کی ضرورت ہے۔ مجاہدہ کرو۔ ریاضت کرو۔ غور کرو اور تم ابلیس کی حقیقت کو سمجھو۔ یہ بڑی بڑی باتیں تمہیں بھٹکا دیں گی۔ جاؤ اپنے مرشد کے پاس لوٹ جاؤ۔"

"مجھے یہ شرف آج تک حاصل نہیں ہو سکا۔" اس نے جواب دیا جیسے شرمندہ ہو۔

جنید کے لیے مدرسہ نظامیہ ایک آئینہ خانہ ہی تھا کیونکہ اپنے سفرِ معرفت پر چلنے سے پہلے، سری سقطی کے بھانجے ہونے کے باوصف وہ آئینوں کے سوداگر تھے۔ زنگ آلود آئینوں کو صیقل کرنا انہیں قابلِ استعمال بنانا ان کا پیشہ تھا۔ وہ سات سال کی عمر سے مجاہدہ و ریاضت کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ سلوک و طریقت کے معلوم اور نامعلوم راستے وہ شناورِ دریائے معرفت تھے اور اب بھی آئینہ سازی ان کا پیشہ تھا مگر اب دلوں کے آئینوں پر روغن کرتے تھے جیسے آئینے کو قابلِ استعمال بنانے کے لیے اس کی ایک طرف کو کثیف کیا جاتا ہے۔ وہ دلوں کو دنیاداری کی کثافتوں کے درمیان سے اٹھاتے تھے۔ پانیوں کے اندھیروں پر جیسے کنول کا روشن پھول کھلتا ہے۔ اسی طرح آدمی کی ہستی دنیاداری اور دنیاوالوں کے درمیان لوٹتی ہے۔ جب وہ اپنا سفر عرش اور فرش کے درمیان اور عرش سے پرے اور ذات خداوندی تک اور ادراک سے درے تک کر چکتی ہے۔ پھر وہ اس سب معرفت کے ادراک کے ساتھ روح کی لطافت اور اس کے بے پایاں حسن کے ساتھ واپس آتی ہے۔

جنید حسین کی طرف دیکھتے رہے۔ اسے اپنے مجاہدے پر ناز اور اپنی طاقت کا غرّہ تھا۔ اسے ابھی قرآن و حدیث کی تعلیم مکمل کرنا تھی۔ اپنی ذات و صفات اور اعمال کو دیکھ کر شناخت کرنا تھا۔ اس کی منزل ابھی دور تھی۔ ایک سپاہی کے غرور کے ساتھ جو اپنی مشقوں اور مشقتوں پر نازاں ہو۔ یہ ناز اس کو کہاں سے ملا تھا، وہ کیوں عاجزی کا راستہ اختیار نہیں کرتا تھا۔ اور حسین سوختہ دل سوختہ تن سوختہ جان بجلی کی طرح اس کی نگاہوں کو ہوش و خرد کو دونیم کرتا ہوا اغول کا سراپا کوند گیا۔ کیا یہ عشق تھا—اس کا حاصلِ حیات۔ وہ حسین تھا کہ وہ اغول تھا۔ اگر وہ نہیں تھا تو پھر وہ کون تھا۔

اغول۔ حسین۔ اغول۔ اغول۔۔۔۔ وہ چلّانے لگا۔ اس کا صبر و قرار رخصت ہو گیا۔ لو بھڑکی۔ حول اور قیامت کی گرمی اس کے تنفس میں شدت تھی۔ وہ قبض کی حالت میں تھا۔ حضرت جنید نے پانی پر پھونکا اور اسے پلایا تا کہ وہ رہائی حاصل کر سکے۔ محبت اس کی نوازش اس کی عطا اس کی طرف سے دی گئی توفیق اور مہربانی ہے۔ دائمی محبت کی تڑپ میں آدمی کی اپنی ہستی کو مٹ جانا چاہیے۔ نہ اغول رہے نہ حسین رہے۔

حضرت نے نہایت محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں خون کبوتر تھیں۔ ان میں سے لہو ٹپکتا لگتا تھا۔

"حسین۔ کیا تم بیضا نہیں چلے جاؤ گے۔ تمہارا باپ وہیں ہے اور نہایت سکون اور آسودگی سے وہاں تم اپنے اسباق پر غور و فکر کر سکو گے۔ سہل بن عبداللہ تستری اگر مریدوں کی طرف تھوڑی توجہ کریں تو وہ جگہ تمہارے لیے موزوں رہے گی۔ تم پہلے بھی وہاں رہ چکے ہو۔ یہاں بغداد میں تماشہ بن جاؤ گے۔ تم سمجھتے ہو نا گوشہ نشینی تمہارے اسباق کے لیے نہایت ضروری ہے۔"

جس شفقت سے انہوں نے اس کی مشکل کو سمجھا تھا، اقطع نے اس سے اتفاق کیا۔

تُستر میں یک سوئی اور وہ توجہ مل سکتی ہے جو یہاں مدرسے کے پھیلے ہوئے کاروبار اور درس و تدریس کی ذمہ داریوں میں حضرت جنید اسے نہیں دے سکتے تھے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ زینب اور حسن کو بیضا میں چھوڑ کر تُستر جائے گا۔ علائق دنیوی کا نبھانا کھیل نہ تھا۔ پھر بیضا میں منصور اکیلا تھا اور اس کا دل اپنے پوتے سے ضرور بہل جائے گا۔ تھوڑی سی طمانیت جیسے درخت کے پھولوں کو دیکھ کر مالی کو ہوتی ہے' اس کے باپ کو بھی ہو گی۔ ریشم کے کپڑے پر خوابوں کے مرقعے سجانے والے اس آدمی کو بھی تو کوئی حقیقی خواب چاہیے جس کی تعبیر اس کے سامنے ہو اور اس کے پاس وقت نہیں رہا تھا۔ یہ ایک اور ذاتی مسئلہ تھا جس کی الجھن وہ کسی سے بیان نہیں کر سکتا تھا۔

حسین نداف کی دکان بازارِ بزرگ کے ایک گلیارے میں تھی۔

روئی دھننے کی آوازیں صبح اذان کے بعد شروع ہوتیں اور رات گئے تک آتی

رہتیں جیسے ساز پر ایک ہی راگ گایا جا رہا ہو۔ کبھی وہ کسی ماہر مغنی کی طرح اس طنبور پر مختلف راگنیاں ترتیب دیتا ہوا لگتا۔ جب سورج کی سرخی ان پرانے مسقّف بازاروں میں اترتی چراغ جلتے اور چہل پہل شروع ہوتی تو وہ دکان کو کھلا چھوڑ کر خانقاہ کی طرف جاتا دکھائی دیتا۔

سہل بن عبداللہ تُستری اپنے حجرے میں ان لوگوں کو اذن باریابی دیتے جو عبادات میں لگے ہوئے ہوتے یا ایسی اشکال کی وضاحت چاہتے تھے جو انہیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ صومعہ کے مختلف گوشوں میں ریاضتوں میں جان لگاتے دیوانے۔ اس کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس کی اشکال نہ تھیں۔ وہ تو ان کے حجرے سے دور سیڑھیوں کے سرے پر بیٹھا رہتا۔ سر جھکائے' نظر جھکائے ___ بغداد میں اس کی تعجیل ایسی تھی جیسے برف پوش پہاڑوں میں سے رودِ دجلہ آفتابوں اور ستاروں کے سے خرامِ ناز میں داخل ہونے سے پہلے تند و تیز دھارے کی طرح پتھروں سے ٹکراتی اچھلتی' پھسلتی سنبھلتی اور بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی ہو۔ پہاڑوں کے دلوں کو چیرنے والے جوش اور ولولے سے ___ مگر یہاں آ کر تستر میں وہ خاموش گہرے پانیوں کی سی نرمی اور روانی سے سہل بن عبداللہ کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ اسے کچھ دریافت نہیں کرنا تھا۔ کچھ کہنا نہ تھا۔ وہ اپنے گوشۂ دل میں نئے چراغ جلا رہا تھا۔ حب رسول کے۔ اپنی عاجزی اور اپنی بے بضاعتی کے اندھیروں کو روشن کرنے کے لیے۔

تُستر میں کسی کو اس کے کام سے کبھی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ جو روئی وہ دھنتا اس میں کئی خوبیاں پیدا ہو جاتیں۔ نرمی اور گرمی بڑھ جاتی۔ پھیلاؤ میں زیادہ ہو کر بھی حدّت میں خوب تر ہوتی اور اس کی توشک اوڑھ کر ایک عجیب سکون ہوتا جیسے کوئی دوست سکون و تسلی دینے کے لیے قریب ہو۔ نماز میں جی لگنے لگتا اور عمدہ خوشبو اس میں سے پھیلتی جس کا کوئی نام نہ تھا' جس کو اس میں سے نکلتا ہوا نہیں پایا جاتا تھا مگر جو بس ٹھہری رہتی' مشام جان کو راحت بخشتی۔ ہو سکتا ہے یہ سارے واقعات فسانے ہوں اور حسین کے روئی دھننے سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

وہ کلام اللہ حفظ کر رہا تھا۔ اس کے سینے میں بحرِ محیط سما رہا تھا۔ متلاطم اور موّاج جذبے جن کا کوئی نام نہیں تھا مگر اسے فرحت و کشادگی کا احساس ہوتا۔ وہ روئی دھنتا اور

ان سرور کی لہروں کو اپنے وجود سے آ کر ٹکراتا اور طمانیت سے پھیلتا ہوا پاتا۔ یہ ایک ایسا کام تھا جس میں اس کے اور لوگوں کے درمیان کم سے کم ملاقات کا امکان تھا۔ وہ خانقاہ میں ہوتا تو لوگ اپنے ڈھیر وہاں ڈال جاتے۔ جب وہ دوسری شام خانقاہ کی طرف جاتا دکھائی دیتا تو اٹھا لے جاتے۔ وہ کھوئے ہوئے کم گو اور اپنے میں گم اس نوجوان سے خوف زدہ سے رہتے۔ اس کے سراپے میں عجیب جاہ و جلال تھا۔ وہ چلتا تو لوگ راستہ چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔ کوئی اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو لگتا بات منہ سے نہیں نکلتی اور زبان لڑکھڑا جاتی۔ آوارہ بچوں نے اس کی کھلی دکان سے کچھ چرانے کی کوشش کی تو ان کے ہاتھوں نے جواب دے دیا اور وہ اپنے ارادے سے باز آئے تو تندرست ہو گئے۔ نہایت دبی زبان سے لوگوں نے اس کے اسرار کو موضوعِ سخن بنا لیا۔

یہ حلّاج کہاں سے آیا تھا؟

جن اس کے تابع تھے۔

اس کے روئی دھننے کی رفتار عام لوگوں سے بہت زیادہ تھی۔

لوگ کہتے وہ خود بیٹھا رہتا ہے سب کام دستِ غیب سے ہوتا ہے۔

کبھی کسی نے اس راز کو جاننے کی خواہش تو اس کی آنکھوں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ خدا کا بندۂ خاص تھا۔ دنیا فسق و فجور سے بھر گئی تھی اور وہ اللہ کی طرف سے سلامتی اور امن لے کر تستر میں وارد ہوا تھا۔ اس کے آنے سے باغوں میں پھل کا بار زیادہ ہو گیا تھا۔ اگر وہ بیمار بچے کے پاس سے بھی گزر جائے تو شفا ہو جاتی تھی۔

ایسی ہی اور کہانیاں تستر میں گشت کرنے لگیں۔ بازاروں اور گلیاروں سے نکل کر صومعہ اور زاویوں مسجدوں اور اقامت گاہوں میں چرچا ہونے لگا اور اس کی بے خبری میں شدہ شدہ یہ خبر حضرت سہل بن عبداللہ تستری تک بھی پہنچ گئی۔

مغرب کی نماز کب کی ہو چکی تھی۔ مدھم چراغ کی روشنی میں جوان کے حجرے کے نیچے دروازے کو بھی نہیں چھو رہی تھی' انہوں نے سیڑھیوں کے سرے پر بیٹھے حسین کو دیکھا۔

"قریب آؤ۔" انہوں نے اسے کہا۔

وہ نہایت سہما ہوا اور ادب سے تقریباً دہرا ہو کر حجرے میں داخل ہوا۔

"حسین بن منصور۔ تم طالبِ راہِ حق ہو۔"
اس نے وہیں زمین کو بوسہ دیا۔ شدت گریہ سے اس کی آواز بند ہوئی جاتی تھی۔
"جواب دو۔" انہوں نے اور نرمی سے پوچھا۔ "تم سے منسوب یہ شعبدے کیا ہیں۔"
"مجھے سیرِ اسماء کا شوق تھا حضرتِ اعلیٰ۔" اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔
"نفس کے ہاتھوں بچوں کے اس کھیل میں منہمک نہ رہو حسین۔ کیا محض اس لیے کہ اس تماشے سے تم سے سوا تمہارے گرد کے لوگ خوش ہوتے ہیں تم اپنی جان گھلاتے ہو۔ یہ گمراہی ہے حسین۔ اس سے بچو۔"
وہ حجرے کی زمین پر اوندھا پڑا رہا۔ اس کا تصور اب بھی عرش پر تھا۔ جیسے مچل مچل کر بار بار ان گلیاروں میں نکل جاتا ہو جہاں کھیل کود سے جی بہلایا جاتا تھا۔ پردوں کے پیچھے کیا ہے' جھانکنے کی تمنا لیے بے قرار دل۔
شیخ کامل نے کہا۔
"نفس کو سزا دو حسین۔ باگیں اپنے ہاتھ میں رکھو۔ اس کی تربیت کرو۔" وہ افسردگی سے اُس کی طرف دیکھتے تھے۔
باہر بسیرا کرنے والے پرندوں میں سے کسی چڑیا نے بے وقت نغمہ سرائی کی۔ شاید اس نے خواب میں ان مہینوں میں اڑان شروع کی تھی۔ جب ہوا پھولوں کی بُو سے لبریز تھی اور بادِ شمال کے جھونکے سردی کی لہر لاتے اور جنوبی ہواؤں کے گرم تھپیڑوں میں مل جاتے تھے۔ یہ تیرِ نیم کش کی سی صدا سرسراہٹوں میں گم ہو گئی۔ بجھ گئی۔

خدا بان کے درخت پر اس پرندے کو خوش رکھے۔
اس کے نغمۂ جانفزا نے مجھے یہ افسانہ سمجھایا۔
کہ پیاروں نے اونٹوں پر ہودے کسے اور صبح دم رخصت ہو گئے
ان کی جدائی کی آگ کو سینے میں لیے میں نے دشت پیمائی کی۔
خدا بان کے درخت پر اس پرندے کو خوش رکھے۔

مسجد سے پرلی طرف شاہراہ پر اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹن ٹن سنائی دے رہی تھی۔ قافلے کا سفر ختم ہو رہا تھا یا کوئی قافلہ رودِ کاروں کے ساتھ مشرقی

کوہستانوں سے پرے شاہراہِ خطا اور خوزستان کو جا رہا تھا۔ مسلسل سفر کی صداؤں سے یہ شاہراہیں آباد رہتی تھیں۔ صدا سناٹے سے افضل ہوتی ہے مگر کبھی کبھار سناٹا اپنی ہولناکی' سفاکی اپنی لبریزی سے بہت مؤثر ہوتا ہے۔

آباد شہر میں حسین کا دل سناٹوں کی ہولناکی اور ویرانوں کے خالی پن سے یوں معمور تھا جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہو۔

مگر شیخ کا حکم کیا تھا۔ وہ کیا چاہتے تھے۔

سیاوش اور منصور تستر آئے۔

بازارِ بزرگ کے وسطی گلیارے میں دکان کھلی تھی اور دھنکی ہوئی روئی سے چھت تک بھری تھی مگر حسین نہیں تھا۔

"پتہ نہیں یہ جان کھپانے کی دھن اسے کیوں ہے۔" منصور نے اپنے آپ سے کہا۔ "ریشم کے کاروبار میں' بیضا میں اس کا جی نہیں لگتا۔" اس نے سیاوش کو مخاطب کر کے کہا۔

دکاندار جمع ہو گئے اور ان کی خاطر داریاں کرنے لگے۔

"حلاج خانقاہ میں ہو گا ـــــ وہ اب رات گئے واپس آئے گا ـــــ آپ اس کے عزیز ہوں گے۔" انہوں نے استفسار کیا۔

"میں اس کا دادا ہوں اور یہ باپ ہے۔" سیاوش نے بات کی۔

"بہت محنت کرتا ہے حلاج۔" انہوں نے بتایا۔ "رات عبادت میں گزارتا ہے اور دن کا اکثر حصہ وہ روئی دھنکتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا۔ یہ سب ایک ہی دن کا کام ہے۔ اتنی جان کیوں لگاتا ہے۔ اس طرح سے تو وہ بیمار ہو جائے گا۔" انہوں نے اطلاع دی۔ یہ خبر' انہوں نے سوچا' نہایت افسردہ کر دے گی دونوں کو۔

"اس کو خدا نے دس آدمیوں کی طاقت دی ہے۔" ان میں سے ایک بولا۔

"روئی ہی تو دھنکتا ہے کوئی مشکل کام تو نہیں کرتا۔" سیاوش بولا۔

"بزرگوارم۔ یہ کام سب سے زیادہ محنت اور توجہ کا طالب ہے اور کوئی کام بھی ہو' ہم سب یہاں اپنے اپنے طور محنت کرتے ہیں۔"

سیاوش نے دونوں ہاتھ سر کے اوپر اٹھائے۔

”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ حسین کے باپ کا ریشم کا کاروبار ہے۔ وہ اس میں لگ سکتا ہے مگر شاید بوجوہ اسے یہی کام پسند ہے۔ ہم اسے واپس لے جانے کے لیے آئے ہیں۔“

”آپ ایسا نہ ہی کریں تو احسان ہو گا۔ ہمارے درمیان وہ باعثِ برکت ہے۔ بازار کی رونق اور ہماری آمدنی اس سے بڑھ گئی ہے۔ وہ مبارک روح ہے۔“ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

”وہ جسے چھو دیتا ہے اسے شفا ہو جاتی ہے۔ وہ جس کی طرف دیکھ لیتا ہے اس کے کام بن جاتے ہیں۔“

سیاوش اور منصور نے ایک دوسرے کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

”اب کیا ہو۔“

حسین بن منصور حلاج جب صومعہ سے واپس آیا تو اس نے ان دونوں کو منتظر پایا۔

”بیضا میں تمہاری بیوی اور بچہ اداس ہیں۔“ سیاوش نے جب وہ کھانے سے فارغ ہو چکے تو کہا۔

”میں تمہیں واپس لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ طویل مسافتوں سے گزر کر۔“ منصور نے کہا۔

”تمہارا بچہ اب گھٹنوں چلتا ہے اور حسین حسین کہہ کر تمہیں پکارتا ہے۔“ سیاوش بولا۔

حسین کے چہرے پر ایک کرن سی پھوٹی جیسے اندھیرے میں روشنی آن بھٹکے۔“ میں ابھی اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکا۔“اس نے باپ سے کہا۔

”عبادتیں اور ریاضتیں اپنی جگہ پر ہیں مگر دنیا اتنی ادنیٰ شے نہیں حسین کہ اسے یوں ٹھکرا دیا جائے۔“ سیاوش نے اپنی طرف سے بہت ہی دکھ سے کہا۔

”میں روئی دھنکتا ہوں۔ کیا یہ دنیاداری نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ریشم میں خوابوں کے مرقعے اور پھولوں کے رنگ بننے کی جگہ میں ریشہ اڑاتا اور صداؤں میں راگ ڈھونڈتا ہوں۔ لوگ مجھے حسین حلاج کہتے ہیں۔ حسین بن منصور حلاج ـــــ“ اس نے نہایت خوشدلی سے کہا۔

"اس ایں ہم رفت و آں ہم رفت میں کیا ہے۔" سیاوش نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

حسین زور سے ہنسا۔

"یہ ایک نیا راگ ہے مگر دربار کے مغنی اسے نہیں گا سکتے۔ یہ آئینہ سازی سے بھی مشکل کام ہے۔ دقت طلب۔"

"یہ کام بیضا میں بھی ہو سکتا ہے۔" منصور نے دل میں سمجھتے ہوئے کہ اس کی بات نہیں مانی جائے گی، کہا۔

"بیضا میں سہل تستری نہیں ہوں گے۔ وہاں تو بس دشتِ سُوس کی زرد ریت اور تنہائی ہے۔"

حسین نے اُٹھ کر چراغ جلایا۔ پھر مغرب کی اذان پہاڑیوں اور بلندیوں پر میدانوں اور نشیبوں پر میناروں سے اُتری۔ منصور اور حسین خانقاہ کی طرف چلے۔ سیاوش لوگوں کے جھرمٹ میں اپنی قصّہ گوئی میں لگ گیا۔

حجرے میں جب منصور کو سہل بن عبداللہ تستری سے اذنِ باریابی ملا تو حسین اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ایک زمانے کے بعد وہ حاضر ہوا تھا۔ ان کے رعب و ہیبت سے اسے ہول آتا تھا۔ اور وہ شرمندہ بھی تھا کہ اس کا بیٹا ان توقعات پر پورا نہیں اتر سکا جو اسے اس سے تھیں اور خود شیخ کامل کی شفقت سے اس نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ یہاں وہاں بھاگا ہوا پھرتا تھا، جیسے آوارہ گردی اس کی روح کو بیماری کی طرح لگ گئی ہو۔ اس بیماری کا علاج کیا ہو۔ کون کرے؟ وہ یہ سب باتیں ان سے کرنا چاہتا تھا۔

"منصور۔ اسے اپنے لیے خود دعا کرنا چاہیے اور ان سب شعبدہ بازیوں سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ یہ پہلے پہل طاقت کی دلیل بن جاتے ہیں مگر آدمی کو اس طاقت پر تکیہ کر کے بیٹھ نہیں جانا چاہیے۔ اس کی منزل دور ہے اور پرے ہے۔ ایسی طاقت حجاب بن کر منزل کے اور آدمی کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔"

منصور سر جھکائے سنتا رہا اور اس کے سر میں دھنکی کا وہ گیت گونجتا رہا۔

در پئے جاناں جاں ہم رفت
جان ہم رفت جاں ہم رفت

رفت رفت

جاں ہم رفت

ایں ہم رفت و آں ہم رفت

ایں ہم رفت آں ہم آں ہم ایں ہم آں ہم آں ہم

رفت

رفتن رفتن رفتن

دے دے دے

رفتن دے رفتن دے

رف رف رفتن دے

اور وہاں بیٹھے اس پر منکشف ہوا کہ حسین طفلِ مکتب کی طرح اپنے سبق سیکھ رہا ہے۔ "در پئے جاناں جاں ہم رفت" — اس کی اپنی جان منصور کی جان جو محمی کا بیٹا تھا نہ کسی آگ کے رشتے سے اور نہ ہی کسی زمینی رشتے سے کہیں جا سکی تھی۔ وہ دنیا کی زنجیروں سے بندھا ہوا ایک جانور تھا۔ دنیا کے در پر اور درِ دنیا سے باہر وہ کس شے کی حفاظت کر رہا تھا؟ دنیا کے باہر کیا ہے اور خود دنیا کے اندر کیا ہے؟ روشن سورج طلوع ہوتا ہے اور دن کا سفر شروع ہوتا ہے۔ روز سہ پہر اور ڈھلتی شام اور مغرب کے آسمان کی نیلاہٹ میں اکیلا تارا اور پھر ستاروں کے جھرمٹ' چاندنی اور اندھیری راتیں۔ اس نے زندگی سے کیا سیکھا تھا اور جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت۔ ایں ہم رفت و آں ہم رفت۔ رفتن رفتن میں وقت ختم ہو رہا تھا۔ سر کے بالوں کی سیاہی میں سفیدی نے ڈیرہ جما لیا تھا۔ وہ ہمہ وقت حسین کے لیے فکر مند رہتا تھا۔ اس کے لیے دعا کرتا تھا۔ اس کے بچوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس نے تو اپنے لیے کبھی دعا بھی نہ کی تھی۔ دنیا نے اسے کیا دیا تھا؟ اور اب اس کا حسین اگر وہ اپنے طور پر زندگی گزارنا چاہے تو وہ اس سے تعرض نہیں کرے گا۔ ہر شخص مقدر کے لکھے کو پورا کرتا ہے۔

شیخ کامل نے جیسے اس کے خیالات پڑھ لیے ہوں۔ کہنے لگے۔

"منصور۔ تم کو بارگاہِ خداوندی سے ایمان کی دولت نصیب ہوئی اور یہ اس کا کرم تھا کہ تم کثرت سے وحدت کی طرف آئے۔ تم نے محبت کا راستہ اختیار کیا۔"

منصور نے سر جھکا کر کہا۔ "بے شک بے شک۔ خدا نے مجھ پر بہت انعام کیا۔ میں اس کا شکریہ کیسے ادا کروں۔"

"تمہیں ایک دل دیا جو الجھاؤ میں نہیں ہے۔ تمہاری امیدیں پوری ہوں گی۔" انہوں نے پھر کہا۔

"میرے لیے دعا کریں' میں روضۂ رسول کی زیارت کے لیے جانا چاہتا ہوں مگر حسین کی بیوی اور بچے میرے پاس ہیں۔ یہ علائقِ دنیوی بہت ہیں۔ اگر حسین گھر لوٹ آئے تو اگلے سال حج کی سعادت حاصل کر لوں۔" منصور کا جی بھر آیا۔

اس کا عاجزی سے جھکا ہوا سر اس کا نالوں کی زد پر کانپتا ہوا وجود اس کا ذوق و شوق اس کی مجبوریاں سب شیخ کامل کے سامنے تھیں۔ اس کی جان ایک دم اتنی بے تاب ہو گئی۔ مرغ بسمل کی طرح پیشانی کو زمین پر رکھے وہ تڑپ رہا تھا۔ وہ معمولی آدمی جو نہ اپنی عبادات میں غلو کرتا نہ ہی ریاضتیں کرتا تھا' جو نہایت عمدہ دنیادار تھا۔

شیخِ کامل کی آواز آئی: "ابو حسین دیکھو۔"

منصور نے ان کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا جیسے پردے اور حجاب اور راستے اور زمین سب کثیف سحاب اٹھ جائیں۔ آئینے کی طرح ہر شے دکھائی دے۔ اسے اپنے سامنے روضۂ رسولؐ دکھائی دیا۔ مسجد نبویؐ' حضرت عائشہ صدیقہؓ کا حجرہ مبارک۔ اور نور اس پر منکشف ہوا۔ جیسے درواہو جائیں۔ ساری پستیوں اور بلندیوں سمیت راستے کشادہ ہو جائیں۔ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ اس کے قلب کو قرار آیا۔ اس کی روح سیراب ہوئی۔ وہ شاد کام ہوا۔ اس کی نظر فراخ ہوئی اور اس کی نگاہ نے جو دیکھا سو دیکھا۔

سیاوش ابھی سیمرغ کا قصّہ سنا رہا تھا جس نے سام کے بیٹے زال کو پالا تھا۔ پہاڑوں کی چوٹیاں اور اس پر ایک پرندے کا گھونسلہ اور اس میں ایک بچے کا پرورش پانا' سب فسانے تھے مگر اب اس کے معنی منصور کے لیے بدل چکے تھے۔ ہر شے ممکن تھی۔ کیا ہو سکتا ہے۔ کیا ہوتا ہے ___ یہ تو اس نے دیکھا تھا۔ مگر کیونکر کی اسے اب بھی خبر نہ تھی۔

ایک قافلے کے ساتھ جو بیت اللہ جارہا تھا حسین بھی ارضِ پاک کی طرف روانہ ہوا۔ سیاوش نے تستر کے لوگوں کو قصے سننے کے شوقین بہت ہی مہمان نواز پایا تو وہ وہیں رہ پڑا۔ منصور اپنی نگاہیں جھکائے رکھتا جیسے کسی راز کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کسی تقدس کی حفاظت کر رہا ہو۔ کسی راز کے پردوں کو پکڑے کھڑا ہو۔ کسی بارگاہ کے سامنے باریابی کی اجازت چاہتا ہو۔

رخصت کرتے ہوئے شیخ سہل بن عبداللہ تستری نے کہا تھا:

"ابو حسین۔ زیادہ فکر مند نہ ہوا کرو۔ تمہارا بیٹا اپنی راہیں خود تلاش کر لے گا۔ اس کا ولولۂ شوق تہذیبِ نفس سے آشنا ہونا چاہیے۔"

اور حسین کے ساتھ ایک بھیڑ تھی۔ وہ اس کے ہاتھ چومتے۔ اس کے پاؤں کی خاک کو اکسیر جانتے۔

اور اس سے دعا کے طالب ہوتے تھے۔ وہ اغماض کی کوشش بھی کرتا مگر لوگ ناقص العقل ضعیف الاعتقاد اس کے وجود کو سعادت اور برکت کا باعث جانتے۔ قافلے میں جب کوئی بیمار ہوتا تو پانی اس سے دم کروایا جاتا۔ ہر تکلیف میں اسے ڈھونڈا جاتا۔ وہ چھپتا اور لوگ اسے ڈھونڈتے۔ یہ بالفعل ایک بڑی کامیابی تھی کہ وہ مرجع خلائق بن گیا تھا۔ صرف تمنا سے 'صرف تڑپ سے 'صرف خدا کی رحمتوں سے 'ورنہ وہ کیا ہے؟ یہ وہ خود بھی جانتا تھا۔ درپئے جاناں۔ اس کے لیے جاں رفتن کا مرحلہ تو ابھی بہت دور تھا۔ وہ منزل جاناں کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا مگر اس کا شوق ابھی ادھورا اور ولولہ بحر محیط کی لہروں کی طرح بس چڑھتا چلا آتا تھا اور ہر مد کا ایک جذر ہے اور اس حالت میں اس کے احساسات کیا ہوں گے؟ وہ رہ نورد شوق نہیں تھا۔ اسے اس اجلال سے جو ذاتِ رسولؐ میں تھا' اس جمال سے جو خود ان کی ذات تھی آشنائی نہ تھی۔ وہ تو غلاموں کا غلام تھا اور اسے اپنے جذبوں کی شدت اور اپنی دیوانگی میں بھی صداقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جذبۂ صادق کی آہٹ وہ کبھی اپنی جان میں سنتا اور دوسرے لمحے ایک عجیب بے کیفی کی کیفیت اس کو سمیٹ لیتی۔ وہ تلاش عشق میں جارہا تھا۔ کاش اس کی جان بے تاب کو اس لو دیتے ہوئے محبتوں اور چاہتوں کے جذبوں تک رسائی حاصل ہو سکے۔ اے

کاش!اس کی ہستی کی تکمیل ہو سکے مگر اس کی ہستی کیا تھی؟ اگر وہ فانی ہے تو پھر باقی کیونکر ہے اور اگر باقی ہے' رہے گا تو پھر فنا کس شے کو ہے۔ یہ فنا اور بقا کا فلسفہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

سیدھی سادہ تعلیمات جس میں ایک مسلمان روح کا آرام اور دل کا سکون تلاش کرتا ہے۔ نماز اور خوف: ؛مختلف حقوق کا تحفظ اور ہر انسان کا دوسرے کے مساوی حق رکھنا' کوئی پست نہیں کوئی بلند نہیں مگر اس سے آگے نازک تر مقام ادب جہاں حب رسولؐ اور عشق محمدؐ اور تمنائے خاص اور آرزوئے نظرِ التفات ہے وہاں پر کیسے گزر ہو؟ وہ جنوں جو آنسوؤں میں ڈھلے تو سارے گناہ دُھلیں۔ اس جنوں تک' ان آنسوؤں تک رسائی کیسے ہو؟

جنون ان عجمی قافلوں کا تمغۂ امتیاز تھا۔ طویل مسافتوں کے یہ راہ گیر' ان کا ذوق و شوق دیدنی ہوتا۔ مجوسی خون اور نصرانی اور یہودی لہو پرستش کا جذبِ شدید جو ان کی رگوں میں تھا' اس کو اسلام نے دو آتشہ کر دیا تھا۔ حب اللہ اور حب رسولؐ بھی ان رگوں میں رواں ہوتی اور ایک آتش عشق در تپشِ مسلسل ان کی جانوں کو بیقرار رکھتی۔ سوزِ دروں سے مجاہدہ' ریاضت اور قرأت میں رقت پیدا ہوتی۔

آنسوؤں کی روانی ان کے دلوں کی تڑپ کو کم نہ کر سکتی۔ ایک ایک قدم جو راہِ محبت میں اٹھتا اس سوز کو فزوں کرتا۔ یہ سعادت جو ان کو نصیب ہونے والی تھی یہ استطاعت یہ طاقت یہ اشارہ کہ ان کو اذن باریابی ملا ہے ان کی سرخوشی اور سرمستی میں کیف وانبساط کا باعث بنتا۔ وہ سب خاص لوگ ہوتے جو سر جھکائے اپنی روحوں کو لبیک کہتے سنتے۔ حاضر حاضر جان و دل حاضر روح و ایمان حاضر ـــــ اللہ ہم تیرے حضور حاضر ہونے والے ہیں۔ تیرے لیے تیری خوشنودی کے لیے تیری راہ پر حاضر ہیں ـــــ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام خانہ کعبہ تعمیر کر رہے تھے تو ان کی دعا یہی تھی کہ اس جگہ کو مرکز بنا۔ اے اللہ یہ تیرا گھر ہے۔ اس کی مضبوطی اس کی خوبصورتی صرف تو ہے۔ اے مالک الملک تو ہے۔

حسین اپنی عبادات میں لگا رہتا اور دیکھتا کہ لوگ کس سادگی سے کوئی بڑی آرزو لے کر نہیں' محض اس کی خوشنودی کی خاطر پاک صاف نیتوں سے اپنی کمزور

جانوں کو اس کی راہ کی طرف چلاتے تھے اور وہ اپنے اندر دیکھتا کہ وہ بھی اس کی خوشنودی چاہتا تھا مگر اس کا سوال اس سے بہت زیادہ تھا۔ اس کی طلب شدید اور اس کی تمنا شدید تر تھی۔

اے ساربان آہستہ چل کہ میری پسلیوں میں آگ ہے۔

وہ اُس سے اُسے طلب کرنا چاہتا تھا۔

اس لیے اس کے دل میں آگ نہیں الاؤ تھا۔

اے میرے خدا' میں حاضر ہوں۔ اپنی جان سے' جان کی ساری بیتابیوں سے۔ تنہائی کی اذیتوں سے۔ روح کی ساری پہنائیوں سے' کرب و درد کی اذیتوں سمیت۔

وہ سوالی تھا مگر اس کا سوال دوسرا تھا۔ اس عجز میں اپنے عبد ہونے کا فخر بھی تھا اور یہ امید بھی کہ اسے خالی ہاتھ لوٹایا نہیں جاسکتا۔ نیاز نہیں ناز۔ ہاں جب اس کے راہ میں ایک قدم اٹھایا جاتا تھا کہ اس کو بڑھ کر اس ہاتھ کو تھام لینا چاہیے تھا۔

دیوانگی کی انتہا۔

شوریدہ سری کی حد

سارے مکالمے اس کے نہاں خانۂ دل میں ہوتے تھے جہاں دونوں سما نہیں سکتے تھے۔ اسے حسین کو دھکیل کر باہر پھینک دینا پڑتا تھا مگر باغی' آوارہ گرد جلاوطن حسین کہاں جائے؟ گدائے بے نوا۔ گدائے بے نوا۔

جب کارواں رودِ کارواں کے ساتھ چلتے ہوئے خرم شہر کی طرف چلا تو شدید سردی کے باعث اور آب رواں کی کمی کی وجہ سے دو دن انہیں دارالسبطین میں قیام کرنا پڑا تھا۔ یہ آب جو' جو رود کاروں سے جا کر ملتی تھی اور کہیں پہاڑیوں کے چشموں میں سے مل کر نکلتی تھی' نشیب میں بہتی تھی اور پتھروں کے درمیان ایک سفید شاہراہ کی طرح کبھی چھپ جاتی اور کبھی ظاہر ہوتی مگر اب اس کی تہہ میں ریت اور پتھروں کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ ٹھہر کر ادھر ادھر کھود کر پانی تلاش کر رہے تھے کہ قرمطی باغیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ چاروں طرف سے گھیر کر انہیں لوٹ لیا گیا۔ عورتوں اور بچوں تک کو انہوں نے ذبح کر دیا تھا صرف حسین کو انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ اس کے پاس زادِ راہ تک

تو تھا نہیں۔ نحیف و لاغر بے چارہ جوان، جس کی آنکھیں کثرتِ گریہ سے سرخ تھیں اور جو انہیں روشنی میں کھول نہیں سکتا تھا۔

"یہ حاجیوں کا قافلہ ـــ بھلا اب وہ بیت اللہ میں کیا کرنے جاتے؟" ان میں سے ایک نے کہا۔

"اسی لیے ہم نے ان کو زحمت انتظار اور سفر کی صعوبتوں سے بچا لیا ہے۔"

"مگر یہ سب ـــ" اس نے لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ حجاج اصل حجاج ہیں کشتۂ راہِ محبت۔" ایک باریش جوان نے کہا۔

"کشتۂ راہِ محبت۔" ـــ سب نے یک زبان کہا اور قہقہوں کے درمیان ان کی آوازیں ڈوب گئی تھیں۔

"وہ سب فنا ہو گئے۔ حاضر ہو گئے۔" ایک دوسرے شقی القلب نے کہا۔

"سر دے کر ہی اس راہ میں محبت کا اعلان کیا جاتا ہے۔" ایک اور نے اپنی خورجین میں چاندی کے سکے بھرتے ہوئے کہا۔

"سنو۔" انہوں نے حسین کو پکارا۔ اپنے پاس بٹھایا اور نہایت تمسخر سے کہا ـــ "ان سب کو دیکھتے ہو ناں۔ انہوں نے راہِ محبت میں سر دے کر جانوں کی قربانی دے کر حج کیا۔"

اس نے حسین کے سر پر مارا۔

"جی۔"

"یہ سب حبِ رسولؐ میں فنا ہوئے ہیں۔ تمہارے رسولؐ کی محبت میں۔ تم جو نمازوں اور دعاؤں اور روزوں اور عیدین میں خوشی ڈھونڈتے ہو۔ اگر تم ہمارا دین قبول کر لو تو ہم تمہیں یہاں کی خوبصورت عورتیں اور مال و منال دیں گے۔"

تھوڑی دیر اس کے جواب کا انتظار کرتے رہنے کے بعد انہوں نے کہا تھا:

"ہم بے قافلہ و راحلہ تمہیں یہاں اس لیے چھوڑ رہے ہیں تاکہ تم اس بات پر گواہی دے سکو کہ یہ زنجی نہیں ہم تھے اور ہم یہ نیم مردہ اونٹ بھی تمہیں دے رہے ہیں تاکہ تم قریب کی کسی آبادی میں پہنچ کر چشم دید حالات سنا سکو۔"

پھر انہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور رودِ کاروں کی طرف لوٹ گئے جہاں سے

بڑی شاہراہ قریب تھی۔

"سردے کر راہِ محبت طے کرنا ہی تو منزل ہے۔" اسے دور تک ان کی آوازیں اپنے عقب میں سنائی دیتی رہی تھیں۔

جب وہ مکہ معظمہ پہنچا ہے تو حج کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ اسے واپس جاتے ہوئے قافلے' بڑے بڑے کارواں اور شاہراہوں میں وادیوں میں مل کر لوٹتے ہوئے لوگ ملے۔ سرشاری کی کیفیت۔ رنگینی کی لہر۔ ہوا میں خوشبو اور سانسوں میں فرحت و تازگی سے فضا معطر ہوتی تھی۔ وہ نوازے گئے، قبول کیے گئے' بلائے گئے' مہمان تھے اور وہ بھٹکتا ہوا' ٹھوکریں کھاتا بس در آیا تھا۔ وہ کیوں سمجھتا تھا کہ اس کا ناز پسند کیا جائے گا؟

آخر اس کے جی میں یہ کیوں آیا تھا کہ وہ دوسروں سے افضل نہ سہی الگ تھا؟

وہ خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے نہیں گیا بلکہ مضافات میں ایک غیر آباد بستی میں ایک پرانی مسجد میں' جس کی چھت تقریباً نہیں تھی' ٹھہر گیا۔

"جب تک مجھے بلایا نہیں جائے گا میں نہیں جاؤں گا۔ قطعاً نہیں جاؤں گا——"

پتہ نہیں وہ کس سے ضد کر رہا تھا۔ شرط باندھ رہا تھا۔ ناز اٹھوا رہا تھا۔ سرفروشی کی تمنا جی میں لیے مگر سر کی قیمت کا شمار ہونا چاہیے۔ وہ پئے جاناں' دھنکی کا گیت اسے یاد آ رہا تھا۔ در پئے جاناں—— در پئے جاناں—— اس کے نہاں خانۂ دل میں یہ صدا و قفوں سے بار بار' ہر لمحہ ہر پل گونجتی۔ مغنی کے ساز کی طرح اسی آواز سے وہ گونجتا تھا۔ وہ پلکیں اٹھاتا تو در پئے جاناں سنائی دیتا۔ وہ انگلی اٹھاتا تو در پئے جاناں ہوا میں ستاروں کو چھو کر آتی۔ روشنی میں جنگل میں جب پرندے گیت گاتے۔ ٹڈوں کی چرچر' گھنٹیاں' شاہراہوں کی صدائیں۔ وہ در پئے جاناں سے گھرا تھا۔ یہی ایک بول جس نے اسے دھنک کر رکھ دیا تھا۔ اس کے آنسوؤں میں' سانس میں بس یہی تھا مگر اس کی جان تھی جان رفتن کی گھڑی دور تھی۔ وہ تھا۔ حسین بن منصور حلاّج تھا۔ وہ دیوانہ نہیں تھا۔ یہ بھی ایک شعبدہ تھا تجلی نہیں محض شعبدہ۔ مئے خودی کے ایک جرعے نے اس کی یہ حالت کر دی تھی۔

درپئے جاناں۔۔۔اس سے مضبوط تو دھنکی تھی جس کے بول گیت میں ڈھل سکتے تھے۔ اس کی جان تو ابھی تھی وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ایک تانت اور لکڑی سے بنی ہوئی معمولی دھنکی بھی نہیں۔ اسے اپنے آپ سے' اپنے آپ کے ہونے سے بہت شرم محسوس ہوئی۔

نواحِ مکّہ میں ان دنوں ایک دیوانہ دیکھا جاتا جو نہ ہنستا تھا نہ بولتا تھا نہ سوتا تھا اور نہ ہی بیٹھتا تھا۔اس کی بے قرار جان اضطراب میں ڈوبی ہوئی' نگاہیں جھکی ہوئیں۔ وہ حرم کعبہ میں داخل بھی نہیں ہوتا تھا' کبھی غارِ حرا کے سامنے' کبھی غارِ ثور کی بلندیوں پر' کبھی جبلِ رحمت کے نواح میں۔ منیٰ اور عرفات میں۔ دوپہر کو جب دھوپ تیز ہوتی وہ تپتے ہوئے پتھروں پر بیٹھتا اور پسینہ چشمے کی طرح اس کے جسم سے جاری رہتا۔ قطرے پتھروں پر گر کر خشک ہو جاتے۔ اس کا دماغ تمازت سے پکنے لگتا ہوگا مگر وہ پتھروں پر بیٹھا رہتا۔ پتہ نہیں وہ اپنی جان کو عذاب کیوں دے رہا تھا۔ تپشِ غم سے اسے نیند کہاں آتی ہوگی۔ بے چھت کی مسجد میں جب وہ نماز پڑھتا تو ہمہ وقت نوافل میں لگا رہتا۔ وہ اس کی آزمائش اور اپنے آپ سے جنگ کے دن تھے۔

لوگ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتے مگر وہ کسی سے بات نہ کرتا۔ وہ درپئے جاناں تھا۔ مہینوں یوں ہی گزر گئے اور لوگ اسے گم سم مگر فرزانہ دیکھتے۔ ننگے پاؤں ریت پر چل رہا ہے۔ لوگوں کو اس کی تلاش رہنے لگی۔ مجمع اس کے گرد بڑھنے لگا۔ لوگ اس سے دعا کے طالب ہوتے۔ اس سے اپنی حاجتیں کہتے۔ وہ کسی کو کاغذ پر لکیریں سی کھینچ دیتا۔ کبھی سیاہی سے کچھ آڑے ترچھے حروف بنا دیتا۔ لوگوں نے اس کا انتظار کرنا شروع کر دیا تھا۔ لوگ اسے کوئی عظیم بزرگ سمجھتے' اس کی بددماغی' کم گوئی کو بھی ایک انداز دلبرانہ سمجھتے۔ اس کی لاپروائی و بے نیازی کو بھی ایک شانِ محبوبی جانتے۔ یہ رحمتوں اور برکتوں والی سرزمین تھی۔ یہ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کا مامن تھی۔ آبِ زمزم کا سرچشمہ' جب حضرت ہاجرہ صفا اور مرویٰ کے درمیان پانی کی تلاش میں رمی کر رہی تھیں اور خدا کو ان کی یہ ادا کتنی پسند آئی۔ جب پانی ایڑیوں تلے سے پھوٹا تو انہوں نے اسے کہا:

"زم۔ زم۔"۔۔۔"ٹھہر۔ ٹھہر۔"۔۔۔اور وہی اس کا نام ٹھہرا۔

ان بے آب و گیاہ صحراؤں کو اس نے ان کے لیے آباد کیا۔ وہ اس کے پیارے تھے اور اس نے اپنے گھر کے لیے یہی سرزمین پسند کی جو امن کی جگہ ٹھہری۔ پتہ نہیں یہ کیا بات تھی کہ کچھ لوگ زیادہ محبوب نہ تھے اور کسی کی طرف اس کی نظرِ التفات بھی نہ تھی۔ وہ اس کا پیارا نہ سہی مگر اس کا بندہ تو تھا۔ اس کی توجہ کا طالب۔

بابِ نبی شیبہ کے سامنے ایک شخص خوبصورت لحن میں روز گاتا ہوا گزرتا چلا جاتا۔

"خدا اپنے بندوں کو محبوب رکھتا ہے

خدا اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے"

جب حسین کے کان میں اس کی آواز پڑ جاتی تو وہ سرتاپا کانپ جاتا۔ وہ محبوب بننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اس کی محبت بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے تو خود اس میں فنا ہونے مٹ جانے کا شوق تھا۔ اسے تو صرف اس کا شوق تھا۔ اسے اپنی ہستی سے 'اپنے ہونے سے کوئی محبت نہ تھی۔ محبتیں اس کا مقصودِ ذات اور مطمحِ نظر نہ تھیں۔ شدت جذبات سے وہ مٹھیاں بھینچ لیتا۔ کان بند کر لیتا۔ وہ یہ سننا ہی نہیں چاہتا تھا کہ خدا بندوں کو محبوب رکھتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے۔ وہ اپنی رگوں پر 'اپنی نبضوں پر اس جذبے کو آزمانا چاہتا تھا۔ اس کی جرأت رندانہ خیال کی بیباکی کہ وہ اپنے جذبۂ بے اختیارِ شوق کی بھی نفی چاہتا تھا اور اپنی بھی ___ وہ کھویا ہوا سا' بھلایا ہوا سا' اس سرزمین میں پھر رہا تھا جو اس کے پیاروں کی سرزمین تھی۔ اس کی تھی۔ فقیرِ بے نوا' راندۂ درگاہ۔

زم زم اس کے لیے نہیں اس لیے وہ اس پانی سے اپنی پیاس بھی نہ بجھاتا۔ اور پیاس کی شدت میں اسے پیاس ہی بھول گئی تھی۔ تسکینِ اضطراب ہو تو کیسے؟ جب اضطراب ہی نہ رہے۔

اس صحرا میں وہ اکیلا تھا۔ کیا کبھی اس پر ابرِ کرم برسے گا؟

وہ اسے ڈھونڈتا تھا جسے وہ سامنے دیکھنا چاہتا تھا' روبرو۔

حق تعالیٰ خلق میں پوشیدہ ہے اور وہی ظاہر ہے اور ساری نسبتیں اسی سے تھیں اور جب وہ خلق کو چاہتا تھا تو اپنے آپ کو چاہتا تھا اور حسین کو بھی چاہتا تھا مگر حسین کو اس خیال سے کوئی تشفی نہیں ہوتی تھی۔ دنیا اور دین اور اس سے بھی پرے ذاتِ حق

تعالیٰ' الجہاد سے' جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھے اور جو اسے پتہ نہیں یہ قیاس تھے تو ان کی حقیقت کیا تھی؟ اگر وہ حقیقی تھے تو امر تھے تو خدا کی طرف سے تھے۔

اگر وہ خیال تھے اور ان کی اصلیت کچھ نہ تھی تو وہ شیطان کی طرف سے تھے۔

اور ان مہلکوں سے بچانے کے لیے اس کے پاس مرشد کا سہارا بھی نہ تھا۔ وہ سالک تھا کہ نہیں!

وہ جبلِ رحمت پر بیٹھا رہتا اور سوالی ہوتا' اے نورِ حق! مجھ پر ظاہر ہو۔

اے نورِ حق مجھ پر ظاہر ہو۔

اب ربِ کعبہ مجھ پر منکشف ہو۔

جیسے ایک ذرۂ ناچیز آفتاب کو پکارے۔ اپنے آفتاب ہونے پر دلیل دے۔

حسین تم کہیں کے نہ رہے ـــــ ایں ہم رفت و آں ہم رفت۔

اس کی پیاسی جان اسی طرح اپنے ساتھ مکالمے میں لگی تھی۔ کیا وہ صاحب ذوق وجدان بھی نہیں تھا۔

دھوپ بارش کی طرح پہاڑوں اور وادیوں پر برس رہی تھی اور لاوے کی طرح بہتی ہوئی ہر پستی اور بلندی کو بھر رہی تھی۔ حسین نے یک بیک اپنی پشت میں ٹھنڈک رینگتے محسوس کی۔ جیسے کوئی ہاتھ اس کے سراپے کو تھپک اور سُلا رہا ہو۔ اس کی حفاظت کر رہا ہو۔ مہربانی و محبت کا زمزمۂ شیریں اسے سنا رہا ہو۔

پتہ نہیں یہ مکاشفہ تھا کہ الہام' اس کی آنکھوں نے روضۂ رسولؐ کو دیکھا۔ اس کا بلاوا وہاں کا تھا۔ وہاں جہاں تاجدارانِ جہاں سر کے بل آتے تھے۔ جہاں کا پیام سارے پیاموں سے افضل تھا۔ اور جہاں پر جانے والے کو نفس گم کردہ ہونا چاہیے۔ نفس جس کے متعلق یہ حکم تھا جس نے اسے پہچان لیا اس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا۔

کیا آدمی اپنے نفس کو پہچان سکتا ہے؟

اور اگر اپنے نفس کو نہیں پہچانتا تو ربّ کو کیسے پہچانے گا؟

اس کو پہچاننا' اس کو ملنا' اس کو ملنا بغیر مرنے کے ممکن نہیں۔ اور اس سے ملنا بھی ضرور تھا۔ پس مرنا بھی ضرور ہے اور موت کا ذکر نہ غمناک کرتا ہے اور نہ ہی پریشان۔ کیونکہ خدا بھی تو اپنے بندوں کا مشتاق تھا۔ جب اللہ نے بندوں میں اپنی روح

پھونکی تو وہ اپنے ہی نفس کا مشتاق تھا۔۔۔ہاں وہ سب طرف خود تھا۔ کائنات میں جانے کیا کچھ تھا اور جو بھی تھا وہ آپ تھا۔ اپنی دید کے لیے انفس و آفاق!

بطنِ فر میں ایک قافلہ ٹھہرا ہوا تھا اور ستاروں بھری رات میں سرسبز و شاداب نخلستان خرمے کے درختوں سے سجا ہوا ایک عالی شان محل کی صورت تھا جس کے ستونوں پر آسمان کی چادر تنی ہوئی تھی اور چراغوں کی روشنی میں وسیع اور آباد بستیاں خواب میں دیکھی گئی خوشنما سیر گاہوں کی عمارتیں تھیں۔ جلیل القدر لوگوں کی آرام گاہیں۔

حسین کو ان لوگوں نے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ وہ نظریں جھکائے دل کے گداز سے اپنے اندر اس بلاوے کی کوئی جہت نہیں پاتا تھا۔ وہ ناکارہ' بے نوا' بے بال و پر' بے سہارا' بے مال و منال۔ جس کی روح کثیف اور جس کا معاملہ اپنے خدا سے بھی صاف نہیں تھا' جس کو حرم کعبہ میں باریابی کی اجازت نہیں ملی تھی کیونکہ صاحب لولاک کے آستانے پر حاضر ہونے کے لیے بلایا جا رہا تھا۔

نرم ہوا کاظمہ کی پہاڑیوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ اور ریت ریشمی چادر کی طرح پاؤں تک پھیلی تھی۔ آبارِ عسفان ایک ویران قلعہ تھا جسے حضرت عثمان غنیؓ نے بنوایا تھا۔ وہ تیسرے خلیفہ اور صحابہ رسول اللہ میں سب سے زیادہ مالِ دنیا کے مالک تھے مگر رسولؐ خدا کے جاں نثاروں میں بھی درجہ ممتاز رکھتے تھے۔ وہ نہایت نرم خو تھے اور اس لیے کنبہ پرور مشہور ہوئے اور اسلام کی فتوحات اور وسیع سلطنت کے بادشاہ ہونے کے باوجود اپنے گھر میں شہید کر دیئے گئے۔ دنیاوی جاہ و عزت نے ان کو شہادت کی موت کی طرف بلایا اور کیا ہی اچھی موت تھی۔ آدمی کو اپنے خدا سے ملنا ضرور ہے۔ وہ خود آدمی سے ملنے کا مشتاق ہوتا ہے۔ کیا دنیا اتنی عظیم اور قابلِ حصول ہے کہ اس کے لیے کلام اللہ کو خون سے رنگا جائے؟ اگر آدمی کی داستان رنگین ہو تو خدا کا کلام جو اس داستان کا مرکز ہے' رنگین تر کیوں نہ ہو۔ دنیا میں محبتوں کی ساری داستانیں مشتاقی اور صبوری کی داستانیں ہیں۔ جان جان آفریں کے حوالہ کرنے کی۔

دشوار گزار پہاڑیوں میں سے جن کے پتھر دھوپ میں جلے ہوئے اور سیاہ معلوم ہوتے تھے قافلہ دشت پر وارد ہوا۔ یہ پھیلا ہوا ریگزار بے پناہ آندھیوں اور بگولوں اور صرصروں کی آماجگاہ تھا۔ حدِ نظر تک پھیلا ہوا ریت جیسے آبادی کے کناروں سے بحرِ ناپید کنار پر اترا ہو۔۔۔۔ حسین کو دشت سُوس یاد آیا جس کی زرد اور سیاہ اور سرخ ریت تمازت میں قوس قزح زمین پر اتری ہوئی لگتی تھی۔ رنگین بگولے ہر شے رنگ میں ڈوبی ہوئی اور زمستان کی شدید راتوں میں برف پر جب شعاعیں منعکس ہوتیں تو یہ الگ الگ لہریئے دمکتے اور پھر ہوا کے دنوں میں جب ریت چلتی اور ٹیلے ایک سے دوسری جگہ اٹھائے جاتے تو لہریوں پر گمان ہوتا جیسے کوئی آہستہ خرام محبوب اپنے دامنوں کو گھسیٹتا ابھی ابھی وہاں سے گزرا تھا۔ بھاری تلواروں اور ڈھالوں کی لڑائی میں جو بدر میں لڑی گئی' کوئی مدد کے لیے پکارا تھا اور فرشتے جو بلندیوں پر صرف حمد و ثناء میں مصروف ہیں' مومنوں کے ساتھ صف آراء ہوئے تھے۔ طبل جنگ بجنے کی صدا نقاروں کی صدا جوان ٹیلوں نے جو اس میدان کو گھیرے ہیں' محفوظ رکھا تھا اور خرمے کے باغوں کے درمیان گنج شہیداں تھا اور جبلِ رحمت سے فتح مبین کی بشارت آئی تھی اور جبل القبول نے ان آوازوں کی بازگشت کو سمیٹ کر رکھا تھا۔ ان زمانوں کا ہر سانس گنج گرانمایہ تھا۔

اور یہ راستے خوشنما تھے۔ آباد خرمے کے باغوں اور پہاڑوں' چشموں اور آبادیوں سے پُر یہ اس قافلے کا راستہ تھا جس نے زمین کو عرش بنا دیا تھا۔ جس سے عرش کی آبادی تھی اور ساتوں آسمان جس کاروانِ سالار کی آمد آمد کا سن کر کُھلے تھے سجائے گئے تھے اور پھیلائے گئے تھے۔ خدا جو بہت بے نیاز اور لاپروا اور پہنچ سے باہر تھا کبھی کبھار کسی کمند افگن کا اسیر ہو جاتا ہے کیونکہ محبت کا طرب اس کی تکمیل اس مشتاقی و دید میں تھا جو وصل کی گھڑی قابَ قوسین اور ادنیٰ ہو کر رہ جاتا تھا اور جبریلِ امین کی رسائی اس تک محال تھی۔۔۔۔ بارگاہیں آباد ہوئی تھیں۔ انبیاء علیہم السلام استقبال کرنے کو جمع ہوئے تھے اور وقت تھم گیا تھا۔

حسین نے نہایت عاجزی سے جبینِ نیاز زمین پر رکھی۔ "بارِالٰہی! میں بھی تیرا مشتاق ہوں اور اس لیے میں تیرے دوست کی دید کا مشتاق ہوں۔ مجھے بلاوا ہے تو باریابی کی اجازت دے۔"

وہ مسجد الحلیفہ میں تھا جہاں رسولِ پاکؐ نے احرام باندھا تھا۔ مسجدِ قبا اور مقامِ مشہد امیر حمزہ تک مدینہ منورہ کا حرم تھا۔ سفید میناروں اور مسجدوں کے گنبد دکھائی دے رہے تھے۔۔۔۔ وفورِ شوق سے اس کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔

اے خدائے بزرگ و برتر! جب تو اپنے دوست کی دید کا مشتاق ہوا تو اسے عرش پر بلایا۔ میں تیرے دوست کے در پر حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے طاقت دے۔ اس ادب گاہ میں کہیں مجھے اذنِ باریابی مل جائے۔

اس کے جسم میں ایک ٹھنڈک تھی اس التہاب سے علیحدہ جو اس کے لہو میں تھی۔ حقیقت انسانی کی آتش جو اس کی رگوں میں تھی جو وہ تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا وہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور ان فضاؤں میں بکھر جائے۔ ان ہواؤں میں مل جائے۔ ان نغمہ سرا پرندوں کی بولیوں میں گھل جائے۔ مدینے کی خوشبوؤں میں۔ خوشبو جو نماز کی طرح خدا کے محبوب کو پسند تھی۔ خوشبو ٹھنڈک تھی۔

"مجھے اس سر زمین میں وہ عطا ہو جس کی مجھے بھی خبر نہیں۔ میرا وہ سوال پورا ہو جو میں نہیں جانتا، مگر جو میری روح کو بے قرار رکھتا ہے، یہاں سے سب کو بے مانگے ملتا ہے خدایا۔"

اپنے حواس مجتمع کر کے اپنے آپ کو سنبھال کر فرطِ ادب سے جھکا ہوا اپنے اندرون کو سنوارے ہوئے شور و غوغا سے مجتنب وہ بابِ جبریل سے اندر داخل ہوا تھا۔

"میں داخل ہو گیا ہوں۔ کیا میرا وجود اس قابل ہے کہ اس حرم میں داخل ہو۔" اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

اور پھر اسے تعجب ہوا کہ وہ ثابت و سالم اپنے وجود اور حواسوں اور دیگر روح اور زخمی قلب بیمار وجود کے ساتھ بابِ جبریل سے اندر آیا تھا۔ وہ جس کو اپنے پر غرّہ تھا، خدا سے اپنے ناز اٹھوانے، ضد سے اپنی بات منوانے کا حوصلہ تھا، وہ کون تھا کہ یہاں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ کانپنے لگا۔

میں کیا ہوں؟

یہ ارض و سماء یہ کائنات جس کے لیے بنائے گئے
وہ سلطانِ عالم محمدؐ عربی

اور دشمنوں کی وجہ سے مکہ معظمہ چھوڑ کر مدینہ میں آن بسے۔ خداوند تیرا حکم کیا ہے؟ تو جب اپنے دوستوں کو آزماتا ہے وہ تیری راہ میں تکلیفیں برداشت کرتے ہیں۔ کبھی حکم دیا جاتا ہے کہ اپنا فرزند قربان کرو ـــــ کبھی وہ دریا میں بہائے جاتے ہیں ـــــ کبھی صلیب پر کھینچے جاتے ہیں اور تجھے پکارتے ہیں۔

"کیا تُو نے مجھے چھوڑ دیا۔"

"اور میں تیرا بندۂ ناچیز' میں تجھ سے عافیت کے ساتھ اذنِ باریابی چاہتا ہوں۔"

وہ کھڑا تھا اور اس کے قدم آگے نہیں اٹھ رہے تھے۔ پھر موذن نے اذان کہی جو ڈھلتے ہوئے سورج اور بڑھتے ہوئے سایوں میں یوں اٹھی جیسے ریگزاروں کو عبور کرنے والی ناقہ اپنے سوار کو لے کر اپنی گردن کو بڑھا کر بہ خرامِ آہستہ منزل کی طرف رواں ہو۔

اسے ہوش آیا۔ اس نے خدا سے مدد چاہی اور ریاضِ جنت میں نوافل پڑھنے کے بعد نماز میں شامل ہو گیا۔

نماز رسول پاکؐ کو بہت پسند تھی۔
نماز انؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔

وہ چاہتا تھا نماز میں تحلیل ہو جائے۔ بس معدوم ہو جائے نہ رہے۔ وہ ان قدموں میں' اس خاک میں جذب ہو جائے۔ گزرے ہوئے وقت پر عمر بن عثمان مکی اور سہل بن عبداللہ تستری اور بصرہ در حرقہ یہ سارے مرقعے تھے جن میں اس کا رنگ پھیکا اور وہ خود نامکمل تھا۔ بھاگ بھاگ کر وہ تھک گیا تھا۔ اس کی برأت کیسے ہو؟ ایک برخود غلط شخص کی شفاعت کون کرے گا؟ اس نے حساب کیا۔ اپنا محاسبہ کیا۔ اس کی لگن بے کیف اور اس کا قلب ٹھہرا ہوا تھا۔ ٹھہرے ہوئے قلب میں رقت کہاں سے پیدا ہو۔ جمود میں حرکت کہاں سے آئے۔ دعا کیسے پرواز کرے اور قبول کیوں کر ہو؟

اسے جو مانگنا تھا اسی در سے طلب کرنا تھا مگر طلب کے لیے جاگتا ہوا دل تو ہو۔ چوکس' زندہ اور اس کے مرضِ کہن کا چارہ بھی شاید یہی تھا۔ اسے اپنے اندر طاقت کا

سر چشمہ دریافت کرنا تھا۔

وہ روضۂ مبارک کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ اس کے جھکے ہوئے کندھے پر کسی نے ہاتھ دھرا۔ جب اس نے سر نہ اٹھایا تو کسی نے پکارا:

"حسین۔ حسین۔"

اس نے سر اٹھائے بنا آواز پہچان لی۔ یہ آقائے رازی تھا۔

"کسی آشنا صورت کو دیکھ کر بڑی تقویت محسوس ہوتی ہے۔ تم کب آئے ہو۔" آقائے رازی نے پوچھا۔

حسین نے انگلی اٹھا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ گفتگو کے لیے تو ایک عمر پڑی تھی۔

آقائے رازی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور اس نے دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے:

"مولائے کُل۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے مجھے اپنے دیدار سے فیض یاب کیا۔ باریابی کی طاقت عطا ہوئی۔ میں حاضر ہوں مولائے لبمل۔ میری جان آپ پر قربان' فقیروں' بے نواؤں کے آقائے نامدار میری حاضری قبول ہو' میری حاضری قبول کیجئے۔ میرا سلام قبول ہو۔ میری دعا قبول ہو۔ اے شاہ امم۔" پھر اس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

حسین حیران تھا۔ جی ہی جی میں اس نے سوچا: "میں اپنے آپ کو رسولِ پاکؐ سے محبت کرنے والا جانتا ہوں اور سمجھتا ہوں مجھ پر انعام و اکرام کی بارش ہونی چاہیے۔ مجھ پر وہ در وا ہوں جو خاصۂ خاصان رُسل پر ہوتے ہیں اور یہاں ایک سوداگر صحراؤں اور شاہراہوں پر گرداں' سود و زیاں کا خیال رکھنے والا نہ اپنے اشواق میں شدید اور نہ ہی اپنی آرزو میں بے پناہ۔ وہ حب رسولؐ میں گریہ کناں ہے۔ یہ توفیق اسے کہاں سے عطا ہوئی ہے۔ کس کی دعا کا اثر ہے اور میں دیوانہ ہو کر بھی فرزانہ ہوں۔ میرے ہوش و حواس قائم ہیں مگر ایسی حضوری مجھے نصیب نہیں ہوتی۔ کہیں نہ کہیں کسی بات کی کمی ہے۔ سا: ؛ دلوں پر شوق کے جذبِ غالب کے وقت جو راز منکشف ہوتے ہیں' مجھ پر کیوں نہیں :. تے۔

مجھے بے منتِ گریہ اپنا سوال دہرانا چاہیے۔ اپنی جان کی بے تابی کو تہذیب نفس کے دائرے میں لانا چاہیے۔ میں اپنی نمازوں میں شدت اختیار کرتا ہوں۔"

ابھی تک اسے وہ سجدۂ شوق عطا نہیں ہوا تھا جس سے اور سجدہ حرام ہو جاتے تھے۔ نوافل کی کثرت کے باوجود شاید اس کی پیشانی میں وہ سجدہ رکھا ہی نہیں گیا تھا۔ اس کا نصیب اس کا مقدر ـــــ قیامِ ازل نے اسے جو دیا تھا وہ دیا تھا۔

آقائے رازی اٹھا تو وہ بھی اٹھا۔

"تم سے ملے زمانہ ہو گیا۔ تم بغداد جا رہے تھے۔ کیا اب بھی دربارِ خلافت میں ہو۔"

"میں دربارِ رسالتؐ میں حاضر ہوں۔" حسین نے لرز کر کہا۔

جانے اس کی حاضری قبول ہوئی کہ نہیں۔ اسے تو صرف اس تجلّی کی طرف سفر کرنا تھا جو اسے اذنِ سفر دے گئی تھی۔ اس کے تو خواب بھی نہ تھے۔ تپشِ غم سے مجالِ خواب محال۔

"کیا اب دربار سے تمہارا تعلق نہیں رہا۔ میں نے اہلِ کارواں میں سے کسی کی زبانی سنا ہے کہ خلیفہ بس ذرا سے بخار سے انتقال فرما گئے ہیں۔ افسوس آدمی حکومتیں، سلطنتیں، سرحدیں بناتا ہے، محل سرائیں اور سیر گاہیں اور انجام اول و آخر فنا ہے۔ ہے نا ـــــ" اس نے حسین کو مخاطب کیا۔

حسین اپنے خیالوں میں گم، اپنی بے وقعتی، کم مائیگی پر نازاں، مسجدِ نبویؐ میں صرف آخری جگہوں کی تلاش میں تھا۔ اگر اس کا شمار ان صفوں میں ہو سکے تو ـــــ خلیفہ کے نام پر اس نے چونک کر دیکھا۔

"اچھا۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"بیباک اور نڈر آدمی جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جرأت رکھتا تھا۔ اسے معتضد یاد آیا۔ اور پھر بغداد اور کنارِ دجلہ کی سیر گاہیں، رندی و ہوشیاری کے جلسے، بکھری ہوئی دنیاداری جو رونقوں میں نمو کرتی تھی۔ اور پھر موت اور ویرانی اور بردباری میں جا کر ختم ہوتی تھی۔ روشنی زندگی ہے تو تاریکی موت ہے اور موت سے ایک قدم ہمیشہ کی زندگی اور اسی لیے اسے فنا سے پیار تھا۔ وہ موت کا طلب گار تھا۔ ایک

آدمی جو پل صراط پر چلتا رہا' آخر کار پار اتر ہی جاتا ہے' مگر کیا موت فنا ہے؟

''کیا سوچنے لگے ہو حسین؟'' آقا رازی نے اس کے کندھے کو چھو کر کہا۔

''آقائے رازی! موت فنا تو نہیں ہو سکتی۔'' اس نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''میں سیدھا آدمی ہوں۔ مجھ سے تم موسموں کا پوچھ سکتے ہو' دنیا کی اقلیموں کا موسم جن میں مَیں نے سفر کیا ہے مگر بخدا میں مر کر دوبارہ جی نہیں اٹھا ہوں کہ بتا سکوں کہ موت فنا ہو سکتی ہے کہ نہیں۔'' پھر کچھ دیر سوچ کر اس نے کہا: ''حسین فنا کا مطلب تو مٹ جانا ہے اور ہم جو رسولِ عربی کا دیدار قیامت میں کریں گے۔ ہم جو قیامت میں جنت اور دوزخ کی طلب اور بچاؤ کی خاطر زندگی گزارتے ہیں ہم مٹ نہیں سکتے حسین۔ ہم فنا نہیں ہوں گے۔ دوبارہ جی اٹھنے کا مطلب فنا ہونا نہیں۔ موت فنا نہیں ہرگز نہیں۔ بالکل نہیں۔'' اس نے حسین کے کندھے کو جھنجھوڑ کر کہا۔

حسین اس کے چہرے کو تکتا رہا۔ جیسے پہلی بار اسے دیکھ رہا ہو۔ بھلا آقائے رازی اس کے سوال کو کیسے سمجھ سکتا تھا۔ وہ کنیزوں اور ریشم کے کپڑوں کی تجارت ایک ہی جذبے سے کرتا تھا مگر اس سرزمین کی محبت جس میں سوائے محبت کے کسی سوال کو دخل نہیں تھا' اس میں کوئی غرض پنہاں نہ تھی' وہ یہاں اس لیے آیا تھا کہ اس کی خوشبو سے اپنی جان کے آرام کا سامان کرے۔ اپنے دل کو اس سیر سے شادکام کرے۔ اس در پر حاضری دے اور اس کو اعتماد تھا کہ اس کی حاضری قبول ہو گی' اس کی طلب صادق تھی اور لامحدود نہ تھی اور اس لیے شرف باریابی اسے مل گیا تھا۔

دونوں روضۂ رسولؐ کے قریب ان قدموں میں بیٹھے رہے۔ ایک خلقت اپنی محبت میں مکمل شوق دیدار سے پروانہ وار اس آستاں پر حاضر تھی۔ پوری زندگیاں اسی خیال میں غلطاں ایک لگن کہ آخر بلاوا آئے گا۔ اپنے بخت رسا پر نازاں جانوں کی تپش سے دلوں کے ارادوں سے قربان ہونے والے۔ خدا نے آسمانوں اور زمینوں میں اس نام کو بلند کیا تھا۔ جہانوں کے لیے رحمتیں بحر و بر پر خشک و تر پر رحمت بن کر آنے والے۔

راتوں کو مسجد نبویؐ کا صحن شمعوں سے بقعۂ نور بن جاتا۔ لوگ کلام اللہ پڑھتے۔

خوش الحان جوان مدح محمد ثنائے رسولؐ ایسی رقت سے پڑھتے تھے کہ سینوں میں دل پانی ہوئے جاتے تھے۔ ریت پر حلقہ باندھ کر بیٹھے لوگوں میں آقائے رازی بھی شامل تھا۔ اور صدقہ و خیرات کے لیے الگ رکھے روپے کو خدامِ حرم میں تقسیم کر کے وہ بھی سننے والوں میں بیٹھ گیا۔ ذکر و فکر کی یہ پُر رحمت شب ہائے روشن جو دلوں کو نزہت اور روح کی تازگی ایمان کی حرارت کا باعث تھیں' یہ زائرین کی جنتِ نگاہ اور وہ لحنِ داؤدی فردوسِ گوش۔

زیارات مقدسہ کے لیے حسین اور آقائے رازی ساتھ چلے تھے۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ میں ایک ایک ذرّے کو آنکھوں میں سرمہ بنا کر لگاؤں۔ میری جان ان راستوں پر قربان' میرا دل ان جگہوں پر فدا جہاں میرے پیارے رسولؐ نے قدم دھرے۔" آقائے رازی نے چلتے ہوئے کہا تھا۔

حسین نے اس کی بات کا کچھ جواب نہیں دیا تھا۔

جبلِ شیطان پر پہنچ کر آقائے رازی نے کہا: "یہ وہ جگہ ہے جہاں جنگِ احد کی گھڑی شیطان نے چلّا کر کہا تھا' تمہارے نبی شہید ہو گئے۔"

"شیطان نے یہ نہیں کہا ہو گا وہ تو شہادت میں یقین ہی نہیں رکھتا۔" حسین نے کہا۔

"مگر میں کیسے کہوں اپنے منہ سے جو بات شیطان نے کہی تھی۔ شیطان جو انسانوں کو گمراہ کرنے والا اور غلط راہوں پر ان کی رہنمائی کرنے والا تھا۔" آقائے رازی نے کہا۔

"وقت کے کسی گوشے میں شیطان بھی فرشتہ تھا۔ سب سے زیادہ عبادت گزار۔ قریب تر۔" حسین نے مسجدِ فتح میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"دنیا میں کتنا امن ہوتا اگر شیطان نہ ہوتا۔" آقائے رازی نے کہا۔

"آقائے رازی یہ ساری رونق اس کے دم سے ہے۔ اگر گناہ کا تصور نہ ہو تو آدمی کس شے سے بچے۔ شیطان نہ ہو تو ابنِ آدم فتنوں سے محفوظ کیسے رہے۔" حسین نے حیرت زدہ آقائے رازی کو بتایا۔

"یہ کج بحثی ہے ابنِ منصور۔ یہ گمراہی ہے۔ اس سے بچو۔ تمہارے خیالوں سے

مجھے تو سخت حیرت ہوئی ہے۔"

"بخدا آقائے رازی آپ کسی سے پوچھ لیجئے۔ میں نے غلط نہیں کہا۔" حسین خوشدلی سے ہنسا۔

"ابنِ منصور۔ میں کسی بات کی وضاحت نہیں چاہتا۔ کسی سے پوچھنا نہیں چاہتا مگر تم کیونکر یہ بات کہتے ہو؟ تم نے نہایت عالموں اور شیوخ کی صحبت اٹھائی ہے۔" رازی کے ماتھے پر لکیریں گہری ہو گئیں۔

حسین پھر ہنسا۔ "آقا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ کلام پاک میں جو لکھا ہے وہ اس بات کے سوا نہیں جو میں نے کہی ہے۔ خدا نے آدم کو بنایا اور ابلیس کو بھی بنایا۔"

"ٹھیک۔"

"آدم کی پیشانی میں اپنا نور رکھا۔"

"رکھا۔"

"فرشتوں کو حکم دیا کہ اسے سجدہ کرو۔ سب نے کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا۔ وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ عرش سے نکالا گیا۔ خوار ہوا۔ انسانوں کو گمراہی میں مبتلا کرنے کے لیے وہ بھی دنیا میں وارد ہوا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو کوئی گمراہی میں مبتلا کیونکر ہوتا۔ اور یہ سوز و سازِ حیات ہی نہ ہو۔ وہ نہ ہو تو جنت نہ ہو۔ اس کی تڑپ نہ ہو۔ اس کے حصول کے لیے کدو کاوش نہ ہو۔ ایک طرح سے تو وہ محسن ہے۔"

وہ بات ختم کر کے ہنسا تو رازی کو جیسے ہوش آیا۔

"بخدا۔ حسین بن منصور تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔"

"شاید۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "شاید۔"

ایک بحرِ بیکراں اور ایک آب جو وہ بھی ناقابلِ ذکر۔ رازی نے ٹھیک کہا تھا وہ حواسوں میں نہیں تھا۔ مگر وہ آب جو اس بحرِ متلاطم میں مل جانا چاہتا تھا۔ مشکل' ناممکن۔ اس کا شمار کہاں تھا۔ مایوسی اور بے چارگی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

خلقت خالق تک کیسے پہنچے۔

خالق سے خلق کی ہوئی چیزوں کے خیالوں اور خوابوں کا کیا رشتہ۔

جو دل میں دخیل ہوتا ہے وہ موج در موج خیال ہیں۔

موجیں اپنی حدوں میں اسیر۔
اصل کو کہاں جانا جا سکتا ہے۔
جو حقیقت ہے وہ اصل سے جدا ہے۔
پروانہ شمع کے گرد پھرتا ہے۔ شب گزاری کے بعد۔
وہ اپنی گردش کا فسانہ کہتا ہے۔
اس فسانے میں سرخوشی ہے
یہ سرخوشی کہ کبھی وہ تکمیل کو پہنچے گا
شعلے کی روشنی حقیقت کا علم ہے
اور گرمیٔ شعلہ وہ اصل ہے
گرمی میں داخل ہونے اور روشنی کو جاننے کے لیے
اصلیت کو سمجھنے کے لیے
پروانہ اپنے آپ کو شعلوں میں جھونک دیتا ہے
اور پھر سرخرو ہو کر پلٹ کر وہ اپنی واردات سناتا ہے
پروانہ دید کو شنید پر ترجیح دیتا ہے
اور خبر دیتا ہے کہ شعلوں کے درمیان اس نے کیسے گزارا
جو دید کی منزل پر پہنچا وہ شنید سے بے پروا ہو گیا
عشق میں تبدیل ہوا
اور دید کی منزل سے مشاہدے کی طرف گیا
مگر وہ جو جبلتوں کے اسیر ہیں
اور گناہ میں ملبوس ہیں
میری طرح کبھی خوش بختی تک نہیں پہنچیں گے!

''تم صبح و مسا ان قدموں میں ناصیہ فرسا ہو کیا چاہتے ہو۔'' آقائے رازی نے اس سے پوچھا۔ ''تم نوافل میں لگے رہتے ہو۔ کیا شمار ہے تمہاری ان عبادات کا۔''

''ایک ہزار یا اس سے زیادہ نوافل۔'' حسین نے کہا۔

''ایک قصہ سنو گے۔'' آقائے رازی نے اس کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے

کہا۔ ”یہ ایک واقعہ ہے جو مجھے شاہراہِ خطا پر پیش آیا۔“
حسین نے سر جھکا دیا۔

”دشتِ لوط سے پرلی طرف پہاڑوں کے سلسلے دور تک چلے گئے ہیں۔ وہاں آزاد قبائل آباد ہیں۔ انہوں نے اسلام قبول تو کر لیا ہے مگر اپنے شعائر اور طرزِ زندگی اور طرزِ احساس میں وہی ہیں۔ وہ لوگ عورتوں کی آزادہ روی کے قائل ہیں۔ درحقیقت وہاں خواتین کی حکومت ہے۔ وہی بڑے بڑے فیصلے کرتی ہیں اور زندگی کے نازک ترین مسائل بھی ان کے فیصلہ پر ہوتے ہیں۔ میں ان علاقوں میں اعلیٰ درجے کی اون اور موتیوں کے لیے جاتا ہوں۔ سردی شدید نہیں ہوتی مگر اچانک برف پڑنے لگتی ہے اور آمدورفت کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ یہاں آنے سے ایک سال پہلے میں ان چراگاہوں کی جنت میں گیا تھا۔ دور تک حدِ نظر تک گھاس کا بیکراں سمندر اور جب ہوا چلتی تو سبزے کی لہریں ایک دوسرے کے عقب میں مواجِ بحر کی طرح چڑھتیں۔ ہمارا پڑاؤ کچھ دن وہاں رہا۔ پاس کی بستیوں سے دوشیزائیں ضرورت کی چیزیں فروخت کرنے آتیں تھیں۔

ایک دن میں چشمے پر وضو کر رہا تھا کہ دو لڑکیاں وہاں آ کر بیٹھ گئیں۔ میں اوٹ میں تھا اور وہ روشنی میں تھیں۔ بیلوں اور درختوں اور پھولوں کی جھاڑیوں سے میرے بیٹھنے کی جگہ ان سے پوشیدہ رہی ہو گی۔

”یہ قافلہ دو ایک دن میں یہاں سے کوچ کر جائے گا۔“ وہ بہت اداس تھی۔

”سلطان آغا! تم نے تو خوب سکے جمع کر لیے ہوں گے۔ اداس کیوں ہو۔“ ایک نے پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ چھوٹے چھوٹے پتھر کنارے سے اٹھا کر چشمے میں پھینک رہی تھی۔ پتھر ”گم“ کی نہایت مختصر آواز سے پانی کی تہہ میں بیٹھ جاتا۔

”نہیں ترخان آغا! یہ بات نہیں۔ رقم تو جمع نہیں ہو سکی۔ اس میں سے نصف میں نے رستم کو دے دی ہے۔ اس نے کارواں والوں سے ایک ریشمی چادر خریدی ہے۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”اس لیے اداس ہو کہ اب گھر والے حساب کریں گے۔“ ترخان آغا نے کہا۔

”سنو۔ دوست پر خرچ کیا ہے تو خوف کیسا۔ اور نصف تو تم نے بچا لیا ہے۔ میں

یوں نہ سوچتی سلطان آغا۔ دوست پر سب کچھ لگا کر کے بھی کوئی گھاٹے میں نہیں رہتا اور حساب کرنے والا کبھی دوست کو خوش نہیں کر پاتا۔ اب خوش ہو جاؤ کہ چاہے تم ماں کو کچھ بتا سکو گی مگر جی میں سمجھتی ہوں ناں۔ تم نے وہ سب کھو نہیں دیا۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنسیں اور چشمے میں انہوں نے جھک کر اپنے سراپے دیکھے۔ بالوں کو سنوارا۔ پانی سے انہیں برابر کیا۔ دودھ والے مشکیزے اٹھائے اور پھر اچانک ترخان آغا کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے زور سے چیخ ماری اور بھاگ گئی۔

"آقائے رازی میرے پاس دوست پر لٹانے کے لیے کوئی شے نہیں۔" حسین نے نہایت درد سے کہا۔

رازی بہت پراسرار ہنسی ہنسا۔ "کچھ نہیں۔ اتنے تہی دست بھی نہیں ہو اور نوافل کا شمار رکھتے ہو۔۔۔"

حسین نے خراباتی کی طرح خردش کیا۔ سر دُھنا اور کہا: "واللہ تم صحیح کہتے ہو۔ بخدا تم ٹھیک کہتے ہو۔"

اسے وہ فہم کیوں نصیب نہ تھا۔ وہ نظر جو سلطان آغا کو ملی تھی اسے کیوں نہ مل سکتی تھی۔۔۔ دوست کے لیے نوافل کا شمار کیسا۔۔۔ وہ ایک دائرے میں اس وقت تک بھاگتا رہا تھا جس کے اندر تو داخل ہوا جا سکتا تھا مگر باہر نکلنے کی راہیں بند تھیں' مسدود۔۔۔ اس کی شوریدہ جان یہ ذرا ذرا سے اسرار سمجھ نہ سکی تھی۔ اسے آج تک اپنے آپ پر ناز رہا تھا۔ وہ اپنے راستے خود چنتا اور خود ان پر چلتا تھا۔ وہ اپنا مقدر خود بناتا آیا تھا۔ وہ اپنا آپ اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا تھا۔

یہ گزاری ہوئی ساری زندگی کی تھکن تھی جس نے اچانک اس گھڑی اسے آلیا تھا۔ بھلا وہ کیا کرتا رہا تھا۔ اس کے پاؤں زخمی تھے اور روح زخمی تھی۔ اس کو اپنی ہمت پر جو ناز تھا بہتی ہوئی دھوپ کے دھارے تلے گزرے مدہوشی کے دن سب اذیتیں جو اس نے نادانی میں اپنی جان پر روا رکھی تھیں اسے پابجولاں قیدی کی طرح اپنے عقب میں گھسیٹے پھرا تھا۔

یہاں ہر طرف امان تھا' نور تھا اور لوگ حلقہ بنا کر مسجد نبویؐ کے صحن میں بیٹھ کر تلاوت کرتے تھے۔ بکثرت جلائی گئی۔ شمعوں کی روشنی میں خروش و غوغا کے بنا ذکر

و فکر کی محفلیں سجاتے تھے۔ وہ اتنا کم فہم تھا کہ یہاں آکر بھی اپنے نعروں سے الامان الحذر میں مصروف تھا۔ ایک چھوٹی سی بے بضاعت چڑیا کی طرح جو شام کی خاموشی اور تاروں بھری نیلاہٹ تلے لوگوں کے آرام میں خلل انداز ہوتی ہے اور اپنے ہونے کا احساس دلانے کے لیے چیختی ہوئی آسمان کی پہنائیوں کے بوجھ سے دبی' گنبدوں اور میناروں پر سے پرواز کرتی رہتی تھی۔

ان قدموں میں بیٹھ کر' ان دیواروں کو چھو کر اس فضا میں سانس لے کر اس نے بے پناہ دولت کی حامل زمین پر اگر امن نہ پایا' سکون حاصل نہ ہوا تو کہیں نہیں ملے گا۔ ہو سکتا ہے وہ مدعا کہے' رسولِ خداؐ سنیں اور اس دنیا میں اس کی شفاعت کریں۔ وہ اپنی مراد کو پہنچے۔

ریاض الجنۃ اور منبرِ رسولِ عربیؐ کے درمیان لوگ اسے دیکھتے۔ وہ بنا ہلے بنا پلکیں جھپکائے بنا کوئی سوال کیے وہاں حاضر تھا۔ احمدِ مرسلؐ میں حاضر ہوں۔ رسولؐ خدا میں حاضر ہوں۔ آپؐ پر ان گنت درود و سلام ہوں' میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں۔ میری جان آپؐ پر قربان' میں حاضر ہوں۔

اس کی عجیب شان تھی کہ کسی کو اسے وہاں سے ہٹانے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ اسے کھانا لا کر دیا جاتا تو وہ ایک ٹکیہ چاروں کونوں سے تھوڑا تھوڑا توڑ لیتا اور دو گھونٹ پانی پی کر باقی لوٹا دیتا۔

ایک روشن چراغ نادیدہ روشنی سے روشن ہوا۔ اس کی روشنی سارے چراغوں سے بڑھ کر تھی۔ ماہِ منور اپنے گرد ہالہ کیے باقی روشنیوں میں نازک تر اور روشن تر ـــــ خدا نے اسے اُمّی کہا۔ عرش پر وہ اس کا مشتاق تھا اور باقی سب ان ایوانوں سے باہر تھے۔ وہ محبوب تھا' بے شک سارے علوم اور سارے سر اس ایک ہستی میں تھے جو آئینہ تھا اور اس کے روبرو تھا اور ـــــ مشتاقِ دید نے اپنا جلوہ دیکھا تھا۔ وہ اس سے ہم کلام ہوا تو اپنے سے ہم کلام ہوا۔ اس کا سوال عین کے عین کا تھا!

اپنی دیوانگی میں وہ بھی ان کے در پر گدا تھا' سوالی تھا۔ مگر اس کے سوال بڑے تھے۔ وہ اس رخِ روشن کا دیدار کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح مشتاق تھا۔ اس کو اپنی حدود میں لوٹنا چاہیے ـــــ حدود کیا تھیں۔

اے نورِ دیدہ ودل جلوہ فگن ہو

اے ماہِ منور اپنی ضیا سے میری تاریک زندگی کو منور کر دے

مجھے اس ماہِ تمام کی تمنا ہے دوستو

تمہارے سامنے یہ روضۂ مبارک ہے جس کی خوشبو مہک رہی ہے

ان پر درود اور سلام پڑھو۔

لوگ روضۂ رسولؐ کے گرد پروانہ وار نثار ہوتے تھے۔ خوف اور رقت سے دل بھرے ہوئے' دماغ سے ہوش و حواس اڑے ہوئے' برہنہ سر رو رو کر دعائیں مانگتے تھے۔ خشوع و خضوع سے الحاہ وزاری سے اپنا دردِ دل کہتے تھے۔

حسین بن منصور کا سوال دوسرا تھا۔

کبھی عالمِ رویا میں اس فقیر درِ خوبی و محبوبی کو دیدار نصیب نہ ہوا تھا۔

رونے والوں کو دیکھتا کہ جیسے کثافت دُھل گئی ہو' پرسکون ہو جاتے۔ اس کی بے چین جان کو قرار کیونکر ہو؟ یہ جگہ جہاں سید الاوّلین ولآخرین' امام المرسلین' رسولِ رب العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف رکھتے ہوں وہاں مایوسی اور پریشانی کو سکینۃ القلب میں بدل جانا چاہیے' بارگاہیں جہاں ملائکہ محوِ حمد و ثنا تھے' عرش جہاں جبریلِ امیں کا آنا جانا تھا اور عرش پر تخت پر جلوہ فگن وہ۔ روشنیوں کی روشنی ـــــ حسین الجھ جاتا۔

تیز آتشیں ہواؤں میں اس کا وجود جلنے لگتا جیسے زیرِ زمیں میں آگ اگلتے ہوئے ذخائر پھٹ گئے ہوں اور حسین ـــــ اسے بال و پر ہی عطا نہیں ہوئے تھے۔ ایک ہی وجود کو قائم رہنا چاہیے۔ وہ اپنے آپ کا کیا کرے۔ اس کی رسائی نہیں۔ اسے طاقت گویائی نہیں۔ اسے یارائے تکلّم نہیں۔

اے انفس و آفاق کے خدائے لم یزل ـــــ

اسے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ ان وادیوں نے' ان پہاڑوں نے' اس سرزمین نے وہ عالی مرتبہ بار اٹھائے تھے کہ وہ عرش سے بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ لرزاں ترساں گریہ کناں شہنشاہ جن کے لیے کلام اللہ نے احترام کیا۔ وہ دونوں اب حضور کے قدموں میں محوِ استراحت تھے جن کی صداقت پر خدا نے خود گواہی دی تھی۔

حسین روتا مگر اس کا قلب قبض کی حالت میں رہتا۔

وہ اپنے تن کی قید سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ وہ اسے گھلا رہا تھا کہ شاید وہ معدوم ہو تو عدم قائم ہو۔

یہ شور و غوغا کرنے کا مقام نہ تھا آہستہ خرام! ارواح ملائے اعلیٰ سے زیارت کے لیے آتیں۔ ایک تانتا بندھا رہتا' مگر خروش کی مجال نہ تھی۔

اہلِ صفہ اس کی طرف دیکھتے اور مسکراتے۔ گویا اس حیرت خانۂ امروز و فردا میں اس کی جدّت طرازی سے محظوظ ہو رہے ہوں۔ اس کی جرأتِ رندانہ پر' اس کی عقلِ ناداں پر اور اس کی بے باکی پر خندہ زن ہوں۔

اہلِ مدینہ اس خرقہ پوش کو وہاں دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ جانے اس کا سوال کیا تھا؟

یہ شعبان کی آخری تاریخیں تھیں۔ بیشتر لوگ عبادت میں مصروف اور رمضان المبارک کی آمد آمد کی وجہ سے نوافل میں لگے ہوئے تھے۔ صحنِ مسجد تلاوت کرنے والوں اور قرأت کے جلسوں میں مصروف خوش الحان قاریوں اور مختلف النوع دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے معلّموں اور حفاظ سے پُر تھی۔ کبوتر دانے پر چونچ نہیں مارتے تھے' جیسے افطار کے وقت کے منتظر ہوں۔

بڑھیا نے حسین کے قریب آ کر پانی کا خمرہ رکھا: "یہ افطار کے لیے شربت ہے۔"

جواب نہ پا کر آگے بڑھنے کے بجائے وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ "کیا تم بھی روزے سے ہو۔" ــــ "کیا تم نے نہ بولنے کی قسم اٹھا رکھی ہے۔ کیا تم قائم اللیل و صائم الدہر ہو۔"

جب اس نے پھر بھی جواب نہ دیا تو بڑھیا نے کہا: "ضد نے اور اپنے پر ناز نے اسے محروم رکھا۔ تم اس کی راہ پر کیوں چل رہے ہو۔"

حسین نے سرخ انگارہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ استغراق نہیں شرک ہے۔ تم کو ادب سیکھنا لازم ہے۔ جہاں تم ہو' جس آقاؐ

کے حضور حاضر ہو کیا ان سے آگے جانے کی خواہش کرتے ہو۔ یہ کفر ہے کفر۔"

حسین کو ہوش آ گیا ہو جیسے اس کی قوتِ گویائی اور شنوائی واپس آ رہی ہو۔ تیز آندھیاں اس کے خون میں چلنے لگیں۔ وہ تنکے کی طرح ان ہواؤں کے دوش پر اڑا جا رہا تھا۔ بگولے اسے اٹھا رہے تھے۔ اپنے دائروں میں گھما رہے تھے۔ اپنے مرغولوں میں اسے بلندیوں کی طرف لیے جاتے تھے اور نقارے پر چوٹ پڑ رہی تھی۔ عناصر اس سے آمادۂ پیکار ہونے والے تھے۔ وہ اسے معدوم کر دیں گے۔ گم کر دیں گے۔ وہ جھک گیا کہ وہ اپنے آپ کو پکڑ کر رکھ سکے۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اذان کی صدا کائنات میں نغمۂ نور کی طرح گونج رہی تھی اور وہ اکیلا تھا۔

بڑھیا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس نے شربت کا ایک گھونٹ افطار کی نیت سے پیا۔

ساتوں عرش اس کی نگاہ کے سامنے پرت در پرت۔

اور اس کی نگاہ اس سے لے لی گئی تھی' اس کو دھویا اور پاک کیا جا رہا تھا تاکہ اسے لوٹائی جا سکے۔

ایوان سجائے جا رہے تھے کسی تپیدہ دل کے استقبال کے لیے۔

جانے وہ کون ہو گا جس کی خاطر داریاں اسے منظور تھیں۔

جنت اور جہنم اور برزخ وہ پھیل کر ہر مقام پر پہنچ رہا تھا اور آستان سے پرے حجابوں کے پار سے سرا پردۂ اسرار سے صدا آ رہی تھی:

"بیا بیا ما بہ میخانہ۔"

پھر اس نے اپنی چشمِ بینا سے دیکھا اور بخدا وہ خواب نہیں تھا کہ رسولِ عربیؐ اس کی طرف محبت سے دیکھ رہے ہیں۔

اس کی نگاہیں جھکی ہیں مگر اس کی جان کی ساری بے تابیاں اور آتش زدگی اور بے چارگی ایک دم رخصت ہو گئی۔ اسے حکم دیا گیا' نہیں اسے سمجھایا گیا کہ وہ خانۂ خدا پر حاضر ہو کر فریضۂ حج ادا کرے۔

وہ بادلوں والی شام رات میں بدل گئی اور گھٹاؤں نے اپنے مشکیزے سارے نشیب و فراز پر کھول دیئے۔ وادیاں اور پہاڑ دھوئے گئے۔ باغوں پر ابرِ رحمت برسا۔ مدینۂ

رسولؐ کے چاروں دروازوں سے پانی ندیوں کی صورت بہہ نکلا۔ حسین کی جان دُھل گئی اور اس کا پیاسا جسم سیراب ہوا۔ اس کا رواں رواں سجدۂ شوق میں مشغول ہوا۔ وہ مسکراہٹ' وہ نظرِ کرم وہ کب اس کا سزاوار تھا۔

شعبان کی میکدہ بدوش راتیں سفر کے لیے نہایت موزوں تھیں۔ وہ پھر قافلۂ شوق میں ایک مسافر تھا جس کے پاس زادِ راہ کے نام پر تقریباً کچھ نہیں اور سواری کے لیے ایک عربی گھوڑا تھا۔ ایسا ہی جسے دو حرقہ سے واپسی پر بغداد جاتے ہوئے خلیفہ کے دربار میں حاضری کے لیے اس کے باپ نے اسے خرید کر دیا تھا۔ دنیاوی جاہ کے نام پر اس کی تہی دستی قابلِ گرفت تھی کیونکہ جس قافلے میں اسے شامل ہونا تھا وہ متمول لوگوں پر مشتمل تھا۔ کثرت سے سامانِ تجارت اونٹوں پر لدا تھا۔ خوبصورت محملوں میں جوان عورتیں تھیں جن کے محملوں پر سونے چاندی سے مزیّن کپڑوں کے قبے بنے ہوئے تھے۔ دو اونٹوں پر مضبوطی سے ایک ہی چبوترہ سا بنا دیا جاتا اور تیز گام ناقائیں اپنے حسین بوجھ سنبھالے ہوئے گام زن ہوتیں۔ پانی کا بوجھ اٹھائے ہوئے کنیزوں اور غلاموں کی سواریوں خورد ونوش کا سامان' غرضیکہ ایک متحرک جہان تھا جو بارگاہِ رسالتؐ سے خانۂ خدا کی طرف رواں ہوا تھا۔ شمعیں جلائی جاتیں اور مصروفِ عبادت لوگ کلام پاک کی تلاوت کرتے ہوئے قاری دل و جان کی ساری مستانہ آرزوؤں سے زیارت کے لیے جانے والوں کی دعائیں' درود وسلام پڑھنے کی آوازیں' سجدہ ریز پیشانیاں گریہ کناں دیدۂ بے خواب معاصی پر منفعل روحیں معاف کر دیئے جانے کی امیدیں نفس بے تاب اور شرمندہ شرمندہ قلب نیم پارہ سوز و ساز سے پر نغمۂ شوق جاری وساری۔

شعلۂ مستعجل کی سی حسین کی جوانی کو عبادات نے ایک عجیب ضیا بخش دی تھی۔ پیشانی پر اس کے نصیب کی روشنی اور آنکھوں میں سکون اور ٹھنڈک کی کیفیت نے اسے لوگوں کے لیے باعثِ برکت وجود بنا دیا تھا۔ اس کی مقناطیسیت کچھ یوں تھی کہ لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ایں ہم آں ہم کا سرور اس کے رگ وریشے میں آرامِ جاں بن گیا تھا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے تیغ کی ساری تیزی اور چمک اس کی دھار میں ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ بھی تیغِ تیز ہے۔

کیا اس پر پھر دیوانگی کا دورہ پڑنے والا تھا۔ اس جان کنی کی حالت میں اترنے سے پہلے اس نے چاندنی میں ضوفشاں ذروں میں ہوا میں اپنے آپ کو ملتے پایا اور اپنے آپ کو بکھرنے سے بچانے کے لیے اس نے مدینۂ رسولؐ کی طرف چہرہ کیا اور اپنی مناجاتوں میں انہیں پکارا۔

اور اس کا تنفس اس کے مالک کا تنفس ہے اور وہ خود مالک ہے اور اپنی زیارت کو جا رہا ہے' وہ تو نہیں ہے سب طرف اسی کا جلوہ ہے۔ ہُو' ہُو ___ وہ ہُو ہے' ہُو' وہ ہے۔

جب کارواں مکہ معظّمہ پہنچا تو قافلۂ نجوم اپنا آدھا سفر طے کر چکا تھا اور دُبِّ اکبر کے ساتوں تارے جن کی سیدھ میں قطبِ آسمان ہے جھکے ہوئے تھے جیسے ناقۂ شب اپنا گھٹنا ٹیک کر گردن کو جھکولے دے کر پشت کو خم کر کے پاؤں پھیلا کر بیٹھنا چاہتی ہو اور انہی گلیوں میں وہ دیوانہ وار اپنے غرور سے زخمی پھرا کرتا تھا۔ یہیں وہ اذنِ باریابی چاہتا تھا اور لوٹایا گیا تھا۔

اور وہ حرمِ کعبہ میں داخل ہوا۔ امن کے شہر سلامتی کے قریے میں جہاں خلیل اللہ نے دعا مانگی تھی اور ان کی دعا کو شرف باریابی بخشا گیا تھا۔ جہاں ہبل ولات و منات نے آباد ہونے کی کوشش کی تھی اور نکالے گئے تھے۔ اونچے اور خشک پہاڑوں سے گھرا یہ خدا کا گھر نشیب میں پیالہ نما وادی کی تہہ میں جس کے گرد پروانہ وار نثار ہونے والوں کا حلقہ ہر دم نگینے کے گرد خاتم کی طرح ہوتا۔

اس کی جاں نے بھی احرام باندھا اور مصروفِ طواف ہوئی۔

پہلے اس نے داخلی طواف کیا پھر مقامِ کریم میں نماز پڑھی اور پھر ملتزم کے پاس خانہ کعبہ کا پردہ پکڑ کر دعا کی اور یہ دعا کیا تھی۔ اب جبکہ وہ حاضر کیا گیا تھا۔ اجازت دیا گیا تھا' وہ کیا دعا کرے ___؟

اس کو باریابی کی اجازت ملی تھی مگر اس کا سوال وہی تھا۔

اسے سوال کو دہرانے کی جرأت نہ تھی۔

وہ کھڑا رہا۔ کھڑا پردہ پکڑے' سے اسے پردوں کو اٹھانے کی اجازت طلب کرنا تھی۔ وہ اسی جگہ تھا جہاں کہ وہ تھا۔

اے میرے خدا کوئی اشارہ کوئی نشانی۔ ایک حرفِ محرمانہ۔

خلقت جو اس سے دریا کی موجوں کی طرح آ کر ٹکراتی اور طواف میں مصروف حجرِ اسود کو بوسہ دینے میں سبقت لے جانے کے لیے بھاگتی تھی' ایک ریلے نے اس کے قدم بھی اکھاڑ دیئے۔ وہ اس موج کے ساتھ بہتا ہوا قبۂ زمزم کے پاس کھڑا تھا۔

اس آبِ حیات آبِ رحمت آبِ زمزم کے صدقے میں مجھے وہ دے جو میری طلب ہے۔

لوگوں کو اس نے دیکھا خوش تھے۔ سیراب ہو کر صفا اور مروہ کے درمیان بھاگ رہے تھے۔ سعی کے بعد سر کے بال ترشوا رہے تھے۔ پھر احرام کھول کر خدا کا شکر ادا کر رہے تھے جس نے انہیں اس دعوتِ ابراہیمی سننے والوں میں داخل فرمایا تھا۔

ہوش آیا تو وہ بابِ سدّہ کے باہر کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کعبۂ بیت الحرام عروسِ دلفریب ہے۔ اس کا لباسِ عنبرین دماغ کو معطر کر رہا تھا اور پرتوِ جمال نے چشمِ یقین کو منور کر دیا تھا۔ کیا بالآخر اس کے اندر کوئی تنویرِ حیام در آئی ہے۔

رقصاں درویشوں کے حلقے سے قریب وہ ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور خلقت کا اژدھام اس سے دعا کا طالب ہو رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آرزوئیں ذرا ذرا سی الجھنیں بگڑے ہوئے مقدروں کے لیے کوئی صراطِ مستقیم' ژولیدہ نصیب کو سنوارنے کے لیے شانۂ اسمِ اعظم۔ دنیا میں سب کچھ پانے کے لیے حرفِ راز' دولت اور جاہ وحشم کو جاتی راہوں پر چلنے کے لیے کوئی آسرا___ عشقِ مجازی میں کامیابی کے لیے تعویذ' دور جانے والے مسافروں کی واپسی کے لیے کوئی زود اثر مناجات___ وہ دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ لوگ دیوانے ہیں کیا___ چند روزہ زندگی کے لیے کتنے پریشان ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہو سکے کہ یہ سب جس کی طلب انہیں بے قرار رکھتی ہے کچھ نہیں تو وہ ناکامی اور دہشت سے مر جائیں۔ اگر انہیں یہ خبر ہو کہ طلب صادق کیا ہے تو وہ ان بے راہوں کے جنگل میں جو آرزوؤں کی آبیاری سے جوان ہوتا ہے کبھی بھی دلچسپی نہ لیں___ روئے زیبا کی جھلک کے لیے اپنی جانوں کو گھلائیں۔ وہ بھلا کیوں کمتر امیدوں سے دل کو بے سکون کریں۔

کنیزوں کے ایک گروہ نے اسے گھیر لیا۔ ان کے دل اپنے وطنوں کی جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ چاہتی تھیں دعا کی جائے انہیں رہائی نصیب ہو۔ وہ خوابوں میں دیکھی گئی ان سرزمینوں کو واپس جا سکیں جہاں ان کے لیے اور کچھ نہ ہو تو خوشبو تو ہو گی اس خاک کی جس نے انہیں جنم دیا تھا۔

وہ سر جھکائے نقش لکھ رہا تھا۔ اس کا مریدِ خاص جو تُستر کا زرگر تھا باری باری اس کے کان میں نام بتا دیتا۔ عجیب بوجھل سی فضا تھی۔ حرم کعبہ سے درود و سلام کی آوازیں آ رہی تھیں مگر اس کی جان ہلکان ہوئی جاتی تھی۔ ناامیدی اور مایوسی' قلب میں وہی ٹھہراؤ' وہی کیفیت جو مدہوشی اور بدمستی کے وقت سے پہلے اس پر طاری ہوتی تھی۔ سینے میں خالی پن جس میں تیز بگولے اٹھ رہے تھے۔ طوفان کی زد پر آیا ہوا اس کا وجود۔ جب اغول کا نام لیا گیا تو اس کے ہاتھ سے قلم گر گیا۔ وہ ساری جان سے کانپا' جیسے سخت سردی سے بخار چڑھنے کی کیفیت ہو اور پھر ایک دم موت کی زردی اس کے چہرے پر کھنڈ گئی۔ اسے لگا ایک زمانہ اسے یہاں ٹھہرے ہوئے ہو گیا ہے اور پلکیں ایک دوسری سے چپک گئی ہیں۔ وہ کبھی آنکھیں کھول نہیں سکے گا۔ اغول کی طرف دیکھنے کی ساری کوشش کے باوجود وہ نگاہ نہیں اٹھا سکا۔

"شیخِ بزرگ!" مرید نے بات جاری رکھی۔ "خاتون اغول کا سوال دوسرا ہے۔ وہ نصیبین جانا چاہتی ہے جہاں وہ اپنی زندگی عبادت و ریاضت میں بسر کرنا چاہتی ہے۔"

پھر جواب نہ پا کر اس نے جھک کر شیخ کو دیکھا اور کیف کی اس حالت کو سمجھ کر اس نے اغول سے کہا کہ پھر کسی وقت آئے۔

بِھیڑ میں گم ہونے سے پہلے وہ لوٹ کر آئی اور زرگر سے پوچھا:

"کیا ان کا نام حسین ہے۔"

"ہاں۔ کیا تم انہیں جانتی ہو۔ پہلے انہیں دیکھا ہے۔" زرگر نے پوچھا۔

وہ حسین کی صورت کو تکتی رہی پھر مڑ کر اس نے نقاب اپنے چہرے پر گرا لیا اور زرگر سے کہا۔

"انہیں کہنا اغول کے لیے دعا ضرور کریں۔"

"اچھا۔" زرگر مرید نے حسین بن منصور حلاج کے تلوے ملنے شروع کیے شاید

انہیں ہوش آ جائے۔

اس عورت کی محبت نے جس کا نام اغول تھا' حسین کو پھر اپنے میں مشغول کر لیا۔ اس جاگی ہوئی روح' تشنہ جان' سوختہ قلب' دردِ آرزو سے بے تاب دل کے ساتھ اسے صرف اغول کی آرزو تھی۔ یہ عجیب بازگشت تھی۔ اس کی عبادتیں اس کے مجاہدے خدا کے لیے اس کی بے چینی اس کا صبر و قرار اس کی دیوانگی سب ایک دم رخصت ہو گئے تھے۔ ساری فضا میں اغول کی خوشبو پھیلی تھی۔ اس کے گرد ایک دائرہ تھا جس میں ایک ہی ہوا بار بار چلتی اور ٹھہر جاتی تھی اور اغول کو پکارا کرتی تھی۔ اس کا جسم اپنی مدتوں کو ترسی ہوئی سوکھی رگوں میں ایک سیال کو تیز چلتا محسوس کرتا تھا۔ اغول کے نام پر یہ روانی بڑھ جاتی۔ کہیں اندر آتش فشاں پھٹ رہے تھے۔ لاوا نس نس میں بہتا جاتا تھا اور سنسناہٹ جو فتنہ انگیز لگتی تھی اس کے آس پاس گنگناہٹ کا وجود ندی کے تیز دھارے میں بہتا ہوا وہ خود ــــ وہ اتنا شدید کیوں تھا ــــ اور یہی دن تھے جب اسے اپنے آپ میں سے اغول کی خوشبو آنے لگی تھی۔ دل میں گھنٹیاں سی بج اٹھتیں اور ایک نام سنائی دیتا۔

میرے دل کے لیے غم۔ اے غم اے خوشی اے سرخوشی
میرے دل میں عشق کی آگ فروزاں ہے
میرے جگر میں سیاہ راتوں کا پورا چاند ڈوب گیا ہے
اے مشک' اے ماہِ تمام
اے ریت کے ٹیلوں کی جھاڑیو
جھاڑیاں کتنی سرسبز ہیں۔ ماہِ تمام کتنا روشن ہے۔ خوشبو کتنی میٹھی ہے
وہ دہن شیریں جس کی مجھے آرزو ہے
اور ماہِ منور وصل کی گھڑی تمہارے رخسار پر شرم کی سرخی میں لپٹا ہوا
کیا اس نے اپنا نقاب اٹھایا ہے
اس کا اٹھا ہوا نقاب میرے دل کے ٹکڑے کر دیتا
اس لیے اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا
وہ افق پر طلوع ہوتا ہوا آفتابِ صبح ہے

وہ ریتلے ٹیلوں کی جھاڑی ہے جس کو مرغزاروں میں لگایا گیا ہو
اگر ابلیس نے آدم کے چہرے میں اس کی ضیا دیکھ لی ہوتی تو وہ کبھی سجدے سے انکار نہ کرتا
مجھ پر تعجب نہ کرو دوستو کہ میں ان غزالیں آنکھوں کا اسیر ہوں
جب قمریوں کو کراہتے سنتا ہوں
تو اس محبوبۂ جانفزا کی یاد میں میری زندگی تلخ ہو جاتی ہے
اور میں موت کو گلے لگا لیتا ہوں

حسین کے ذہن میں ایک ہی نام گونجتا۔ وہ دیوانہ وار مکہ معظمہ کی گلیوں کی بھیڑ میں جھانکتا۔ ایک ایک حسین چہرے کو تکتا اسے کہیں قرار نہ تھا۔ وہ نام اس کے خون میں گھل گیا تھا۔ اب اسے پہلی بار اغول سے ملنا یاد آتا۔ چاندنی رات اور حوض کا کنارا اور اس کا اپنے کتے کے بالوں میں منہ دے کر ہولے ہولے رونا۔ بے یقینی کی وہ زندگی' مستقبل کے اندھیرے میں کود جانے کی سی کیفیت اور معلوم انجام۔ اس کا مطالبہ ایک ہی تھا کہ "مجھے بھلانہ سکو۔ مجھے یاد رکھو۔ میرے لیے دعا کرو۔" ان دنوں اسے شدتِ آرزو کا معلوم نہ تھا۔ یہ محبت کا قلعہ جس میں اب وہ قید تھا اتنے برسوں میں تعمیر ہوا تھا۔ کیا ہوتا اگر وہ اغول سے کہہ سکتا کہ وہ اسے چاہتا ہے! اس نے پکار پکار کر ہواؤں سے کہا تھا کہ اسے اغول سے عشق تھا۔ اس نے رات کے اندھیروں میں سجدوں میں' نماز میں' عبادات میں ہر جگہ ہر گھڑی اسے بھلایا نہیں تھا۔ وہ اسے بھلانے پر قادر نہیں تھا۔ اسے اپنی عبادات نے کوئی قدرت اپنے پر عطا نہ کی تھی۔ اسے اپنے پر کوئی تصرف نہ تھا۔ وہ تو ایک ناکارہ نوجوان تھا جس کی زندگی نے ایک مسلسل خواب دیکھا تھا مگر اس خواب کی تعبیر اس کی حرماں نصیبی تھی۔

اس کا جاگا ہوا وجود اس کی اذیت کا باعث تھا۔

زرگر مرید جس کا نام توفیق تھا' پریشان ہو گیا۔ اب حسین بن منصور حلاج میں کوئی روح در آئی تھی۔ کوئی سایہ اس کے سر پر تھا۔ وہ اپنے طور پر تعین کرنے کی کوشش کرتا اور الجھ جاتا۔ کنیزوں کے جانے کے بعد سے اس مردِ بزرگ کی اس شیخِ صائم کی یہ حالت ہوئی تھی وہ کس سے اس کا اظہار کرے۔ اپنے خدشات کا' اپنے خوف کا۔ بھلا وہ

اغول کون تھی۔ وہ شیخ کو کیونکر جانتی تھی۔ اس نے کیوں کہا تھا کہ اس کے لیے دعا کی جائے اور پھر وہ بعد میں کبھی نہیں آئی۔ اسے دعا کی ضرورت تو تھی۔

شیخ پر تستر میں بھی ایسی قبض کی حالتیں ہوتیں مگر وہ تستر تھا اور سہل بن عبداللہ کا ہیبت و جلال ہر درد کی دوا تھا۔ وہ کس سے کہے کہ حسین بن منصور کے لیے دعا کرے اور اس نے سوچا بہتر یہی ہے کہ وہ خود حسین سے اس سلسلے میں گفتگو کرے۔ درد کا مداوا بولنے اور کہنے اور اندر کا غبار نکالنے سے ہی ہو سکتا ہو شاید۔ کوئی رازداں۔

حسین کے چہرے پر التہاب ذات کا پرتو ہوتا اور جسم پر تشنج کی کیفیت۔ عناصر سے بنے ہوئے اس کے وجود پر آتشِ شوق کی لپٹیں نکلتیں مگر توفیق کس سے بات کرتا۔ حسین جو پہلے ہی کم گو تھا' اب بالکل خاموش رہتا۔ اندر کے خروش کی کیفیتیں ان آنکھوں سے عیاں ہوتیں جو بھیڑ میں ہر چہرے کو تکتیں اور کبھی کبھار کنیزوں کے جھرمٹ کے عقب میں حسین چلتا رہتا۔ کیا وہ سچ مچ دیوانہ ہو گیا تھا۔

پتہ نہیں وہ کسے ڈھونڈ تا تھا۔

بابرکت رمضان المبارک کی راتوں میں جب حرم کا صحن ذکر و فکر کی محفلوں سے آباد ہوتا اور ہر ہر امام اپنے مقلدوں کے ساتھ عبادت میں مصروف ہوتا تو حسین نواحی پہاڑوں اور وادیوں کی طرف نکل جاتا۔ پھر اس کے دل کا درد اس کے نالوں میں ڈھلتا اور اس کی آواز آتش نوا مغنی کی سی دلنوازی سے کون و مکاں کی حدود کو پار کرتی اور اس حریم ناز کے باہری ایوانوں میں دستک دیتی لگتی تھی۔ زرگر توفیق پر بھی عجیب بے خودی طاری ہوئی جاتی۔ وہ سائے کی طرح اس مجذوب کا' اس سالک کا' اس نداف کا پیچھا کرتا جو ہجوم سے بیزار تھا اور چہروں کے میلے میں کسی کی تلاش میں تھا۔ جو پہاڑوں سے کہتا تھا:

''تم مجھ پر اسے آشکار کرو۔ وہ کہاں گئی۔''

کہکشاں ایک تندرو ندی کے دھارے کی طرح اس رات آسمان کی پہنائیوں میں ستاروں کے غبار کو لیے زمین پر آبشار بن کر گر رہی تھی اور حسین کے عقب میں ایک سائے کی طرح توفیق زرگر اس پہاڑ کے دامن میں کھڑا تھا جہاں رسولِ خداؐ عبادت

گزاری اور شب بیداری کے لیے اکثر تشریف لاتے تھے اور غار میں متمکن ہوتے تھے۔
جب یک بیک حسین نے مڑ کر توفیق سے کہا:

"میں اپنی عروس کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ تم یہیں میرا انتظار کرو۔"

اور توفیق ابھی اپنے حواس جمع کر کے ان لفظوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جب اس نے حسین کو ہوا میں تحلیل ہوتے دیکھا اور پھر گھوڑے کی ٹاپوں کی صدا وادیوں میں گونجنے لگی۔ ہولے ہولے وہ گونج بھی دور ہوتی گئی اور توفیق کے آئینے میں اغول کا سراپا ابھرا جیسے ہوا پر کوئی اپنے ہاتھ سے مرقعے بنا رہا ہو۔ صورتیں ہی صورتیں ــــ قافلہ اور پانی کے حوض اور چاندنی کے بحرِ مہیب میں زرد بالوں والی اغول اور حملہ کرتے ہوئے سیاہ صورتوں والے وجود اور ایک حملہ آور کے گھوڑے پر لدی بے ہوش اغول ــــ توفیق کو لگا اس کا سر رنگا رنگ صورتوں اور واقعات سے بھرا ہوا ایک پٹارا ہے اور یکے بعد دیگرے حالات اور واقعات اس میں سے نکل رہے ہیں۔ وہ صورتوں سے گھرا تھا۔

اس نے دیکھا بازار پُر رونق اور معمور ہیں اور سوداگر کنیزوں کو فروخت کرنے کے لیے لا رہے ہیں۔ اغول کو بھی لایا گیا۔ وہ زرد چہرے اور دراز زلفوں والی کنیز شرم سے سر جھکائے پاؤں کے انگوٹھے سے اپنے سامنے کی زمین کرید رہی ہے۔ وہ نظر اوپر اٹھا کر دیکھتی ہی نہیں تھی۔ کون اسے خریدتا ہے۔ اس واقعہ سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بغداد کے امراء کی ایک ٹولی کنیزوں کی خریداری کے لیے آئی تھی اور ایک زنگی سردار نے اس کے مایوس سراپے میں' اس کے بے آس چہرے میں' اس کے مکمل حسن کو جو چمکتے لباس کو بھی ماند کر رہا تھا' دیکھا۔ وہ رُکا رہا کہ وہ کنیز اوپر دیکھے مگر اغول اسی طرح زمین کی طرف تکتی رہی یہاں تک کہ سوداگر دوسرے لوگوں کے ساتھ ادھر آیا۔ اس گستاخ کنیز کو ڈانٹا اور زنگی سردار سے اس کی قیمت کے متعلق بات کرنے لگا۔

وہ بغداد میں تھی جو اس کا مقدر تھا۔ وہ کتنے الجھے راستوں سے اپنے مقدر تک پہنچی تھی۔

زنگی سردار کی منظورِ نظر لونڈیوں میں سے اغول بھی تھی جس کے خواب التائی کی ان سرزمینوں کے تھے جہاں نسطوری پادریوں نے چراگاہوں اور گھاس کے میدانوں'

جھیلوں اور خوبصورت وادیوں میں ان کی تربیت کی تھی۔ وہ جذبہ شہادت سے سرشار تھیں اور بکنا ان کے لیے دل آزاری کا باعث نہ تھا۔ اغول حسین کو بھول نہ سکتی تھی۔ وہ عجیب سا نوجوان جس کی نگاہوں نے حسن کو نہیں دیکھا تھا خوبصورتی اور تکمیل پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا تھا مگر وہ بے پناہ آنکھیں رکھتا تھا۔

زنگی سردار جب حج کا فریضہ ادا کرنے حرمِ کعبہ کی طرف آیا تو وہ بھی ہمراہ تھی۔ اپنا دین وہ بھول چکی تھی کیونکہ اس کا مالک اسے لونڈی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ سب سے بہت التفات سے پیش آتا۔ اس کے خدشات دور ہو گئے تو پہلی بار اس کے جی کی گرہیں کھلیں۔۔۔ کیا ہو کبھی حسین سے ملاقات ہو جائے!۔۔۔ ناممکن کا ممکن بھی تھا۔

ان باغوں اور رونقوں کے درمیان اسے وہ یاد آتا۔ رقص کی محفلوں میں دعوتوں اور گہما گہمی میں وہ اسے بھلا نہ سکی تھی۔ پتہ نہیں کئی صورتیں ایسی کیوں ہوتی ہیں کہ تم ان سے اپنا دامن چھڑا نہ سکو۔ وہ پہلا نوجوان نہیں تھا جس کو اس نے دیکھا تھا۔ اس کے قبیلے کے نوجوان سجیلے، گھڑسوار، جنگجو سپاہی، بلند و بالا چیتے کی پھرتی سے گھات سے نکل کر دشمن پر حملہ کرنے اور ہر وقت مسلح رہنے والے ہوتے۔ دوشیزائیں ان کے دل میں محبت کے نغمے گانے کا شوق تو پیدا کرتیں مگر زندگی میں وہی سب کچھ نہ ہو سکتیں۔ دودھ دوہتے، کومس بناتے، ریوڑوں کی رکھوالی کرتے ہوئے اناج کو کاٹتے بوتے، دودھ کے ذخیروں کی حفاظت خشک گوشت کو محفوظ کرنے کے طریقوں کو آزماتے ہوئے وہ اپنی مصروفیت میں خیمہ گاہوں کے باہر انہیں دیکھتیں کہ تیار ہیں اور گرد اڑاتے ہوئے شعلہ کی سی تیزی سے دشمن کے تعاقب میں جا رہے ہیں۔ ہنستے گاتے ہوئے شکار کی تلاش میں جاتے وہ سنجیدگی سے محبتوں کے لیے کبھی پریشان نہ ہوتے۔ قبیلے کی لڑکیاں ان کی جائیداد تھیں اور ان کا مسئلہ نہ تھیں۔

پھر ننگے پاؤں سردیوں اور گرمیوں میں کوہ و صحرا پر سفر کرنے والے پادریوں نے نسطوری طریقِ عبادت سکھایا اور شہادتوں اور کڑی آزمائشوں کے پراسرار پیمانے، مسلمان لوگوں کا مقابلہ کرنے کے لیے طریقے اور قربانیاں دینے کا بے پناہ حوصلہ ان میں پیدا کیا۔ بغداد اور مغرب کے تمام ممالک میں سلطنتوں کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے لیے انہوں نے سازشوں کے جال پھیلا دیئے۔ یہ نصرانی راہبات جن کے لیے

زندگی محض خدا کی عبادت اور اس کی راہ میں قربان ہو جانے تک محدود ہوتی ــــ اور عشق کے نغموں کو صرف اس کے لیے گاتیں جو قربانی دے کر صلیب پر آویزاں ہو کر خدا کا بے بدل پیغمبر اور بعد میں اپنی قربانی کی مناسبت سے ان کا خدا بن گیا تھا۔ وہ تین خداؤں کی پرستش کرتے تھے۔ خدا کا بیٹا روح القدس اور خدا باپ۔

پتہ نہیں اغول کو راہ چلتے چلتے ٹھوکر کیسے لگی تھی۔ وہ حسین میں کیا دیکھ کر اس کی محبت میں گرفتار ہوئی۔ اور ایک لمحے نے انہیں جدا بھی کر دیا۔ فراق کے التہاب نے اسے رنج اور سرخوشی دونوں جذبے دیئے تھے۔ محبت کی اعلیٰ و ارفع منزل کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ اس وجود کا وہ کیا کرے جو قربانی کے جذبے اور منزل کے درمیان کہیں سے آموجود ہوا تھا۔

اس کے سراپے میں آتشیں شعلوں کی لپیٹیں سما گئی تھیں۔ وقت نے اس زخم کو مندمل نہ ہونے کے قابل بنا دیا تھا۔ اس کے دل میں ایک ہی نام بار بار لپکتا۔ پھر وہ بغداد کے بازار میں نیلام ہوئی اور نصیبین پہنچنے کی جگہ ایک عمائد سلطنت کی کنیز بن کر سرفراز ہوئی۔ اس نے اپنے بڑے بچے کا نام اپنے جی میں حسین رکھا تھا کیونکہ پکارے تو وہ اسی نام سے جاتے تھے جس نام کو مالک پسند فرماتا۔ ہوا اور فضا اور ستاروں تلے رات کا آسمان ہر شے اسے اس کی یاد دلاتے۔ وہ کبھی مکمل طور پر اسے بھلا نہ سکی۔ اپنے دل سے اس کا خیال علیحدہ نہ کر سکی۔ وہ چھوٹا سا نام گونج کی طرح اس کے اندر بند ہو گیا تھا اور خالی مکان میں ایک بار دہرائے جانے والے لفظ کو جس طرح ہوائیں اور دیواریں اور چھتیں بار بار واپس لاتی ہیں' اس کا نام بھی اغول کے اندر سنائی دیتا رہتا۔

گھٹن اور بے چارگی سے گھبرا کر اس نے اپنے ساتھ کی ایک کنیز دلشاد سے جو جھیل بیکال کے علاقے سے جتہ مغلوں کے قبیلے سے تھی اور معمولی سی جھڑپ میں گم ہوئی تھی اور یہاں آن پہنچی تھی' اپنا حالِ دل کہا۔

دلشاد نے بہت غور سے اس کی بات سنی اور پھر کہا:

''اغول۔ تمہارے لیے ایک ہی راستہ ہے' اسے بھلا دو۔ تم اسے یاد کہاں ہو گی۔ ایک لمحے کے لیے تو تم ملے تھے۔''

''اگر میں اسے بھلا سکتی۔'' اغول نے کہا۔

"دیکھو۔ کسی قسمت کا حال بتانے والے سے دریافت کریں گے۔ کسی بزرگ سے دعا کروائیں گے۔" دلشاد نے کہا۔

بغداد میں اس کے باوجود کہ عورتوں کو آزادی تھی اغول نے کبھی محل سرا سے باہر قدم نہیں دھرا۔ نا امید ہو کر وہ اس کی یاد کو بھلانا چاہتی تھی۔

دلشاد نے کہا: "یہ بیماری ہے اغول ورنہ عشق تو دیکھنے بھالنے ملنے کی کیفیت ہے۔"

اغول بہت دیر خاموش رہی پھر نہایت رازداری سے اس نے کہا: "وہ عمیق ترین خلوتوں میں ہوتا ہے۔ بحرِ محیط کی طرح اس کا وجود میرا احاطہ کیے ہوئے۔"

"یہ تو گناہ ہے اغول۔" دلشاد نے نہایت دل سوزی سے کہا۔ "یہ تو آقا سے بے وفائی ہے۔ تم اس کی مرتکب کس طرح سے ہوتی ہو۔"

اغول نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

"دلشاد! تم میری دوست ہو۔ بتاؤ میں کیا کروں۔" وہ بہت پریشان تھی۔

اور اسی لیے جب ان کا آقا مکہ معظّمہ کی طرف بغرض حج روانہ ہوا تو وہ دونوں دوسرے خدم و حشم کے ہمراہ تھیں۔

حسین کو پہچان کر اغول کو انتہائی صدمہ ہوا۔ نوجوان جو اس کی یاد میں زندہ تھا اور تھا بالکل دوسرا اور یہ جلال و ہیبت سے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے آدمی بالکل دوسرا تھا۔ اسے اپنے پر حیرت ہوئی۔ اس نے سوچا وہ شاید غلطی پر ہو مگر حسین کی بے ہوشی کے بعد وہ گم صم واپس خیمے میں پہنچ کر بالکل تباہ شدہ کشتی کی طرح جس کے بادبان پھٹ گئے ہوں' مستول ٹوٹ گئے ہوں اور چرچراتے تختوں کے سوراخوں میں سے پانی اندر آ گیا ہو۔ وہ بس ڈوب گئی' پانی کی لہریں اور موجیں اس پر سے گزر گئیں۔ گزرتی چلی گئیں۔

دلشاد نے کہا: "اغول ہو سکتا ہے تم غلطی پر ہو اور وہ بزرگ حسین نہ ہو۔"

"نہیں۔" اغول نے سر کو دائیں بائیں پھیرتے ہوئے نہایت مایوسی سے کہا۔

"میں ان بے پناہ آنکھوں کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ دیئے کی لو کی طرح جلتی ہوئی اس کی پیشانی۔ یہ وہی تھا' وہی تھا یقیناً۔"

دلشاد نے اس کی مایوسی کو محسوس کرتے ہوئے کہا: "اغول کبھی کبھار عورت کا دل عجیب و غریب دیوانگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ تم تو اس حسین کا سوچا کرو جس کو تم نے چاہا تھا۔"

قطعی ناامیدی سے جو بے حوصلگی پیدا ہوتی ہے' اغول کا دل اس کے شکنجے میں تھا خونیں ہنگام۔ وہ سخت بیمار ہو گئی۔ ایک حدّت سے تپتا ہوا اس کا وجود ریشمی چادروں اور ایرانی قالینوں اور شاندار خیموں کے بوجھ کو برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ وہ بند آنکھوں پر ہاتھ دھرے موت کی راہ دیکھتی۔ اسے اپنے بچے پر' باندیوں پر اور کنیزوں پر سخت غصہ آتا۔ کاش وہ نصیبین جا سکے۔ اکیلی ہو۔ اس کے لیے یہ دنیا کا اختتام تھا۔

دلشاد نے خیمے کے پردے کو اٹھایا تو اندھیرے میں اسے روشنی کا ایک ہالہ سا نظر آیا۔

اغول بستر پر ہی سجدے میں پڑی تھی۔

دلشاد نے اس کا کندھا چھوا تو وہ بخار کی حدّت کہیں نہیں تھی۔ خوف سے اس نے اسے تقریباً ہلا ڈالا۔

اغول نے سر اٹھایا تو اس کا چہرہ چمک رہا تھا جیسے وہ سکون اور اطمینان سے ہو اور بیماری نے کبھی اسے گھیرا ہی نہ ہو۔

"مجھے مبارک کہو دلشاد۔ میں نے وہ پایا ہے جو کسی نے نہیں پایا۔" وہ کھڑی ہو گئی اور سرمستی میں ناچنے لگی۔

"اغول تم ایک گھڑی پہلے تک تو بیمار تھیں۔ اب کیا ہوا ہے۔ میں کس شے کی مبارک کہوں۔" دلشاد حیران تھی اور اس کا خیال تھا گرمی نے اس کے ذہن پر اثر کیا ہے۔

جیسے بہت راز کی بات ہو' اغول نے کہا: "تمہیں پتہ ہے نا کہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ پیدا ہوں گے اور وہ دنیا پر حکومت کریں گے۔"

"مگر ان سے تمہاری سرِمستی کا کیا تعلق۔ مبارک کا کیا تعلق؟"

"میں نے انہیں دیکھا ہے۔ خدا پاک مجھ پر کتنا مہربان ہے دلشاد میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میں نے کیا دیکھا ہے۔" اغول سر جھکائے جھوم رہی تھی۔

”جب دماغ میں حدّت ہو اور خیالوں کا ہجوم ہو تخیل اور تمہارا حد سے بڑھا ہوا احساسِ محبت صورتوں کو تمہارے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ تمہیں ہر طرف حسین نظر آنے لگا ہے۔ کوئی خاکی وجود جو عناصر سے بنا ہے خیموں کے حصار میں نہیں آسکتا۔ پہرے دار، سپاہی اور غلاموں کی ایک فوج آقا کے ساتھ ہے۔ اغول تم نے جو دیکھا ہے اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ لوگ تمہاری بات پر یقین نہیں کریں گے۔ ہمارے قبیلے میں جب کوئی عورت بہت بیمار ہو تو ہوا میں صورتیں دیکھتی ہے تو اس پر دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔ تمہارے لیے بھی آقا سے کہہ کر کسی حافظِ قرآن کو بلایا جانا چاہیے۔“

”مگر تم کیوں ایسا کرو گی دلشاد ـــــ میں نے جو دیکھا ہے اس کھلی آنکھ سے دیکھا ہے ‘البتہ ابنِ مریم کی شکل حسین میں ملتی ہوئی تھی۔“ اغول نے بات ختم کی۔

دلشاد نے کہا: ”مت بولو اغول دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور یہ بالکل تمہارے خیالوں کے ہیولے ہیں۔“

اس نے اغول کے لمبے زرد اور سنہری مائل بالوں پر ہاتھ پھیرا اور انہیں تھپکا۔ یہ عجیب رنگ کے بال تھے کہ ان دراز زلفوں کی کہیں مثال نہ تھی اور خود اس چپ چاپ رہنے والی تقریباً اداس اور خاموش کنیز کو اس نے بہت کم ہنستے دیکھا تھا۔ ان سب کو اپنے اپنے عقائد کے مطابق عبادت کرنے کی آزادی تھی۔ صرف بچوں کی تربیت آقا کے اپنے مذہب پر کی جاتی تھی اور انہیں ماؤں سے دور رکھا جاتا تھا۔ اغول کو اپنے بچے سے جس کا نام وہ حسین پکارتی تھی ‘نہایت شدید لگاؤ تھا۔ وہ بڑی بڑی آنکھیں اور بہت کچھ جانتی ہوئی نگاہ۔ وہ کھلکھلا کر ہنستا تو اغول کے چہرے سے سائے ایک لمحے کے لیے دور ہو جاتے مگر پھر وہ سوچتی ہوئی اپنے خیمے میں پہروں فضا میں دیکھتی رہتی۔ زندگی کی سب راہوں پر اندھیرا تھا اور ان سرزمینوں کے صرف خواب دیکھے جاسکتے تھے۔ یہ فراق تھا مکمل‘ یہ جدائی تھی ابدی‘ یہ خواب تھے بیکراں‘ یہ زندگیاں تھیں بے کنار اور حیات بحرِ محیط کی طرح ان پر رواں تھی مگر آغاز کی مرکز کی محبت اور یاد دل کے کسی گوشے میں موجود رہتی نکالے نہ نکلتی‘ پرچھائیں اور سائے اور ہیولے اور صورتیں اور خیال یورش کرنے والے غنیم کے جاسوسوں کی طرح موجود رہتے اور موقع بہ موقع خدشات اور خواب بن کر ظاہر ہوتے۔ دلشاد نے باہر جھانکا۔ خیموں کے اس شہر سے

پرے اذان کی آواز ابرِ رحمت کی طرح پرواز میں تھی:

"ربِ کعبہ' خدائے قدوس۔ اغول کو اپنی پناہ میں رکھنا۔ اسے دیوانہ ہونے سے بچائے رکھنا۔"

مگر جو میری آنکھوں نے دیکھا کیا وہ دھوکا تھا۔

جو روشنی کا ہالہ میں نے دیکھا کیا وہ دیوانگی نہ تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے چالیس ہزار فرشتوں کے ساتھ اترے ہیں تو وہ صرف اغول کے لیے آئے ہیں۔

اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ کی ہتھیلیوں سے ملا۔ میں تو دیوانہ نہیں ہوں۔ یقیناً نہیں بالکل نہیں۔

وہ خانۂ خدا کی زیارت کرتے طواف کرتے حجرِ اسود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اغول اور حسین کے خیال سے رہائی نہ پا سکتی۔ رمی کرتے ہوئے وہ لوگوں کو قرآن کریم پڑھتے اور قادریوں کو تلاوت کرتے سنتی۔ لوگ حلقہ بنا کر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر طواف کر رہے تھے۔ دردمند اشعار سے جانیں سینوں میں تڑپتیں۔ آنسو جاری ہو جاتے۔ پردوں کو پکڑ کر حطیم میں سجدہ ریز ہو کر مقامِ ابراہیم پر ناصیہ فرسائی کر کے ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہوئے دل میں گڑگڑاتے ہوئے اسے محسوس ہوتا کہ خدا کا گھر پھیل گیا ہے' دیواریں پھیل گئی ہیں اور سب لوگ اس حلقے میں ہیں۔ ساری کائنات عرش اور ستارے اور زمین اور اس کے خزانے وہ خود اس گھر کے مرکز میں ہے۔ نکتے کی طرح ـــــ یہ تجربہ جس کو نام نہیں دیا جا سکتا' بیان نہیں کیا جا سکتا' لفظوں سے ماورا' رمضان المبارک کی شب بیداریاں' زندہ دار ہجوم عاشقاں اور وہ کیا تھی جس کو یہ تجربے کرائے جا رہے تھے' یہ خواب دیئے گئے تھے وہ اغول سے نہیں کہہ سکتی کیونکہ وہ اسے سمجھ نہیں پائے گی۔ یہ اس کے خون میں نہیں تھا۔ حُبِّ رسولؐ نہیں۔ کیا وہ دیوانہ ہوئے جا رہی تھی۔ اس رحمتوں اور محبتوں کے مرکز میں اس کی رسوائی نہ ہو۔

قبۂ زمزم کی دیوار کے پاس چبوترے پر جو حجرِ اسود کے سامنے ہے' حسین کے ہمراہ ایک جماعت تھی اور وہ اشعار پڑھتے اور وجد میں آ کر رقص کر رہے تھے۔ ان کی عبائیں ہوا اور حرکت کی وجہ سے پھیل رہی تھیں۔

عشق ایک مزرعِ گلاب ہے
اس کی پگڈنڈیاں ان کے لیے ہیں
جو عاشقوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں

ذرا پرے ایک عجمی بڑے ذوق و شوق سے اشعار پڑھ رہا تھا اور اس کی آواز کبھی بلند اور کبھی پست کبھی نہایت سوز میں ڈوبی اور آہِ کرب ناک سے بے قرار کرنے والی تھی، کبھی وہ بالکل خاموش ہو جاتا' جیسے سینے میں دل کو سنبھال رہا ہو۔ کبھی وہ دلوں کو تڑپانے والے لحن سے شعر پڑھتا اور تکرار سے ایک ہی بیت کے ٹکڑے کو دہراتا یہاں تک کہ آنسوؤں سے اس کا گلہ بند ہو جاتا تھا۔ حُسنِ کلام اور سوز و گداز نے رقصاں درویشوں کے وجد میں اضافہ کیا۔

اگرچہ میرے افعالِ بد نے دور کر دیا ہے۔
مگر تمہارے ساتھ میرا حسنِ ظن قرب کا باعث ہے۔

اس کی تکرار کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ رقصاں درویشوں نے تھم کر چبوترے کے اس حصے کی طرف دیکھا جہاں وہ تھا' مگر اب اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ شاید وہ نیچے گر گیا تھا اور بے حس و حرکت پڑا تھا۔

لوگ حیران کھڑے تھے کہ ایک عجمی عورت آئی۔ اس نے زمزم اس کے منہ پر چھڑکا۔ تب درویشوں میں سے ایک دو نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا۔ اس نے ہوش میں آتے ہی اپنا منہ چھپا لیا اور اٹھ کر باب بنی شیبہ کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد حسین کو جیسے ہوش آیا ہو وہ اپنے حلقۂ مریداں کو چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگا۔

یہ مجاہدات و ریاضات میں عجیب منہمک آدمی استقامت اور کرامت کے لحاظ سے بے نظیر جس کی آواز سوئے دلوں کو جگا سکتی تھی جس کی تڑپ بارگاہ خداوندی کے کنگرے ہلا کر رکھ دیتی تھی۔ حسین کے مرید حیران تھے اور خود حسین کا کہیں پتہ نہ تھا۔

دلشاد کو اس کے بعد حرم کعبہ میں ستون سے ٹیک لگائے ہوئے شہر مکہ میں دروازوں کے باہر اور اندر اس بھیڑ میں حسین کہیں دکھائی نہیں دیا۔

جبلِ قبیس پر لوگ ہلال کو دیکھ کر آپس میں مبارکباد دیتے معانقہ کرتے تھے۔

چراغ جلائے جاتے۔ کثرت سے روشنی کی جاتی اور مخلوق کی زبان پر صدائے لبیک تھی ـــــ ہیبت خداوندی سے دل پگھلتے تھے اور آنکھ سے آنسو بہتے تھے۔ مقامِ کریم اور ملتزم اور حطیم کی پر شور رونقیں ـــــ غلافِ کعبہ کو پکڑ کر گریہ وزاری کرتے ہوئے لوگ' خانہ کعبہ کو طواف کے وقت شوق سے لپٹتے ہوئے جیسے بچے ماں کو لپٹتے ہیں' پردوں کو گرم جوشی سے کھینچتے ہوئے' نماز پڑھنے میں سرخوشی سے سجدوں میں الحاح وزاری کرتے ہوئے اخلاص سے دعائیں یوں ادا کرتے کہ سننے والوں کے دل سینے میں پانی ہوئے جاتے تھے۔

وہ اس مجمعے میں کھویا ہوا کھڑا تھا اور بے لفظوں کی دعا کر رہا تھا۔ "ان دلوں کا درد مجھے نصیب ہو۔ یہ گریہ وزاری مجھے عطا ہو۔"

رفیق زرگر اس کے برابر میں کھڑا تھا اور اسے یاد آ رہا تھا کہ صحرا میں تستر سے روانہ ہونے کے بعد جب بھیڑ کو پانی کی کمی نے جاں بلب کر دیا تھا تو حسین نے ہاتھ زمین پر مار کر پانی کا چشمہ جاری کر دیا تھا۔ وہ سب سیراب ہوئے تھے۔ ان کے اونٹ اور گھوڑے اور بار برداری کے جانور' انہوں نے مشکیزوں میں پانی بھر لیا تھا اور کپڑے دھوئے تھے۔ یہی شیخ کامل پھر نظر سے گم ہو گیا تھا۔ وہ تلاشِ عروس میں اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اغول ہاں اس کنیز کا نام اغول تھا مگر یہ گدڑی پوش جس کو اب اپنی خبر نہ تھی جس کے بال بڑھے ہوئے تھے اور خرقہ میل کی وجہ سے دیکھنے والے کو بوجھل معلوم ہوتا تھا جانے کہاں سے وارد ہوا تھا۔ یہ وقت اس نے کہاں گزارا تھا۔ رمضان المعظم' خوشیوں کا مہینہ۔ شوال اور ذی قعد پھر رحمتوں اور برکتوں کا ماہِ حج جیسے کرنیں غلیظ بادلوں میں سے کہیں کہیں سے جھانکتی ہیں۔ ان مہینوں کی یاد حسین بن منصور حلاج کے ذہن میں بھی یادوں کو جلا بخشتی۔ وہ مکہ کی گلیوں میں مارا مارا پھرا تھا۔ اس نے سرا پردوں سے پوشیدہ خیموں اور دریچوں کے اندر جھانکا تھا۔ محفلوں میں گستاخانہ گھسا تھا اور دھتکارا گیا تھا۔ کئی جگہ وہ جھگڑے کا سبب بنا تھا۔ اس نے لمبی مسافتیں طے کی تھیں' لوگ اسے بے نوا سمجھ کر خیرات دیتے تھے۔ اسے دیوانہ سمجھ کر اس سے ہمدردی کرتے رہے تھے۔ اس کے بے خواب سراپے کو دیکھ کر ابلی ہوئی پچکی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر اسے اپنے سے دور کرتے رہے تھے۔

کبھی اغول کا سراپا ہوا میں سے اس پر اترتا۔ خاموش اداس کتّے کے بالوں میں منہ دے کر اپنے نالوں کو بند کرتی ہوئی نسطوری راہبہ اور وہ اس کی آتش شوق کو بڑھانے کی خاطر اس کی طرف بڑھتا مگر قرب شعلے بن کر اسے جلا دیتا تو وہ راکھ بن کر ہوا میں اڑایا جاتا۔ پھر جمع کیا جاتا پھر جلایا اور اڑایا جاتا۔ اغول کی غمناک مسکراہٹ اس کے تعاقب میں رہتی۔ ان دنوں وہ بنتا بگڑتا، پھیلتا سمٹتا ایک آتشیں ہیولا تھا۔ مگر اس نے تو سجدے سے انکار نہیں کیا تھا؟ تو وہ سراپا سجدۂ شوق تھا۔ پھر وہ راندۂ درگاہ کیوں تھا؟

عزازیل کے متعلق کئی خیال ہیں
وہ عرش پر انسان کو حادثے کی اطلاع دینے والا ہے
اور زمین اور آسمانوں میں
اس نے فرشتوں کو اچھے اور بُرے پر آگاہ کیا
اور زمین میں انسان کو گناہ پر اطلاع دی
خیر کا مقابل شر ہے اور شر کو کاٹنے والا خیر ہے
حاکمِ اعلیٰ خیر و شر کا خالق ہے
خیر پر ٹھہرنے والے خیر ہوتے ہیں
اور جو شر پر خیر نہیں رکھتے اور جو شر کو جاننے سے انکار کرتے ہیں
خیر کو کیسے پہچان سکیں گے

وہ غارِ ثور کے سامنے جبلِ ثور پر کھڑا تھا اور ہوا میں آندھیوں اور کبوتروں اور تارِ عنکبوت کی آویزش سے ایک شہد آگیں سرور تھا۔ لوگ دعا اور نوافل کے لیے اندر جا کر اپنی باری کے منتظر تھے۔

عجمی نے اس کے پاس آ کر کہا: ”جو گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں جو نااہل ہیں وہ اندر داخل نہیں ہو سکتے۔“

”میرے لیے دعا تو کی جا سکتی ہے۔“ حسین نے کہا۔ ”تمہیں تو خدا نے لحنِ داؤدی عطا کیا ہے۔ تمہاری آواز نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا۔“

”لحنِ داؤدی۔“ عجمی ہنسا۔ ”یہ تو دل پُر شوق تھا۔“

”دلِ پُر شوق۔“ حسین نے حیرت سے کہا۔ ”کیا دل پُر شوق پرواز اور حدِ

ادراک سے پرے لے جاتا ہے۔"

"سفر شرط ہے کبھی منزل بہ منزل اور کبھی منزلوں سے ماورا' حدِ ادراک سے پرے پلک جھپکتے میں جذب صادق ہو تو۔" پھر کچھ دیر چپ رہ کر اس نے کہا: "شعبدہ بازیاں تمہاری راہ میں حائل ہیں۔ اغول پر مثیلِ مسیح بن کر اترنے میں تمہارا کیا مقصد تھا۔ وہ تمہاری منزل نہیں تھی۔

اور نہ ہو سکتی تھی۔"

حسین عجمی کی طرف دیکھتا رہا' دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہاں نہ جبلِ ثور تھا نہ باری کا انتظار کرتے شوق سے دیوانے لوگ تھے۔ صرف طلب کے صحرا میں وہ اکیلا تھا۔ خجالت سے اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور اس کی پیاسی روح کو آبِ زمزم کی طرف پلٹنا تھا جس کی تعریف میں رسول پاکؐ نے فرمایا تھا:

"اللہ تعالیٰ اس کے تشنہ کاموں کو اس سے سیراب کرے۔ اس کے پینے سے رنج وتعب زائل ہو جاتا ہے۔ فرحت وراحت پیدا ہوتی ہے۔"

"ہاں۔" اس نے اپنے آپ سے وعدہ کیا۔ وہ منیٰ' عرفات' مزدلفہ اور میقات میں پُر سکون رہے گا۔ اس کے سفرِ حج کو اگر شرف قبولیت عطا ہو۔ اس راہ میں وہ ابھی طفلِ مکتب تھا۔ اسے مرشد کی تلاش تھی جو اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ان پُر خطر راہوں سے پار اتروا سکے۔ اس کی کشتی ٹوٹی ہوئی تھی اور ساحلِ مراد دور تھا۔ پتہ نہیں وہ گھڑی گھڑی بھٹک کیوں جاتا تھا۔ یہ کس بد دعا کا اثر تھا۔ گنج نامہ کے مطالب اس پر واضح تھے بھی اور نہیں بھی مگر اسے زمانے چاہئیں کہ وہ ان پر عمل پیرا ہو۔ اب اس کا نالہ بے موسم تھا۔ تلاشِ بسیار کے باوجود اسے یہی پتہ چل سکا تھا کہ وہ ابھی تک کہیں بھی نہیں تھا۔

یہ شہرِ خوبی و محبوبی یہ شہرِ قریش شہرِ حرم ابراہیم خلیل اللہ کا قریۂ امان' مکہ۔ پہاڑوں سے گھِرا ہوا۔ ان پہاڑوں سے جن پر تجلیاں قربان ہیں' ان پناہ گاہوں کو اپنی آغوش میں چھپائے جن پر ساری آزادیاں نثار ہوں۔

محملوں' عماریوں' قبوں سے رنگین زائرین سے معمور دعاؤں سے عبارت فضا میں پکاریں اور گونج۔ پروانوں کو شمع سے جو نسبت ہے وہی لوگوں کو خدا کے گھر سے' اپنی جانوں کو دیدارِ کعبہ کے لیے ہلاکت میں ڈال کر خوش ہوتے لوگ' اس کی حرمت پر

جانیں فدا کرنے کو سعادت سمجھنے والے' حسرتوں اور ارمانوں کو اس کے دیدار سے سیراب کرتے ہوئے عشاق۔ مسافرانِ کوئے خوباں اپنی تڑپ کے لیے قرار ڈھونڈتے۔ احرام باندھ کر قوموں اور ملکوں اور وطنوں کی شناختوں کو گم کرتے ہوئے ایک ہی جذبے سے سرشار ستاروں سے عرش کی طرح مزّین زمین دعا اور ثنا اور خوش الحانی سے قرأت کرتے لوگوں سے گونجتا یہ شہر اور اس میں سناٹے میں گم ایک دل حسین بن منصور حلّاج کا دل۔ ہاں اے درِ کعبہ وا ہو۔ اے ربّ کعبہ مجھ پر آشکار ہو۔ اے تجلّی مجھے اپنے میں گم کر۔ ہر میدان میں ہر منزل پر ہر مقام میں لوگ اسے دیکھتے اور محسوس کرتے کہ وہ صرف زائر ہی نہیں سوالی ہے اور لپٹ کر نہیں تڑپ کر نہیں مگر جانے کیسے سوال کرتا ہے کہ لگتا ہے دیواریں شق ہو جائیں گی۔ زلزلے سے زمین ہل جائے گی' پلٹ جائے گی' اس آتشِ سوزاں سے جو اس کی آہ نیم کش میں ہے۔ بت کدۂ صفات میں غلغلہ الاّمان کا شور اٹھے گا۔

"کیا تم روضۂ رسول کی زیارت سے شاد کام نہیں ہوئے۔" اس کے برابر کھڑے ہوئے کسی نے اس سے سوال کیا۔

"یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی ہے۔" حسین نے ہولے سے کہا۔

"اس شدت کو جو تمہارے اندر ہے کیا تم نے تہذیب کے دائرے میں لانا نہیں سیکھا۔ اس آقائے سبل ختم الرسل مولائے کل سے تم نے کچھ نہیں سیکھا۔" آواز سرزنش کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی افسوس زدہ۔

حسین نے مڑ کر دیکھنا چاہا مگر اس کی گردن اس طرف پھیری نہ جا سکی۔

"نرمی اور عاجزی سیکھو۔ ہوا کی طرح جو ہر مقام پر بار پا سکتی ہے مگر جس کا اپنا کوئی وجود نہیں' کوئی تقاضا نہیں۔"

"میں کس سے مخاطب ہوں۔" حسین نے حرم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی بھی کوئی بھی ــــــ اس سے غرض نہ رکھو۔"

"مجھے معلوم ہونا چاہیے۔" حسین نے ضد سے سوال کیا۔

"سب کیوں جان لینا چاہتے ہو۔ یہ امانت ہے بہت بڑا بوجھ اس کو اٹھا نہ سکو گے۔"

"میری طاقت آزما دیکھو۔" حسین کے اندر سے پھر کسی غرور نے زہریلے ناگ کی طرح پھنکار کر کہا۔

ہنسی کی آواز سنائی دی۔ دبی دبی تمسخر اڑاتی ہوئی رگوں میں تلخی بن کر اترتی ہوئی' جان کو نہایت مضطرب کرتی ہوئی۔

"اغول کے عشق سے رہا ہو گئے ہو کیا۔" سوال کیا گیا۔

"اغول کون اغول۔" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بڑھو آگے بڑھو مگر احتیاط شرط ہے اور یہ مت سوچو کہ صرف تم ہی طلبِ صادق کے داعی ہو۔ بساط سے بڑھ کر مت مانگو۔ توفیق سے زیادہ مت چاہو۔ اپنی حدوں میں رہو۔" آواز سناٹے میں گم ہو گئی۔

حسین کے گرد خلقت کا اژدھام تھا جو اس سے ٹکراتا اور پلٹتا تھا۔

وہ بارگاہ سے باہر ٹھہرا رہا۔ بلاوے کا منتظر طلب کیے جانے کے لیے جاں فرشِ راہ کیے دل کو سجدہ ریز کیے اجتماعی دعاؤں میں اس نے شرکت کی۔ یہ خیر و برکت کا مجمع تھا جو اپنی اپنی طلب لیے حاضر تھا۔ لبیک کہتا ہوا اتنے انکسار سے عاجزی سے انسان اپنی عبودیت کا اقرار کر رہے تھے اور سنت رسولؐ کا اتباع کر رہے تھے جو سب سے مکمل عبد تھے۔ رسولِ خدا' جن کے لیے یہ ساری بساط بچھائی گئی تھی' وہ جو وجۂ کائنات تھے' حیاتِ انسانی کے کاروانِ سالار۔

چاہنے والوں ماننے والوں عقیدت مندوں' سوال کرنے والوں' دعا کے طالبوں کی ایک بڑی بھیڑ حسین کے جلو میں تھی۔ جب وہ حج کے بعد وارد بغداد ہوا تھا۔ وہ دیکھی بھالی جگہوں زاویوں مدرسوں اور خانقاہوں کی اقامت گاہوں میں پھیل گئے۔ انہوں نے اپنا رختِ سفر کھولا' کچھ دنوں کے لیے متمکن ہو کر وہ اپنا آپ ان مدرسوں اور صوفیا کی جماعتوں کے درمیان آزمانا چاہتا تھا۔ اس کا حاصلِ حیات حاصلِ سفر اور حاصلِ جانکاہی جو تھا اس نے مدرسہ نظامیہ کی مجلس میں حضرت جنید بغدادی کے سامنے رکھنے کا فیصلہ اپنے جی میں سوچ لیا تھا۔ وہ خدا کا نہایت عاجز کمتر بندہ جب یوں

نوازا گیا ہے تو پھر حضرت جنید کو جو شیخ کامل اور استاد زمانہ تھے' اس نوازش کی آگاہی ہونا ہی چاہیے' اس میں خود نمائی خود فریبی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

اتنے عرصے کے بعد اس کا بغداد میں آنا خود اسے بھی حیران کر گیا۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو کمسن تھا' آتشِ شوق سے پگھلتا ہوا دل لیے سوختہ جان جس کو بہت سی درگاہوں سے نکال پھینکا گیا تھا' جسے عمر بن عثمان مکی نے نہایت خفگی سے بددعا دی تھی۔ اس کے جاننے کے شوق نے اس کی راہ میں خارپاشی کی تھی۔ وہ صرف جاننا ہی تو چاہتا تھا۔ محرمِ اسرار ہونا چاہتا تھا اور محرمِ راز ہونے کی تمنا سے اس کو انہوں نے راندۂ درگاہ قرار دیا تھا۔ خانقاہوں اور مدرسوں کی یہ عجیب دنیا تھی جہاں جہالت کو نہیں آگاہی کو نشانۂ ملامت بنایا گیا تھا۔

اور یہ بھیڑ راہ میں اس کے ساتھ جمع ہو گئی تھی کیونکہ حجاج کے اس قافلے پر قرمطیوں کا حملہ بہت منظم اور سخت تھا۔ معتضد کے مرنے کے ساتھ ہی قرامطہ نے مختلف نواح میں زور پکڑ لیا۔ ان کے داعی ایسے قافلوں کے ساتھ مل جاتے اور نہایت ہوشیار رہنماؤں کی طرح انہیں نزدیکی راستوں سے منزل کی طرف لے جانے کا دعویٰ کرتے۔ ایسے راستے جو باغوں اور مرغزاروں میں سے ہو کر نکلتے تھے' نخلستان سے گزرتے تھے اور چشموں سے آباد ہوتے۔ پھر گھات میں سے نکل کر قرمطی ان پر حملہ کر دیتے۔ لوٹ لیتے عورتوں اور بچوں تک کو تہہ تیغ کر دیتے کیونکہ غلام بنا کر پابہ زنجیر کر کے وہ خود پابند ہو جاتے تھے۔

جب قافلے پر حسین کی موجودگی میں حملہ ہوا تو رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ قافلہ میں سے جو لوگ نوافل پڑھتے اور تہجد گزار تھے وہ نماز میں مشغول ہو گئے باقی کارواں آرام کی غرض سے کمریں کھول کر لیٹ ہی رہا تھا کہ عقب سے نہایت خاموشی سے قرمطی نکلے اور لوٹ مچانے لگے۔

"ٹھہرو۔" حسین بن منصور نے انہیں حکم دیا۔

جس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا اور انہیں ہاتھ ہلانے اسے نیچے یا اوپر کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

"یہ افسوں اور ساحری نہیں ہے۔ اگر تم لوگ اب بھی اپنے ارادوں سے باز

آجاؤ تو تمہارے ہاتھوں کی حرکت جو سلب کرلی گئی ہے' واپس مل سکتی ہے' لوٹ آئے گی مگر توبہ صدق دل سے کروا اپنے باطل مذہب سے توبہ کرو تمہارے بازو خود بخود حرکت میں آجائیں گے۔"

وہ رونے اور زور زور سے توبہ استغفار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی حرکتیں لوٹ آئیں۔ انہوں نے تلواریں نیام میں کیں اور حلاج کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے مذہب سے تائب ہونے کا اعلان کیا اور حجاج میں مل کر بیٹھنے لگے۔ وہ متعجب تھے کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔

پھر انہوں نے اس مرد بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور توبہ کر کے اس کے عقب میں بغداد آگئے۔

بازاروں میں شاہراہوں پر خانقاہوں اور مسجدوں میں اس کی کرامت کا چرچا ہو رہا تھا اور وہ نہایت عاجزی سے سر جھکائے مدرسہ نظامیہ کے دالان در دالان صحنوں میں شاندار درس گاہوں کے باہر حضرت جنید کے حضور حاضری کے لیے نہایت انکسار سے بیٹھا رہتا تھا۔ منتظر ـــ اسے یہ جرأت نہیں ہوسکتی تھی کہ اپنی آمد کی اطلاع کروائے' اذنِ باریابی چاہے۔

میلوں میں پھیلا ہوا یہ مدرسہ مشرق اور مغرب کے علوم کا چشمۂ جاری تھا۔ فلسفۂ یونانی اور تعلیمات اسلامی دونوں کے شعبے تھے' فقیہ و فقیر یہاں درس دیتے تھے۔ اس آئینہ خانے میں خام طبیعتوں کے مس کو کندن بنایا جاتا تھا۔ خدا اور انسان کے بارے میں بحث واستفسار کے دروازے کھلتے تھے۔ ذاتی تجربے کے ساتھ اسلامی روایات کو ایک نئی زندگی اور نیا آہنگ عطا ہوا تھا۔

حضرت جنید کے لیے چراغ کی لو اونچی کیے غلام نے دہلیز کے باہر نظر کی تو جھکے ہوئے وجود کو نہایت پُر سکون اور منتظر پایا۔

"حضرت کوئی دہلیز کے باہر سوال کرنا چاہتا ہے کیا اسے اذنِ باریابی دیا جائے۔"

"آؤ حسین آؤ۔" انہوں نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

غلام نے چراغ طاق میں رکھ دیا اور سہارا دے کر اسے اندر لایا۔

"میں کئی دن سے تمہارا منتظر تھا۔ حجاج کے قافلے کو یہاں آئے بہت دن ہو

گئے ہیں ـــــ" حضرت نے استفسار کیا۔

"میں شرمندگی کی وجہ سے حاضر ہونے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔" حسین نے رُک رُک کر کہا۔

"یہ بشری کمزوریاں ہیں مگر کاروبارِ حیات یوں بھی چلتا ہے خیر ـــــ" انہوں نے بات ختم کی۔

"حضور میں کاروبارِ حیات چلانا نہیں چاہتا' میرے لیے دعا کیجئے' میرے لیے "عطا" ہو۔" حسین نے نہایت آزردگی سے کہا۔

"تم عام زندگی بسر کیوں نہیں کرتے۔ یہ سب اس کی عطا ہے۔ یہ روشنی اور آتش اور حدت شوق کیا ہے؟" انہوں نے اس سے سوال کیا۔

"میرا سوال دوسرا ہے۔ بالکل دوسرا' مختلف' سوالوں سے ماورا۔" حسین نے ہولے ہولے کہا۔

حضرت جنید دیر تک خاموش رہے۔ چراغ کی لو بھڑکی۔ ہوا کے جھونکے نے اسے بجھا دیا۔ ستاروں کی ضیا اس سرد رات میں کہیں سے در آئی۔ کمرے میں دو نفوس تھے اور خدائے بزرگ و برتر انہیں دیکھ رہا تھا۔

"حسین ازلی اور قدیم حادث سے جدا ہے۔ اپنے مانوس بسیروں کو ترک کر دو۔ بھائی بندوں کو چھوڑ دو۔ نا معلوم کو بھلا دو اور ان سب کی جگہ صرف ذاتِ خداوندی کو یاد رکھو۔ یہ اس کی توحید ہے۔" حضرت جنید نے بہت محبت سے حلاج کو مخاطب کر کے کہا۔

"کسی مقام پر ازلی اور حادث کا اتصال ممکن نہیں۔" حسین نے بہت پست آواز میں کہا۔

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔" حضرت جنید نے تیزی سے کہا۔ "وہ حدِ ادراک سے ماورا ہے۔ کوئی شے اسے احاطہ نہیں کر سکتی۔ کوئی صفت اس کے لیے کافی نہیں۔ جب تم اس کی تعریف کرنے پر قادر نہیں ہو تو کس اتصال کی بات کرتے ہو۔"

حسین خلا میں تکتا رہا۔

"تمہیں معلوم ہے خدا ہر جگہ موجود ہے۔ ہر آن ہر ساعت تمہارے ساتھ

موجود ہے۔ تمہاری پکار سنتا اور پکار کا جواب دیتا ہے۔" وہ بہت ہی آہستہ بات کر رہے تھے۔ "تمہیں پکارتا بھی ہے——"

حسین کے وجود میں یوں حرکت ہوئی جیسے کسی درماندہ مردہ وجود میں یک لخت زندگی کی رو دوڑ جائے۔

"وہ پکارتا ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔"

"تم تو پھر بھی موجود رہو گے۔ تم اسے پکارو گے۔ وہ تمہیں پکارے گا۔ اس کی ذات کا کامل ادراک تمہیں اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک تم اپنے آپ کو بالکل گم نہ کر دو۔ اس کے جمال کا مشاہدہ تمہارے اندر حس اور حرکت کو ختم کر دے گا۔"

جنید اسے یوں سمجھا رہے تھے جیسے بچے کو مشکل سوال سمجھاتے ہیں۔

"کیا یہ ممکن نہیں۔" بہت دیر کے بعد حسین نے جواب دیا" کہ وہ اور میں ایک ہو جائیں۔ حضرت ایسا ممکن ہو گا خدا اور بندے کی ہستی مل جائیں ایک ہو جائیں۔ کامل ادراک سے بھی آگے' بندے اور خدا میں کوئی فرق نہ رہے۔ کوئی فاصلہ نہ رہے۔ ذرا سا بھی۔"

جنید سوچتے رہے اور حسین کی طرف دیکھتے رہے اور جی ہی جی میں کہتے رہے' خدا میں انسان کبھی مدغم نہیں ہو سکتا۔ پھر انہوں نے اس کی بے پناہ آنکھوں میں دیکھا—— دیکھتے رہے——اور آخر کہا:

"حسین ایسی باتیں تمہیں دار تک لے جائیں گی۔ کیا تم لکڑی کے سرے کو سرخ کرنے کے لیے کوشاں ہو۔"

"دوست سے جو بھی پہنچے اس کا انعام ہو گا۔" حسین نے متانت سے کہا۔

"تم اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھو۔ تمہیں معلوم نہیں اسلام میں حواس کھونے والے کا کوئی مقام نہیں۔ رسولِ خدا اپنی عبدیت میں خوش تھے۔ تمہارے خیال میں کیا وہ اس مقام سے آگے نہ جا سکتے تھے۔"

جنید اب اس کی شکل کو دیکھ کر خفا ہو رہے تھے۔

"انہوں نے یہ چاہا نہیں ہو گا حضرتِ شیخ۔ انہوں نے یہ کیوں نہیں چاہا۔ ان

کے لیے تو یہ ممکن تھا۔" حسین نے جوش میں کہا۔

"کوئی مقام رسولِؐ خدا کے مقام سے آگے نہیں ہے۔ کسی کو اس کی تمنا بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ کفر ہو گا صریحاً۔ حسین تم اپنے حواس میں نہیں ہو' بخدا تمہیں شعبدوں نے' جو اتفاقاً تمہیں مل گئے ہیں' دیوانہ کر دیا ہے۔ کیا قرمطیوں کے بازوؤں کی طاقت سلب کر لینا اتنا بڑا کارنامہ ہے ــــ آغازِ اسلام میں لوگ جنگوں میں بشری قوتوں کے ساتھ لڑتے رہے' شہید ہوتے رہے۔ کیا ان کو یہ سب قوتیں نہ تھیں۔ کائنات کے نظام کو درہم برہم کر کے اپنا وجود قائم کرنا اپنی ذات کا منوانا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ تماشے ہیں۔ تم کہاں بھٹک گئے ہو یہ ناسمجھی کی باتیں ہیں۔"

جنید اب بہت خفا تھے۔

"تمہارے اندر بے پناہ ممکنات ہیں مگر تم آسان راستوں سے سفر کرنا چاہتے ہو۔ کیا تم قرمطی ہو۔"

حسین بیٹھے سے اٹھ گیا اور جھک کر اس نے شیخِ کبیر کے پاؤں چھوئے اور الٹے قدموں دہلیز کے باہر آیا جہاں اس کے مریدوں کے ہمراہ ابو یعقوب اقطع اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اب کے حجاج کے قافلے کے ساتھ حسین کے آنے کی امید میں منصور بغداد آیا۔ شاید اسے بچے کی یاد کھینچ لائے۔ اس نے سب سے پہلے خانقاہ میں حاضری دی۔ حضرت شیخ المشائخ کے حضور مگر اس کے ساتھ مریدوں کی ایک بھیڑ تھی اور اس کی نرالی شان کو دیکھ کر منصور کے دل پر عجیب ہیبت طاری ہوئی۔ وہ ہرگز خوش نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا سوائے سہل بن عبداللہ تستری کے حسین نے کہیں بھی دلجمعی سے زانوئے تلمذ طے نہیں کیے تھے۔ اس نے زمیں کی ساری مشقتیں نہیں اٹھائیں۔ بھلا وہ رازدارِ عرشیاں کیسے بن گیا۔ مگر اپنی عادت کے مطابق اس نے سوال نہیں کیا۔ صرف سفر کے حالات ان مریدوں کی زبانی سنتا رہا جو اب بغداد میں یہاں وہاں مقیم تھے اور حسین کے جلو میں نہایت تمکنت اور وقار سے چلتے تھے اور ان کرامات کا ذکر کرتے تھے جو اکثر اس سے سرزد ہوتی تھیں۔ وہ حاجتوں کا روا کرنے والا' دعا کرنے والا' رازوں کا جاننے والا کہلایا جانے لگا تھا۔ وہ جس کی طرف دیکھ لیتا اس کا مقدر بدل جاتا تھا۔ عورتوں

اور کنیزوں اور خواتین کا ہجوم اس کے گرد رہنے لگا تھا۔ محملوں اور عماریوں میں پیدل اور سواریوں پر عمر رسیدہ اور جوان دوشیزائیں اور ازدواج' بیمار اور تندرست' مغموم اور خوش شہزادیاں اور گداگر' اس کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ وہ دلوں کا بھید جان لیتا۔ پوشیدہ چیزوں کے ٹھکانے بتادیتا۔ لوگ اس کی پرستش کرنے لگے تھے۔

بغداد کی بیشتر آبادی اس کے اتباع کے لیے تیار تھی۔ اس کا اتباع کرتی تھی۔ وہ کبھی اکیلا نہیں ہوتا تھا۔ وہ رات اور دن کے کسی حصے میں فارغ نہیں ہوتا تھا اور منصور کو محسوس ہوتا تھا جیسے ساری دنیا سوالی' بھٹکی ہوئی اور سچ کی جویا ہے کم از کم اپنی ذات تک تو لوگ کسی نہ کسی تلاش میں رہتے تھے۔ لوگ اس سے مستقبل کی خبریں مانگتے جوان کے مقدر میں تھا اس کی خبر چاہتے تھے۔ انسان کتنا بے چین اور بدحواس اور گم گشتہ ہے۔ اس کا ایمان کتنا کمزور اور اس کی حاجتیں کتنی بے پناہ ہیں۔ خدا نے یہ تماشا گاہ بنائی تو ہے مگر اس کی آبادی کا کوئی سہارا نہیں لگتا۔ بدحواس جاندار ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں اور طوفان کے بعد کی حالت میں مبتلا ہیں۔

منصور نے اپنے بیٹے کے پُرجوش چہرے پر تمتماہٹ دیکھی اور اس میں ناامیدی کی لہریں جو بار بار آکر اس کی پیشانی سے ٹکراتی تھیں۔

"تمہاری حاضری قبول ہوئی کہ نہیں۔" اس نے حسین سے پوچھا۔

"مجھے قرمطی کا خطاب مل گیا ہے اور دار کی خوش خبری ملی ہے۔" اس کی مسکراہٹ میں عجیب مایوسی اور سرخوشی تھی۔

"کیوں آخر کیوں۔" منصور نے نہایت بے تابی سے پوچھا۔

"یہ روشن راستے اتنے پیچیدہ ہیں یا بنادیئے گئے ہیں' سمجھ میں نہیں آتا۔ جو سوال کرتا ہے راندۂ درگاہ قرار پاجاتا ہے۔"

"صبر کرو حسین اور اس دہلیز سے چمٹے رہو۔" منصور نے دلاسہ دینے والے باپ کی طرح کہا۔

"عشق ابن السبیل ہے۔ اس کے ہزاروں مقام ہیں۔ کیا میں اس مقام سے گزر نہیں سکتا جو ایک دہلیز سے لپٹا رہوں گا۔" حسین نے نہایت بے چارگی سے کہا۔

منصور نے کہا: "مجھے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں مگر عاجزی ا

صبر و توکل کے علاوہ اور کیا کر سکو گے۔"

"کچھ بھی۔ کچھ بھی۔ اپنی آزمائش ہی سہی۔" حسین نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ مریدوں کی مودّب بھیڑ اور اشاروں پر چلنے والے رفیقوں نے اسے گھیر لیا اور ان کے جلو میں وہ ستاروں کے جھرمٹ میں ماہتاب کی طرح گدڑی میں روشن چہرہ لیے اس شاہراہ پر چل رہا تھا جو مدرسہ نظامیہ سے بازاروں اور رونقوں کو سمیٹتی کنار دجلہ جا نکلتی تھی۔ منصور کو عتابیہ محلّہ جانا تھا کیونکہ یہاں وہ ریشم بنتا تھا جو مختلف الالوان اور سوت سے تیار ہوتا تھا۔ ابو یعقوب اقطع حسین کے ساتھ محلّہ کی طرف چلے گئے جہاں خلیفہ منصور کی عالی شان جامع مسجد تھی اور معمور آبادی کی وجہ سے بہت پُر رونق تھی۔

منصور کو عتابیہ کی ایک چوڑی گلی میں کارخانے کے باہر وہ ہندی سوداگر مل گیا جو محّمی کے وقتوں میں بیضا میں ان کی سرائے میں آکر ٹھہرا کرتا تھا اور ریشم خریدنے کی بڑی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے بعد دونوں دجلہ کے کنارے ایک مطبخ میں جہاں مچھلی اور دوسری نعمتیں عمدہ اور ارزاں ملتی تھیں، چلے گئے۔ ہندی راستوں اور مشکلوں اور عام بے چینی کا جو سلطنت میں پھیلی تھی ذکر کرتا رہا تھا۔ یہ امن و امان کی حکومت تھی مگر اب اس کے حصے بخرے ہو گئے ہیں، اس لیے سوداگروں کو جو سہولتیں میسر تھیں وہ نہیں رہیں۔

"یہ دنیا کا دستور ہے ہندی بھائی۔" منصور نے کہا۔ "وسیع و عریض سلطنتوں میں ایسے فتنے اٹھا ہی کرتے ہیں جیسے یہاں وہاں کوئی آگ روشن کرنے کی کوشش کرے۔ کورشِ اعظم سے لے کر داریوش تک یہی ہوا ہے۔ تمہارے ہاں حالات مختلف ہوں گے۔"

"ہم سوداگر لوگ سلطنت کے کاموں کو برہمنوں اور اونچی ذات کے حکمرانوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر ہمارے ملک میں یہ نئے نئے مذاہب اور فرقے اور فتنے نہیں ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو اتنی مضبوط دیواروں میں محفوظ کر رکھا ہے کہ کوئی حملہ کوئی عقیدہ ان کو ہلا نہیں سکتا۔" ہندی نے فخر سے سر بلند کر کے باہر دیکھا جہاں ایک نوجوان کے جلو میں بھیڑ کی بھیڑ چلی آ رہی تھی۔ عقب میں چلتے ہوئے مؤدب لوگ ایک قدم پیچھے گردنیں جھکائے ہوئے اور درویش اپنی سرشاری میں ہوشیار باخبر بھی اور بے خبر بھی،

ہجوم کا حصہ بھی اور اس سے الگ بھی' ناآشنا بھی اور آگاہ بھی۔ عاجزانہ فخر سے زمین پر نہایت انکسار سے قدم رکھتا اور اپنے گرد مجمعے کے کیف و سرور میں مست بھی اور بے پروا بھی کلمہ طیبہ کا ورد کرتے لوگوں کا ساتھ دیتا بھی اور رکتا بھی جیسے وہ ان لوگوں کو فنا کا درس دے بھی رہا ہو اور حیات و موت کے درمیان کے فاصلے کو انہیں سمجھا بھی رہا ہو اور اسے مٹا بھی رہا ہو۔ اردگرد کے رنگا رنگ نظاروں سے آنکھیں بند کیے بھی اور رونقوں سے مجتنب بھی' ان کی محبت کی گرفتاری سے بیزار بھی اور ان کے لیے کوشاں بھی ـــــ ہندی اسے دیکھتا رہ گیا۔

"کیا جلال ہے۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

منصور نے سر جھکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دعا کر رہا تھا کہ حسین کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ خود اس کی نظر سے بھی وہ بچا رہے۔ عجیب بے چین طمانیت نے اس کے جی کو بھر دیا جیسے کوئی آگ ڈھونڈنے جائے اور اسے بادشاہت مل جائے۔

"یہ کون ہو سکتا ہے۔" ہندی نے منصور کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے اور جو لرز رہا تھا۔

ہندی نے اس کا شانہ ہلایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"طبیعت تو اچھی ہے۔" اس نے منصور سے پوچھا۔ "تم پر لرزہ کیوں طاری ہے۔ یک بیک بیمار ہو رہے ہو کیا؟"

منصور نے سر کے اشارے سے اسے تسلی دی مگر اس کی زبان گنگ ہو رہی تھی۔ تستر کی خانقاہ اور زاویے اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ بصرہ اور اس کا نواح اور خود وہ سارا ماضی جسے بھلانے اور فراموش کرنے' ذہن سے محو کرنے کی اس نے سر توڑ کوشش کی تھی آج تک کے گزرے بزرگوں کے تقریباً بھولے ہوئے نام پردے پر تصویروں کی طرح اس کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ حسین کا یہ جلال اس آتشِ روشن کا حصہ لگتا تھا۔ یہ بڑھی ہوئی تابش و تپش اور اب اس کی سمجھ میں یہ بات ذرا سی واضح ہو رہی تھی کہ وہ ان سب امانتوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے تو اسے دوسروں سے مختلف ہونا ہی چاہیے۔ اس کا طرزِ عمل کیونکر ایسا ہے جیسا کہ ہے اور اسے کیوں ایسا ہونے کا حق ہے!

"کیا اس نوجوان کو دیکھنے سے تمہارے دل کو تکلیف ہوئی ہے۔" ہندی نے اس کے قریب جھک کر پوچھا۔

"اولاد کو دیکھ کر کسی باپ کو تکلیف ہوتی ہے کیا؟" منصور نے پست آواز میں کہا۔

ہندی کھڑے سے بیٹھ گیا اور حیرت سے کھلی آنکھیں لگتا حلقوں سے نکلنے کے قریب ہیں۔

"محّمی کا پوتا۔" بہت دیر بعد اس نے کہا۔

"منصور کا بیٹا حسین۔ جناب سہل بن عبداللہ تُستری کے پاؤں کی خاک۔"

"اپنے والد کے اس دنیا سے کوچ کرنے سے پہلے میں دینِ اسلام پر تھا۔" اس نے ہندی کو بتایا۔ "میں انہیں بتا ہی دیتا مگر وقت نے مہلت نہیں دی۔" پھر اس نے محّمی کی موت کا واقعہ ہندی کو سنایا۔

"میں ایک ذاتی سوال کرنا چاہتا ہوں جو ہو سکتا ہے گستاخانہ بھی ہو مگر گزرے دنوں نے مجھے یہ حق دیا ہے۔" پھر ذرا رُک کر اس نے کہا۔ "محّمی بہت عمدہ انسان تھا' صاف گو اور سیدھا۔ کیا تم اس سے مختلف محسوس کرتے ہو۔ میرا مطلب ہے اس سے اچھے ہو گئے ہو۔ یقیناً تم نے ایسا محسوس کیا ہو گا۔"

"ایک بہتر نظامِ حیات جس میں حسنِ ترتیب کے ساتھ آدمی کے اندر اندھیروں کو روشنی نصیب ہو' انسان کی ممکنات' حد ادراک اور خود بار گاہوں تک اس ذرۂ خاک کی رسائی یقیناً ایسی منزلیں ہیں جن کا اس سے پہلے کی زندگی میں مجھے تجربہ نہ تھا۔ یہ تکمیل اس سے پہلے میں نے کہیں نہیں دیکھی۔" منصور نے بات ختم کی۔

ہندی سوچتا رہا اور پھر اس نے کہا: "انتشار جو پھیلا ہوا ہے کیا وہ اس کی تکمیل سے ناامیدی ہے۔"

"سلطنتوں کے معاملات اس نہج پر ہوتے ہیں۔ آفتاب نصف النہار پر پہنچتا ہے تو ڈھلتا ہے۔ جانے دنیا کب سے ہے اور زمانے لوگ بادشاہتیں، ہر شے فنا کی زد میں ہے مگر اس سے مذاہب کی صداقت پر نہیں ان کے ماننے والوں پر حرف آتا ہے۔ سمنی مذہب کی خانقاہیں بھی آباد ہی رہی ہوں گی۔ زرتشت کے معبدِ ناہید کی روشنیاں کبھی

اقصائے عالم کو روشن کرتی تھیں۔ بودھ کے مجسّمے اور وہ مکمل مسکراہٹ لیے ہوئے مورتیاں اب بھی دور دراز پہاڑوں کے دامنوں میں موجود ہیں مگر ان سب کو سمیٹ کر جو پیغام اب رقم ہوا ہے اس کو جھٹلانے کی کوشش کرنے والے خود مٹ جائیں گے' یہ سچائی دائم و قائم رہے گی۔"

ہندی نے منصور کی بات ختم ہونے سے پہلے کہا: "کیا ایسی مورتیوں اور عبادت گاہوں تک پہنچنے کی کوئی صورت ہو گی۔ میں ریشم سے زیادہ ایسے نوادرات کی تلاش میں ہوں۔"

"ہمارے مدارس میں مذاہب کے تقابلی مطالعہ کرنے والے بہت کچھ جانتے ہیں اور روز روشن کی طرح ان پر سب واضح ہوتا ہے۔ کہاں' کیا ہے' وہ بہتر طور پر بتا سکتے ہیں۔" منصور نے فخر سے کہا۔

"مگر ان تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔" ہندی نے افسوس سے کہا۔

"کیا تم نے کوشش کی ہے۔ یہاں پر تو ہر رنگ و نسل کے لوگ موجود ہیں۔ دربار کے اندر اور باہر مدارس میں اور دوسری جگہوں پر عوام کے مجمعوں میں مباحث کی محفلوں میں ہر شخص بار پا سکتا ہے۔ پہلی حکومتوں میں ذرا سی سختی روا رکھی گئی تھی کہ مسلم اور غیر مسلم میں فرق کرنا ممکن نہیں رہا تھا مگر اب حالات پھر وہی ہیں۔ یہ خلفائے عباسیہ کی رواداری ہے جس نے فرقوں اور خیالوں اور مذہبوں کو رواج دیا ہے۔

"یہ بات تو ہے۔" ہندی نے تسلیم کیا۔ پھر اس نے بہت دیر سوچتے رہنے کے بعد کہا' تم نے اپنے بیٹے کا نام تو مجھے بتایا ہی نہیں۔

"حسین۔ حسین بن منصور حلاج۔"

دونوں دیر تک ہنستے رہے۔

ہندی نے پوچھا: "تمہارا حسین شروع سے اس وضع پر ہے۔"

"تقریباً۔ مگر اس کی طبیعت میں بے قراری بہت ہے۔ کبھی نہایت دنیادار اور کبھی یہ درویشی۔ بیوی بچوں سے ذرا سی رغبت نہیں۔ کبھی عبادتوں اور ریاضتوں میں الجھا ہوا علوم کے مطالعے کے شائق دربار سے منسلک اور پھر سب کچھ یک قلم موقوف دنیاداری میں مصروف۔ میں خود اس کی افتاد طبع سے عاجز ہوں مگر الجھنا میری عادت نہیں۔"

"ہر انسان اپنے مستقبل کا معمار اور اپنے دنوں کا مالک ہوتا ہے۔" ہندی نے کہا۔
"حسین کو جس رنگ میں مَیں نے آج یہ دیکھا یہ رنگ اب شاید ہمیشہ اس پر جم جائے۔"
"زندگی سے اس کے مطالبے بے شمار اور اس کے سوال بے حساب ہیں۔ خدا کا اس کا رشتہ بھی ناز کا ہے۔ وہ اس سے اتنا کچھ چاہتا ہے کہ میں حیران ہوں آخر کیوں۔ مگر میں اس کے معاملات میں شروع سے کبھی دخیل نہیں رہا۔ صرف دعا کرتا ہوں اور دوسروں کی طرح تماشائی بھی۔"
"میں تمہارے بیٹے سے اور محی اپنے دوست کے پوتے سے ملنا چاہتا ہوں۔" ہندی پُر شوق تھا۔
"ضرور ضرور۔" منصور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ آپ اپنی کارواں سرائے میں ہوں گے۔ میں آج شام یا کل صبح کسی وقت اس ملاقات کا بندوبست کروں گا۔"
پھر وہ دونوں باہر آئے اور کنارِ دجلہ چہل قدمی کرتے رہے۔ ہوا نہایت خوشگوار تھی اور سیر کرنے والوں کا ہجوم کشتیوں پر سواریوں پر اور پیدل رواں تھا۔ گھنے باغوں میں پھول کھلے تھے اور گھرے سایوں میں لوگ بچوں کے ساتھ پانی کے تالابوں اور فواروں کے پاس خوش گفتگو میں لگے تھے۔ پھر ہندی اپنے مستقر کی طرف مڑ گیا اور منصور بہت فکر مند سا ابو یعقوب اقطع کے ہاں اپنے پوتے حسن کی طرف پلٹا۔

بظاہر حسین کی زندگی چمکدار قابلِ رشک اشاروں پر چلنے والی بھیڑ اور اتباع کرنے والوں کی زیادتی کی وجہ سے بہت خوب تھی۔ یہ حاصل اس کی کشتِ مراد سے اسے ملا تھا مگر بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے فقیہ اور مشائخ اس سے کیوں گریزاں تھے۔ عمر بن عثمان مکی کیوں اس کو راندۂ درگاہ سمجھتے تھے' حالانکہ اس کے نوافل کی کثرت اور عبادات کی شدت نے لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ دعا کے طالبوں کا ہجوم اس کا منتظر رہتا اور وہ خدا کے خوف سے لرزاں ترساں گریہ وزاری میں مصروف ہوتا۔
اس کے گرد شہباز تھے اور وہ ممولے کی طرح سینے پر سر جھکائے آنکھیں بند کیے

طلب اور مزید طلب میں لگا ہوتا۔ جنید اس کا سوال سمجھتے کیوں نہیں۔ وہ آخر کہاں سے جواب مانگے۔

ابو یعقوب اقطع نے کہا: "تم حضرت جنید کو کسی طرح اپنی طرف مائل کرو۔ بہر حال وہی تمہارے مرشد کامل ہو سکتے ہیں۔ مرشد کے بنا سفر میں ٹھوکر لگتی ہے۔"

"وہ مرشد میں خود ہوں۔ میں اپنے اندر اور باہر سفر کرنے کی سمتیں جانتا ہوں۔" اس نے اپنے باپ کے روبرو اپنے سسر کو جواب دیا۔

"یہ تعلّی ہے غرور۔ اس سے بچو حسین۔ ہادی کے بغیر کوئی کسی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔" منصور نے اسے سرزنش کی۔

"منزلیں خود میری طرف سفر کریں گی پدرِ محترم! خدا کا ملک تنگ نہیں ہے۔" حسین نے سر جھکا کر کہا۔

منصور نے مباحثہ بیکار سمجھ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ صرف ہندی کا بتایا جو اس کے دادا کا دوست تھا اور اس سے ملنے کا آرزومند تھا۔

برادر ہندی کی سرائے شہر کی ان کارواں سراؤں سے ذرا ہٹ کر نخلستان کی طرف جانے والے راہ پر آخری تھی اور اس لیے اس میں شور کم تھا اور اس پر ایک مدرسے کا گمان ہوتا تھا۔ منصور کو اسے دیکھ کر بیضا یاد آ گیا۔ محمی کی سرائے اور درختوں سے پٹا ہوا صحن اور اپنا پن' وقت کیسے گزر جاتا ہے۔ اس بڑے دروازے سے اندر جا کر اس نے مالک سے برادر ہندی کا پوچھا۔

اطاق کے نیم روشن اندھیرے میں مجسمہ منصور کو دکھائی دیا۔

"آؤ۔ آؤ۔" میزبان نے ہاتھ ملتے ہوئے اٹھ کر کہا۔ "میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے یہاں قدم رنجہ فرمایا۔ میں نے یہ مجسمہ آج بلکہ ابھی خریدا ہے۔ ایک قبطی افغان اسے قندھار سے لایا تھا مگر اس چہرے پر وسطی ایشیائی بلکہ منگولیائی چھاپ ہے۔ دبی ہوئی آنکھیں' ابھری ہوئی رخساروں کی ہڈیاں۔" اس نے مجسمہ منصور کے سامنے رکھ دیا۔ "ناک ذرا ستواں ہے۔" پھر ہنس کر اس نے کہا: "دنیا کے کسی حصے میں بھی وہ بدھستوا کے مجسمے اس ناک کے بغیر نہیں بنا سکتے اور اس مسکراہٹ کے بنا بھی نہیں جو مخفی نور کے خزانے کی طرح جانے کہاں سے ظاہر ہوتی ہے۔" ہندی کا چہرہ جوش سے

تمتمایا ہوا تھا جیسے نایاب خزانے کے ملنے سے یا اچانک کسی نہایت اچھی خبر کے سننے سے ہو۔

منصور اپنے سامنے پڑے پتھر کے اس ٹکڑے کو دیکھتا رہا اور پتھر کی ممکنات پر غور کرتا رہا تو یہ خیال پتھر کے اندر مستور ہو گا۔ مصور تو بہر حال وہی تھا جس نے صورتیں بنائی تھیں، تصویر گری کی تھی مٹی میں کیا کیا ممکنات تھیں۔

برادر ہندی نے پھر کہا: "یہ ایک نہایت نادر مجسمہ ہے۔" اس نے اسے پھر چھوا۔ "سنگِ یشب کی یہ مورتی ایک خزانے سے کم نہیں۔"

منصور اس سارے عرصے میں چپ چاپ صرف سوچتا ہوا کھڑا رہا۔

"میں نے بیٹھنے تک کو نہیں کہا منصور برادر۔ اصل میں آدمی کی بساط کیا ہے اور اس میں پوشیدہ طاقتیں کیا ہیں۔ انسان کا ہاتھ جب خالق کا ہاتھ بنتا ہے۔"

"ارے بیٹھو نا۔" اس نے ایک خالی نشست کی طرف رہنمائی کی۔ "میں بس دیوانہ ہو جاتا ہوں تخلیق کے یہ نمونے، تکمیل مجھے بے چین کر دیتے ہیں۔ ہر حسین شے مجھے نہایت مضطرب کرتی ہے، میرے اندر ہلچل مچا دیتی ہے اور مجھے اداس بھی کر دیتی ہے کہ یہ میرا ہاتھ کیوں نہیں جس کو یہ طاقت عطا ہوتی۔ میں نہایت حاسد آدمی ہوں۔" وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ پھر مڑ کر اس نے منصور کی طرف دیکھا۔ "مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ اشلوک چکر والا پاؤں اپنے آسن کو بھول کر ابھی قدم دھرے گا۔ یہ بہت کچھ جانتی ہوئی آنکھیں کھلیں گی اور وہ نظر جانے وہ نگاہ کیا ہو گی۔ میں اس کی تاب ہرگز نہیں لا سکوں گا۔ بس میں راکھ ہو جاؤں گا۔" اس نے جوش کے عالم میں پھر اپنے ہاتھ ملے۔

منصور مبہوت سا اسے دیکھتا رہا اور اس کی نگاہوں میں مرقعے گھوم گئے جو اس نے دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھے تھے۔ آدمی کی اپنی دیوانگی اور اس کا اپنا شوق ہے نا!

ہندی نے مجسمے کے سراپے کو پھر شوق سے گھورا۔ "کس قدر مکمل" پھر اس نے منصور کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سنگِ یشب میں اس سے بڑی دولت کبھی بھی میرا مقدر نہیں ہوئی۔ پھر یہ پاکشی اور نٹ راج سے بھی کہیں آگے ہے۔ آپ کو پتہ ہے برادر منصور کہ آپ کے والد کا اور میرا شوق اس سلسلے میں برابر تھا۔ وہ فارس میں میرے لیے

ان نوادرات کی خبر رکھتے تھے، بخدا ان کی طرح کا دوست پھر مل نہیں سکتا۔"

مجسمے کی ادھ کھلی آنکھیں دریچے میں سے آنے والی ایک کرن سے یوں روشن ہوئیں جیسے نگاہیں اٹھا کر ابھی نظر اطاق کے اندرون پھیلے گی۔ اقصائے عالم میں کیسے کیسے مذاہب اور عقائد پھیلے اور سمٹتے رہے تھے۔ دنیا والوں پر عرش کی نعمتیں قطرہ قطرہ جرعہ جرعہ بوند بوند ساعت ساعت پہنچتی رہی تھیں۔ آدمی نے اپنی عقل سے ادراک تک سفر کتنی صدیوں میں طے کیا تھا۔ معلوم سے حدوث سے قدیم تک سمجھ اور ناسمجھی کے رشتے الجھے ہوئے دراز اور فہم سے ماورا تھے۔ آدمی نے ہر اس شے کی پرستش کی تھی جو اسے طاقت ور اور بالاتر دکھائی دی تھی۔ آدمی نے کائنات کے بھید جاننے کے لیے کہاں کہاں تک سفر کیا تھا مگر کائنات کے راز اسی طرح سربستہ رہے تھے۔ اس نے ستاروں سے لے کر آتش پرستی تک زقندیں لگائیں مگر وہ جو مقصود تھا اور محلِ نظر تھا ماورا ہی رہا۔ حسن کی تکمیل سے عشق کی تکمیل تک داستان رنگین تر ہوتی گئی مگر داستان ہی رہی۔

"جب کپل وستو کے راجکمار کی طبیعت دنیاداری سے اوب گئی تو اس نے جنگلوں کا رخ کیا۔" ہندی نے اس کی طرف منہ کر کے کہا۔ "آپ کو یہ کہانی تو معلوم ہی ہے نا۔"

"دنیا نہایت دلفریب جگہ ہے۔" منصور نے کہا۔

"کالیسا کے مندر میں قطار اندر قطار اندھیروں میں ڈوبی لمبی راہداریاں بدھ کے مجسّموں سے سجی ہیں جو زمین پر ہوتے ہوئے بھی اس سے اوپر اور بہت پرے ہے۔ وہ جسامت صرف حیران ہی نہیں حیرت زدہ بلکہ خوفزدہ کر دیتی ہے۔ عظمت کا کپکپا دینے والا تصور اور آدمی کی اپنی بے بضاعتی فن کی معراج اور پھر فن کار کے اندر کی ممکنات اس کے تخیل کی پرواز میں کیا بتاؤں منصور برادر۔"

"وہ سب ایک نسل کا کام تو نہیں ہو سکتا۔" منصور نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ آدمیوں کا نہیں آدمی کا کام ہے۔ آدمی جس نے سوچا کہ وہ اپنے مذہب کی خدمت کر رہا ہے۔ اپنے بدھ کو اپنے تخیل سے دوبارہ بنا سنوار کر رکھ رہا ہے اور اس لیے یہ فن پارے زمانے کی اس دست برد سے محفوظ رہے۔"

"اور خدا مجسمہ سازوں کی دست برد سے محفوظ رہا۔" منصور نے ہنس کر کہا۔

ہندی نے ہولے ہولے اپنے پاؤں پر گھوم کر گہری نظروں سے منصور کو دیکھا اور دیکھتا رہا۔

''میں نے کوئی بات قابلِ گرفت اور دل آزار کہی ہے۔'' منصور نے پوچھا۔

''اگر آپ کی بات کو سچ مان لیا جائے تو اس لازوال فن کی اہمیت محض نقش گری کی رہ جاتی ہے۔'' ہندی ایک نشست پر ٹک گیا۔

''میں جاہل آدمی ہوں برادرِ ہندی اور فن کی باتیں بالکل نہیں سمجھتا۔ اس کی معراج کیا ہے اور اس کی ممکنات کیا ہیں، یہ نہیں جانتا مگر یہ مجسمہ حسین ہے اور یہ سارا حُسن خدا نے اس پتھر کے سینے میں رکھ دیا تھا۔ صنعت گری تو آدمی کی نہیں اس کی ہے۔ مصور تو پھر بھی وہی ہوا۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔''

ہندی نے سر ہلایا مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔

کالیسا کے مندر میں پہاڑوں کے اندر بنی راہداریوں میں ورطۂ حیرت میں ڈالنے والی ہر شے بنانے والا تو وہی ہے صرف آدمی نے کاوش کی اور اسے ڈھونڈ نکالا۔ جس کو آدمی پتھر سے کھوجتا ہے وہ تو پھر بھی نہ ملا کیونکہ وہ مل نہیں سکتا۔ بھلا جس نے کئی کائنات تخلیق کیے ہوں، وہ اپنی ہی تخلیق کردہ ایک مخلوق کے ہاتھ آسکتا ہے۔ اسے ملنے کا اسے دیکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اسے فانی چیزوں میں تلاش کرنا دیوانگی ہے۔''

''برادر منصور یہ دیوانگی آدمی کو خوشی دیتی ہے۔'' ہندی نے مجسّمے کو اٹھایا اور سر پر سجے مکٹ کو ہاتھ سے چھوا۔ ان پپوٹوں کو انگلی سے محسوس کیا۔ انتہائے حسن کی تمتماہٹ میں سکون لیے اس چہرے کو دیکھتا رہا۔ اشوک چکر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ دنیاؤں اور آکاش اور دھرتی، سمندروں اور اندھیروں اجالوں سے آشنا مسکراہٹ لیے ہوئے سراپا۔ کیا آدمی کی رسائی ماوراء تک ہے۔

پھر اس نے نہایت حفاظت سے اسے لپیٹا اور صندوق کے زیریں حصے میں رکھ کر ڈھکنے کو مضبوط بند کیا۔ لکڑی کا جوتا ایک کونے میں اتارا اور یمنی طیلساں کو کندھے پر درست کر کے وہ منصور کے ساتھ ابو یعقوب اقطع کے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔

راہ کے دوسری طرف بادلوں کی وجہ سے جو سورج کے سامنے آکر کبھی روشنی کو

روک لیتے تھے، دور درختوں کے جھنڈ میں سے جھانکتے ہوئے کھنڈرات کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی۔

"میں اکثر ان ویرانوں میں گھومنے نکلتا ہوں، جب بھی میرا گزر بادشاہتِ بغداد میں کہیں ہوتا ہے۔" ہندی نے اس طرف اشارہ کیا۔

"ان میں کیا ہے۔" منصور نے پوچھا۔ "یہ کھنڈرات کیا ہیں۔"

"گزرے زمانوں کی کہانیاں ہیں جن کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ جو وقت کے دھارے کے سامنے کھڑی ہیں۔ وقت ان کے آس پاس ادھر ادھر سے بچ کر نکل جاتا ہے آنکھ بچا کر۔" ہندی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

عافیت اسی میں ہے کہ ازلی ادبی وقت کے سامنے شکست تسلیم کرلی جائے۔" منصور نے جواب دیا۔

"برادر منصور کئی چیزیں آدمی کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں مگر اس سے آگے نکل کر بس اس کے راہ میں جم جاتی ہیں۔ اسی طرح کئی خیال کئی خواب مجسم ہو کر ٹھہرے رہتے ہیں۔"

"کیا ان کھنڈرات میں تمہیں نوادرات ملے ہیں مجسمے جن کی تلاش میں تم رہتے ہو۔" منصور نے کہا۔ "یوں خصوصیت سے تمہیں یہی جگہ پسند ہے ورنہ دشتِ سُوس کے وسط میں اور پرانی معدوم شاہراہوں کے ساتھ ساتھ آبادیوں کے نشان ہیں جن پر ریت نے پہاڑیاں تعمیر کردی ہیں۔ چرواہے جب شاموں کو لوٹتے ہیں تو ان ٹیلوں پر سے کئی عجیب وغریب چیزیں لاتے ہیں۔"

"ہاں برادر! ذہن کے سب گوشے کسی نہ کسی وقت آباد رہتے ہیں اور ایک خدا کے تصور سے پہلے لوگوں نے کس کس شے کو پوجا ہوگا۔ دنیا بہت قدیم ہے اور مجسّموں کی میری تلاش بھی، سمجھ لو میری دیوانگی ہے" ـــــ پھر ٹھہر کر اس نے کہا۔ "گزرے ہوئے خداؤں کی تلاش۔" وہ بڑی خوشدلی سے ہنسا۔ "تخت سے اترے ہوئے بُھولے اور بھلائے ہوئے دیوتا اور پیغمبر اور اوتار ـــــ سمنی مذہب ان علاقوں میں تو اب تقریباً معدوم ہو چکا ہے مگر ان خانقاہوں کے تہ خانوں میں اب بھی بدھ کی مورتیاں ہیں۔"

"تلاش جاری رکھو اور تم پر ہی کیا منحصر ہے ہر آدمی کچھ نہ کچھ تلاش کرتا رہتا

ہے جس دن یہ تلاش نہ رہی آدمی کے اندر بے چینی نہ رہی آدمی نہیں رہے گا۔" منصور خوش تھا۔

"آدمی تو بھگوان کو ڈھونڈ اور پاکر بھی کچھ اور کھوجتا ہے برادر منصور۔" ہندی بہت سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

ابو یعقوب اقطع کے گھر کے دروازے پر ایک بھیڑ جمع تھی جس میں سے راستہ بناتے ہوئے گویا سروں پر پاؤں دھرتے ہوئے وہ پہلے دروازے کی طرف بڑھے۔ بھیڑ اندر بھی تھی۔ عورتیں اور بچے اور بے چینی سے منتظر لوگ اور سکون سے وقت اور فرصت کا انتظار کرتے لوگ باریش جوان اور شرطے اور فوج کے افسران اور ہر طبقے کے نمائندہ لوگ۔ بڑے بڑے نقابوں کے پیچھے کنیزیں اور لونڈیاں۔ لگتا تھا کسی بہت بڑے طبیب کا دواخانہ ہے۔

منصور معافی مانگتا اور راستہ بناتا آخر اندر جانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس کے پیچھے ہندی نے بھی کسی نہ کسی صورت اپنا وجود لڑھکا لیا تھا۔ روشنی سے ایکدم وہ نیم تاریک سے کمرے میں داخل ہوئے تو انہیں آنکھوں کی سرگوشیوں میں باتیں کرتے بہت سے لوگ دکھائی دیئے۔ پھر چند لمحوں کے بعد منصور نے مڑ کر دیکھا تو ہندی ہاتھ جوڑے سر کو ان پر دھرے ہمہ نیاز بنا ہوا اپنے وجود کو سجدہ ریز کرنے کے لیے لوگوں کے سروں پر گویا گر رہا تھا۔

"برادرِ ہندی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "آپ آگے کی طرف نکل آیئے۔"

مگر ہندی اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں پر سر جھکائے کھڑا تھا بالکل ساکت جیسے کسی مندر میں دیوتا کے سامنے ہو یا برزسوا کے سامنے معبد ناہید میں کوئی موبد اوستا پڑھتا ہو اور تجلیٔ آتش کو اپنے دل میں ابھرتا محسوس کر رہا ہو۔

ہولے ہولے یا جانے کس جذبے سے حسین نے اوپر دیکھا۔

ہندی کے بندھے ہوئے ہاتھ کھل گئے بازو نیچے گر گئے اور وہ جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ اس کے منہ سے جو نکل رہا تھا اسے سوائے اس کے کوئی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کم روشنی میں جو لوگوں کے سانسوں سے دہکتی لگتی تھی منصور نے ہندی کو پسینے میں تر ہوتے دیکھا۔ بال اس کے سر پر کھڑے تھے جیسے خوف کی وجہ سے نس نس تن گئی ہو اور

ٹوٹنے کو تیار ہو۔ پھر اس نے حسین کی طرف مڑ کر دیکھا اور مجمعے کو بھی۔ اس کے بیٹے کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں اور حلقوں سے باہر نکلی ہوئی لگتی تھیں۔ فضا میں کچھ رکاوٗاور گھٹن تھی جیسے طوفان سے پہلے سناٹا ہو۔

''میں کوئی اوتار نہیں ہوں، بالکل نہیں، تم غلط سوچتے ہو۔'' حسین کی آواز گرجدار گونج اور بجلی کے کوندے کی طرح لہرائی جیسے طوفان یکدم برس پڑے۔ شدّتِ جذبات سے ہندی جھکا جاتا تھا اور لرز رہا تھا۔ اس کی پیشانی تقریباً زمین کو چھو رہی تھی اور حسین کی خفگی دُرے کی طرح اسے تڑپا رہی تھی۔

''نہیں نہیں۔ ایسا نہیں۔ میں نے جھوٹ نہیں دیکھا۔ تم ہی بھگوان کے اوتار ہو۔'' برادر ہندی کی بے تابی دیدنی تھی۔

لوگ اس مکالمے کو سن رہے تھے اور دم بخود حیرت زدہ تھے۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ منصور بھی ان میں سے ایک تھا۔ وہ اپنے دوست کو اس کی درخواست پر اپنے بیٹے سے ملاقات کے لیے لایا تھا مگر وہ خود ایک اجنبی تھا اور مکالمے کی نوعیت وغایت، ماہیت اور نہج سے قطعاً بے خبر تھا۔

''مجھے غلط مت سمجھو۔ میں خود تلاش میں ہوں۔ بے خبر ہوں اور راہوں کے الٹ پھیر میں الجھا ہوا ہوں۔'' حسین اٹھ کر ہندی کے قریب آ گیا۔

ہندی نے سر اٹھایا۔

''یہ آنکھیں، یہ پیشانی، یہ ماتھے پر تڑپتی لو جو بجھتی نہیں جلتی ہے۔ تمہارا سارا وجود جس سچ اور جس تیج سے بول رہا ہے تم اسے کیوں جھٹلا رہے ہو۔ میرے مذہب کی کتابوں میں آنے والے زمانوں کی پیش گوئیوں میں یہ سب لکھا ہے، ایک ایک حرف۔ یہ نشانیاں ہیں۔ میں ملک ملک میں انہیں ڈھونڈتا پھرا ہوں اور میں نے انہیں پالیا ہے۔'' اس نے جھک کر حسین کے پاؤں چھو لیے۔

حسین تڑپ کر پیچھے ہٹا۔

''میں محمی تمہارے دادا کا دوست ہوں اور میں غلط کہنے والا نہیں ہوں۔ دنیا کے کناروں تک گھوما ہوں اور میری تلاش بس تم تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔'' ہندی نے حسین کے سامنے کی زمین کو بوسہ دیا۔

"اٹھو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہاری تلاش نے تمہیں گمراہ کیا ہے۔" حسین نے گرج کر کہا۔

منصور نے آگے بڑھ کر حسین کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ تمہارے دادا کے دوست ہیں بیٹے۔"

حسین نے باپ کا ہاتھ کندھے سے جھٹک کر الگ کیا۔ "میں راہِ حق کی تلاش میں خود پریشان ہوں اور یہ مجھے قابلِ سجدہ سمجھتا ہے۔ اپنے دیوتاؤں کی بدلی ہوئی شکل کسی مجسّمے کی شباہت مجھ میں ڈھونڈتا ہے۔ اسے کہیے ابھی یہاں سے چلا جائے۔"

منصور نے کہا "حسین، ہوش میں تو ہو۔ انہیں میں لایا ہوں۔ وہ تو تمہاری دید کے متمنی تھے بس۔"

"ہاں یہ محض اتفاق ہے کہ میری منزل یہاں ہے۔" ہندی نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

"تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ میں پھر کبھی نہ تمہاری شکل دیکھنا چاہوں گا اور نہ تم سے ملنا۔" حسین نے باپ کی بات کا جواب دینے کی جگہ ہندی سے کہا۔

"یہ مکمل شکل ایک اوتار کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔ میرے دل کا حال سوائے اس کے کوئی جان نہیں سکتا۔ میرے ملک میں لوگ تمہارے منتظر ہیں۔ ہماری زمین کو تمہاری ضرورت ہے۔ تم ہمارے ہو، بالکل، قطعاً ہمارے۔" ہندی نے عاجزانہ فخر سے کہا۔

یہ عجیب تماشا تھا جیسے محبوب اور محبّ کے درمیان ہو جیسے دو دشمنوں کے درمیان ہو۔ ایک ہمہ ناز اور دوسرا ہمہ نیاز۔ ایک وفورِ شوق سے بے تاب اور دوسرا پہچان سے بھی منکر۔ زمانوں پہلے کی دو روحیں، دو ذرّے اچانک ایک دوسرے سے ملاقی ہوئے ہوں اور دامن چھڑا رہے ہوں۔

منصور نے ہندی کو اشارہ کیا۔ وہ خود بھی سخت دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ ایک بھرے مجمعے میں حسین نے اس کی بات سنی تک نہ تھی۔ جانے اسے کیا تھا۔ وہ اسے نہایت فرمانبردار تو نہیں کہہ سکتا تھا مگر آج تک اس نے سعادت مندی سے اس کے دل کو دکھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ خود شرمندہ تھا۔

ہندی پھر حسین کے قدموں کی طرف جھکا تو اس نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔
"دیکھو تمہاری دیوانگی میری دیوانگی سے ٹکرا کر پاش پاش ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ اپنے کو بچاؤ اور یہاں سے بھاگ جاؤ۔ سمجھے۔" اس نے اسے تقریباً دروازے کی طرف دھکیل دیا۔۔۔ "جاؤ۔۔۔!"
منصور اور ہندی چپ چاپ ابو یعقوب اقطع کے گھر سے نکلے اور سرائے کی طرف چلے۔
"برادر منصور۔ میں خود سرائے تک چلا جاؤں گا۔" ہندی نے کہا۔
"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں برادر ہندی۔ مجھے حسین سے یہ امید نہ تھی۔ مگر تمہاری بات کی بھی مجھے سمجھ نہیں آئی۔ تم اسے کیا کہہ رہے تھے۔"
ہندی ہنسا۔۔۔ "یہ میرے اور اس کے درمیان ایک راز تھا۔ مگر یہ جان لو کہ تمہارا حسین ہرگز معمولی آدمی نہیں ہے۔ ایسے انسان صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اسے پیدا تو ہمارے یہاں ہونا چاہیے تھا مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی اس راز کی کون ٹوہ لگائے گا کہ وہ محمی کا پوتا ہو کر تمہارا بیٹا ہو کر ہمارے لیے کیسے ہو گا۔"
پھر اس نے مڑ کر منصو کا بازو زور سے تھام لیا۔ "اسے آخر میں وہیں آنا ہو گا۔ ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں بھی ہو وہ اوتار آخر بھارت ورش کا ہو کر رہے گا۔ تمہارے بیٹے کو وہاں آنا ہو گا۔"
منصور نے کہا: "برادر ہندی، مشیت کو نہ کوئی جان سکتا ہے اور نہ اس سے لڑ سکتا ہے کہ میں محمّی کا بیٹا ہو کر کیوں ایسا ہوا اور وہ خود میرا بیٹا ہو کر حسین کیونکر ہوا۔ وہ جو ہو جیسا ہے کیوں ایسا ہے۔ قدرت کے کارخانے کی کوئی بات آدمی سمجھ نہیں سکتا۔ اس کا مقدر کیا ہے، آنے والے زمانے میں کیا ہو گا، مجھے نہ تو معلوم ہے نہ ہی معلوم کرنے کی جلدی ہے۔ ایک باپ ہونے کی حیثیت سے میں صرف اس کے لیے دعا کر سکتا ہوں۔"
ہندی نے کہا "آج رات کے پہلے پہر میرا قافلہ خوزستان کی طرف روانہ ہو جائے گا اور مجھے کچھ خریداریاں بھی کرنی ہیں اس لیے میں رخصت چاہوں گا۔ ہو سکتا ہے حالات ہمیں پھر ملائیں۔ ستارے پھر ایک دوسرے کی مخالف سمتوں کی بجائے مطابق

سفر کریں یا ہو سکتا ہے پھر کبھی ملاقات نہ ہو مگر ایک بات ضرور دھیان میں رکھو کہ محمّی کا پوتا اگر معبدِ ناہید کا بڑا کاہن نہیں ہے مگر اتنا عظیم ضرور ہو گا کہ زمانہ اسے بھلا نہ سکے۔"

"شکریہ۔" کہہ کر منصور نے اسے گلے لگا لیا۔ ہندی نے اپنی یمنی طیلساں اس کے کندھوں پر ڈال کر کہا:

"یہ میرا تحفہ ہے۔ امید ہے ایک بھائی دوسرے بھائی کا ذرا سا نذرانہ قبول کر لے گا۔"

"اب اس کو واپس کرنے کی گنجائش ہی کہاں رہی ہے۔" منصور نے اپنے کندھوں کو تھپتھپایا۔

پھر بہمن کی تیز سرد ہوا نے دونوں کو کپکپا دیا اور دونوں پھر ایک تازہ گرمجوشی اور محبت سے گلے ملے۔ ہندی اتر کر اپنی راہ پر ہو لیا اور منصور اپنے خیالوں میں گم بہت کچھ سوچتا ہوا مدرسہ نظامیہ کی طرف چلا۔ وہ حضرت جنید سے ملنا اور حسین کے متعلق کچھ دریافت کرنا چاہتا تھا۔

فیروردین کے آخری دن تھے۔ برف پگھل کر زمین کی جھولی کو رنگ برنگ پھولوں سے بھر گئی تھی۔ دجلہ میں پانی شفاف اور تیز تھا۔ اور بغداد کی عمارتوں کا بہتا ہوا عکس کشتیوں کی روانی کے ساتھ ہلتا تو زیرِ آب ایک جنت کا گماں ہوتا۔ معمور اور آباد شہر کی رونقیں مختلف النوع لباس پہنے لوگوں کے مجمعوں سے بڑھ گئی تھیں۔ یہ دور دراز ملکوں سے آئے ہوئے اپنے نمائندہ سفارتوں کے ساتھ منسلک لوگ تھے جو آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے شہر کا مقابلہ کرتے اور حیران ہوتے تھے۔ سواری کے جانوروں کی بھیڑ بھاڑ سوداگروں کے عجیب لباس جو وسطی ملکوں سے آئے تھے اور عجوبوں سے کم نہ تھے۔ پھر زمانوں سے یہاں پر مقیم ایسے لوگ جو خلیفہ کی نگاہِ کرم کے منتظر تھے اور دربار تک رسائی نہ پا سکے تھے۔ بڑی بڑی عیسائی سلطنتوں کے پیغامبر جو جاسوس اور ریشہ دوانیاں کرنے والوں سے کسی طور کم نہ تھے۔ پُراسرار ترک جو درّانہ ہر جگہ گھستے اور بغداد کو اپنی مملکت گردانتے تھے۔ موسم کے بدلنے کے لیے بہار کی ہوائیں

نے دلوں میں نئی امنگیں پیدا کر دی تھیں اور اس سارے ہنگامے سے دور حسین بن منصور اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ تستر کی طرف رواں ہو رہا تھا۔ اس نے مالِ تجارت کے کچھ اونٹ ٹھیک کیے تھے اور اپنے بزرگوں سے تقریباً قطع تعلق کر لیا تھا۔

حضرت جنیدؒ بغدادی نے منصور سے کہا تھا: ”تمہارا بیٹا بھٹک گیا ہے۔ اس نے تو ابھی ابتدائی مراحل طے نہیں کیے۔ سلوک اور طریقت کی راہوں سے ناآشنا عجیب و غریب انسانوں کا مرجع اور اپنی بساط سے بڑھ کر مدعی۔

منصور سر جھکائے آنسو بہاتا رہا۔

حضرت نے کہا: ”میرا منشا تمہاری دل آزاری نہ تھا مگر صورتِ حال یہی ہے۔ وہ اپنے کو شیخِ کامل تصور کرتا ہے۔ لوگوں کو اپنے گرد جمع رکھتا ہے۔ یہ غرور ہے جیسا ابلیس نے کیا تھا اور راندۂ درگاہ ہو گیا تھا۔“

منصور نے کانپ کر کہا: ”حضور اُس کے لیے ہدایت کی دعا کیجئے۔“

حضرت جنیدؒ اپنے کسی رسالے کی تدوین کر رہے تھے اور انہوں نے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ وہ قلم ہاتھ میں لیے کسی گہری سوچ میں ڈوبے تھے اور باہر اسفند کی بارش چپ چاپ عورت کے آنسوؤں کی طرح برس رہی تھی۔

منصور نے پہلو بدلا تو گویا انہیں اس کے وجود سے آگاہی ہوئی۔ وہ اس کی طرف دیکھتے رہے۔

”لوگوں میں حسین کے لیے سرگوشیاں پھیلی ہیں۔ اس کی دعا مستجاب، اس کی نظر دوررس اور اس کی طاقتیں بے اندازہ ہیں مگر یہ افواہیں اس کے لیے خود نیک فال نہیں ہیں۔ ابھی تو اس نے اپنی منزل کی طرف سفر شروع نہیں کیا۔ وہ تقدیروں کا بدلنے والا کب سے ہو گیا ہے۔“

منصور نے جھک کر کہا ”حضور اس کے لیے دعا کیجئے۔ وہ میری کل متاع ہے۔“

حضرت جنیدؒ نے کہا: ”اسے اس شعبدہ بازی اور مجمع سازی سے روک سکو تو یہی میری دعا ہو گی۔“ وہ پھر اپنے قلم کو سنہری روشنائی میں ڈبو کر کچھ لکھنے لگے اور منصور الٹے قدموں چلتا ہوا ان دالانوں میں سے ہوتا ہوا باہر نکلا جہاں جگہ جگہ طالب علموں کی ٹولیاں علمی مباحث میں لگی تھیں اور خوشگوار ہوا میں مدرسہ نظامیہ کے پھولوں اور

صحنوں میں لگے شجر سایہ دار کی خوشبو ان مشامِ جان کو معطر کرنے والے ناموں میں گھل رہی تھی۔

رف۔ رف۔ رفتن کی صدا تُستر کے اس گلیارے میں پھر لوگوں کو متوجہ کرنے لگی تھی جہاں دعا کے لیے منتظر ٹولیاں اب لوٹ جاتی تھیں کہ حسین نے کسی کے لیے بھی دعا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

حضرت جنیدؒ کو مل کر جب منصور لوٹا تو اس نے بیٹے کو اپنی ملاقات کا حال بتا کر کہا تھا۔ "وہ شیخ کامل ہیں اور غلط نہیں کہہ سکتے۔"

"میں بھی غلط نہیں کہتا گو میں شیخ کامل ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔" حسین نے نہایت نرمی سے جواب دیا تھا۔

"مگر جو خواب تمہارے دل میں منعکس ہوتے اور جو طاقتیں تمہیں قابو کیے ہوئے ہیں ان سے اپنا دامن چھڑاؤ۔ سلوک کی جن منزلوں سے تم نہیں گزرے، ریاضت کی جن مشقتوں کو تم نے نہیں آزمایا، انہیں آزماؤ بیٹے۔" منصور نے آخر وہ بات کہہ ہی دی۔

حسین بہت دیر چپ رہا۔ اس سے دعا کی طالب بھیڑ، خود اس کا تصرّف جو خدا کا عطا کردہ ہی تو تھا، پرچھائیں اور سایوں کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سے وہ جلسے وہ محفلیں وہ اسباق گزر گئے اور وہ سب اسی کی دین تھی۔ حضرت جنیدؒ یہ سب جانتے تھے اور اس کے باوجود انہوں نے اس کے ذکر و فکر کو شعبدہ بازی سے تعبیر کیا تھا۔ اس کی مشقت و ریاضت کو دیوانگی کہا تھا۔ جھنجھلاہٹ اس کی روح میں اترتی چلی گئی اور مایوسی بھی۔ بغداد اسے کبھی بھی پسند نہیں کرے گا۔ اسے اپنی سند کہاں سے حاصل کرنا تھی؟ اگر اس کے نصیب میں کسی اعلیٰ روحانی درجے پر فائز ہونا نہیں تھا تو وہ کیونکر مشیت سے لڑ سکتا تھا۔ اس نے سوچا یہی بہتر ہوگا کہ وہ عام سادہ زندگی گزارے جو ہر وہ شخص جو اس روئے زمین پر پیدا کیا گیا، گزارتا ہے۔ اپنے دنوں کو یونہی تمام کرے۔ اگر حضرت جنیدؒ جو استادِ عصر اور پیرِ طریقت تھے، یہ کہتے تھے تو صحیح ہی کہتے ہوں گے۔ آخر

وہ سوالوں کے پردے میں مدعی کیونکر تھا۔ کاش اسے ایسی آنکھیں عطا ہوں کہ وہ ماضی میں اور آنے والے زمانے میں دور تک دیکھ سکے۔ اس سے اپنا مشاہدہ کیوں سلب کر لیا گیا تھا؟ ایک لمحے کو اسے محسوس ہوا جیسے سوائے اندھیرے کے کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتا۔ وہ ایک دیوار ہے جس کی نہ بینائی ہے اور نہ ہی کوئی حیثیت جیسے ساری طاقتیں اس سے واپس لے لی گئی ہوں۔ روشنیاں اور نور اور آئینے کی طرح صیقل کیا ہوا اس کا دل، اس کے حوصلے سب کچھ!

رف رف رفتن۔

رقص کے لیے تیار وجود تن تن کر اس کی نسیں ڈھیلی ہوتیں اور ڈھیلی ہو کر تن جاتیں۔ گویا وہ ایک لَے ہو جس میں پوشیدہ نغمے بے تاب ہو رہے ہوں۔ گویا وہ ایک باجا ہو جس میں بند راگ تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہے ہوں۔ وہ ایک قید خانہ ہی نہیں تاریک زندان ہو جس میں بے بسی اور ناامیدی کے مارِ سیاہ پھنکار رہے ہوں اور پھر وہ ایک طنبور ہو اور اس کی اپنی انگلیوں سے مضراب چھین لیا گیا ہو۔ پچھلے پہر جب رات نرم رو قاصد ستاروں اور نیم قوس کہکشاں کی موجودگی میں پرندوں کے خوش الحان گیتوں میں ڈھلتی اور خوشبو کے معطر جھونکے کائنات کی شہنائی کے صد ہا بول اس پر انڈیل دیئے جاتے تو وہ کراہتا اور بے چین ہوتا، سراپردۂ اسرار سے پرے کیا ہے؟

وہ کون ہے؟

وہ اپنا اور اس کا رشتہ کبھی سمجھ سکے گا کہ نہیں؟

پھر وہ سر جھٹک کر سب سے چھوٹے بچے کو اپنے ساتھ بھینچ لیتا۔ وہ بھی اس کی طرح بے بس تھا اور ہر لمحہ محتاج اور ناسمجھ۔ اس کی حفاظت کون کرے گا۔

زینب نہایت آہستگی سے بچے کو اس کی گرفت سے لے لیتی ہے۔ وہ اپنی ساری سادگی کے باوصف یہ جانتی تھی کہ حسین یہ سب اولاد کی محبت میں نہیں کرتا۔ اپنے آپ کو بچا رہا تھا، پکڑ رہا تھا، سمیٹ رہا تھا، بکھرنے سے بچا رہا تھا، پناہ گاہ کی تلاش میں تھا، آسرا چاہتا تھا۔

وہ اپنی ساری آرزوؤں کے ساتھ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ جانتی نہ تھی، سوائے اس کے کہ وہ اپنے آپ سے انکار کر رہا تھا۔ اپنے آپ سے بھاگ رہا تھا۔

کرب کی ان کیفیتوں کو جنہیں وہ چھپانا چاہتا تھا، وہ جانتی تھی۔
زینب کو اس پر رحم آتا۔ اس کے کھوئے ہوئے وجود پر، اس کی بے چینی پر۔ کاش وہ ایک عام معمولی انسان ہوتا۔ اصل میں دُھنیا، جسے تانت اور لکڑی کے بنے ہوئے روئی دھنکنے کے اس آلے سے دلچسپی ہوتی، خود زینب کی زندگی میں ایک بے صبر سا سکون تھا جس کی عادت اسے ہو چلی تھی۔ بیضا کی سرائے میں منصور اور حسین اور بچوں کے ساتھ رہنا، اپنے باپ کے گھر میں محفلوں اور جلسوں مباحثوں اور مراقبوں کی گونج سننا جو خانقاہ کے قرب کی وجہ سے تھی اور اب وہ اور حسین نہر کے کنارے باغ کے سِرے پر تُستر کی خانقاہ کے عین نیچے اس چھوٹے سے گھر میں جس کا راستہ نہر سے پار کشتی کے ذریعے جاتا تھا۔ جیسے حبابوں کا قافلہ جو لہروں پر آگے ہی آگے بہتے تھے۔ اسے معلوم تھا حسین ایک مسافر کی طرح یہاں رُکا تھا اور آخر اپنے سفر پر روانہ ہو گا مگر اس سفر میں زینب کو اس کا ساتھ نہیں دینا تھا۔ وہ منتظر تھی اور وہ گن رہی تھی۔ یہ خوشبو جو اس کے گرد تھی آخر پرواز کرے گی، ٹھہرے گی نہیں۔ نہر میں پانی لوٹ کر تو نہیں آتا تھا۔ لہریں آگے ہی آگے حبابوں سے بے پرواہ ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتی اس کنارے سے اس کنارے بھاگ کر آگے ہی جاتی تھیں۔ آدمی بھی اپنی کشتی کھیتا پانی کے رخ بہتا تھا۔ اسے بہنا تھا۔

یہ فاقہ مست خاندان تھا جس کی ضرورتیں محدود اور آمدنی محدود تر تھی۔ نداف کی دکان جہاں دن رات رف رف کے باوجود اکثر بھوکا سونا پڑتا۔ کبھی رات کو دیئے میں تیل نہ ہوتا اور بیمار بچے کے لیے دوا لانے کو پیسے نہ ہوتے۔ اندھیرے میں بخار کی ہذیانی کیفیت میں جب بیمار ڈر کر چیختا تو زینب خدا سے پناہ مانگتی، دل ہی دل میں مناجاتیں پڑھتی، دم کر کے پُھونکتی، قرآنی آیات کا ورد کرتی۔ حسین گھبرا کر باہر نکل جاتا۔ کانوں کو بند کر کے ہاتھ ان پر دھر لیتا۔۔۔ برفباری کے دنوں میں حسن پھٹے جوتے پہنے جن میں سے اس کی سرخ ایڑیاں جھانک رہی ہوتیں، مکتب کی طرف جاتا دکھائی دیتا۔ اس کا گول چہرہ چمکدار آنکھیں سرد ہوا میں ٹھٹھرتیں سکڑتیں اور لمبی پلکوں سے سجے رخسار اور بھی سرخ ہو جاتے۔

اُن دنوں جب حسین گھر لوٹتا اور موٹی خانہ ساز رنگین طیلساں کا دامن الٹ کر

کھانے کی کوئی چیز یا کوئی پھل نکالتا تو خوشی کی لہر سب چہروں کو بدل سا دیتی جیسے چاندنی کا دھارا بادلوں کو چمکا دیتا ہے۔ وہ بے موسم کے پھل ہاتھ کے اشارے سے حاضر کرنے اور ایسی ہی اور کرامات رکھنے والا شخص کسی گزرے زمانے کی کہانیوں کا کردار لگتا تھا۔ یہ حسین اپنی طاقتوں کو بھول کر اپنے گھر میں ایک عام آدمی کی طرح مطمئن اور متمکن لگتا تھا اور زینب بھی کبھی زیادہ کا مطالبہ نہ کرتی۔ صبر و شکر سے وہ حسین کا اس کے اور بچوں کے قریب ہونا سب سے بڑی آسائش تصور کرتی تھی۔

حسین نے لوگوں کے لیے دعا کرنا چھوڑ دیا تھا اور جیسا کہ لوگوں کا حافظہ جلد بھلا دینے والا ہوتا ہے تُستر میں لوگ تقریباً بھول گئے تھے کہ حسین بن منصور حلاج ان کے درمیان ہے۔ جیسے دریا کے دھارے تلے چھپا موتی ہو۔ یہاں تک کہ ایک کارواں سرائے میں آکر رُکا۔ اُن لوگوں کے ساتھ ایک جاں بلب بیمار تھا۔ وہ بہت دور سے آئے تھے، اطرافِ بغداد سے اور چاہتے تھے کہ حسین اس بچے کا علاج کرے۔ اس کے لیے دعا کرے۔ انہوں نے سنا تھا وہ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔

جب وہ اس کا ٹھکانا ڈھونڈتے ہوئے نہر کے دوسرے کنارے پر پہنچے تو رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی۔ پچھلی راتوں کا چاند نیلاہٹ میں غوطے لگاتے تاروں کے ساتھ بادلوں کے اِکّادُکّا ٹکڑوں کی اوٹ میں آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔

"حسین حلاج کا گھر یہی ہے کیا؟" دوسرے کنارے سے کسی نے پکارا۔

زینب جاگ گئی اور پریشان ہو گئی۔ اس نے حسن کو بیدار کیا اور دریافتِ حال کے لیے باہر بھیجا۔

"کیا کام ہے۔" حسن کی چھوٹی سی آواز بہتے پانی کے اوپر سے، درختوں کی شاخوں میں سے سنائی دی۔

"ہم ایک بیمار کو لائے ہیں اور بغداد کے محلّہ رصافہ سے آئے ہیں۔" انہوں نے دوسرے کنارے سے جواب دیا۔

حسن نے ماں سے آکر سب حال کہہ دیا۔ حسین نوافل میں مشغول تھا۔ اب کیا کیا جائے؟ تُستر میں آکر تو اس نے اپنا ماضی بھلا دیا تھا۔ اب کون اسے اس بات پر مجبور کرے گا؟

"پھر میں ان سے کیا کہوں۔" حسن کی نیند سے بوجھل آواز زینب کو سنائی دی۔
"تم کشتی میں جا کر انہیں یہاں لے آؤ۔ معلوم کریں گے۔ جو لوگ رصافہ سے آئے ہیں وہ لمبا سفر طے کر کے بہت امید لگا کر آئے ہوں گے۔ انہیں ناامید کرنا کفر ہوگا۔" وہ حسن سے زیادہ اپنے آپ سے بات کر رہی تھی۔

پھر چپوؤں کے پانی سے ٹکرانے اور کشتی کے رواں ہونے کی صدا آئی۔
"کیا وہ بیمار کو لے آئیں۔" حسن نے باہر سے ہی ماں سے پوچھا۔
"میرا تو یہی خیال ہے۔ اگر حسین خفا ہوئے تو بھی ہمیں ان کے پاؤں پکڑ کر دعا کروانا ہی ہوگی۔" زینب نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

وہ ایک کم عمر زرد رُو لڑکا تھا جس کی سانس رُک رُک کر آ رہی تھی اور جو نقاہت کی وجہ سے آنکھیں تک نہیں کھول سکتا تھا۔ وہ سائے کی طرح لکڑیوں کو باندھ کر بنائے ہوئے جھولا نما بستر پر لیٹا تھا اور چادر کا ایک حصّہ لگتا تھا۔ زینب نے دیکھا کہ بس وہ کوئی دم کا مہمان تھا۔ پتہ نہیں وہ اسے محلّہ رصافہ سے یہاں کیوں لائے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دجلہ اور رونقیں اور طرب انگیز ہوائیں اور دارالخلافے کی چہل پہل گھوم گئی۔

ہاں وہ آئے تھے اور بغداد کی ہواؤں اور خوشبوؤں اور یادوں کو ساتھ لائے تھے۔ اس کا دل بے چین ہو اُٹھا۔ اسے اس سرزمین کے ذرّے ذرّے سے پیار تھا اور پھر وہ ماں تھی۔ جانے کیوں اس کا دل اس بچے کی طرف کھنچ رہا تھا اور پہلی بار اسے غصہ آ رہا تھا۔ بے چینی سی کہ حسین اپنے طویل نوافل کو مختصر کیوں نہیں کر سکتا۔

بچے کے ساتھی خاموش تھے اور اداس۔
"کیا بغداد کے نواح میں اس کا علاج نہیں ہو سکتا تھا جو اس حالت میں تم لوگوں نے اسے یہاں لانے کی زحمت اٹھائی۔" زینب نے ان سے پوچھا۔
بغداد میں حسین حلاج کی شہرت سن کر اس کی والدہ محترمہ نے بامنت یہاں بھجوانے کی درخواست کی۔ ان کا کہنا ہے کہ "صرف ایک شخص ہے جو اپنی طاقت میں مسیحا صفت ہے اور جو اس کو حیاتِ نو بخش سکتا ہے۔ جس کی دعا کی تاثیر تقدیروں کو بدل دیتی ہے۔"

زینب دکھ کے باوجود مسکرائی۔

"یہ دعا کرو کہ وہ اس کے لیے دعا کرنے کو تیار ہو جائے کیونکہ وہ تو اب ہاتھ اٹھا کر کسی کے لیے ایک کلمہ نہیں کہتے۔"

"مگر حسین کی والدہ محترمہ نے کہا تھا کہ وہ اس بچے کے لیے ضرور دعا فرمائیں گے۔ یہی ایک بچہ ان کی زندگی اور متاعِ حیات ہے۔" انہوں نے بہت پُر امید ہو کر کہا۔

"انہوں نے کبھی اپنے لیے دعا کروائی ہو گی۔" زینب نے پوچھا۔ "کیا اسم مبارک ہے ان کا۔"

"اغول ــــ وہ امیر حامد بن عباس کے گھر میں ہیں۔ مگر ابھی تک اپنے مذہب پر ہیں، جیسے بغداد کے امراء کے گھروں میں کنیزیں ہیں۔" انہوں نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

زینب نے جا کر دیکھا حسین سجدہ میں گرا تھا۔

"امیر حامد بن عباس اور اغول کا بیٹا دعا کا طالب ہو کر بغداد سے یہاں آیا ہے۔ اس کے لیے بھی دعا کرو۔ وہ اپنی ماں کا لختِ جگر ہے اور بہت امیدیں لے کر وہ لوگ آئے ہیں۔"

زینب نے سوچا حسین نے اپنے مراقبے اور دعاؤں میں ہمیشہ کی طرح اس کی آواز کب سنی ہو گی۔ مگر پھر یوں ہوا کہ سجدے میں اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا جیسے خود اس کی جان نکل رہی ہو۔ تڑپ اور بے کلی سے جیسے روح سجدہ ریز وجود کو چھوڑ رہی ہو۔ اس حال میں زینب نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں خونِ کبوتر کی طرح، گوشت کے دو ٹکڑوں کی طرح سرخ ہو گئیں۔ زینب خوفزدہ ہو کر باہر آئی۔

"حسن! تم دیکھو تمہارے باپ کو جانے کیا ہو گیا ہے۔"

لمحوں کی یہ کیفیت ختم ہو چکی تھی اور ایک بدلا ہوا حسین اپنے جلال و جمال میں بے مثال اپنی سطوت و شوکت میں بادشاہوں کی طرح بے نیاز اور پُر اعتماد، نہایت پر سکون مسکراہٹ چہرے پر لیے، جیسے خود اسے ایک نئی زندگی کی بشارت ملی ہو۔

"اغول اور حامد کا بیٹا سلامت رہے گا۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

منصور جب ایک سال کے بعد تستر پہنچا تو حسین بھیڑ میں تقریباً دکھائی

نہیں دیتا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا، نگاہ نیچی اور ایک لمبی ہزار دانوں کی عقیق کی تسبیح کا ایک سرخ ڈھیر اس کے سامنے تھا۔ منصور نے دیکھا، بیماروں اور دعا کروانے والوں کی ایک بھیڑ ان کے دروازے سے دور تک پھیلی تھی۔ لوگ کئی دنوں سے اپنی باری کے منتظر تھے اور نہایت مطمئن تھے۔ یہاں کی ہوا میں ایسی تاثیر تھی کہ شفایاب ہونا ضروری تھا۔

باپ کو دیکھ کر حسین کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ اٹھا اور بھیڑ میں سے راستہ بناتا باپ کے پاؤں چھو کر باہر نکل گیا۔ شام رات میں ڈھلی، رات کے دامن صبح کی سرخی سے رنگین ہوئے، دوپہر ہوئی، بہار کی ہوا نے سایوں کو جُھلایا اور طویل کر دیا۔ خوشبودار گلرنگ پودوں پر کلیوں نے اپنے منہ نقابوں سے باہر جھانکنے کے لیے آدھے آدھے کھولے بازارِ بزرگ کے گلیارے میں رف۔ رف کی صدا تھم گئی۔ وہ سب اس کے منتظر رہے اور پھر انہیں معلوم ہو گیا کہ اب شاید وہ لوٹ کر نہ آئے۔

”کیا ہی بھلا تھا اور تم لوگوں کے لیے بہتر، اگر میں نہ آتا۔“ منصور نے زینب سے کہا۔

”مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مسافر کو آخر سفر پر نکلنا ہی تھا۔“ زینب نے جواب دیا۔

”میں نے سوچا تھا تم لوگ اب زندگی کے دل میں آباد ہو گئے ہو۔ بچوں کی محبت اور ٹھکانہ آدمی کو یہ چیزیں گھیرنے کو کافی ہیں۔“

”وہ آبادیوں میں متوحش صحراؤں کا غزال ہے پدرِ محترم۔“ زینب نے بہت حوصلے سے کہا۔

منصور چپ ہو گیا۔ یہ مقدر تھا اور اسے کون روک سکتا تھا۔ پھر انہوں نے رختِ سفر باندھا۔ حسن کو خانقاہ میں چھوڑا اور خورداد کے آخری دنوں میں جب کم کم ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی وہ بیضا کے لیے روانہ ہو گئے۔

ابوالعباس حسین قرمطی چبوترے کے قریب بیڑیاں پہنے کھڑا تھا اور اسے اپنے انجام کا انتظار تھا۔ سفید داغ پر جو اس کے ماتھے پر تھا، حریر کی لمبی ٹوپی ڈھکی تھی اور عبا کا حریر میلا تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس میں وہ استقامت نہ تھی جو عذابوں کو گوارا بناتی ہے۔ وہ ڈرا ہوا اور جھکا ہوا تھا۔ مرجھایا ہوا شجر جس کی جڑیں کسی تیز آندھی کے زور میں زمین سے باہر آپڑی ہوں۔ المدثر اور المملوق بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے اور بغداد کی پولیس کے افسرِ اعلیٰ کا انتظار کیا جارہا تھا۔

یہ نئی شریعتوں کو لانے والے لوگ تھے جن کے خیالوں میں ان کے اندازوں کے مطابق وحی نازل ہوتی تھی اور بشارتیں دی جاتی تھیں۔ پتہ نہیں انہیں اس انجام پر مطلع کیوں نہ کیا گیا تھا۔ اس کے مقلدوں کی ایک بھیڑ بھی اپنے انجام کو پہنچنے والی تھی اور وہ اس میں تنہا نہیں تھا۔

پہلے اس کو بے حس کیا گیا۔ پھر ہاتھ پاؤں کاٹے گئے۔ لکڑی کو آگ لگا کر اس کے کولہوں اور پیٹ کے درمیان رکھا گیا۔ پھر جب اس کی آنکھیں کھلنے اور بند ہونے لگیں تو اس کی گردن ماردی گئی تھی۔ اس کے سر کو لکڑی پر بلند کیا گیا اور اس کا جسدِ خاکی بغداد کے جسرالاعلیٰ پر لٹکا دیا گیا تاکہ لوگ اس سے عبرت پکڑیں۔ لوگوں نے مہدی ہونے کے، رسول ہونے کے، امام ہونے کے اور خدا ہونے کے دعوے کیے تھے اور اپنے انجام کو پہنچے تھے مگر لوگ ایک دوسرے کے انجام سے عبرت نہیں پکڑتے۔ کیا یہ آدمی کی سرشت میں تھا؟

یہ ایک بڑی فوج تھی جس نے دیارِ مصر میں تباہی مچا رکھی تھی۔ ابنِ جیجک مکتفی باللہ جو معتضد کے بعد تختِ خلافت پر متمکن ہوا تھا اور دین کی حفاظت کے لیے مدینۃ السلام سے رقہ آیا تھا۔ پھر قرمطی فتنے کو نیست و نابود کر کے وہ قیدیوں کے ہمراہ فتح یاب واپس ہوا۔ وہ نرم رو شیریں گفتار اور مہربان تھا مگر اسلام کی حفاظت کے لیے عباسی خلفاء اب تک سینہ سپر ہوتے تھے۔ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور زندگی کے بعد جنت میں مقام حاصل کرنے کی خواہش میں، جنت تقریباً ناقابلِ حصول انسان کی گرفت سے دور اور ہر مسلمان اس کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ بشارتیں، خواب،

الہامات، خوشخبریاں، ریاضتیں سب اُس زندگی کے لیے تھیں۔ مگر ایک ایسا گروہ تھا جو ان سب سہولتوں کے خیال سے ماوراء تھا۔ جس کے ارادے عظیم تھے جو کسی بھی دنیا کے طالب نہ تھے، جن کا مطلوب و مقصود صرف وہ تھا۔ وہی وہی...... ھُوھُو۔

بظاہر اس سے بڑی جسارت اور کیا ہوسکتی تھی کہ آدمی ممکنات کی حدود سے نکل کر خالقِ کائنات کی تلاش میں نکلے۔ اس کی نظر ایک ذرۂ ناچیز کی نگاہِ گستاخ سراپردۂ اسرار سے پرے جانا چاہے۔ اس دنیا کی محبت میں لوگوں نے اس دنیا کو ٹھکرایا تھا۔ شہادت کے متلاشی رہے تھے اور جو دیوانے خالقِ کل کی تلاش میں تھے ان کا انجام بھلا کیا ہونا تھا۔ وہ جو نا ممکنات سے بھرے سجدوں کو جبیں میں لیے گھومتے تھے، جانے کس آستاں پر جبیں سائی کرنا چاہتے تھے۔ ایسا ہونا بھلا کہاں ممکن تھا۔ جیسے پروانے شمع کو پکڑنا چاہیں اور اس کے شعلے کی اصل کو جاننا چاہیں۔ بھلا جل کر کوئی بتاپایا تھا کہ جلنے میں کیا لذت تھی۔

حسین نے ستورز کے جنوب میں لوہار کی بھٹی دہکاتے ہوئے سنا ایک اندھا فقیر کشکول تھامے گاتا ہوا گلی میں سے گزرتا تھا۔ مگر اس کا آقا سخت گیر تھا اور بھٹی کو دہکانے کے کام میں زیادہ انہماک اور توجہ چاہتا تھا۔ ہتھی کو پھیرتے ہوئے جب چمڑے کی مشک میں ہوا بھرتی اور ہوا کوئلوں کو دہکاتی تو چنگاریاں اڑ کر ادھر ادھر پھیلتیں، بھٹی میں رکھا ہوا لوہا تپ جاتا، سرخ ہو جاتا، اتنا سرخ کہ وہ کوئلوں کا حصہ لگنے لگتا۔ آگ بن جاتا۔ آگ میں اور اس میں فرق کرنا ممکن نہ رہتا۔ یہاں تک کہ حداد کی آواز سنائی دیتی۔

"ابنِ منصور اب اسے باہر نکالو۔"

اور دوسرے ملازم سے کہتا "اس پر تیزی سے ضرب لگاؤ۔ اس انگارے پر ہتھوڑے سے کوٹو تاکہ جس شکل میں ڈھالنا ہو ڈھالا جاسکے۔"

حسین بھٹی کے قریب دھونکنی میں ہوا بھرتا رہتا۔ جب اس کا ہاتھ ذرا ڈھیلا پڑتا تو ابو سلمان کہتا:

"لوہے کی شناخت بدلنے والے سویا نہیں کرتے۔"

یا پھر کبھی زیادہ خفا ہوتا تو کہتا "تم کبھی اچھے استاد نہیں بن سکو گے ابنِ منصور۔ تم کام

کرتے ہوئے خواب دیکھتے ہو۔ یہ رزقِ حلال کھانے والے کی عادت نہیں ہونا چاہیے۔"

کبھی بہت موج میں ہوتا اور حشیش کا دم لگا کر بیٹھا ہوتا تو کہتا:

"حسین! مجھے بتا سکتے ہو تم کیا خواب دیکھتے ہو۔ تمہاری آنکھیں پتہ نہیں چیزوں کے پرے دیکھتی ہوئی لگتی ہیں۔ تمہاری نگاہیں کہیں اور بھٹک رہی ہوتی ہیں۔"

پھر دوسرے آدمی سے کہتا "صدام! لوہے کو تلوار بنانے کے لیے اس کی ضیافت ضروری ہے۔"

پھر حسین کا دھیان باہر کی طرف گیا جہاں پانی کی نالی سے پاؤں باہر نکالتا وہ گا رہا تھا اور ٹھوکر لگنے سے اس کا کشکول الٹ گیا تھا۔

مجھے الزام نہ دو۔ مجھے عاقبت سے نہ ڈراؤ۔

مجھے انعام دو مالک کہ میں اکیلا ہوں۔

مجھے الزام نہ دو۔ مجھے قیامت سے نہ ڈراؤ۔

حزاز حدّاد زور زور سے ہنس رہا تھا "برادر! تم کو الزام کون دیتا ہے۔ مگر تمہارا انعام یہ ہوا کہ تم سے کشکول کی متاع چھن گئی، الٹ گئی، مشیت نے اسے تم سے لے لیا۔ صدام! اگر تم ہتھوڑا رکھ کر بیٹھے ہو تو اس کی مدد کرو۔ اس کا کشکول سیدھا کر دو۔ اسے کھانے کے لیے روٹی لا دو۔"

اس کی بیوی نے جو ڈیوڑھی کے دروازے کے قریب اپنے سُوت کی انٹی سلجھا رہی تھی، بڑی درشتی سے کہا "حدّاد ہو کر تم کو سخاوت زیب نہیں دیتی۔ دکان میں دو دو منہ کھانے والے ہیں اور تمہارا دوزخی پیٹ ہے اور اب تم اس نابینا پر اپنی نیک دلی کا سکّہ بٹھا رہے ہو۔ صدام! کوئی ضرورت نہیں روٹی لانے کے لیے اندر آنے کی۔ سنا تم نے۔ اگر کوئی بھی اندر کی طرف بڑھا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

صدام نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر ڈھک کر کہا "کشکول والے کو کہیں نہ کہیں سے کوئی شے مل ہی جائے گی۔ خدا اس پر مہربان ہے۔" اور اس نے لمبے دست پناہ سے باہر کھینچ کر ہتھوڑے سے لوہے پر ضربیں لگائیں۔

فقیر آگے نکل گیا۔ گلی میں کتے بھونکے۔ بچے چیخے اور پھر خاموشی ہو گی۔

حسین نے جنگل میں اپنی عبادت گاہ کے ایک کونے میں سجدہ ریز ہو کر کہا:
"میرے پروردگار! میں اکیلا ہوں۔ اے میرے مالک میں اکیلا ہوں۔ مجھے وہ عطا ہو جس سے وحشتِ تنہائی دور ہو۔ مجھے اپنی محبت کی آتشِ سوزاں میں پگھلنے کا حوصلہ تو دے۔ ہاں میرے خالق، مجھے انعام دے کہ میں اکیلا ہوں۔"

اور پھر اس خاموشی میں جس میں پتوں کی سرسراہٹ، ہوا کی چلت پھرت اور شاخوں کا ٹوٹنا، چٹخنا، پرندوں کی بولیاں، خوشبو اور سایہ تھا۔ اس نے محسوس کیا اس سے ذرا پرے کوئی جنگلی جانور بولا۔ پھر خشک پتوں پر پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور ایک بھیڑیئے نے زمین پر پھیلی بیلوں اور روئیدگی میں سے اپنی تھوتھنی نکال کر اردگرد سونگھا اور اس کی عبادت گاہ کی طرف آیا۔ باہر کھڑا رہا۔ جیسے منتظر ہو۔ پھر اس کے اکیلے پن کو دور کرنے اور اس کی اس تعلّی کے جواب میں کہ مالک میں اکیلا ہوں، جنگل کے چرند پرند اور زمین کے نہاں خانوں کی مخلوق وہاں جمع ہونا شروع ہو گئی۔

حسین نے سجدے سے سر اٹھایا تو وہ ہنسا۔ اس کی وحشتِ تنہائی کو دور کرنے کے لیے یہ عطا تھی۔ اور وہ اکیلا نہیں تھا۔

اسے مانگنے، سوال کرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا۔

حضرت عمرو بن عثمان مکی کے دروس میں جب وہ شریک ہوتا تھا تو وہ ہدایت کرتے تھے۔

حق تعالیٰ کی طرف کامل توجہ کرو۔

سچ کی طرف رغبت کرو۔ عالم روحانی کی طرف نفس لگاؤ۔

نفس کو بُری صفات سے پاک رکھو۔

اس کو بدنی صفات سے روکو۔

اس کو عمدہ صفات سے متصف کرو کیونکہ یہ سب باتیں اس کو روشن کرتی ہیں۔ نفس جس قدر قوی ہوگا، ظلمت و تاریکی کو دور کرنے پر اسے قدرت حاصل ہو گی۔ نفس پر ان ارواح سے فیضان ہو گا اور مشاہدۂ کامل حاصل ہو گا۔ پھر جب فیض کا حکم اس سے منقطع ہو گا تو نفس عالم شہادت کی طرف اپنے سارے علم کے ساتھ پلٹتا ہے۔

اور پتہ نہیں اس نے خلافِ شرع کیا کام کیے تھے کہ اس کے حجاب بڑھ رہے تھے۔ ظلمت اس کے چاروں طرف تھی اور خواب میں اسے قبیح صورتیں دکھائی دیتی تھیں۔ پریشان خواب جن میں اغول کا سراپا اور روتی ہوئی زینب کی صورتیں دکھائی دیتیں۔ یہ خوفناک امور تھے اور وہ سارے امور اس کے احوالِ ظاہری کا نتیجہ تھے۔ شیطان نے یہ سچی اور جھوٹی باتیں ملا کر اس کے گرد ایک جال پھیلا دیا تھا۔ وہ کس طرف جائے، کیا کرے۔ اس کے فیضان کے راستوں پر یہ سب بیٹھے تھے۔ ان مہلکوں سے بچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

قرآن اور حدیث جو رسولِ خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کشفِ تام کی خبر دیتے تھے۔

کیا اس کے نصیب میں ہر گام پر روزِ اول تھا کہ وہ قرآن و حدیث کی روشنی سے بھی فیضان حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

فہم و ادراک بھی مل کر کبھی اس "اصل تک نہیں پہنچ سکتے۔

اعیان ثابتہ کا ادراک بھی اصل نہیں ہوتا۔ اصل تک پہنچ نہیں پاتا۔

اصل کا ادراک مشکل ہے اس لیے اصل کے اصل تک رسائی کیسے ہو۔

اللہ اصل سے ماوراء ہے اور اس اصل میں خدا شامل نہیں ہے۔

کیونکہ وہ ہر اصل کے اصل سے ماوراء ہے۔

مکہ معظمہ میں وہ ایک کھوئے ہوئے انسان کی طرح گھومتا تھا۔ ابنِ عطا نے اس سے کہا:

"تمہاری جسارت پر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ تم کیوں اتنی شدید طلب کرتے ہو۔ ماوراء کا بھی ماوراء اور اس سے آگے۔ اپنے آپ کو سنبھالو ورنہ کفر کے الزام سے بچ نہ سکو گے۔"

"بچنا کون چاہتا ہے۔ میں تو اس سر کو جو بارِ دوش ہے بے وجہ سنبھالے پھرتا ہوں۔" حسین نے کہا۔

لبریز اور معمور اور مدہوش و خوابناک آواز نے ابنِ عطا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لرز کر انہوں نے کہا تھا:

"اگر تمہیں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے تو سجدۂ شوق میں تمہارا وجود گھُل

جانا چاہیے تھا۔ تم ابھی نامکمل ہو۔ سائل ہو کر بھی جانے کیوں شانِ استغناء سے یوں بات کرتے ہو جیسے احسان کرتے ہو۔ تمہارا سوال کون پورا کرے گا۔"

"اگر اس کون کو پا سکوں تو سوال بھی کہوں۔" حسین نے اپنی گدڑی کو لپیٹتے ہوئے کہا جس میں سے ایک بڑی جوں گری تھی، ہڈیوں پر کسی ہوئی تقریباً بے آب کھال اور بے پناہ تابناک آنکھیں جو ابنِ عطا کے اندر تک دیکھ رہی تھیں۔

"میں حالتِ تنزّل میں ہوں۔ یہ نفس مجھے معصیت کی طرف لے جاتا ہے۔ میں نفس کو مارنے، تفرقہ اور بُعد کو رفع کرنے اور رجوع الی اللہ میں لگنا چاہتا ہوں مگر میرا نفس عود کرتا ہے اور میں ان افعال واخلاق پر تبّرا کرتا ہوں۔ ملامت کرتا ہوں۔"

ابنِ عطا نے ہنس کر حسین کی طرف دیکھا۔

"یہ حالت پہلی حالت سے عمدہ ہے اور فرشتوں کی صفات تم میں پیدا ہو رہی ہیں۔ یہاں تک کہ تم محو در محو ہو جاؤ اور الہامات کا سلسلہ تمہارے نفس کو مطمئن کر دے اور تمہارا قلب، قلبِ سلیم ہو جائے اور پھر قلبِ سلیم نفسِ حق ہو۔" ابنِ عطا نے ہولے ہولے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"ہاں۔ یہ مبادیات مجھے سمجھاؤ کہ میں بار بار اسی مقام پر رہوں جہاں سے چلا تھا۔ قدم قدم نہ تجلّی، نہ اشارہ۔ یہ تو صحرا میں پیدل چلنے، ریت میں دھنسنے، اپنے آپ کو دلدل سے نکالنے اور پھر دب جانے دفن ہو جانے کے برابر ہے۔ کوئی سواری نہیں۔ کوئی ناقۂ تیز گام نہیں کہ کہہ سکوں۔

"اے ساربان آہستہ چل کہ میری پسلیوں میں آگ ہے۔"

اجیالِ اکبر میں یمن کی سراہ قوم کے قافلے اترے تھے۔ اونٹوں پر عماریاں اور قبے، میلی چادریں، لمبی ٹوپیاں پہنے ہوئے اور گھاٹی سے ادھر اور ادھر ساری جگہیں ان سے پُر تھیں۔ اناج اور خرمے، انگور بادام کے لدے ہوئے اونٹ مکہ کے بازاروں میں ان کے آنے سے ہر شے ارزاں ہو گئی تھی اور خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔

جبلِ ابو قبیس سے ملے ہوئے راستے پر بھی ان کے شور و غوغا کی گونج پہنچتی تھی اور حسین کو اپنے مراقبوں میں اکثر ہوا کے ساتھ یہ گونج سنائی دیتی۔ رجب کی یہ حرمت والی راتیں عمرہ کرنے والوں کے جوش و خروش سے یوں لبریز تھیں جیسے شیریں دودھ سے پیالہ، تقدیس و تکریم اور ذکر و سوز سے معمور سننے والوں کے رونگٹے کھڑے کرنے والی آوازیں، یہ لوگ دعا پڑھتے تھے۔ ان کی بے تابی شوق اور بیت المکرّم کے لیے ان کی محبت رنگین داستان کی طرح خواب آگیں اور کھلے زخم کی طرح تڑپا دینے والی تھی۔ عام زندگی میں وہ لوگ نماز پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ سجدہ سے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھ لیتے۔ باتیں کرتے ہوئے نماز پڑھنے لگتے مگر دعا میں ان کی جانیں پگھل کر ان کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگتیں۔ ان کا نیاز، ان کی عاجزی، ان کی خاکساری، وہ الحاح و زاری ہر کسی کو نصیب نہ تھی۔ جب وہ دعا کرتے تو لوگ ہاتھ اٹھا کر ان کے ساتھ آمین کہتے۔ رب کعبہ نے ان کی دعاؤں کو تاثیر بخشی تھی۔ ایک طرف یہ عجمی تھے کہ ہنستے کھیلتے اس وادیٔ شوق میں اترے تھے اور پتھروں کو پگھلانے کی طاقت ان کی زبان میں تھی۔ اور ایک یہ عجمی تھا حسین جو اپنے آپ کو گھلانا چاہتا تھا مگر اس کا وجود سب سے بڑا پتھر تھا۔

"اے پروردگار! ان سب کی جانوں کا سوز مجھے عطا کر۔ اے ربِّ کعبہ! مجھے ان کی زبانوں کی تاثیر عطا کر۔"

اور اس گھاٹی میں چاند کی تیز روشنی میں جو نور بن کر اتر رہی تھی، ان کے اونٹوں کے درمیان چلتے ہوئے حسین نے اپنے سائے کو دیکھا۔

"میں ہی وہ ظلمت ہوں، کثافت، جو کسی پر تو سے روشن نہیں ہو سکتی۔"

وہ زور زور سے ہنسنے لگا جیسے دیوانہ ہو گیا ہو اور اب حضرت جنید بغدادی کی بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ آج تک شعبدوں میں لگا رہا تھا۔ یہ تصرفات جو تھوڑی سی کوشش سے لوگوں کو نصیب ہو جاتے تھے، دیواروں کے پار دیکھ لینا، ہوا میں سے چیزوں کو حاضر کر دینا، دوسروں کے دلوں کی بات بتا دینا، پُر تاثیر دعائیں، بیماریوں سے شفا کے لیے ہاتھ اٹھانا اور بیماری دور کر دینا۔ آدمی کے اندر بے پناہ پوشیدہ طاقتیں تھیں اور تصرفات تو کچھ بھی نہ تھے...... گو رحمتِ خداوندی شاملِ حال تھی مگر وہ ان رحمتوں کی فکر

میں نہ تھا۔ اسے وہ نگاہ چاہیے تھی۔ وہ تو کچھ بھی نہیں چاہتا تھا۔ کسی شے کا بھی طالب نہ تھا، سوائے اس نگاہ کے۔

حسین بھی نگاہ کی تلاش میں تھا۔ اس کے دنوں کی تپش بس اس ایک نگاہ کے لیے تھی مگر خدا کی مرضی کیا تھی، پتہ نہیں وہ اس کی طرف کب دیکھے گا۔ دیکھے گا بھی کہ نہیں۔

باب المعلیٰ سے اتر کر لوگ عمرہ کے لیے جا رہے تھے۔ خوش اور پُر شوق اور دلوں میں دعائیں لیے، لبوں پر دعائیں لیے دست بدعا، امیرِ مکہ اپنی فوج کے ہمراہ ننگی تلواروں کے پہرے میں کرتبوں اور کھیلوں اور نقاروں کے ساتھ۔ آس پاس کے پہاڑ تماشا دیکھنے والوں سے بھرے تھے۔ مسجدِ عائشہؓ تک سروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ لوگ دیوانہ وار طواف کر رہے تھے۔ سرد ہوا میں تیزی تھی اور بادلوں سے بھرے آسمان پر سورج کی روشنی سفیدی بن کر ان پردوں سے منعکس ہو رہی تھی۔

پردوں اور غلافوں سے ڈھکا یہ خانۂ خدا، کیا صرف اینٹوں اور پتھروں کا گھر تھا؟ جس کے گرد لوگ یوں پھرتے تھے جیسے شمع کے گرد پروانے۔ جاں نثار کرنے والے، فدا ہونے والے، اس کی ایک جھلک کے لیے دور دراز سے سفر کر کے آتے تھے۔ راہ کے مصائب اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے تھے۔ اس سرزمین کی مٹی میں بھی شفا تھی۔ بیمار جانیں، گھری ہوئی روحیں صحت و انبساط سے ہم کنار ہوتی تھیں۔ یہ گھر جو حجر اسود کی طرف سے ظاہر ہے۔ یہ پر اسرار ستون قطب ہے اور روح القدس اس مکان کی جان روحِ محمدی اور ساری جانیں جو اس کے گرد چکر کاٹتی ہیں، دراصل والا و شیدا ہیں کہ اس کے سائے تلے اپنے ازلی وجود سے ملاقی ہوں۔ تمام اعیان اور مظاہر خدا کے اس گھر کے سائے تلے آشکار ہوں۔ یہ روحانی تجربہ جس میں آدمی اپنی بے تابیوں کو بھول کر تسکین و قلبِ سلیم کے ساتھ اس بیتِ معمور میں داخل ہوتا ہے۔ سارے علم کے ساتھ جو اوّل و آخر ہے ظاہر و باطن ہے جو خدا ہے۔ کائنات کا دل ہے۔ کعبۂ دل اور کعبہ دل کے گرد طواف ہوتا ہے۔ آدمی تلاش کرتا ہے اور یہ طواف وہ تلاش ہے حرفِ راز کی تلاش مگر تلاش کرنے والا اکیلا! نہیں ہوتا۔

جبلِ ابو قبیس کی اس گھاٹی میں اتر کر جب حسین نے ناقاؤں کی قطاروں کو

دیکھا، خیموں کے سامنے الاؤ جلتے دیکھے، آگ کے شعلے دیکھے، روشنی دیکھی اور اس کا جی چاہا وہ اس آگ کی اصل اپنی اصل اپنے دل میں پوشیدہ آتش سوزاں پر بھی اطلاع پائے۔ زندگی کے دَل میں رہتے بہتے یہ سادہ دل لوگ جو کسی پریشانی میں مبتلا نہ تھے اور آسمان کی کھلی آنکھوں تلے شاید عین مین اپنے خدا کی نظر میں تھے، محبوبِ حقیقی کی نگاہ میں۔

بیتِ کعبہ روشنیوں سے منور تھا۔ لوگ طواف کرتے، حجرِ اسود کو بوسہ دیتے، غلافِ کعبہ کو پکڑ کر آہ وزاری اور دعاؤں میں لگے تھے، حسین قبۂ زمزم کے پاس کھڑا تھا اور منتظر تھا کہ کب اس کی باری آئے اور شعبان کی اس مبارک رات میں جب زمزم کے کنویں کا پانی بڑھ جاتا ہے وہ بھی سیراب ہو کہ کسی نے عقب سے اس کا دامن کھینچا۔

حسین نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ ایک کنیز تھی۔ منہ کو چادر سے چھپائے، خوشبو سے معطر اور اس کے لباس کا جو حصہ ظاہر تھا وہ بہت عمدہ تھا۔ ایسے ریشم سے بنا جو بغداد کے محلّہ عتابیہ میں ہی بنتا تھا۔ اسے اپنا باپ منصور یاد آیا۔ زینب، حسن اور محّمی، پورا ماضی ایک کوندے کی طرح لپکا۔

"ابنِ منصور۔ ایک بیمار کے لیے دعا کی حاجت ہے۔ میں پہر دن رہے سے تمہاری تلاش میں ہوں۔"

حسین نے مڑ کر دیکھا۔ چونکہ صورت ظاہر نہ تھی وہ اسے پہچان نہیں سکا۔ اس نے جواب بھی نہیں دیا۔

کنیز نے پھر کہا "بیمار جاں بلب ہے۔"

"یہ خانہ خدا ہے اسے زمزم پلاؤ۔" حسین نے جواب دیا۔

"وہ کچھ بھی نگل نہیں سکتا، اس کا منہ بند ہے۔ ایک قطرہ پلانا ممکن نہیں۔" کنیز نے کہا۔

لوگوں کے مجمع میں سے جو اس یخ بستہ رات کو قبۂ زمزم کے گرد جمع تھے، وہ دونوں باہر نکلے۔

"میں طبیب نہیں ہوں، خود بیمار ہوں۔ تم کسی اور سے دعا کے لیے کہو۔" حسین نے پھر رک کر کہا۔

"آپ میرے ساتھ چلئے تو سہی۔" کنیز نے اب تیز چلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھا رہی تھی اور معالج سر جھکائے اس کے پیچھے تھا۔ باب السفل کی طرف جو مکہ معظّمہ کا جنوبی دروازہ ہے وہ ایک گلیارے میں داخل ہوئے۔

"چلے آیئے۔" مڑ کر دیکھے بنا کنیز نے کہا اور ایک اونچا دروازہ کھول کر اندھیرے میں داخل ہو گئی۔ حسین تذبذب کی حالت میں باہر کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ خاصی دیر ہو گئی۔ اس نے سوچا یہ کسی گمراہ کن خواب کا ایک حصہ ہے اور وہ حالتِ خواب میں ہے۔ یہاں تک کہ ایک کمزور سی روشنی اور ایک نہایت شیریں آواز نے اس کی راہ نمائی کی۔ اوپر دیکھے بنا وہ اس کرن کے تعاقب میں دروازے کو پار کر گیا۔

"بیٹھ جاؤ حسین۔" شمع کی لو کی طرح آواز کی لپک نے ماضی کی یاد کے کوندے نے اسے اچک لیا۔

مخملیں نشست پر وہ اکڑوں ٹِک گیا۔

"بیمار کہاں ہے۔" حسین نے سوال کیا۔

"میں ہوں۔"

طبیب نے آواز کی سیدھ میں دیکھا۔ سنہری زلفیں کرنوں کی طرح اس چہرے کو ہالہ کیے تھیں۔ صرف گود میں کتا نہیں تھا اور وہ جھکی ہوئی نہیں تھی۔ آنکھیں خشک تھیں۔

حسین تڑپ کر کھڑا ہو گیا اور پھر دروازے کی طرف لپکا۔

"تم ہی دین دار اور نیک نہیں ہو۔ تمہیں اپنی کن قوتوں پر اتنا ناز ہے۔ بیٹھ جاؤ۔"

سحر زدہ سا وہ پھرا اور نشست پر تقریباً ڈھے گیا۔

"کیا میں تمہیں یاد ہوں حسین۔"

سر کے اشارے سے حسین نے جواب دیا۔

"ابنِ منصور! حیرت ہے نا۔ ہم کبھی نہیں ملے۔ تقریباً نہیں۔ اس کے باوجود تمہاری زندگی ایک مسلسل اور بدلتی ہوئی تصویر کی طرح ہر لحظہ ہر گھڑی میری نگاہوں کے سامنے رہی تھی۔ جیسے ہوا پر کوئی مصور رنگوں سے نقوش اجاگر کرتا جائے! ذریعہ

طاقت مجھے تمہارے نام نے دی تھی۔ تمہاری شخصیت نے تمہارے خیالوں نے، یہ جلا تمہارے اس وعدے نے بخشی تھی۔ جب اس حوض کے کنارے رات کے پچھلے پہر چاندنی میں تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ نہیں میں بھول رہی ہوں۔ میں نے تم سے وعدہ لیا تھا التجا کی تھی کہ تم مجھے بھلاؤ گے نہیں۔ میں جو کچھ بھی ہوں تمہاری وجہ سے ہوں۔ تم میرے مسیحا ہو اور تمہارا دم، دمِ عیسیٰ ہے۔"

وہ حیران سا اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ ہنوز خواب میں تھا۔

"کیا تم میری باتیں سن رہے ہو۔ زمانوں سے تم مجھ سے نہیں ملے۔ ہماری ملاقات تقریباً کبھی نہیں ہوئی اور اب کہ میرا وقتِ آخر ہے۔ میں یہ سب تمہیں بتانا چاہتی ہوں تاکہ تم سمجھ سکو کہ جب تک یہ سب مشیت نہ ہو کوئی ریاضت کہیں نہیں لے جاسکتی، مشقتیں کچھ کام نہیں آتیں۔ خدا سے توفیق مانگو حسین اور اس کی نگاہِ کرم۔ جن پردوں کے پار آدمی دیکھنا چاہتا ہے وہ ہٹ بھی جائیں تو بھی نگاہ حجاب بن کر درمیان میں آجاتی ہے۔ میں ایک کمزور عورت ہوں اور تمہارے دین پر بھی نہیں ہوں۔ میری باتیں اہم نہیں ہیں مگر ان میں غور کرنا، زندگی اور موت میں کوئی ایسا فاصلہ نہیں ہوتا۔"

وہ دم لینے کو رُکی تو حسین نے اردگرد دیکھا۔ وہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ باریک ریشمی پردے ساکن تھے، ہوا چپ تھی اور دنیا آوازوں سے خالی تھی جیسے بس وہی دونوں باقی رہے ہوں۔

"حسین! تم اس بات پر بھی گواہ رہنا میں ابنِ مریم کو خدا کا بیٹا نہیں سمجھتی۔ وہ حضرت جبریل کے نفخ سے پیدا ہوئے تھے اور چونکہ وہ حضرت مریم پر بشری صورت میں ظاہر ہوئے تھے اس لیے حضرت عیسیٰ میں زندہ اور اچھا کرنے کی جو قوت تھی وہ حضرت جبریل کی جہت سے تھی۔ ان کا مردوں کو زندہ کرنے کا فعل اللہ کی طرف سے تھا کیونکہ یہ صفت صرف اور محض خدا کی صفت ہے اور جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ خدا ان میں حلول کر گیا تھا، وہ گمراہ ہیں۔"

"اغول۔" حسین نے گھبرا کر کہا اور کھڑا ہو گیا۔

"حسین! یہ میری آخری گھڑیاں ہیں۔ ایمانا میں ایک نسطوری عورت ہوں مگر

میرا عقیدہ سب سے مختلف ہے۔ اب اس گھڑی جب زندگی کی روشنیاں ختم ہو رہی ہیں میں نے ہمیشہ تمہاری قوتوں کو بھی خدا کی دین جانا ہے اور تمہارے نفس کو نفسِ مسیحا، حالانکہ وہ روح اللہ تھے اور یہ بھی یاد رکھو کہ میں نے جس گھڑی سے تمہیں دیکھا تھا تم سے محبت کی ہے۔ اتنی ہی، جتنی مجھے اپنے آپ سے ہے۔ محبت بڑی مہربان ہوتی ہے، نگران فرشتے کی طرح۔ اس نے ہم دونوں کی حفاظت کی ہے۔ ہمیں بھٹکنے سے بچایا ہے۔ محبت کائنات کا دل ہے حسین۔ خدا کی رحمت' اور مَیں آخری گھڑی میں نہایت طمانیت محسوس کر رہی ہوں اور میری آرزو ہے کہ تم خدا کی محبت میں مشقت نہ کرو۔ اس کو مجبور نہ کرو۔ مشیت میں جو ہے وہی ہو گا۔ بس نگاہ کے لیے دل کو پاک رکھو اور امیدوار رہو۔"

پھر وہ لیٹ گئی، جیسے تھک گئی ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کنیز نے اندر جھانکا۔ نہایت سرد ہوا کا جھونکا پردوں میں سے سرسراتا اندر آیا۔

چراغ کی لو کانپی اور پھر بجھ گئی۔

حسین نے اس اندھیرے میں سوچا۔

"اغول کے لیے سب کچھ اتنا آسان کیوں تھا۔ محبت کرنا، دل کی بات کہنا، برداشت کرنا، زندہ رہنا، الجھی ہوئی باتوں کو سمجھنا۔

پتہ نہیں، اس نے یہ طاقت کہاں سے حاصل کر لی تھی کہ اسے اس کی پوری زندگی کی ایک ایک ساعت کا علم تھا۔ یہ علم اس نے کہاں سے سیکھا تھا۔ وہ کیوں ایسی بنائی گئی تھی اور اس کی راہوں سے کیوں گزری تھی۔ انہوں نے دو ذرّوں کی طرح ایک لمحے کے قیام سے کیا پایا تھا۔

اور آخر میں اس نے اسے کیوں بلایا تھا۔ کیوں اس سے ملنے کی متمنی تھی حالانکہ جب وہ بغداد میں تھا تو وہ یقیناً یہ جانتی تھی اس نے اس سے ملنے کی کبھی کوئی کوشش کیوں نہیں کی۔ پھر وہ باب السفل میں اس گلیارے میں اس نہایت خوشنما گھر میں کیوں تھی۔ حسین کو یوں محسوس ہوا جیسے عرش اور فرش اس کے خلاف ہو گئے ہیں۔ کائنات بکھر گئی ہے۔ چند ستارے ٹوٹ گئے ہیں اور اس مردِ واحد کی، اس کی کائنات برباد ہو گئی ہے۔

جبلِ ابوقبیس پر وہ نہایت کھویا ہوا حیران دھوپ اور سائے تمازت وحدّت

سردی اور گرمی سے بے پرواہ رات اور دن کے فرق سے بھی بے نیاز بیٹھا تھا۔ لوگ اسے ایک دیوانہ سمجھتے، جذبِ حال سے مغلوب، جب شام رات میں ڈھلنے لگتی اور نیلی ہوا ان آبریز پہاڑوں سے نیچے وادی میں چراغوں کی لوؤں کو جھلاتی تو اس دیوانے کا سایہ معدوم ہو جاتا۔ شعبان گزر کر رمضان المبارک کی ذکر و فکر سے آباد راتیں گھاٹیوں اور وادیوں، آبادیوں اور ویرانوں پر اتری تھیں اور پیالہ نما نشیب میں ربِ کعبہ کے دیوانے طواف میں پروانوں کی طرح گھومتے تھے۔ حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے اور اسرارِ کعبہ کو جاننے کے لیے سرگرداں ہوتے تھے اور درِ کعبہ ہر روز وا ہوتا تھا۔

سمنون محبّ نے حسین کو پکارا تو اس کو اپنے جسم سے مس کرتی ہوا میں ایک عجیب سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ یہ پکار گویا ایک تازیانہ تھا جو اسے بھگا رہا تھا۔ ایک کوڑا تھا جو ان دیکھی طاقتیں اس کے گرد لہرا رہی تھیں۔

''ابنِ منصور! کیا جبل ابو قبیس کا حصہ بننے کا ارادہ ہے۔'' انہوں نے کہا۔

حسین نے سر کو جھٹکا، آنکھیں ملیں اور حیرت سے ان کو دیکھا۔

''کیا مجھے نہیں پہچانتے ہو ــــ دیکھو۔'' انہوں نے پھر آہستہ سے کہا۔ ''یہ صریحاً گستاخی ہے، بے ادبی کہ تم حرمِ کعبہ کے سامنے محض اس لیے متمکن رہو کہ ایک نسطوری عورت کی محبت تم سے بازی لے گئی۔''

حسین نے سر جھکا لیا۔ کیا وہ رسوا ہو گیا تھا۔

''تم محبت کی طاقت سے واقف نہیں ہو حسین۔ تم ہر جذبے کو صرف اپنا ہی سمجھتے ہو، ہے نا۔'' انہوں نے شفقت سے اسے دیکھا۔

حسین نے ایک آہ کھینچی اور خاموش رہا۔

''یہ سب عطیہ خداوندی ہے اور راہیں کسی پر بند نہیں ہیں۔ تمہارے خیال میں صرف گدڑی پوش ہی خدا سے محبت کر سکتے ہیں۔ صرف اپنے آپ کو رسوا کرنا ہی محبت کرنے کا طریقہ ہے۔ ہاؤ ہو اور سینہ کوبی ہی سے یہ جذبہ تسکین پاتا ہے۔ تم اپنے آپ میں الجھے ہوئے ہو۔ سمجھتے کیوں نہیں ہو۔''

حسین نے محسوس کیا کہ اس درسِ محبت کو اس کے گرد پہاڑ اور ان پر کی روئیدگی اور وادیوں میں سائے اور گھاٹیوں میں گھاس، چھوٹے بڑے درخت، پانی کے چشمے اور

جھکا ہوا پیالے کی طرح سروں پر ڈھکا ہوا عرش سب سن رہے ہیں۔ ہوا وجد کرتی ہوئی جھومتی ہوئی، نیلگوں آسمان بے ستونوں کی دنیا پر سایہ کیے ہوئے دھواں دھواں سا گوش بر آواز ہے۔ فرشتگان اور مقربین بارگاہ الٰہی ہمہ تن گوش ہیں۔ حرمِ کعبہ اور مکہ کی گلیاں، دروازے اور راستے لوگوں کا جمِ غفیر اور سواری کے جانور سب چپ چاپ سامع ہیں۔ سمنون محبّ کے اس درسِ محبت کو جو وہ نہایت شیریں لہجے اور نرم آواز میں صرف حسین کو دے رہے ہیں۔

"حسین یہ رازِ عرشیاں ہے اور رازِ زندگی ہے۔ کیا اس کے بوجھ کو برداشت کر سکتے ہو۔"

جب وہ چپ رہا تو انہوں نے پھر کہا:

"یہ نفسِ حیات ہے جس شے پر بھی پھونکو گے جاگ اٹھے گی۔ یہ نفس جبریل ہے۔ سامری نے ایک مشتِ خاک سے اپنے بچھڑے کو پوجنے کے قابل بنالیا تھا اور تم ابھی تک سرگرداں ہو کہ اس نسطوری عورت نے کیوں اور کیسے اس راز کو پالیا——حسین یہ سعادت صرف خدا کی عطا ہے۔ عطا، اور وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔"

"سب چیزیں فروزاں ہیں صرف میرا دل بجھا ہوا ہے۔" حسین نے کہا۔

"اپنے آپ کو جلاؤ روشن کرو۔" سمنون محبّ نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"آتشِ سوزاں سے بچنے کے لیے میں نے یہ راہیں اختیار کیں۔ مَیں نہیں چاہتا تھا کہ آگ میں ہی رہوں۔ میں مجوسیت سے الگ اور بلند ہوں۔" حسین نے ٹٹول ٹٹول کر لفظ ڈھونڈ کر ایک ایک حرف کر کے اپنا مطلب ادا کیا۔

ایک مقام پر جدائی اور محبت کا مطلب ایک ہو جاتا ہے۔ سوز اور محبت کا مطلب ایک ہوتا ہے۔ فنا اور بقا کا راستہ ایک ہے۔ خود فنا اور بقا ایک ہی ہیں۔"

حسین اور سمنون محبّ طواف کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ حطیم اور ملتزم مقامِ ابراہیم پر روشنیاں ہی روشنیاں تھیں اور خانۂ خدا کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ گریہ و زاری کرتے مغفرت کی دعا کرتے لوگ غلافِ کعبہ کو لپٹتے جیسے ان کو جان اسی گھڑی جانِ آفریں کے حوالہ کرنا ہو۔

حسین کا دل کہتا تھا۔

یہ دروازہ اس مقام کی طرف لے جاتا ہے جہاں سچ ہے۔
مگر تم ایک دم اس سچائی تک نہیں پہنچ پاؤ گے کیونکہ اب تم خود ایک بند در ہو۔
تیسرا بند دروازہ تلاش کرنے والا جو بھٹک گیا ہے، سچائی کے صحرا میں سچ کی
اصل تک اور جو سچائی کے دائرے میں بار پا سکا کہاں جائے گا۔
کیونکہ دائرے سے باہر کون جا سکتا ہے۔
دائرے میں نشانات اس کی تمنائیں ہیں، اس کی تڑپ کے نشان اس سے پرے
دوسرا نشان جو اس کے قدموں میں ہے، نیچے اس کی روانگی کا مقام ہے۔
اور درمیان میں اس کی سراسیمگی اس کی حیرت ہے
دائروں میں گھومتے ہوئے اندرونی دائرے میں داخل ہونے کا کوئی دروازہ
نہیں
اور سچ اس دائرے کا نقطہ ہے
سچ کا مطلب ہے کہ اندرون اور بیرون اس سے باہر نہیں ہے
اور یہاں کوئی صورت گری ممکن نہیں
یہ اس کی غیرت ہے جس نے ہمیں حقیقت تک پہنچنے نہ دیا۔
اور خوف جس نے ہمیں جدا رکھا
اور حیرت
یہ سچ کے مطلب ہیں
یہ پہلے دائرے کا ابتدا کا نشان ہے
اور مدارج کی تدوین
اور عقل کی نارسائیاں
جو فہم و تخیل سے ماوراء ہیں
کیونکہ مشاہدہ کرنے والا صرف دائرے کا نظارہ باہر سے کرتا ہے، اندر سے
نہیں
اور سچ کے علم کے لیے جو علم چاہیے وہ اس سے نابلد ہے
علم مقام کا متلاشی ہے اور دائرے میں کوئی مقام نہیں یہ حرم ہے۔

اور رسولِ خدا کو حرم کہا گیا
کیونکہ صرف وہی اِس دائرہ سے باہر آئے
وہ حیرت اور خوف سے بھرے تھے
سچ کی پوشاک پہن کر وہ دائرے سے باہر آئے اور ساری مخلوق کو آہ کہہ کر مخاطب کیا۔

سمنون محبّ نے کہا ''حسین یہ تمہاری کم فہمی ہے کہ تم سچ کی تلاش میں نکلنا چاہتے ہو۔ کیا حرمِ پاک اور وجودِ حرم تمہارے لیے کافی نہیں ہیں۔ آدمی کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی جہاں تک تمہارا گمان ہے۔''

حسین اور سمنون محبّ طواف کرنے کے بعد دعائیں پڑھتے صفا اور مروہ کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے نہایت حیران ہو کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

سمنون نے پھر کہا ''سچ کا پیراہن زیب تن کر کے صرف وہی باہر آ سکتے تھے بے دروازوں کے اس دائرے سے۔''

''آپ میرے خیالات پڑھ لینے پر قادر ہیں۔'' حسین نے کہا۔

''نہیں۔ صرف اپنی شدید محبت کی وجہ سے تمہاری کیفیت جان پایا تھا اور لفظوں میں پناہ لیتی تمہاری تلاشِ حق اور حیرت اور علم کی تڑپ اور تخیل کی پرواز۔''

حسین چپ چاپ صفا اور مروہ میں دوڑتا رہا۔

''وہ جب پسند کرتا ہے تو بس پسند کر لیتا ہے اور وہ بے نیاز ہے۔ اس وادیٔ غیر ذی زرع میں اس نے ایک عورت اور ایک بچے کو روک لیا تاکہ زندگی کی رونقیں یہاں پر اپنا دامن پھیلائیں اور یہ گھر امن و عافیت کا گھر ہے۔''

سعی کے بعد وہ بال ترشوا رہے تھے جب سمنون محبّ نے حسین کی طرف بہت گہری نظروں سے دیکھا اور حطیم کی طرف چلنے لگا۔

طواف کرنے والوں سے حطیم کیوں خالی تھا۔ اس کی سمجھ حسین کو نہیں آئی۔

باہر لوگوں کا مجمع زور زور سے لبیک کہتا روشنیوں میں دیوانہ وار خانہ خدا کے گرد نثار ہو رہا تھا۔ نہایت مسکرا کر سمنون بہت عاجزی اور سبکساری سے حطیم پر داخل ہوئے اور انہوں نے حسین کو بھی اشارہ کیا کہ پیچھے آئے۔ طواف کرنے والے بہت دور رہ گئے اور حد نظر تک حطیم ہی حطیم تھا اور وہاں کا ہجوم تسبیح کناں سجدہ ریز دعا گو نہایت چمکتے ہوئے آئینہ رو لوگوں کا تھا۔ سمنون نے حسین کا ہاتھ پکڑ لیا اور قطاروں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتے جیسے کسی کی تلاش میں ہوں۔

وہ چلتے رہے یہاں تک کہ حسین تھک گیا۔

"خواجہ حسن بصری سے ملو حسین۔" اس نے سنا۔ وہ بیٹھ گیا اور سمنون بھی بیٹھ گئے اور منتظر رہے یہاں تک کہ دعا کے لیے اٹھے ہوئے خواجہ کے ہاتھ کھلے اور انہوں نے نہایت شفقت سے اس کی طرف دیکھا۔

"حسین ادراک پانے کے لیے عاجزی کرنا ہی ادراک ہے۔" ان کی آواز شیریں نرم اور چاندی کی نہایت سریلی گھنٹیوں کی طرح اس کی طرف آ رہی تھی اور اس کی جاں اس شیرینی کو جذب کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس کی نغمگی کو دیکھ سکتی تھیں۔

محبت کی روشنی سب طرف پھیلی تھی۔

"جب تمہارا سوال تمہارے وقت کے برابر ہو گا تو دعا قبول ہو گی مگر اس میں عجلت ہرگز نہیں ہونی چاہیے حسین۔"

حسین ایک تجلی میں نہا رہا تھا۔ سکون اس کے چاروں طرف بحرِ ذخار کی لہروں کی طرح پھیل رہا تھا۔ ایک کشتی جو تنکے کی طرح موجوں پر بہتی جائے اور وہ بہا جاتا تھا۔ پھر موجیں ایسے آئینے تھیں جن میں حسین ہی حسین تھا۔ اس کوششِ جہت سے جو آئینہ مقابل تھا اس میں بھلا وہ کہاں سے آن ٹپکا تھا؟ ہر آئینے میں وہ آپ نظارہ بھی تھا اور نگارگی بھی وہ پھر حائل تھا اس کا وجود۔

نہایت بے چارگی سے اس نے خواجہ کے پاؤں چھوئے۔

سمنون محبّ نے کہا: "ہاں بس یہی ہے۔ یہی ہے۔ تم جرمِ آئینہ کو دیکھنا چاہو گے مگر کبھی دیکھ نہ سکو گے۔" وہ ہنسے۔

خواجہ نے محبت کرنے والے کی طرح سمنون کی طرف دیکھا۔ حسین نے محسوس

کیا گویا وہ سرزنش کرنا چاہتے ہوں۔

"اپنے نفس کو اس سے اعلیٰ درجے کی ترقی میں حیران و پریشان نہ کرو۔"

حسین کا نفس روشنی کی طرف بڑھا۔ چاند حطیم کے ان چہروں کے سامنے ایک کمزور اور بجھنے والی شمع لگ رہا تھا اور اسے سفید کناروں والے سیاہ بادل گھیرے میں لے رہے تھے۔

اس نے سیاہ زلفیں کھول کر اپنے گرد پھیلا لیں۔
کہ دیکھنے والے ان کو مارِ سیاہ سمجھیں اور قریب نہ آئیں۔
بخدا مجھے ان سیاہ زلفوں کا خوف نہیں۔
مجھے ڈر ہے کہ شاید میں اس چہرے کو دیکھنے کے لیے
کل تک زندہ نہ رہوں۔

حیرت انگیز طور پر اسے بصرہ میں لکھے ہوئے اپنے اشعار یاد آئے تو وہ ماضی اور حال میں یوں چل پھر رہا تھا جیسے ہوا پردوں کو ہلاتی جھلاتی اٹھکیلیاں کرتی چل پھر رہی ہو۔ اغول اور تنہائی اور حدت سے لبریز راتیں اور ہر جہت سے وہ خود جلوہ افروز، وہ خود منعکس۔ آپ ہی آپ۔ محبّ اور محبوب، اور محبت اور سوادِ محبت۔

خواجہ اٹھے تو عبادت گزار ارواح حطیم سے گزر کر طواف میں شریک ہوئیں۔ وہ اور سمنون محبّ بھی باہر آئے اور قطب کعبہ حجر اسود کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے لبیک کہتے ہوئے ان سب کے ساتھ گھومنے لگے۔ ہزاروں لاکھوں، ان گنت فدا ہونے والوں، جاں نثار کرنیوالوں، جل مرنے والوں، حاضر حاضر کہہ کر فدا ہونے والوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ جو فدا ہو چکے تھے، جو نوازے گئے تھے۔ وہ سب جو اول آدم سے اس بھیڑ میں شریک تھے اور جو ان راہوں پر چلائے گئے تھے اور جو خود اس کے مطلوب تھے۔

ترکی کنیزیں اپنے روایتی لباس میں ملبوس تھیں اور کمنجہ کے تاروں کو چھیڑنے والے ہم وطن موسیقار سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں کیونکہ حامد بن عباس

امیر الامراء کا انتظار کیا جارہا تھا۔ عربی دھنوں پر ترکی گیتوں کو گانے کی کوشش ہو رہی تھی۔ رات دور تھی اور خوشگوار دنوں میں ہوا کسی محبوب کے آنچل کی خوشبو سے بھری اور دلنواز تھی۔ جسم سے مس ہوتی تو فرحت بخش نیند لاتی۔ دجلہ میں پانی شفاف تھا اور پہاڑوں پر برف پگھلنے کی وجہ سے نہایت ہی یخ بستہ اور شیریں صحن چمن میں پھل اور درختوں پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں ڈال ڈال شور مچا رہی تھیں اور شاخیں جھکی ہوئی پانی کے آئینے میں اپنا عکس دیکھتی تھیں۔ مغرب کی اذان افق پر بادلوں کی طرح اٹھی اور سفید کناروں والی گھٹا بن کر محلوں اور ایوانوں پر چھا گئی۔ خادم چراغوں کی روشنی کے کم و بیش ہونے کے درجے سے جگہ بہ جگہ رکھنے لگے تھے اور حریری پردوں کی طویل سلوٹوں میں رنگ اور چمک کے تناسب سے تاریکی اور سائے گھل مل رہے تھے۔ فانوس اور قندیلیں صحنوں میں دیواروں اور اشجار کے سایوں کو تصویروں کی سی خوبصورتی عطا کر رہی تھیں۔ صراحیاں اور جام سجائے گئے تھے۔ مسندوں پر بڑے چھوٹے تکیے مرتبے کے لحاظ سے پڑے تھے۔ تازہ نبیذ کی مہک دریا کی طرف کھلنے والے لمبے دریچوں سے باہر کھڑے محافظوں کے لیے لذیذ اور اشتہا انگیز تھی اور وہ ہر وقت بہاؤ کی طرف نظر کیے ہوئے تھے جہاں کشتیوں میں تفریح کرنے والوں کا ہجوم ہوتا اور گانے والے اپنے ساز سنبھالے دھار سے پرنم ہوا میں لمبی تانوں والے غم انگیز اشعار گاتے ہوئے گزر جاتے۔

بہت سے لوگ جن کے دل میرے دل سے ہم آہنگ نہیں ہیں میرے دل سے عبدہٗ کی محبت کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لیکن میں ان سے کہتا ہوں تم میرے دل کو اس کی مرضی اور اختیار میں آزاد چھوڑ دو اور اس لیے کہ عاشق دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، سر کی آنکھوں سے نہیں دیکھتا

یا

کون ہے جو میرے لیے اس دل کو نرم کر دے جو پتھر کی چٹان سے تراش کر بنایا گیا ہے۔

میں نے اپنی نگاہ سے اس کے رخساروں کو زخمی کر دیا تو فوراً ہی اس نے میرے

دل سے اس کا قصاص لے لیا۔

کشتیوں میں جلتے چراغوں کی لوئیں لہروں میں یوں ڈولتیں جیسے کسی سپاہی کی زرہ پر رات کے پچھلے پہر دمِ رخصت اس کی محبوبہ ہاتھ میں روشنی لیے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی اور زرہ کی کڑیاں یہاں وہاں چمک رہی ہوں۔ لگتا تھا اس زمانے کو کبھی نیند نہیں آئے گی اور آسمان اپنے چاند ستاروں سمیت یونہی ان بارگاہوں کے دریچوں کے سامنے منتظر رہے گا۔

نہر الخطیب کی طرف سے ایک تیز رفتار زورق سیڑھیوں کے ساتھ آلگی۔ سوار کود کر اترا اور بھاگتا ہوا بڑے دروازے کی طرف بڑھا۔

"امیر کہاں ہیں۔ میں ایک نہایت ضروری نہایت المناک پیغام لے کر حاضر ہوا ہوں۔"

پہرہ داروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "آقا اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ انتہائی راز کی محفل میں ہیں۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا "مگر تم کہاں سے وارد ہوئے ہو۔"

"ارضِ پاک سے اور یہ ایک موت کی اندوہ ناک خبر ہے۔" اس نے ذرا تفاخر سے کہا۔

حسین لمبی راہداری سے جو دریچے کی طرف سے گزر کر گھومتی ہوئی پھر عقبی حصے سے جا ملتی تھی ادھر آیا۔ وہ نمازِ مغرب کے لیے جا رہا تھا اور جلدی میں تھا۔ موت کا لفظ سن کر ٹھہر گیا مگر اس نے پوچھنے کی ہمت نہ کی۔

وہ رکا رکا سا اکھڑا اکھڑا چپ چاپ لڑکا تھا جس کی شکل پر دلسوزی اور یتیمی تھی حالانکہ حامد اسے بہت چاہتا تھا کیونکہ وہ اس کی اولاد میں سب سے زیادہ ذہین اور نازک تھا۔ مگر حسین نے اس محبت کو قبول نہیں کیا تھا۔ اسے اپنی ماں کی چاہت شدید تھی اور اس کی شکل ہر گھڑی اس کی آنکھوں کے سامنے ٹھہری رہتی۔ دھندلی اور بھولی ہوئی خواب میں دیکھی پرچھائیں جس کے سراپا میں سے ایک عجیب روشنی نکلتی تھی۔ ان آنکھوں کی زخمی نگاہ بے بس اور محبت سے بھیگی ردا کی طرح، اس کے گرد لپٹی ہوئی۔ اس کی ملاقات تقریباً اس سے نہیں ہوتی تھی کیونکہ اتالیق اور تربیت تعلیم اور سپاہیانہ

مشقتیں جوان لڑکوں کو اتنا وقت نہیں دیتی تھیں کہ وہ ماؤں کی دعاؤں کو طلب کرنے محلات میں جائیں۔ درس و تدریس دین و دنیا کے مختلف علوم آدابِ دربار اور سیاست وقت ان کو مصروف رکھتے تھے اور اس کے باوجود اس کی ماں کا سراپا تمکنت و جلال، پُر جمال اور دلنواز مسکراہٹ جس میں زخمی ہونے کا احساس ابھرتا ہوا لگتا اور زردی جو دنیا سے الگ اور زندگی سے بھی علیحدہ کوئی مافوق الفطرت مخلوق بنا دیتی تھی۔ اس کی آواز اتنی دل نشیں تھی کہ جب وہ بات کرتی تو حسین چاہتا کہ وہ سنتا رہے۔ اپنے لمبے گھیر دار لباس پر نیمہ پہنے جو سر پر پہنے لمبے کلاہ کی لمبی موتیوں کی لڑیوں سے مزین لگتا اور سنہری بالوں کی کاکلیں بل کھا کر پھولوں کی طرح کانوں پر سجی ہوتیں اور ہیروں کی دمک سے رخسار صرف چمک پکڑتے رنگ نہیں۔ ہو سکتا ہے اسے رنگوں کی شناخت نہ ہو۔ اس کی طویل بیماریوں نے اسے ملول اور اداس کر دیا تھا جیسے بجلی گھٹا میں شاخ در شاخ تڑپے اور زمین کی ظلمتوں کو روشن کرے۔ حسین کا دل گھبرایا۔

پھر پہرہ داروں نے حسین کو وہاں ٹھہرا ہوا پایا اور وہ اس کی طرف آئے۔

"ارضِ پاک سے کسی کی موت کی خبر آئی ہے۔" انہوں نے سلام کرنے کے بعد کہا "مگر وہ صرف امیر سے ملنے کا متمنی ہے اور امیر اس وقت نہایت خلوت میں ہیں۔ کیا آپ وہ اطلاع وصول کر لیں گے۔"

"یہ اصول کے منافی ہے۔" حسین نے قدم آگے بڑھائے۔ اس کا دل بے چین ہو رہا تھا۔ جانے کیا خبر ہو؟

کشتی پانی پر روشنی اور تاریکی کے دھارے پر بے خبری اور خبر کے درمیان ہچکولے لیتی رہی۔ پھر ملاح نے زور سے کہا:

"مجھے اجازتِ رخصت ہے۔"

آنے والے نے جھک کر نیچے دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔

مسجد میں جماعت کب کی کھڑی ہو چکی تھی۔ حسین تقریباً بھاگتا ہوا راہداری کی طرف سے نکلا۔ پہرہ دار مستعد ٹہلنے لگے۔ دریا پر کی ہوا اونچے میناروں اور خلیفہ مکتفی باللہ کے محل اور باغوں کی سیاہی کی طرف چلنے لگی۔ کوئی پرندہ نہایت غم ناک آواز میں بولنے لگا جیسے سسکیاں لے رہا ہو اور مارِ سیاہ کی سی گھٹائیں پھنکارتی ہوئی

بڑھنے لگیں۔ آندھی دریچوں کو پُرشور پھٹکانے اور توڑنے میں لگی تھی۔ جب تک لوگ سنبھلیں ایک مہیب طوفان ان کے سروں پر وارد ہو گیا تھا جو برفبار تھا اور اونچے ایوانوں اور بارگاہوں، محلوں اور گنبدوں، درختوں اور دریاؤں پر برف ہی برف تھی جو عشا کے وقت تک سارے بغداد کو کفن میں لپیٹ چکی تھی۔ پانی جم رہا تھا اور اصطبلوں میں گھوڑے کانپ رہے تھے۔ کارواں کسی اوٹ کی تلاش میں درختوں کی پناہ ڈھونڈ رہے تھے جو بہت ناکافی تھی۔ آسمان نامہربان کیوں ہو گیا تھا۔ یک بیک!

ارضِ پاک سے نہایت تیزی میں آنے والے سوار پر یک بیک تھکن نے حملہ کر دیا تھا۔ اتنی طویل مسافت کے بعد وہ مزید انتظار کی وجہ سے نہایت مضمحل تھا، گویا کسی نے شعلوں پر برف ڈال دی ہو۔ اس کی ردا میلی اور سربند ڈھیلا تھا۔ گردِ سفر اس کے سر کے بالوں میں تھی مگر اسے کسی سے بات کرنے اور کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی۔

جب وزیر قاسم اس دعوتِ نبیذ سے باہر آیا تو برف باری جاری تھی۔ وہ کانپا، پلٹا اور حامد بن عباس کے ساتھ پھر ایوانوں کی طرف چلا گیا۔ رات بوجھل پروں والے پرندے کی طرح اڑنے کی کوشش کرتی اور گرتی تھی۔ کوئی من چلا نشے میں دھت گاتا ہوا اور اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا گزر رہا تھا۔

اور یہ ایسے گروہ ہیں کہ جب میں ان کے درمیان رہا
تو زمین تنگ ہو کر میرے لیے انگوٹھی کے نگینے کے حلقہ کی مانند ہو گئی۔
ابلیس اس کے وجود پر خندہ زن ہے
اس لیے کہ یہ آدم کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔"
اپنی مصیبت کے باوجود پہرہ دار ہنسے۔
"شاید یہ شراب کی محفل سے دھکیل کر پھینکا گیا ہے۔"
"ہو سکتا ہے یہ کوئی یہودی یا نصرانی جس پر دنیا تنگ ہو گئی ہو۔"
"نہیں یہ کوئی قرمطی ہے جو تائب ہو گیا ہے۔"
اپنی یخ ہوتی ہوئی ٹانگوں کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے اور دریا کی طرف دیکھ کر سپاہی نے کہا:

"اتنے فتنوں کے درمیان تائب ہونے سے بھی کیا ہوتا ہے۔"

"کیوں کیوں۔" باقیوں نے یک زبان اس سے سوال کیا۔

"اس لیے کہ نئی نئی امارتیں قائم ہو رہی ہیں۔ بلادِ مغرب میں فاطمین نے اپنی ریاست بنالی ہے۔ مہدی کا ظہور ہوا ہے۔"

"تم نے کیونکر جانا، کب سنا؟" وہ پوچھنے لگے۔ آباد شہر اذانوں کی آوازوں سے جو ہر گلی اور ہر شاہراہ سے بلند تھیں، بھرا تھا۔

"سارا بغداد جانتا ہے جو ہوا ہے۔ کیا ایسا موسم اس سے پہلے تم نے کبھی ملاحظہ کیا تھا۔"

وہ سب سر ہلانے لگے جیسے اس کی بات کو سمجھ رہے تھے، متفق تھے۔

"مہدی کا ظہور قربِ قیامت کی نشانی تھی اور یہاں وہاں جنگ بھڑکنے کے واقعے بھی تو قربِ قیامت ہی ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

مدینتہ الاسلام سے خلیفہ ان کی بیخ کنی کرنے اور ان کی پیش قدمی روکنے کے لیے باب الشماسیہ سے روانہ ہوا تھا۔ لشکر اور خزانہ اور خیمے اور سراگاہیں اس کے ہمراہ تھیں۔

"کبھی عباسی خلفاء کا نام سن کر مصر تک لوگ کانپ جاتے تھے۔ بلادِ مغرب میں کسی کو سر اٹھانے کی جرأت نہ تھی۔" دوسرے نے نہایت افسوس سے کہا۔

اور اب خلیفہ کی روانگی کی خبر نے بھی کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ قرمطی حسین صاحب الشامہ کے قتل کر دیئے جانے، اذیت میں مارے جانے کے باوجود قرمطی پورے مغرب میں فساد برپا کر رہے تھے۔ وہ تبلیغِ مذہب ہی سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے، جہانبانی اور جہاں رانی ان کا مقصد تھا۔"

"جہاں رانی۔" ان میں سے کسی نے طنزیہ سیٹی بجائی اور ہوا کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔

مگر ہوا دیوانی بنی شائیں شائیں کی مہیب آواز سے لرزہ پیدا کرتی ان عمارتوں پر وارد ہوتی رہی اور مکینوں کو ڈرانے کے لیے اس نے مکانوں کو ہلایا۔

"کسی نہایت عظیم روح کو قبض کرنے کے لیے عزرائیل اپنے سارے لشکر و

جاہ و جلال سمیت زمین پر نازل ہوا تھا۔"

سپاہیوں کی ایک ٹولی پناہ پناہ پکارتی گشت کرتی ہوئی دوسری طرف سے گزری۔ ان کے قدموں کی چاپ سنسان شاہراہوں پر گونجتی رہی اور برف کے بگولے اس گونج کو دور دور لے جاتے رہے۔ دریا پر حرکت میں رہنے والی اور خلیفہ کے محل کی حفاظت کرنے والی کشتیاں تیزی سے گزر رہی تھیں اور ان کی مدھم روشنیاں برف میں دھندلا کر صرف کنارے کے درختوں کی سفیدی کو واضح کر رہی تھیں۔

حامد بن عباس کی بارگاہ سے جب وزیر قاسم بن حسین جبّوں اور رداؤں میں لپٹا اپنے محل کے لیے روانہ ہوا تو اس کا حفاظتی دستہ جو ترکوں پر مشتمل تھا بہت خوش تھا کیونکہ اپنے وطن سے دور ہونے کے باوجود ترکی کے موسموں کو یاد کرتے رہتے تھے اور سارے عیش بھی انہیں اس سرزمین کے خوابوں سے علیحدہ نہ کر سکتے تھے۔ اب زمین کی روئیدگی کا رنگ بدلے گا اور وہ نئے پھولوں سے مزین ہو گی۔ برف نئے نئے نادرِ روزگار گل بوٹے لایا کرتی ہے۔

حامد بن عباس کو وہ دن یاد آتے تھے جب اس نے کنیزوں کے سوداگر سے اسے خریدا تھا۔ یوں اسے کنیزیں خریدنے کی ایسی عادت نہ تھی۔ اس کی تربیت سختی سے کی ئ تھی اور چونکہ اس کی زندگی کی منزل وزارتِ عظمٰی تھی اس لیے دن رات محنت کرنا بڑتی تھی۔ خانقاہ اور مدرسوں سے جب وہ فارغ ہوا تو چونکہ اس کا باپ زیرِ عتاب رہا تھا س لیے ایک معمولی عہدے کے لیے بھی اسے بہت دنوں انتظار کرنا پڑا تھا اور بالآخر وہ مد بن جراح کاتب کے دفتر میں خراج کے حساب کی کتابوں کا متولی بنا دیا گیا تھا جس لرح آگ سے خوفزدہ آدمی مجبوراً اس میں کود جاتا ہے اسی طرح حامد بھی ان معمولی دمیوں میں اٹھنے بیٹھنے اور کام کرنے لگا۔ وہ بہت محتاط کم گو اور ظلم کی حد تک اپنے کام بں منہمک رہتا تھا۔ اس کے دوست بہت کم تھے اور وہ دانت بھینچ کر نہایت سختی اور بر سے آنے والے دنوں کی طرف دیکھتا تھا۔ اپنی ساری ایمانداری کے باوجود اس کے

باپ نے دنیا سے شکست کھائی تھی اس لیے وہ دوسری دفعہ ایک شکست خوردہ ٹوٹا ہوا ہارا ہوا انسان بن کر جینا نہیں چاہتا تھا۔ ہولے ہولے اس نے کاغذوں پر جھکے جھکے اپنے باپ کی ضبط شدہ امارت تک اپنے راستے صاف کر لیے۔ معافی کا طلب گار ہوئے بنا اس نے وہ سب کی سب تو نہیں مگر اس میں سے کچھ چیزیں حاصل کر لیں۔ دجلہ کے مشرقی کنارے جہاں عباس بن حسین کے ذاتی محلات تھے اس کے لیے واگزار کیے گئے اور وہ ایک دیوانے کی طرح اکیلا ہی ان راہداریوں میں گھومتا اور ان بارگاہوں سے، دریچوں سے باغوں کا نظارہ کرتا۔ پھر ہنستا۔ یہاں تک کہ آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہو جاتے۔ اس کے اجداد نے عباسیوں کی خدمت کی تھی اور ذرا سی لغزش سے وہ ساری خدمت خاک میں مل گئی تھی۔ کیا آدمی غلطی نہیں کرتا؟ اور جبکہ زمانہ اتنا ناپائیدار تھا۔ خلافت روٹی کے ٹکڑے کی طرح آج ایک ہاتھ میں تھمائی اور کل دوسرے کے لیے اس سے چھینی جاتی تھی۔

افسوس اور بے بسی نے اسے نہایت منتقم بنا دیا تھا اور وہ باریک بین بال کی کھال اتارنے والا سخت سوال کرنے والا تھا۔ وہ بڑے محل کے ایک کمرے میں اکیلا کتابوں پر جھکا رہتا اور جب فراغت ہوتی تو ٹہلتا اور آنے والے دنوں کی سوچتا۔ جب وہ دولت مند ہوگا، صاحبِ ثروت ہوگا اور ان بڑے بڑے خالی کمروں میں رونقیں ہوں گی جیسی اس نے اپنے بچپن میں دیکھی تھیں۔ اس کا اپنے ساتھ کام کرنے والوں میں سے کسی کے ساتھ بھی کوئی رابطہ نہ تھا جیسے وہ ہوا میں سے اس اطاق میں داخل ہوتا ہو اور پھر تحلیل ہو جاتا ہو۔

خدا کہاں تھا؟ وہ اکثر سوچتا۔

اسے نئی سوچوں، ہنستے چہروں اور خوبصورتی سے سخت نفرت تھی۔ اسے قہقہے، رونقیں اور نبیذ کی محفلیں سخت ناپسند تھیں۔ دجلہ کے کنارے کے یہ پُرشباب قہوہ خانے اور تماشے اس کے خون کو غصے سے کھولا دیتے۔ اسے بولنے والے پُراعتماد لوگوں سے چڑ تھی۔

اور اس لیے جب وہ اپنے محکمے میں ترقی کرتا ہوا بڑھتا گیا تو بھی وہ بخیل ہی رہا۔ ایک ایک دینار درہم کو دانتوں سے پکڑتا ہوا وہ اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔

اس نے جن لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا وہ اس سے ہر لحاظ سے کمتر تھے اور اسے آقا سمجھتے تھے۔ وہ برابر کے ساتھیوں سے خدمت کی حد تک روابط نہ رکھنے کا عادی تھا۔

جب قافلہ ارضِ پاک سے واپس ہوا تو اغول اس میں نہیں تھی۔ وہ اسے بیابانِ سماویہ کے کنارے ایک بستی میں دفن کر آئے تھے کیونکہ اس سے قریب جگہ کہیں نہ تھی۔ اسے اغول کے نہ ہونے کا ملال تھا یا نہیں، اس کی خبر نہ ہو سکی تھی کیونکہ ان دنوں خلیفہ قرامطہ کی دست درازیوں سے سخت پریشان تھا اور چھوٹی دور دراز سرحدوں کی طرف جنگوں کے اخراجات کے حسابات بہت بڑھ گئے تھے جس کے لیے حامد کو تقریباً اپنے محکمے کی درستگی سب سے زیادہ ضروری تھی اور کام بہت بڑھ گیا تھا۔ وصیف بن صوار تکین زکرویہ کے شکار کے لیے نکلا تھا کیونکہ کوفہ بصرہ کا راستہ تقریباً بند ہو گیا تھا اور حجاج کے قافلے لوٹ گئے تھے۔ شورِ قیامت تھا جس نے مکتفی جیسے امن پسند خلیفہ کو بھی بغداد سے نکالا تھا۔ محاصل میں حیرت انگیز طور پر کمی ہو گئی تھی اور حامد کو ایک ایک درہم کا حساب نہایت ہی جانفشانی سے رکھنا پڑتا تھا اور اسے اپنی زندگی میں ایک کنیز کے کم ہونے سے کیا کوئی کمی محسوس ہوئی تھی؟ قاسم بن حسین سے اس کی دوستی نہایت گہری تھی مگر سلطنت میں دوستی کا کیا اعتبار؟

اس کے ہاں نبیذ کی نہایت پر تکلف محفلیں ہوتیں۔ ناچنے والی ترکی کنیزوں کا اس کے ہاں ایک ہجوم تھا اور وہ جب کسی کو بطور خاص مدعو کرتا تو ترکی سازوں پر عربی دھنیں بجائی جاتیں اور عرب شاعروں کا کلام ترکی دھنوں پر ترتیب دیا جاتا۔ وہ سخت گیر آقا تھا اس لیے ناچ میں ذرا ذرا سی جزئیات کا خیال رکھا جاتا اور ترک موسیقار رقص و سرود کی ترتیب میں کئی دن پہلے سے لگ جاتے۔ وہ ہر کام کو انجام تک صحیح دیکھنے کا جنون کی حد تک شائق تھا اور غلطی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دشمنوں کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایسا ہی تھا۔ اس میں معاف کرنے کی صفت نہ تھی۔ اور اس کے باوجود کہ وہ غلاموں کا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا اور انہیں پتھر اور جانور نہیں سمجھتا تھا۔ کوئی بھی اس سے خوش نہیں تھا۔ لوگ ان سہولتوں کے بجائے آزادی اور دوری کے خواہش مند رہتے تھے۔ اغول ہر طرح آزاد تھی۔ ایک نکاحی بیوی کی طرح وہ جو چاہتی کرتی اور جہاں جی چاہے جاتی مگر پھر جب مرنے کی خبر محل میں پہنچی تو لوگوں نے کہا:

"خوش قسمت آزاد ہو گئی۔"

سوداگروں نے نئی کنیزوں کے پرے اس کے سامنے سجا دیئے۔ ان کی نرم خوئی اور حسن کی تعریف میں زبانیں سوکھ سوکھ گئیں مگر حامد نے کہا:

"اب زمانہ بدل گیا ہے اور مجھے کنیزوں کی ضرورت نہیں رہی۔"

"خوشبو اور نماز اور عورت" کسی نے دہرایا۔ "ہمارے کریم النفس رسولِ خدا کو بھی پسند تھیں۔"

اس نے بولنے والے کی طرف نہایت خفگی سے دیکھا۔ "کیا ہم اس زمانے میں ہیں۔ ہم کون ہیں۔ مجھے مذہب کی یہ تاویلات ہرگز پسند نہیں ہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے قربِ قیامت میں کیا ایسی باتوں کی گنجائش ہے۔"

لوگوں نے اس کو بھی اس کی طبیعت کی ایک نئی جہت جانا۔ سوداگر کنیزوں کو واپس لے گئے اور حامد بن عباس اپنے محاصل اور خراج کے کاتب اعلیٰ کی حیثیت میں لگ گیا۔

بڑے بڑے قافلے حجاج کرام کو لے کر ارضِ مقدس کی طرف روانہ ہو رہے تھے اور راتیں روشن تھیں۔ موسم خوشگوار اور سفر کے لیے نہایت موزوں تھا۔ جب حامد بن عباس کی طرف سے اس کنیز کی طلبی ہوئی جو اغول کی منظورِ نظر تھی اور اب حسین کا خیال رکھتی تھی۔ قہرمانہ جو اس کے محلات کے انصرام اور بندوبست پر ملازم تھی موقع بموقع اس سے یہ بات کہتی تھی کہ گل رنگ حسین کا بہت خیال رکھتی ہے جیسے وہ اس کی کنیز اور خدمت گار نہیں۔

حامد اپنی اولاد کی تربیت پر بہت محنت کرتا تھا اور جزئیات پر اس کی نظر رہتی تھی۔ اسی لیے اس کے باوجود کہ وہ وقت کی کمی کا اسیر تھا، وہ حسین کی ہر ہر حرکت پر نگاہ رکھتا تھا۔ علم و ادب کے استادوں سے اکثر خلوت میں ملتا اور اس کی ترقی اور ذہانت پر مطلع ہونا چاہتا۔ اسے حسین پر بجا ناز تھا مگر خود حسین اپنی ماں کے بعد بجھ سا گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ بغداد کی شبانہ زندگی اور محفلوں میں کم ہی کم دکھائی دیتا۔ فن سپہ گری میں

طاق ہوتے ہوئے بھی اس نے کبھی اس پر فخر نہیں کیا تھا۔ حامد اسے مکمل دیکھنا چاہتا تھا۔ ہر لحاظ سے ایک عمدہ دنیادار، ایک منجھا ہوا درباردار، خلیفہ وقت کی ہم نشینی کے قابل ــــ وہ کبھی کبھار اسے نبیذ کی اسی نجی محفلوں میں آنے کی اجازت دیتا جہاں سوائے چند مصاحبین اور رازدار دوستوں کے اور کوئی نہ ہوتا اور حسین دیکھتا کہ کس طرح جھکنا اور خوشامد سے اپنی بات کہنا ایسی جگہوں پر آسان ہو جاتا تھا۔

مگر خود اس کی طبع ان سب باتوں سے مجتنب تھی۔ اسے خانقاہی مزاج جانے کس پشت سے ورثے میں ملا تھا کہ دربار اور ریشہ دوانیوں سے نفرت تھی۔ وہ کسی فقیہ کے دروس میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ وہ نماز اور مسجد کی خدمت میں دل سے یقین رکھتا تھا۔ ایک دفعہ حامد نے ہنستے ہوئے اسے سرزنش کی اور سنجیدگی سے کہا تھا۔

"دنیا اتنی ناکارہ جگہ نہیں ہے کہ تم اس سے احتراز کرو۔"

"میں دنیا میں ہوں اور اس میں دلچسپی لیتا ہوں مگر میری خواہش دوسری اور میری تمنائیں لامتناہی ہیں۔" حسین نے نہایت مضبوطی سے جواب دیا تھا۔

"تمہیں دربار میں میری جگہ لینا ہو گی۔" حامد نے ذرا نرمی سے کہا۔

"اگلے سانس کی خبر تو کسی کو ہوتی نہیں جگہیں تو دور کی بات ہے۔" حسین نے مؤدب جواب دیا تھا۔ "اور پھر مذاہب کے ظاہر و باطن، یہ سارے جھگڑے فلسفہ اور اس کی الجھنیں مجھے گھبرا دیتی ہیں۔"

"تم سے یہ باتیں کون کہتا ہے۔" وہ اب بالکل خفا ہو رہا تھا۔

"کیا آپ نہیں جانتے کہ کتنی دعوات پورے عالمِ اسلام کا احاطہ کیے ہیں۔ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔ کیا سیدھا ہے اور کیا ٹیڑھا۔ کہاں ظلمت ہے اور کہاں روشنی۔ کون یہ سب جان سکتا ہے۔"

حامد خاموشی سے کمرے میں ٹہلتا رہا۔

"فاطمین کا مصر پر قبضہ اور مہدی کا ظہور کیا کوئی پوشیدہ سانحہ ہے۔" اس نے باپ سے پوچھا۔

باپ کے اضطراب کو محسوس کر کے اس نے کہا: "آدمی ایک نظامِ حیات کا حصہ ہے اور اس کی زندگی صرف اور محض اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مفاد کے لیے ہی

کوشاں رہے۔ میں اپنے طور پر ان سب دعوات کا مطالعہ کرنا اور ان لوگوں سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں تا کہ روشنی میں دیکھ سکوں۔"

"خاموش رہو حسین۔" اس کے باپ نے کہا۔ "تم کسی نہایت زہر آلود صحبت میں یہ سیکھ رہے ہو اور میں یہاں ان سب باتوں کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مذہب کی اصل یہی ہے، سیدھی اور سادہ نماز جس میں تم دل لگا سکو۔ خدا اور اس کے رسولؐ پر مکمل اعتماد رکھو اور بس اطاعت کرو۔"

مسکرا کر حسین نے کہا "والدِ محترم! ایک مطلب وہ ہے جو آپ اور میں اس سے سمجھتے ہیں اور دوسرا مطلب لفظوں کے اندر پوشیدہ ہے جو اس کی تاویلات ہیں باطنی معانی۔"

حامد اس کی طرف آیا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے اور دیر تک اس کی صوت دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا اور اسے معلوم ہو گیا کہ یہ باتیں جو حسین کو بے چینی کر رہی ہیں اس کے رگ و ریشے میں پیوست ہیں، وہ محض سوال سمجھ کر انہیں اس کے سامنے نہیں دہرا رہا۔ وہ ان پر اعتقاد رکھتا ہے مکمل اور مکمل تر۔ وہ لمبی رات میں اسے رخصت کرنے کے بعد بھی اپنی خلوت میں بے چین رہا۔ روشنی اس کی آنکھوں میں چبھن بن گئی تھی اور حریری بستر کا ہر تار اسے خار زار لگتا تھا۔ اس نے ایک عمارت تعمیر کرنا چاہی تھی اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اب تک اس نے ریت پر اسے اٹھایا تھا۔ وہ کیا کرے۔

اس کے بیٹے، اس کے حسین کو یہ بے چین کر دینے اور برباد کرنے والی سوچ کہاں سے ملی تھی۔

رات کے پچھلے پہر کی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ دجلہ پر کشتیوں میں نئے پہرہ دار اپنی تان آوازوں کے ساتھ اور مضبوط ہاتھوں سے کشتیاں کھے رہے تھے۔ شاہراہوں پر گھوڑوں کی ٹاپیں تیز ہو گئی تھیں اور دور کسی مینار پر نصب ساعت نما سے گھنٹہ بجا تھا اور یکایک اسے یاد آیا کہ قہرمانہ نے کہا تھا کہ گل رنگ اس پر بہت توجہ دیتی ہے۔

بے چینی میں جیسے قرار آ جائے۔ اس نے گُل رنگ کو بلا کر اس سے بات کرنے

کا ارادہ کیا اور صبح سے پہلے وہ لرزتی کانپتی اس کے حضور حاضر کر دی گئی۔
''بیٹھ جاؤ گل رنگ۔'' اس نے رات کا اضطراب چھپائے ہوئے کہا ''میرے پاس فرصت کا یہی وقت ہے۔ تمہیں واپس آئے تقریباً دس ماہ ہو گئے ہیں۔''
''جی آقا۔'' اس نے اس نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا جس کی طرف حامد نے اشارہ کیا تھا۔
''میں تمہارا نہایت شکر گزار ہوں کہ تم حسین پر خصوصی توجہ دیتی ہو۔''
حیرت کے مارے وہ نشست سے تقریباً گرتے گرتے بچی۔
''تمہیں حسین کی والدہ نے اس کی دلداری کا ذمہ سونپا ہوگا۔'' حامد کی شدید خواہش تھی کہ وہ مطلب کی بات تک جلد از جلد پہنچے۔
''جی آقا۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا ''آخری وقت میں کوئی بات نہیں ہو سکی تھی۔ انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ تو ایسے ختم ہوئیں، اس جہاں سے ایسے گزر گئیں جیسے ہوا کا جھونکا ایوانوں کے پردوں کو ہلائے اور گزر جائے۔''
''تو آخری گھڑی میں تم اس کے پاس نہ تھیں۔ وہ بیمار تھیں؟'' حامد کو اپنی کوتاہی پر غصہ آرہا تھا کیونکہ ان سب باتوں کا علم اسے بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔
''نہیں آقا۔ وہ باتیں کرتے کرتے ایک دم خاموش ہو گئیں جیسے چراغ ایک دم بجھ جائے۔'' گُل رنگ کو اب اپنے دم میں کچھ دم آتا جان پڑا۔ آقا صرف اغول کی موت کی آخری گھڑیاں جاننا چاہتے تھے۔
''تم نے ابھی کہا وہ تم سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ کیا باتیں تھیں۔ کیا تم اس گفتگو کو دہرا سکتی ہو۔ اگر تمہیں یاد ہو تو میرا خیال ہے تمہارا حافظہ کمزور نہیں ہے۔'' اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔
''نہیں۔ وہ مجھ سے محو گفتگو نہ تھیں۔'' گُل رنگ کو لگا وہ گہرے اور نامعلوم پانیوں کی طرف لائی جا رہی ہے۔ وہ کیا کرے۔
''تو پھر کون تھا۔ اسے بلایا جائے۔ اس سے پوچھا جائے۔ میں نہایت ضروری جاننا چاہوں گا۔'' حامد نے ایک دیوار سے دوسری دیوار کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ اس کا سایہ مدھم چراغ کی روشنی میں بہت مہیب لگ رہا تھا جیسے وہ سارے کمرے میں بھرا

ہو۔ گل رنگ کانپنے لگی۔

"ہاں گُل رنگ وہ کون تھا۔" اس نے پھر پوچھا۔

"مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں قبۂ زمزم کی طرف جاؤں اور جو شخص سب سے الگ اور سکون سے کھڑا ہو اور جس کی گدڑی سب سے میلی ہو اسے بلا کر لاؤں۔"

حامد بن عباس نے ہمت پکڑنے کے لیے نبیذ کا ایک جام خود ہی صراحی میں سے بھرا اور پی گیا۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔ مسند پر دونوں ہاتھوں کا سہارا لے کر اس نے کہا۔

"ہاں تو گُل رنگ۔ اس کا نام بھی تم نے پکارا ہو گا۔ اسے کچھ تو کہا ہو گا۔"

آنسو گُل رنگ کی آنکھوں سے رواں تھے اور اس کا سانس رک رہا تھا۔

"ابنِ منصور۔ شاید یہی نام تھا۔" اس نے یاد کرتے ہوئے کہا "میں نے کہا تھا ابنِ منصور آپ ایک جاں بلب مریض کے بسترِ مرگ پر بلائے جا رہے ہیں۔"

"کیا تمہاری آقا بیمار تھی۔"

"نہیں آقا۔ میری نگاہوں میں وہ بہت ٹھیک تھیں۔ اس سے پہلے دن بھی اور سب دنوں میں جب ہم یہاں سے روانہ ہوئے ہیں انہیں ذرا سی شکایت نہیں تھی۔"

"تو پھر تم نے اس گدڑی پوش سے کیوں کہا کہ وہ ایک جاں بلب مریض کو دیکھنے کے لیے طلب کیا جاتا ہے۔" حامد نے نہایت خفگی سے کہا۔

"آقائے مہربان۔ آقا خاتون نے کہا تھا کہ میں ایسا ہی کہوں۔"

"انہیں کیسے معلوم تھا کہ وہ قبۂ زمزم کے پاس کھڑا ہو گا۔"

"میں دلوں کا حال نہیں جانتی جو حکم دیا جاتا تھا بجا لاتی تھی۔" گُل رنگ نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔

"تم نے ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی وہ سنی تھی؟ میری طرف دیکھو اور جواب دو۔" اس نے سختی سے کنیز کا چہرہ اوپر اٹھا دیا۔

سسکیوں کے درمیان اس نے کہا: "میں دوسرے کمرے میں تھی اور مجھے ان کی باتیں سننے کا کوئی حق نہیں تھا۔"

"مگر تم نے ضرور کچھ سنا ہو گا۔" پھر اس نے دانت پیستے ہوئے کہا "گُل رنگ۔ تمہاری زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے۔ تلوار کی اس نوک سے میں تمہاری

آنکھیں نکال سکتا ہوں اور تم سے جواب چاہوں گا۔ تم جو جانتی ہو، سناؤ۔"

"آقا۔" اس نے تقریباً بے ہوش ہوتے ہوئے پکارا۔ "مرنے والوں سے دغا کیسے کروں۔"

"دیکھو لڑکی۔" حامد نے پھر اس کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو اٹھایا۔ "خدا کی نگاہ میں وہ صرف میری زرخرید کنیز ہی نہیں میرے بیٹے حسین کی ماں ہے اور مجھے ہر حق پہنچتا ہے کہ میں اس کے آخری لفظوں کو سنوں جو تم جانتی ہو وہ مجھ سے کہو۔ کہہ دو تاکہ میری روح سکون پکڑے۔"

بہت دیر دونوں کے درمیان خاموشی رہی گویا آوازوں کو نیند آ گئی تھی اور سانس رک گئے تھے۔ پھر گُل رنگ نے جیسے موت اور حیات کی حقیقت کو، اپنے نصیب کو سمجھ لیا ہو، اپنے لیے کوئی راستہ منتخب کر لیا ہو۔ اس نے کہا:

"آقا۔ انہوں نے ابن منصور کے سامنے اپنی لازوال محبت کا اقرار کیا تھا۔ اپنی نگران آنکھوں کا، جو اس محبت کی وجہ سے ہر جگہ اسے دیکھتی تھیں اور جو موت کے بعد بھی اس پر نگراں رہیں گی۔"

حامد بن عباس نے تھوک نگلتے ہوئے گُل رنگ کی طرف دیکھا۔ "کیا تم نے جو سنا تھا وہ کیا ہے۔"

موت کے لیے تیار ہونے والوں کی طرح کنیز نشست سے اٹھ کر زمین پر بیٹھ گئی اور اس نے آقا کے قدموں کو چھو کر کہا:

میں نے غلط نہیں سنا تھا آقائے محترم اور اس آخری گھڑی میں جب زندگی میرے لیے چند سانسوں سے سوا باقی نہیں ہے میں خدا کو گواہ بنا کر صاحب الزماں کی قسم اٹھا کر کہتی ہوں کہ سچ یہی تھا۔ ایک ایک حرف۔"

حامد پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

دور کسی گھر کے کونے میں مرغ نے اذاں دی۔ پھر باغ میں پرندے بولے جیسے سوتے سے جاگ گئے ہوں، جگا دیئے گئے ہوں۔ حامد نے دریچے سے دیکھا۔ اندھیرا ابھی اسی طرح گہرا تھا۔ دریچوں سے ٹکرا کر واپس جاتی آواز ہوا میں ملی نمی کی وجہ سے بوجھل اور ٹھہری ہوئی لگ رہی تھی جیسے موت کی تاریکی میں کودنے سے پہلے پیچھے رہ جانے

والے راہ پر نظریں دوڑا رہی ہو۔ وہ سوچ رہا تھا۔ نہیں وہ محبتوں سے انکار کیا گیا انسان خالی ہاتھ سے پٹ کو کھولے کھڑا تھا۔ اغول نے اس کی زندگی کی عمارت میں ایک دم آگ لگا دی تھی جیسے جمع شدہ گھاس کے محفوظ ڈھیروں میں کوئی چنگاری پھینک دے۔

حسین کی ماں جسے اس نے چاہا تھا۔

اس کی روح ایک ویرانہ تھی۔ شدتِ جذبات سے اس نے چاہا کہ وہ یہاں سے دریا میں کود جائے۔ شاید اس سوزِ نہاں کو کوئی آرام نصیب ہو۔

آخر وہ ابنِ منصور کون تھا۔

وہ پلٹا اور اس نے گُل رنگ کو ایک جھٹکے سے اٹھا کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

''کیا تم جانتی ہو وہ کون تھا۔ وہ ابنِ منصور۔ وہ گدڑی پوش غلیظ آدمی۔ وہ کون تھا آخر۔ تمہاری مالکہ اسے کب سے جانتی تھی۔''

گُل رنگ نے حامد بن عباس کے چہرے کو دیکھا جو دھواں دھواں تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں جیسے اس پر سے قیامت گزر گئی ہو۔ اس کا جلا ہوا وجود سوزِ دروں سے مہکتے شعلے کی سی ہوا دے رہا تھا۔

''آقا۔ مجھے ظہورِ مہدی کی قسم۔ میں اس کے سوا جو آپ کو بتا چکی ہوں کچھ نہیں جانتی۔''

''اگر وہ اب کبھی تمہیں نظر آئے تو تم اسے پہچان سکو گی۔'' حامد کی آواز نہایت مدھم تھی اور شک آلود، بے یقین اور گری ہوئی۔

''مجھے مہدی موعود کی قسم میں اسے پہچان لوں گی۔ ہاں وہ بے پناہ آنکھیں کوئی ہرگز نہیں بھول سکتا۔ ایسی آنکھیں بس اسی کی ہی ہو سکتی ہیں۔ بھید جانتی ہوئی نگاہیں۔''

حامد اپنے پاؤں پر ہولے ہولے گھوما۔ ماتھے پر ہاتھ دھر کر وہ وہیں بیٹھ گیا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ حریری پردوں کو صبح صادق کے جھونکوں نے ہلایا۔ مسجدوں میں اذانیں بلند ہوئیں۔ پھر اونچے میناروں سے اٹھنے والی اس صدا سے خلائیں اور فضائیں بھر گئیں۔ ہواؤں نے رقص ناتمام کے چکروں میں جھومنا شروع کیا اور عرش بھی اسے سن کر سجدہ ریز ہوتے گئے۔

''کیا حسین کو معلوم ہے کہ اس کی ماں ایک گدڑی پوش سے عشق کرتی تھی۔''

گُل رنگ کو لگا وہ قیامت سے گزر کر ایک اور زندگی میں داخل ہو رہی تھی اور کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ صرف اسے حامد کی اذیت کو کم کرنے کے لیے اسے سچ بتا دینا چاہیے۔

"آقائے محترم! یہ عشق نہیں تھا۔ یہ ایک طرح کا معاہدہ تھا۔ ایک مذہبی عقیدہ تھا۔ وہ گلیم پوش "روح اللہ" تھا۔ آقا زادی نے اسے یہی کہا تھا۔ مسیحِ موعود جس کے فس سے مردہ زندگی کی رگوں میں خونِ حیات دوڑنے لگے۔"

حامد ہنسا۔ مذہب کے یہ الجھاوے اسے ہمیشہ سے ناپسند تھے: "کوئی روح اللہ ہے، کوئی روح حیات ہے، مہدیٔ موعود ہے، آخر کیوں؟"

گُل رنگ نے اپنی پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کیے۔ "دنیا فسق و فجور سے بھر گئی تھی۔ اور اسے کسی مسیحا نفس کی ضرورت تھی۔ قائم القیامہ کی، امامِ مستور اب ظاہر ہوئے ہیں۔ ظہورِ مہدی ہو چکا۔"

حامد نے تیزی سے اٹھ کر اس کے کندھے پکڑ لیے۔ "تم قرمطی ہو زندیق ہو یا اہلِ بیت کی داعی ہو۔ کون ہو تم ___ تم کب سے اس دعوت میں شریک ہو اور تمہارے ساتھی کون ہیں۔"

"آلِ فاطمہ کی اذیتوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کے لیے کسی نئی دعوت میں شرکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر دور کا تحفہ ہے جو آلِ رسول کے لیے آلِ حسین کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ آلِ علی آلِ فاطمہ کیا منتظر نہیں ہیں کہ اس سیاہ رات سے دن کی روشنی میں آئیں۔"

"خاموش۔" حامد نے زور سے پاؤں زمین پر مارا۔

پھر اس نے تالی بجائی۔ ایک زرہ پوش حبشی نے اپنی تھوتھنی اندر کی۔ "حکم آقا۔"

"اس کنیز کو لے جاؤ اور اس سے وہ سب راز دریافت کرو جو ظہور مہدی سے متعلق ہیں۔ عمار سے کہو ساری تفصیل مرتب کر کے مجھے بھیجے۔ صبح میں امیر المومنین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

تہ خانے کی طرف اترتی نم سیڑھیوں پر کائی کی وجہ سے ان دونوں کے قدموں کی

چاپ اسے سنائی نہ دی۔ دور نقارے پر چوٹ پڑ رہی تھی۔ فوجیں صبح کی مشقوں کے لیے مستعد تھیں اور سوئے ہوئے بغداد میں حامد کے دل پر قیامت گزر چکی تھی۔

حسین ابنِ منصور نے سوچا

سچ کیا ہے؟

ظاہر اور باطن اور تخلیق

جو ہر لحظہ تغیّر پذیر ہے سرگرداں، حرکت میں، جوشِ نمو میں بیتاب، مربوط اور غیر منقسم، گم کردۂ راہ، ژولیدہ، بکھری ہوئی اور ٹکڑے ٹکڑے۔

اور اپنے اپنے دائروں میں گردش کرتی ہوئی، ضمیرِ انسانی کے جھٹپٹے میں،

حیران و پریشان

تغیر پذیر بدلتی ہوئی اپنے الیے سے آشنا

ایک سے دوسری وادی میں محوِ رقص

یہ تخلیق کا شعور ہے اسے بے قرار رکھے ہوئے

لمحہ بہ لمحہ

حقیقت اس کو احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس سے ماوراء ہے

اور ذہن انسانی کی نارسائی کا ثبوت ہے

سچ کیا ہے؟

اسے ہندی سوداگر یاد آیا جس نے اسے کالی کا اوتار کہا تھا۔ اسے ''روح اللہ'' کہا تھا۔۔۔ مسیحا نفس۔ مگر وہ خود کون ہے؟ اسے خود سے بہت خوف آیا۔ وہ کیا تھا؟ پہلے اسے اس کی تلاش تھی اور اب وہ اپنی ہی تلاش میں تھا۔ اگر میں وہ ہوں۔ کیا۔ کیا؟ سفاک سوالوں سے بچنے کے لیے وہ نوافل میں مشغول ہو گیا تھا۔ اے رازِ کائنات مجھ پر عیاں ہو۔ اے حقیقت مجھ پر آشکار ہو۔ سچ کیا ہے ظاہر اور باطن؟ حسین نے اپنے نفس سے کہا۔ ابھی ٹھہر، عجلت کی اجازت نہیں۔ سوال اور وقت کا انتظار کھینچ۔

وہ منتظر رہا کیونکہ سوال کرتے رہنے اور اسے دہراتے رہنے کی لذت اس سے اٹھالی گئی تھی۔ سرِ عرش منور سے درِ سدرۃ المنتہیٰ تک کتنے ہیں جو منتظر ہیں وہاں سے آگے جانے میں پر جلتے تھے___ لامتناہی حطیم میں جو تھے وہ سب کیا سوالی تھے منتظر تھے۔

نفس نے ہنس کر کہا: "میں بارگاہوں سے باہر ٹھہروں گا مگر میری منزل سدرۃ المنتہیٰ نہیں ہے۔"

حسین نے کانپ کر کہا: "تم کہاں جانا چاہتے ہو۔ اتنے گستاخ کیوں ہو۔ نمازِ عشق کے سجدۂ شوق کی تو تمہیں توفیق نہیں۔"

نفس نے کہا: "میں خود ہی عشق ہوں اور نماز بھی۔"

حسین اس تعلّی کو سن کر خوف زدہ ہوا اور زمین پر ناصیہ فرسائی کر کے توبہ کرنے لگا۔ سمنون محبّ کا کہیں پتہ نہ تھا اور بغداد میں اس کی عبادات کا چرچا تھا۔ اس کی ریاضتوں کے فسانے بننے لگے تھے۔ غلام سمری جو اس کی خدمت میں رہتا تھا ان قصوں کو ہوا دیتا تھا۔ امراء کے گھروں سے کنیزیں دعاؤں کے لیے حاضر ہونے کی اجازت چاہتیں۔ سواریاں اس خانقاہ کے دروازے سے لگی رہتیں جہاں پر وہ مقیم تھا۔ ابو یعقوب اقطع اس سے بیزار تھے اور وہ گویا زیرِ عتاب تھا۔

اس نے سوچا وہ سفر کرے گا اور کوہ وصحرا کی تخصیص کے بنا چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ان ساری بستیوں سے دور ہو جائے۔ خلقت جو اس کے گرد جمع ہوتی تھی اس کی محویت میں مخل ہوتی تھی۔ لوگ اس کی دعاؤں کی اجابت پر یقین بھی رکھتے تھے اور حیران بھی ہوتے تھے۔ اس کی خاموشی سے متاثر بھی سوال کرنے سے پہلے جواب پا لینے کی حیرت کیسے کم ہو سکتی تھی۔ وہ دلوں کے بھید جاننے والا تھا۔ رازوں پر خبر دینے والا تھا۔

اونچے میناروں والے ایوانوں میں دالان در دالان محلوں میں، بغداد کے گلی کوچوں میں اس کا شہرہ پھیل رہا تھا۔ وہ آنکھ اٹھا کر بات نہیں کرتا۔ کثرتِ نوافل سے اسے کوئی وقت نہیں ملتا تھا۔ وہ ہمہ وقت روزے سے ہوتا تھا۔

پھر کچھ ایسی خبریں پھیلنے لگی تھیں۔

اس کے نفس میں شفا ہے۔ وہ اگر سوکھی ہوئی شاخوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ

لے تو وہ ہری ہو جاتی ہیں اور ان پر پھول کھل آتے ہیں۔

وہ جس بیمار کے لیے کہہ دے کہ تندرست ہو جا تو ہو جاتا ہے۔

پھر اور مبالغہ آمیز باتیں کہ وہ پانی پر چلتا ہے۔ دجلہ کو چل کر پار کرتے ہوئے اسے کئی دفعہ دیکھا گیا ہے۔

دیواریں اس کے سامنے سے ہٹ کر خود بخود اسے راستہ دے دیتی ہیں۔

اس کی دعا سے ناممکن باتیں ممکن ہو جاتی ہیں۔ وقت رک جاتا ہے ــــ ہوا میں پرندے ٹھہرے رہتے ہیں۔ اس سے کچھ چھپا ہوا نہیں اور وہ مہدیٔ آخر الزماں ہے۔

حامد کی ایک محبوب جاریہ کسی نامعلوم عارضے میں مبتلا تھی اور طبیبوں کی اَن تھک کوششوں نے بھی اسے تندرستی کی طرف راغب نہیں کیا تھا۔ وہ خاموشی سے لیٹی رہتی۔ نہ کوئی شکایت نہ کوئی آواز، نہ تیمارداروں کی بھیڑ کی طالب۔ بس اپنے سامنے تکتی رہتی، کبھی ہنس دیتی اور پھر وہی المناک خاموشی دیکھنے والے کہتے اسے صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہوا میں آباد مخلوق اس پر سایہ فگن ہے۔ کوئی اس پر قابو پا چکا ہے۔ کوئی کہتا اسے عشق تھا۔ مگر یہ سرگوشیاں سب دبی زبان میں ہوتیں۔ اغول کی موت کے بعد سے حامد بہت زود رنج ہو گیا تھا۔ وہ بات بات پر قہرمانہ سے بھی الجھ پڑتا اور محلات میں کم ہی آتا تھا۔ پھر گل رنگ کے یکایک غائب ہو جانے سے بھی سب طرف ایک ہراس پھیلا ہوا تھا۔ لونڈیوں پر نگرانی سخت کر دی گئی تھی اور انہیں آزادی سے بازاروں میں گھومنے اور سامانِ خانہ لانے کی بھی اجازت نہ تھی۔ مگر اس رومی نژاد لونڈی پر حامد ہزار جان سے عاشق تھا اس لیے جب قہرمانہ نے دبی زبان سے کہا کہ طبیبوں کے ہاتھوں میں اگر شفا نہیں رہی کیوں نہ کسی مردِ خدا سے دعا کا طالب ہوا جائے تو حامد نے سر کے اشارے سے اجازت دی اور نبیذ کا پیالہ ساقی کنیز سے لے کر موسیقی کی ان دلنواز تانوں میں اپنے آپ کو گم کرنے لگا جو پس پردہ سازوں، آوازوں کے تانے بانے سے بُنی جا رہی تھیں۔ رقص کرنے والے نوخیز لڑکے جب گردن کو خم دے کر نیم وا آنکھوں

سے اسے دیکھتے تو نبیذ کا نشہ سہ آتشہ ہو جاتا۔ لمبے سیاہ بالوں والی ساقی کنیز کی موہوم سی کمر پر نظر نثار ہونے لگتی اور ساری عمر اس آغوش میں گزار دینا ہی حاصلِ حیات ہوتا۔ اے کاش!

گانے والے نے طنبور پر اپنی انگلیاں پھیریں اور گایا۔

جب ہمارے دل میں تمہارا خیال آتا ہے
تو غمِ فراق سے دم نکلنے لگتا ہے
اگر ہم ضبط نہ کریں تو واقعی ہم مر جائیں
آہ کیا زمانہ تھا
وصال کا
جب ہم مسرور و شادماں تھے
خدا اس کی یاد دل میں سدا سرسبز رکھے
وہ زمانہ جب تم ہماری روحوں کے لیے مہکتے ہوئے پھول تھے
بخدا ہمارے دل نے تمہارے سوا نہ کسی کو اپنے اندر جگہ دی
اور نہ ہماری آرزوؤں نے تمہارے سوا کسی اور کی خواہش کی

وہ کچھ ہفتے پہلے بلادِ مغرب کی ایک نہایت سخت ترین جنگ سے لوٹا تھا جہاں مکتفی نے اس کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا۔ حالات اتنے لرزہ خیز اور دگرگوں تھے کہ اسے سلطنت کے پائے ثبات میں لغزش ہی نہیں محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا اب کوئی دن میں انہدام شروع ہو جائے گا۔ ظہور مہدی کی اس گھڑی نہایت جانفشانی سے پھیلائی ہوئی دعوات کی وجہ سے سارے علاقے اپنے مال و منال سمیت مہدی کے حلقہ بگوش ہوئے جاتے تھے۔ ابو عبداللہ نہایت نیاز مندی سے مہدی کے گرد دولت کے انبار لگا چکا تھا۔ اور ایک ادنیٰ غلام کی طرح صرف خدمت گزاری میں خوش تھا۔ فوجیں اس جوشِ شہادت سے معمور تھیں جو آغازِ اسلام میں غزوات کے لیے پایا جاتا تھا اور اس لیے بغداد کی فوجوں کا ان پر فتح یاب ہونا تقریباً ناممکن ہوا جاتا تھا۔ خونریز خوفناک جنگ میں خلافت کی فتح ہوئی اور عبداللہ شیعی مغرب کی طرف دھکیل دیا گیا جہاں جاہل بربر عربوں سے بیزار ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت

اوراس کے مذہب کو قبول کر رہے تھے۔
ابو عبداللہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور اس نے جبلِ ایکجان کو مضبوط قلعہ بنالیا تھا۔ زیادۃ اللہ کی غفلت کی وجہ سے اس نے بہت طاقت پکڑ لی تھی اور اپنے بھائی احول کو جو ایک جنگجو اور باتدبیر سپہ سالار تھا، قتل کروایا تھا۔ اس کی عیش کی محفلوں میں جب بڑھتے ہوئے خطرے کا ذکر آتا تو وہ شراب کا جام اٹھا کر دیوار کے ساتھ دے مارتا۔
"جبلِ ایکجان کیا جبل الطارق ہے کہ ہمیں اپنے پیچھے کشتیاں جلانی پڑیں گی۔"
سردارانِ قوم نے اپنی بقا اور عافیت کے لیے ابو عبداللہ کی اطاقت قبول کر لی تھی اور ظہورِ مہدی کی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔ بھلا ہونے والے واقعہ کو کون روک سکتا تھا؟ اور یہ تو قائم القیامتہ کے ظہور کی گھڑی تھی جس کے لیے لوگ جانے کب سے منتظر تھے؟ قرامطہ اور اسماعیلی اور داعی جنہوں نے صرف خوشخبریاں پھیلائی تھیں اور تاجروں کے بھیس میں ملکوں ملکوں گھومے تھے۔ آلِ فاطمہ کے دن پھرے تھے۔
آلِ عباس کی بساط مغرب میں سے سمیٹی جارہی تھی۔
اور کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بھلا کوئی کیا کر سکتا تھا؟ یہ خدا کی مرضی تھی کہ بساطیں لپیٹی اور بچھائی جائیں۔ حامد بن عباس نے اخراجات کی تفصیل پیش کی اور دوسرے وزراء دور کے ملکوں میں لڑی جانے والی جنگوں میں محاصل کو لگانا یوں بھی ضیاع سمجھتے تھے اور مصر تقریباً دوسری دنیا تھا۔ علیحدہ اور دور۔ اوران کا مسئلہ نہ تھا۔
حامد کی رومی نژاد محبوب جاریہ کے لیے جب قہرمانہ ابنِ منصور کے پاس پہنچی تو وہ مراقبے میں تھا۔ اس کے غلام سمری نے کہا: "اگر آپ توقف فرمائیں بھی تو لاحاصل ہے وہ اب اگلی صبح کو ہی مل سکیں گے۔"
"یہ کثرتِ عبادات انہیں تھکا نہیں دیتی۔" قہرمانہ نے پوچھا۔
"تھکا؟ وہ عبادت کے بعد مثل تازہ پھول کے ہوتا ہے۔ نہایت پیچیدہ ریاضتوں میں خدا سے ہم کلام۔" سمری نے فخر سے کہا۔
قہرمانہ نے حیرت سے آنکھیں کھول کر کہا "لوگ کہتے ہیں اس پر فرشتے اترتے ہیں۔"
"فرشتے؟ وہ تو بلا واسطہ خدا سے راز و نیاز میں مشغول ہوتا ہے۔" سمری نے سرگوشی کی۔

قہرمانہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پیغمبر بھی وحیٔ الٰہی کے منتظر رہتے تھے۔"
"جو صورتِ حال ہے میں نے اس کی آپ کو اطلاع دی ہے۔" سمری نے کہا۔
"تم نے کبھی سنا ہے کچھ دیکھا ہے کہ محض فسانہ بنا رہے ہو۔" وہ بہت الجھ گئی تھی۔
"بخدا خاتونِ محترم! میں افسانے بنانے والوں میں سے نہیں ہوں مگر میں نے اسے ہوا سے گفتگو کرتے اور ہاتھ پھیلا کر چیزیں لیتے دیکھا ہے۔ وہ بھوک اور پیاس سے ناآشنا ہے۔ نیند سے اس کی آنکھیں کبھی بند نہیں ہوتیں۔ آرام اور اونگھ اس کے لیے نہیں۔"
"یہ صفات۔" قہرمانہ نے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔ "انسان میں نہیں ہو سکتیں۔ تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔"
"پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ خود دیکھ سکتی ہیں کہ جب وہ مراقبے میں ہو تو اسے کوئی خبر نہیں رہتی۔ وہ مافوق الفطرت ہے۔" سمری نے جواب دیا۔
"عام آدمیوں سے بڑھ کر، پیغمبروں سے بڑھ کر، یہ خدائی صفات ہیں ——"
قہرمانہ کھڑے سے بیٹھ گئی۔
"میں کیا عرض کروں۔ اس دورِ غلامی میں اتنی عجیب باتیں دیکھی ہیں میں نے کہ ان کے بوجھ سے میرا دل پھٹنے لگتا ہے۔ ذہن کام نہیں کرتا۔ میں دروازے پر حاضر ضرور رہتا ہوں مگر میری ضروریات بھی دستِ غیب سے خود بخود پوری ہو جاتی ہیں۔ حاجت مند یہاں آتے ہیں اور ان کی حاجتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔"
قہرمانہ نے ہولے سے کہا "ارے غلام دروغ گو۔ اگر یہ سب باتیں نہ ہوئیں تو یاد رکھ تاریک ترین تہ خانہ تیرا منتظر ہو گا —— میں اب چلوں گی۔"
سمری اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ خچر نہایت عمدہ اور زرد رنگ کا تھا اور آگے پیچھے راستہ صاف کرنے والے اچھی وردیوں میں ملبوس غلام تھے۔ وہ ہاتھ ملنے لگا۔ اس نے اپنے کلّوں پر زور زور سے طمانچے مارے۔ وہ تو اس خاتون کو مرعوب کرنا چاہتا تھا، صرف مرعوب۔ پتہ نہیں اب کونسا تاریک تہ خانہ اس کا مستقر ہو؟ کیا ہو؟

مگر ابنِ منصور کے کثرتِ نوافل اور طویل مراقبوں کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے۔ سمری نے سوچا۔ وہ اور لوگوں کی طرح کیوں نہیں؟ شب و روز کا شمار اس کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ بھوک پیاس، کسی شے سے اسے تکلیف نہیں ہوتی اور پھر بھی کثرتِ گریہ سے اس کی جان اتنی بے تاب کیوں رہتی ہے؟ اس کی آنکھیں مشعلوں کی طرح کیوں ہیں؟

جب قہرمانہ واپس پہنچی تو بیمار کنیز دریچے سے باہر دیکھ رہی تھی اور نشست پر نیم دراز تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے سوچا یک بیک اس پر خواب کی کیفیت چھا گئی تھی اور نیند، تھکن اور گرمی نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔

"ناممکن۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ابھی صبح کے پہلے پہر میں اس مردِ خدا سے ملنے گئی تو یہ اپنا ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔ آنکھیں کھولنا اس کے لیے مشکل تھا۔ مجھے اس کی حیات سے مایوسی تھی اور اب ــــــ؟

اس نے پلٹ کر دیکھا اور اٹھ کر اس سے لپٹ گئی۔

"دیکھا آپ نے۔ مجھے ایک دم شفا بخش دی گئی ہے۔ میں چل سکتی ہوں۔ مجھے سخت بھوک محسوس ہو رہی ہے۔"

"قہرمانہ اسی جگہ بیٹھ گئی۔ "بخدا یہ ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔"

"ایک آواز میرے کان میں کہہ رہی تھی "بیدار ہو جاؤ۔ تم بالکل تندرست ہو۔" اور پھر میں نے اپنے آپ کو ایسا پایا جیسا آپ مجھے دیکھ رہی ہیں۔"

"وہ روح اللہ ہے، مسیحا نفس ہے یا ان سے بھی عظیم۔ غائب دان اور خدا کی طرح شفا بخشنے والا۔"

قہرمانہ بالکل حیران ہو رہی تھی۔ "مگر لوگ اس کے درپے ہو جائیں گے۔ خلقت اس کے لیے ہلاکت بن جائے گی۔ میری نگاہوں نے بڑے پُرغرور سروں کو خاک میں ملتے اور خیالوں سے بھرے ہوئے ذہنوں کو قطع ہوتے دیکھا تھا۔" وہ سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے اٹھتے ہوئے کہا "میں آقا کو اطلاع دوں کہ تم بخیریت ہو۔"

رومی نژاد لونڈی نے اپنے لمبے سنہری بالوں پر ہاتھ پھیرا اور شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔

وہ آخر اتنی طاقتوں کا مالک کیسے ہو گیا تھا۔

اس پر فرشتے اترتے تھے۔

قہرمانہ نے اگلے دن غلاموں سے آنکھیں بچا کر پیدل اس خانقاہ تک راستہ طے کیا جہاں وہ مقیم تھا۔ وہ سراپا نیاز تھی اور منتظر مگر اسے باریابی کی اجازت نہیں ملی اس لیے کہ ابنِ منصور نے غلام سمری سے کہا تھا کہ وہ کسی خاتون سے ملنا نہیں چاہتا۔

"کیا تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ میں صرف ایک نظر انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"میں دروغ گو غلام نہیں ہوں اس لیے جھوٹے وعدے کیسے کر لوں۔" سمری نے جواب دیا۔

قہرمانہ خاموشی اور نیاز مندی سے سر جھکائے اس کی باتیں سنتی رہی۔

"مجھے ایک بار، صرف ایک بار شرفِ ملاقات بخشو۔" قہرمانہ نے کہا۔

"نہیں۔ جب تک مجھے اذنِ ملاقات نہ ہو میں ایسا نہیں کر سکتا۔" سمری نے نہایت رعونت سے کہا۔

"شاہی دربار میں بھی بار مل جایا کرتا ہے۔ بڑے بڑے شہنشاہ بھی خلقت کے محتاج ہوتے ہیں۔"

"صرف سائل کو اجازت ہوتی ہے، محض ملاقات کرنے والوں کو نہیں۔" سمری اندر چلا گیا۔

وہ بھیڑ میں جو باہر جمع تھی مل کر بیٹھ گئی۔ جہاں چہرہ چھپائے ہوئے اپنے آپ لو رداؤں میں لپیٹے بیمار اور تندرست سب طرح کی عورتیں جمع تھیں۔ مرد اور جوان، بچے اور بوڑھے سب تھے مگر کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ کوئی عجلت میں نہیں تھا۔ کوئی ذنِ باریابی نہیں چاہ رہا تھا۔ یہ عجیب بھیڑ تھی۔ قہرمانہ نے ہمیشہ خلافت کے ایوانوں بس لوگوں کو جمع دیکھا تھا۔ سرگوشیاں کرتے، بے تاب، پریشان، منتظر، تیزی میں الجھے وئے، پیشانیوں پر لکیریں، گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے، پسینے میں شرابور، بزار، کنپٹیوں کی رگیں پھڑکتی ہوئی، آنکھوں میں سوال لیے دیوانوں کی طرح ان کے ہرے سوال ہی سوال ہوتے تھے۔ مگر یہاں جو لوگ تھے وہ کہاں سے آئے تھے۔

کیوں ایسے تھے؟ نرم گفتار، خاموش، کسی اور دنیا کی مخلوق اور یہ بادشاہت کوئی اور بادشاہت۔

میں اب تک کیوں بھٹکتی رہی ہوں۔ کہاں بھٹکتی رہی ہوں؟

جب دن ڈھل گیا تو لوگوں کی واپسی شروع ہوئی۔ کسی کو اندر نہیں بلایا گیا۔ کسی کو اذنِ باریابی نہ دیا گیا۔ کسی کو کچھ نہیں کہا گیا۔ سمری لوگوں کو پانی پلا رہا تھا اور ان سے کبھی ویسی ہی باتیں کرتا تھا جیسی اس نے اس سے کی تھیں۔ سب سے آخر میں اس کی باری آئی۔

"تم واپس جاؤ اور منتظر رہو۔" سمری نے نقاب کی طرف اچٹتی ہوئی نگاہ بھی نہیں ڈالی۔

جب قہرمانہ قصر میں واپس آئی تو اس نے ایک غلام کو اپنا منتظر پایا۔ پھر اس نے اپنی چادر اتاری اور وہ حامد بن عباس کے اس کمرے کی طرف چلی گئی جہاں باریابی کے لیے بلائے جانے والے کو اجازت تھی۔ وہ داخل ہوئی تو حامد کھڑا تھا۔ بغیر پلٹے اس نے کہا:

"قہرمانہ! میں قبیحہ کو دیکھ کر حیران ہوں۔ یہ تو ایک معجزے سے کم نہیں۔"

"جی آقا۔ یہ معجزہ ہی ہے کیونکہ میں ابنِ منصور کو دیکھ نہیں سکی۔"

"کیا مطلب۔" اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کہ وہاں کسی کو باریابی کی اجازت نہیں۔ سب لوگ باہر منتظر رہتے ہیں اور پھر گھروں کو چل دیتے ہیں اور ان کے دکھ درد خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔"

"دلچسپ۔" حامد نے کہا "تم نے اسے دیکھا ہے جس کے در پر سوالی بیٹھے رہتے ہیں۔"

"جی نہیں آقا۔"

"تو اسے دیکھو اور پھر مجھے اطلاع دو۔" وہ نہایت تلخی سے مڑا۔ اس نے تالی بجا کر حبشی غلام کو بلایا اور اسے نیند کے وقت سے بہت پہلے صراحی لانے کو کہا کیونکہ اس کی طبیعت اتنی بڑی خوشی کے باوجود اندر سے بہت مکدر تھی جیسے قہرمانہ نے ابنِ منصور سے نہ مل کر کوئی بہت ہی بڑی کوتاہی کی ہو۔۔۔ پتہ نہیں یہ کونسا ابنِ منصور تھا

اور اس کے ذہن پر گزرے واقعات جیسے پردے کے سامنے سے تصویریں گزریں، گزرنے لگے——

نبیذ زہر کا پیالہ تھی——

ساقی کی صورت میلی میلی اور صراحی پکڑنے کا انداز نہایت کریہہ تھا۔

رقص بیکار اُچھل کود تھی

موسیقی نوحہ تھی

سازوں میں آہنگ نہیں تھا

اس نے نبیذ کا پیالہ وہیں الٹ دیا۔ سازندوں کو خاموش کر دیا گیا۔ رقص کرنے والی کنیزیں واپس لوٹا دی گئی تھیں۔ پردے برابر کر دیئے گئے تھے۔ رومی نژاد جاریہ کہیں اندر کے ایوانوں میں ٹھہری رہی اور حامد بن عباس کے منہ میں ریت کا مزہ تھا۔ اس کے دانتوں تلے کچکچاہٹ تھی۔ بغداد اسے اتنا ویران کبھی نہیں لگا تھا۔ زندگی نہایت بے کیف تھی۔ پھر یکایک اسے کچھ یاد آیا، اس نے تالی بجائی تو زرہ پوش حبشی نے اپنی تھوتھنی اندر کی۔

"آقا۔"

"اس کنیز کو لاؤ، گُل رنگ کو۔" اس نے کہا۔

وہ تھوتھنی پردوں کے عقب میں غائب ہو گئی تھی مگر وہ منتظر اور بے تاب رہا۔ ایک ایک لمحہ اس پر ہزاروں سال کا ہو کر گزر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ کائنات کا آخری فرد ہے اور سب کچھ تباہ ہو گیا ہے۔ اس کے گرد سوائے راکھ کے اور کچھ نہیں۔ وہ ایک ویرانے میں ہے اور مر نہیں سکتا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ تنہا تھا اور عذابِ جہنم سے گزر رہا تھا۔ چاروں طرف ایک عجیب تپش تھی۔ اس نے کتنے نامعلوم پُرخطر راستوں سے اس طاقت تک سفر کیا تھا۔ اپنے ماضی کو جو ایک بار اجڑ چکا تھا پھر سے سرسبز کیا تھا۔ اس نے ان خیابانوں کو پھر آباد کیا تھا۔ ایک بے نام طالب علم سے اس نے ایک وزیر کے عہدے تک اپنی محنت و ریاضت سے رسائی حاصل کی تھی اور اب جب وہ اپنے حرم میں اقصائے عالم سے لائی ہوئی طرحدار کنیزوں اور بے پناہ حاجت مندوں کے ہجوم میں غلطاں تھا۔ یکایک اسے معلوم ہوا کہ کسی شے کی بھی کوئی اہمیت

نہیں۔ ایک گدڑی پوش نے اس کی زندگی کے چمن کو پھر سے ویران کر دیا تھا اور وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جو خلیفہ کے مزاج میں دخیل اور وزیر با تدبیر تھا۔ کیا تھا؟

گُل رنگ کو لے کر ان ہزار سیڑھیوں کی پھسلن کو پار کر کے جب حبشی غلام نے جھک کر حاضر ہونے کی اجازت چاہی تو اس کی تلوار نے زرہ کو چھو کر ایک خفیف سا شور کیا۔ حامد مڑا اور اس نے گُل رنگ کو دیکھا جو اسی طرح تازہ دم نو بہار تھی اور جس کے چہرے پر چمک تھی اور آنکھوں میں ایک سکون تھا۔ سردی جس کے جھونکے نے اس پر کپکپی طاری کر دی۔ پتہ نہیں یہ یخ جھونکا کہاں سے آیا تھا کون اسے ساتھ لایا تھا۔ اس نے کیونکر ایسا محسوس کیا تھا حالانکہ پردے گرے ہوئے تھے۔ دریچے بند تھے اور دریا کی طرف کھلنے والے دروازوں پر بھی خاموشی تھی۔

''ادھر آؤ۔ قریب آؤ۔'' اس نے کنیز کو حکم دیا۔

گُل رنگ کے چہرے پر تحیّر اور تمسخر دیدنی تھا۔ اس کے گرد کوئی خوف و ہراس نہ تھا مگر وہ ایک ایک قدم یوں اٹھا رہی تھی جیسے موت کی طرف مراجعت کر رہی ہو۔

حامد نے کہا:

''گُل رنگ تم ابنِ منصور کے پاس جاؤ اور دیکھو کہ شہر میں وارد وہی ہے جسے تمہاری آقا خاتون نے روح اللہ کہا تھا جو اس کو زندہ دیکھنے والا آخری انسان تھا۔''

گُل رنگ نے سر جھکا لیا۔ حامد کے منہ سے لفظ کنکریاں بن کر چُبھے۔ اس کے دل میں بحرِ سیاہ کی سی موجیں اٹھ رہی تھیں۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو آزاد کر دیا جائے گا مگر مجھے ابنِ منصور پر اچھی طرح سب معلومات چاہئیں۔ وقت اور ذرائع تمہارے لیے لامتناہی ہوں گے مگر مجھے اصل خبر چاہیے۔''

گُل رنگ نے آداب کر کے کہا: آقائے محترم! اگر ابنِ منصور وہی شخص نہ ہوا تو پھر۔''

''پھر بھی تم آزاد کر دی جاؤ گی۔ تمہیں حدودِ مصر کی طرف جانے کی اجازت ہو گی۔'' حامد نے خوشدلی سے کہا۔

حبشی غلام واپس جا چکا تھا اور گُل رنگ ابھی تک وہاں تھی۔

"اپنے قید و بند سے متعلق ایک لفظ نہیں۔" حامد نے یوں کہا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔

"بہتر آقا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"قہرمانہ کو کیا جواب دیا جائے گا آقا۔" گُل رنگ نے پوچھا۔

"تم اسے میرے پاس بھیج دو۔ تم حرم میں جا سکتی ہو۔" حامد نے کہا۔

پھر اس نے اسے بڑے دروازے میں سے اندر کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اس نے ان دنوں کو یاد کیا جب اغول تھی اور پھر حسین کی ولادت اور چھوٹے چھوٹے واقعات بارش کے قطروں کی طرح ٹپ ٹپ اس کے گرد برسنے لگے۔ یادیں اور مسرتیں اور اس کی مسکراہٹ اور خاموشی اور سنہری بالوں کا خیال اور اس کا استغناء، کم آمیزی جو بے رخی ہرگز نہ تھی۔ اس کی عبادات اور سنجیدگی، دوسری کنیزوں سے اس کا ایک دم الگ تھلگ ہونا، وہ اس کی زندگی میں رس بس ضرور گئی تھی مگر پتہ نہیں کیوں وہ ہرگز خوش نہ تھی۔ اسے وہ زمانہ یاد آتا تھا جب حسین پیدا ہوا تھا۔ پھر تربیت کے لیے اس کا حرم سے باہر رکھا جانا اور اغول کا تنہائی کی طرف لوٹ جانا۔ اپنے خدا کی عبادت میں منہمک ہو کر خدم و حشم کے ساتھ طویل سفر کرتے رہنا۔

حامد کو دربار کی مصروفیات اور ذمہ داریوں نے لپیٹ لیا تھا۔ آخری بار جب وہ اس سے رخصت ہو رہی تھی تو طمانیت کا نور سا اس کے چہرے پر تھا۔ اس کی طویل غیر حاضری میں حامد کو یاد آتا تھا کہ اس نے کہا تھا:

"آقا! اب ہو سکتا ہے ملاقات میں کچھ زمانہ لگے۔"

وہ اس کے لیے اپنے جی میں عجیب سی بے چینی پاتا تھا۔ اس جملے کی توجیہات اس نے اپنے طور پر کی تھیں اور پھر اس کی موت کی خبر اور ملاقات کے لیے زمانوں کی دوری۔ پتہ نہیں حشر کے میدان میں، روزِ حساب ان کی ملاقات ہو کہ نہ ہو۔ بہر حال سینے میں دل کی جگہ ایک خلا تھا جو بعد کی مصروفیتوں نے کبھی پُر نہیں کیا تھا۔

وہ یقیناً اسے نہیں مل سکے گی اس لیے کہ وہ ابن منصور کی محبت میں گرفتار تھی۔ اس کے آگے اور پیچھے اندھیرا تھا۔ یہ سب کنیزیں جن سے اس کا حرم رشکِ جنان تھا اس سے محبت کرتی تھیں۔ ان کی ادائیں، ان کی محبت، ان کا بانکپن، کیا مجبوری نہ تھی؟ اور

وہ رومی نژاد لونڈی جس کے سنہرے بالوں کے جال میں وہ گرفتار تھا کیا وہ اس کو چاہتی تھی، چاہ سکتی تھی۔ محبت اس کے لیے کہاں تھی۔ صرف زندگی کا بے سایہ ویرانہ تھا جس میں اسے اکیلے ہی بھاگتے رہنا تھا اور جس کی منزل ناپید تھی۔ طلسم حیات کے بند دروازے اس کے لیے بند ہی رہیں گے۔ وہ کبھی اس شہزادی تک نہ پہنچ سکے گا جس کو ہزار دقتوں اور جان جوکھوں سے حاصل کیا جاتا تھا اور جو پھر حاصلِ حیات بن جایا کرتی تھی۔

لوگ کن لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔

محبت کیا شے ہے۔

وہ تگ و تازِ حیات میں کبھی سمجھ ہی نہیں پایا تھا کہ محبت کیا شے ہے۔ اس نے آج تک کسی کو کچھ دیا نہیں تھا ان سے لیا تھا۔ ان کی وفا کا طالب رہا تھا۔ ان کی نگاہ کا طالب رہا تھا۔ اپنے آپ کو نقطۂ پرکارِ محبت سمجھتا رہا تھا۔ اس نے کیا سمجھا تھا۔

رازِ حیات کیا ہے۔

اگر محبت ہے تو پھر خدا کی محبت کرنا بھی ممکن ہی ہو گا۔ کیا وہ مقصودِ حیات تھا۔ بکنے والے غلاموں کی طرح جو بازار میں خریدے جانے کے منتظر ہوتے ہیں۔ اس کے سوال بھی جوابوں کے انتظار میں تھے۔

دل ہی دل میں وہ یہ دعا بھی کر رہا تھا کہ ابنِ منصور وہی نہ ہو مگر اس میں ابنِ منصور کا کیا قصور تھا۔ وہ طلب کیے جانے پر غلط اطلاع پر گیا تھا۔ وہ اغول سے کب ملا تھا۔ کیونکر ملا تھا۔ کبھی نہ حل ہونے والے معموں کی طرح گدڑی پوش مردِ حق اور اغول کی تصویر اس کی نگاہوں میں گھوم گئی۔ اغول نہیں تھی اور کوئی بتا نہ سکتا تھا کہ وہ ابنِ منصور کو چاہتی رہی تھی۔ کیوں؟

بظاہر دنیا کی سب نعمتیں اسے میسر تھیں۔ اس نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اسے زرخرید لونڈی نہ سمجھا تھا۔ اس نے شادی کی تھی تاکہ صالح اولاد کا باپ کہلا سکے۔ اسے حسین سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ اس کا کھویا کھویا سا سہما ہوا انداز، کونوں میں چھپ چھپ کر رونے کا طریقہ ہمیشہ اس کے دل کو دہلا دیتا تھا۔ آزاد فضا میں تربیت دیا گیا یہ بچہ ایسا کیوں تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

حسین کہاں تھا؟ گُل رنگ سے اس تفصیل کے معلوم ہونے کے بعد اس کی زندگی ایک بُھس بھرے کھلونے کی سی ہو گئی تھی، جو حرکت کرتا ہے کہ اس کی ڈوری کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ تماشا دکھانے والے کی صوابدید پر اس کا انحصار ہوتا ہے۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ کیا تھا۔ کنیزیں اور شبانہ زندگی دربار کی مصروفیات، سفر، سب سائے میں دیکھی صورتوں کی طرح اس کے گرد اس تماشے میں شامل ضرور تھے مگر اس کے احساسِ شکست میں شریک نہ تھے۔ وہ بکھرا ہوا انسان تھا جو نا معلوم سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تھا اور خون آلود وجود کو یونہی گھسیٹے پھرتا تھا۔ ابن منصور ایک سائے کی طرح اس کے تعاقب میں تھا۔ ہر موڑ پر حملہ آور ہونے کو تیار تھا اور حیرت تو یہ تھی کہ اسے پتہ نہیں تھا کہ اس کا دشمن کون ہے۔

ابنِ منصور ایک عام آدمی تھا اور اس کے نزدیک کسی عہدے پر فائز نہ ہونے کی وجہ قابلِ اعتنا نہیں تھا۔ وہ شاعر نہیں تھا، موسیقار نہیں تھا اور حامد بن عباس اس سے آگے کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آدمی عظیم ہوتا تھا تو دربار میں اس کی کرسی ناقابلِ حصول ہوتی تھی جس کو حاصل کر کے اس نے اپنے آپ کو نہایت قابل تسلیم کروالیا ہوتا تھا۔ وہ اس سائے سے کس طرح عہدہ برآ ہو۔ اسے گُل رنگ کے لوٹ کر آنے اور ابنِ منصور کے متعلق صحت شخصیت پر گواہ ہونا تھا۔

گُل رنگ اس سے دغا نہیں کر سکتی تھی۔ اسے بغداد میں رہنا تھا اور وہ اس سے فریب نہیں کر سکتی تھی۔ بہتر ہوتا وہ قہرمانہ کو بھی گُل رنگ کے ہمراہ بھیج دیتا۔

اس نے تالی بجائی۔ قہرمانہ کو بلانے کے لیے حرم کی حبشی کنیز کو حکم دیا۔

قہرمانہ نہیں تھی۔ حبشی کنیز نے اپنے موٹے ہونٹ لٹکا کر جواب دیا تھا۔

مگر وہ کہاں تھی؟ حامد بن عباس کو لگا دیواریں اس کے گرد گر رہی تھیں۔ چھت اس کے سر پر آ رہی تھی۔

"تقریباً ایک ہفتے سے وہ یہاں نہیں ہے۔ شاید رخصت طلب کر کے کہیں گئی ہو۔" حبشی کنیز کانپ رہی تھی۔

"قہرمانہ ــــ کہاں ہے قہرمانہ اسے بلایا جائے۔" اس نے پاس لٹکی ریشمی ڈوری کو کھینچا جس کا مطلب اس کے محافظ دستے کی فوراً طلبی تھی۔

ایک ساتھ پاؤں اٹھنے کی آواز نے عجیب سنسنی پیدا کر دی تھی اور اب کہ وہ سب ایوان کے باہر باادب منتظر کھڑے تھے اور ان کی بے نیام تلواروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہ جی ہی جی میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ کیا قہرمانہ کے لیے اس نے انہیں بلایا تھا۔ موہوم سے خوف کی بنا پر اور خوف بھی کیا تھا؟ اسے کیا خوف تھا۔ ایک بے نام نامعلوم سا خوف کہ قہرمانہ نے بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑ دیا ہو۔ کوئی کسی کو وفادار رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

وہ باہر منتظر رہے اور ان کے سالار نے اندر آ کر ''حکم آقا'' کہہ کر سر جھکا دیا۔
وہ ایسے جاں نثاروں کا دستہ تھا جس کو حامد نے زرِ کثیر کے خرچ سے اور بہت داد و دہش سے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ سلطنت میں آگے بڑھنے اور اپنے پاؤں اپنی جگہ مضبوط جمانے کے لیے ایسے اقدامات ضروری تھے۔ پھر حامد کے دل میں آرزوؤں کی جو بھٹی جلتی تھی اور گزرے وقار کو حاصل کرنے کی جو جدوجہد اس نے کی تھی، اس کے لیے بھی اور ترکوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو مضبوط بنانے کی خاطر بھی وہ دولت لگانے میں بخیل نہ تھا۔

''تمہاری طلبی محض امتحان تھا اور کچھ نہیں۔'' اس نے اپنے سامنے حسابات کے کاغذوں کو لپیٹ کر رکھتے ہوئے کہا۔

''مستعد اور جاں نثار۔'' سالار نے بات مکمل کی۔

''جاگتے ہوئے اور ہوشیار چوکس پاسبان۔'' حامد نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ حکم کا منتظر وہاں کھڑا رہا۔

حامد نے کہا: ''نئے ترک سواروں کا ایک دستہ وصیف نے ابھی متعین کیا ہے وہ لوگ کیسے ہیں۔''

''شوریدہ سر اور مغرور بغداد کے بازاروں کی رونق اُن لوگوں کی آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے۔ وحشی قبائلی لوگ جب یہاں پہنچتے ہیں تو دنوں میں اپنا ماضی بھول جاتے ہیں۔'' سالار نے جواب دیا۔

''ماضی بھولنے کے لیے نہیں ہوتا اور جو لوگ ماضی کو بھول سکتے ہیں وہ حال

میں بھی زندہ نہیں ہوتے۔" حامد نے وضاحت کی۔ "تم لوگ اپنی آنکھیں کھلی رکھو اور ان پر نگران رہو۔"

سالار پھر جھکا اور پھر کھڑا رہا۔

"اب تم جا سکتے ہو۔" حامد نے اسے رخصت کی اجازت دی۔

قہرمانہ کو کہاں ڈھونڈا جائے۔ کس سے کہا جائے۔ ابنِ منصور کو تلاش کرنے والی وہی تھی مگر اس کا بنا اطلاع دیئے غائب ہو جانا اسے کچھ اچھا نہیں لگا۔ حرم کی رازدان اور کنیزوں کی حاکم اس کے لیے کسی نئی عقیل و فہیم عورت کو جو نگران ہو سکے، بہت مشکل ہو گیا تھا۔ کہاں تلاش کیا جائے۔

بغداد میں صوفیاء اور اذکیا کا یہ نہایت معمور دور تھا۔ مسجدیں اور خانقاہیں مدرسے اور صومعے، زاویے اور جامع ان سے آباد تھے۔ ایک دنیا سمٹ کر دجلہ کے کنارے آباد ان مشرقی اور مغربی حصوں میں سما گئی تھی۔ استادانِ فن اور فلسفی اپنے اپنے شاگردوں کی بھیڑ میں شاموں کو دجلہ کے کنارے باغوں میں فروکش ہوتے اور بحث مباحثے کی نشستیں جمتیں، اعتقادات و مذہب کا ایک ایک مسئلہ زیر بحث لایا جاتا تھا ___ آزادیٔ فکر اور دعوتِ عام سے یونانی اور ہندوستانی کوئی بھی مکتب خیال ایسا نہ تھا جس پر پابندی ہو۔ خلیفہ معتضد باللہ کے جو وساوس اور خوف تھے، اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کا ازالہ ہو رہا تھا۔ انسان اور اس کی حدود، ممکنات اور کائنات۔ خدا اور اس کی ذات سب پر مدلّل اور طویل مباحث کی مجالس ہوتیں جس میں یہودی اور نصرانی بھی حصہ لے سکتے تھے اور اپنے بڑے بڑے مدارس سے محض ان میں حصہ لینے آتے تھے۔ مبالغہ اور مکالمہ سب کی اجازت تھی۔ یہ ایک ایسی آزاد دنیا تھی جس کے دروازے کسی پر بند نہ تھے اور اس لیے حامد کو یقین تھا کہ سوائے گُل رنگ کے اس کی آتشِ انتقام کو سرد کرنے کے لیے کوئی نشانہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔

حسین نے اپنے باپ منصور کو دیکھا کہ باہر منتظر بھیڑ میں سے راستہ بناتا اندر

کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ غلام سمری نے اسے نہایت گستاخی سے روک کر پوچھا:

"تم کس کی اجازت سے گھسے چلے آتے ہو۔"

منصور نے نہایت آزردہ ہو کر کہا: "باپ کو بیٹے کے پاس آنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

سمری نے اس بوڑھے آدمی کو ایک نظر سر سے پاؤں تک دیکھا۔ سفید بالوں میں کہیں کہیں سیاہی کے تار تھے مگر دمکتا ہوا چہرہ حسین کی شباہت لیے تھا، معافی چاہتے ہوئے اس نے کہا: "معاف کر دیا جاؤں تو بہتر ہے، میں نے دانستہ یہ غلطی نہیں کی۔"

"یہ درویش کی بارگاہ ہے کسی حاکم اعلیٰ کی بارگاہ نہیں۔" منصور دروازہ کھول کر اپنے بیٹے کی طرف گیا۔

حسین اور وہ زمانوں کے بعد ملے تھے۔ منصور نے دیکھا اس کے بیٹے کے چہرے پر جلال تھا، ماتھے پر ایک رگ تڑپ رہی تھی اور لو دیتی تھی۔ ہندی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دائیں بائیں سے ناک اور پیشانی اور لبوں سے ٹھوڑی تک ہر حصہ برابر تھا۔ یہ ایسا رخِ روشن تھا جس کی چمک پر سے نظریں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ وہ نظر کی امان کی دعا پڑھتا ہوا جی ہی جی میں اس پر نثار ہوتا ہوا بڑھا کہ اسے گلے لگائے مگر حسین اس کے قدموں میں لپٹا تھا جیسے کوئی غلام ہو۔ وہ حواسوں میں تھا اور فسانے جو ابو یعقوب اقطع نے اسے سنائے تھے سب غلط تھے۔

حسین نے دیکھا اس کے باپ پر بڑھاپے نے شب خون مارا تھا۔ زندگی اور دنیا سب لمحہ گزران تھا اور آدمی کیسے عاقبت کی طرف سفر کرتا تھا۔ ابھی اسے وہ گھڑی یاد تھی جب اس نے اقطع کے گھر اپنے دادا کے دوست ہندی سوداگر کو نکل جانے کا کہا تھا۔ یہ عجلت پسندی اور تیز دلی جو اس کی طبع میں تھی۔ اس کی سرشت اور اس کے خون میں تھی۔ یہ التہاب جو اس کی ذات کا حصہ تھا۔ یہ حدّت جو اس کی رگوں میں خون کے ساتھ رواں تھی، یہ اس آتش پرستی کی باقیات تھیں جو اس کے آباء کا مذہب تھا۔ شعلے کی طرح بھڑکنا اور الاؤ کی طرح روشن ہونا۔ وہ خون کی امانتوں کو جھٹلانے پر قادر نہیں ہوا تھا۔ ہر گام پر اس کی عجلت پسندی نے اس کے لیے فتنے کھڑے کیے تھے۔

اس کے مطالبے اور اس کی تمناؤں میں یہ شدت وحدت غالب تھی۔
سفرِ حیات میں
نفس کے ساتھ جنگ میں بھی وہ سرخرو نہیں ہو سکا تھا۔
اپنے مالک کے ساتھ بھی اسے سمجھ نہیں تھی۔
خواجہ نے اسے جو سمجھایا تھا اس کو سمجھنے کے باوجود مطلب اس کے ذہن سے محو ہو جاتے تھے اور وہ سب اس کے خون کی امانتوں کا کرشمہ سمجھتا تھا۔
"حسن تمہیں بہت یاد کرتا ہے اور زینب کی طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ میں نے اب کے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں واپس لاؤں گا۔ تمہاری دعاؤں کی اس سرزمین کو زیادہ ضرورت ہے جس کی آب و گل سے تمہارا خمیر ہے۔ پھر دشت سوس کے ساتھ ساتھ قبریوں میں نئے داعی پراسرار دعوتیں لے کر لوگوں میں عجیب بے چینی پھیلا رہے ہیں۔ اشاروں کنایوں میں باتیں کرتے ہیں اور دولت جمع کر کے مغرب کی طرف بھجواتے ہیں۔ معبد ناہید کے نئے پجاری معبدوں کو درست کر رہے ہیں۔ اس بے چینی کے لیے اور اس کے سدِباب کے لیے تمہیں لوٹ چلنا چاہیے۔" اس نے کنکھیوں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ "تمہارے دادا کے کمرے میں تمہاری جلائی ہوئی آتش اب بھی فروزاں ہے۔"
"شعلہ جہاں بھی ہو اسے فروزاں ہی رہنا چاہیے۔ سوزِ دروں کے لیے یہ ضروری تھا۔" حسین نے جھکے جھکے کہا۔
منصور نے محسوس کیا کہ اس کا بیٹا ہمیشہ کی طرح باتوں کے دوران اس سے دُور ہے اور دل سے متوجہ نہیں۔
"اقطع خفا ہیں۔" اس نے کافی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔
"پھر۔" بیٹے نے پوچھا۔
"وہ کہتے ہیں تمہارا بیٹا کیا خدا ہو گیا ہے کہ بنا سوال کے وہ سائل کے لیے دعا کرتا ہے اور وہ دُعا مستجاب ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ سستی شہرت اور رسوائی ہے۔ یہ بلندی اور سرفرازی آدمی زادہ اس بوجھ کو کہاں اُٹھا سکتا ہے۔ یہ دیوانگی ہے۔ وہ چاہتے ہیں تم بغداد سے کسی لمبے سفر پر روانہ ہو جاؤ۔"

حسین نے آہ بھری مگر کہا کچھ نہیں۔
منصور اور وہ دو دشمنوں کی طرح آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے کی طاقت کا اندازہ لگانے والوں کی طرح۔
"میں تُستر گیا تھا۔ سہل تمہیں یاد کرتے ہیں۔" منصور نے کہا۔
"کیا کبھی انہوں نے میرے لیے دُعا نہیں کی۔ نہیں کی۔ وہ میرے لیے دُعا نہیں کرتے۔" اس نے نہایت حسرت سے کہا۔
"حسین ان کا فرمان ہے کہ تم اپنے لیے خود دُعا کرو۔" منصور نے نہایت نرمی سے کہا۔
"آگ کا جلنا ہی اس کا دستِ دُعا ہے۔" حسین نے باپ کے پاؤں کی گرد جھاڑی۔
"تم آتشِ فروزاں ہو۔" منصور نے نہایت دردِ دل سے کہا۔
"مگر میں اس کی پرستش نہیں کرتا۔ پدرِ محترم! آپ گواہ ہیں جب آگ پیدا کرنے والے کی طرف نگاہ ہو تو آتشِ فروزاں کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔" حسین نے ہنس کر کہا۔
"حسن ریشم کا بہترین نبّاض ہے۔ مسافروں کو خوب جانتا ہے مگر فیاض اور مہمان نواز ہے۔ بات نہایت سوچ سمجھ کر کرتا ہے اور اکثر دشتِ سُوس میں جنوب کی طرف خراسان سے وارد ہونے والے گھوڑوں کے سوداگروں سے بحث میں الجھتا ہے۔ اسپ تند خو کو سدھانے میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھار میں حیران ہوتا ہوں کہ تمہارا بیٹا کس کی صفات دُہرا رہا ہے۔" بحرِ ناپید میں ڈوبی ہوئی زمینیں بھی سطحِ آب سے سر بلند کرتی ہیں۔ عشق تو الجھے راستوں والا باغ ہے۔" حسین نے نہایت سادگی سے کہا۔
حسین نے پھر کہا: "یہ میری چند کتابیں ہیں انہیں اگر آپ حفاظت سے لے جا سکیں تو حسن کے لیے اچھا مطالعہ ہیں۔"
منصور نے بڑے غرور سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا جو اگر آتش پرست رہتا تو محّمی کی سرائے میں بیٹھا ہوتا اور اگر اس کے پیشے میں بھی نام پیدا کر لیتا تو حلاج ہی

رہتا۔ تانے بانے میں الجھا ہوا' تیز اور شوخ' مدھم اور دبے ہوئے رنگوں میں جان کھپاتا ہوا۔ رف۔ رف۔ رفتن اور دے۔ دے میں مصروف۔ اس نے کتابیں لے کر اپنی گود میں رکھ لیں۔

"تم کب روانہ ہو رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے ایک کنیز کا انتظار ہے جس کی رہائی کے لیے میرا وجود ضروری ہے۔"

منصور نے سن کر مزید کچھ نہیں پوچھا۔

پائیز کی ہوا میں پھولوں کی مہک تھی' جو خانقاہ سے ملحق باغ میں کھلے تھے اور موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ درس قرآن کی محفلوں میں لوگ دور دراز سے آ کر شریک ہوتے تھے۔ اور مشرق و مغرب کے طالب علم نسل اور وطن کی تخصیص کے بغیر گھلے ملے ان زاویوں میں مکین تھے جہاں حکومت ان کی سب ضروریات کا خیال رکھتی تھی۔ حفاظ اور قاری تفسیر اور حدیث کا علم حاصل کرنے والے لوگ امامانِ دین اور مختلف الخیال مدرسہ ہائے فکر کی وضاحت چاہنے کے لیے پیاسے متلاشی فلسفے کی گتھیاں سلجھانے کے لیے پریشان اور ان خانقاہوں میں ایک دنیا تھی۔ ہر نیا خیال بہت چھان پھٹک کر قبول کیا جاتا تھا اور اس کے باوجود بغداد ایوانوں سے بھی پُر تھا۔ لوگ سرِدار پہنچنے کے لیے تاکہ ان کا نام پکارا جائے' بے خوف کود پڑتے تھے۔ دن اور رات یکساں تھے۔ سائل کی دریافت کے لیے علماء کے کھلے دروازوں کو جب جی چاہتے کھٹکھٹاتے۔ گو اسلام پر تقریباً تین صدیاں گزر چکی تھیں پھر بھی اس تازگی اور مہک کو جس نے سارے جہاں کو مہکایا تھا لوگوں کی جانیں شدت سے اس کی خواہشمند اور متلاشی تھیں۔

جب گُل رنگ داخل ہوئی ہے تو سمری غلام اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

"میں نے اسے روکا ہے مگر اس کا مسئلہ نہایت اہم اور فوراً حل چاہتا ہے۔" اس نے حسین سے کہا۔

حسین ہنسا اور اس نے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا: "میں ابنِ منصور ہوں۔"

وہ کھڑے سے ایک دم بیٹھ گئی اور یوں جھکی جیسے اسے سجدہ کر رہی ہو۔

سمری نے کہا: "یہ سجدہ ریز ہے۔"

"تم کیوں ایسا کہتے ہو۔ وہ چل کر آئی ہے اور گھبرا گئی ہے۔" حسین نے کہا۔

پھر اس نے گُل رنگ کی طرف بڑے افسوس سے دیکھا۔ اس کی شعلہ بار نگاہیں افسردگی اور محبت سے اس کنیز کو دیکھ رہی تھیں اور اس سے اپنی آخری ملاقات یاد آ رہی تھی۔

کیا وہ حواسوں میں تھا؟

"کیا تم چاہتی ہو میں تمہارے ہمراہ حامد بن عباس کی طرف چلوں؟"

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔" اس نے زمین پر پڑے پڑے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔

"اٹھ جاؤ اور سیدھی بیٹھ کر آنکھیں بند کر لو۔ انہیں کھولنے کی اجازت نہیں جب تک میں تمہیں کہوں نہیں۔ تمہیں پکاروں نہیں۔"

"ابنِ منصور۔ ابنِ منصور۔ یہ میرے آقا کی عزت کا سوال ہے۔" گُل رنگ نے پھر کہا۔

"تم اس زندگی اور جاوداں زندگی میں، موت اور حیات میں فرق سمجھتی ہو۔" حسین نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"حیات اور موت کی گتھیاں۔" حسین اپنے آپ سے گویا تھا۔

اس کی بات کاٹ کر گُل رنگ نے کہا: "وہ آنکھیں اب بھی نگران ہوں گی اور مہربان اور محبت کا چشمہ جاری رہے گا۔ میں اپنی آقا کو اکثر دیکھتی ہوں مگر میں سوچتی ہوں یہ میرا واہمہ ہے۔ دشت و کوہ و بیاباں راہ کی گرد بن جاتے ہیں اور دشتِ سماویہ کے ایک کونے میں وہ بھلایا نہ جانے والا وجود ہوتا ہے، جیسے یہ سب میرے پاس ہو۔"

حسین مسکرایا۔

سمری غلام نے حاضر ہو کر کہا: "باہر کچھ غلام منتظر ہیں۔"

"انہیں ٹھہرنے کا کہو۔" گُل رنگ نے کہا۔ سمری واپس چلا گیا۔ "ابنِ منصور! حامد بن عباس مجھے قتل کرا دے گا۔ وہ سمجھ نہیں سکتا۔"

"نہیں، وہ قتل نہیں کروا سکتا۔ موت اور اذیت کا وعدہ کسی اور سے ہو چکا ہے۔" اس نے ہولے سے کہا۔

"ابنِ منصور! اس کی خباثت پر کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔" گُل رنگ سہمی ہوئی تھی۔

"اب تم غلاموں کے ہمراہ جاؤ اور مقدر کا انتظار کرو۔"

گُل رنگ نے اپنی ردا لپیٹی۔ آنکھوں تک چہرے کو چھپا کر وہ باہر نکلی اور غلاموں کی حفاظت میں حامد بن عباس کے محل کی طرف روانہ ہوئی۔ دجلہ کے پل کو عبور کرتے ہوئے بھی وہ ان کے درمیان تھی۔ شفاف پانی میں ان کے عکس بہتے جاتے تھے اور دھوپ نے ان کو طوالت دی تھی۔ عجیب مافوق الفطرت سے سراپے۔ پھر انہوں نے محسوس کیا کہ آنکھ جھپکتے میں ایک بگولے نے ان کو اپنے میں لپیٹ لیا ہے جو موت کی طرح سرد اور کپکپانے والا تھا۔ وہ گرد و پیش سے بے خبر ہوگئے جیسے فنا ہوگئے ہوں۔ ان کی آنکھیں بند ہوگئیں جیسے نیند نے انہیں آلیا ہو۔ یہ کیفیت چند لمحوں رہی۔ وہ ہوشیار ہوئے ہیں تو گُل رنگ نہیں تھی ــــ انہوں نے حامد بن عباس سے یہی کہا۔

حامد اپنے لمبے دالان میں زخمی جانور کی طرح تیز تیز چلتے ہوئے غرّا رہا تھا۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بیسویں بار واقعہ سن چکا تھا' مگر اس کے باوجود وہ ان میں سے ہر ایک کو باری باری اسے دُہرانے کو کہتا۔

"جب تم ابنِ منصور کے پاس سے چلے ہو تو کیا وہ تمہارے ساتھ تھی۔ بولو؟"

"یا سیدی بیشک بیشک۔ وہ ہمارے درمیان تھی جیسے خاتم کے درمیان نگینہ۔"

حامد نے نہایت ڈراؤنی "ہوں" کی۔

"جب بگولے نے تمہیں گرفتار کیا ہے تو کیا تم لوگ فوت ہوگئے تھے۔ تمہیں موت نے آلیا تھا؟ تم دیکھ اور محسوس نہیں کر سکتے تھے؟ تم امانتوں کی حفاظت کرنے والے نہیں ہو۔ یہ ہرگز سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ راستے میں ایک کنیز' جو زندہ اور سانس لیتی ہوئی ہو' بُھس میں سوئی کی طرح غائب ہو جائے ــــ وہ دریا میں تو نہیں لُڑھک گئی؟"

"ہرگز نہیں۔ بالکل نہیں۔" ان میں سے جو ذرا پختہ عمر کا تھا کانپتے ہوئے بولا۔

"کیا تمہارے گرد پل پر اور لوگ تھے۔ یہودی' نصرانی' ترک' کوئی غیر ملکی' سندی' مغل۔" وہ خود بہت الجھا ہوا تھا۔

"جب ہم پل عبور کر رہے تھے تو دور دور تک کوئی نہیں تھا۔" اس غلام نے پھر کہا۔

فہم سے بالاتر یہ بات ایسی ہے جس کی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ تم کہتے ہو وہ تمہاری حفاظت میں تمہارے درمیان چل رہی تھی' پل پر کوئی نہ تھا' تم غافل نہ تھے' بگونلے نے صرف چند لمحوں کے لیے ہی تمہیں اپنے سے فنا کیا پھر تاویل کیا ہے۔ کیا راز ہے؟"

"سیّدی! ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟ ہم کوتاہی کے مرتکب بھی نہیں ہوئے۔ بگولوں کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟"

"قدرت پتا نہیں کیا کچھ اپنے دامن میں پوشیدہ رکھتی ہے۔" حامد ہارے ہوئے فاتح کی طرح تھا۔

قہرمانہ غائب ہو گئی تھی۔ گُل رنگ ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ حسین کی ماں چپ چاپ مر گئی تھی۔ ابنِ منصور کوئی ساحر ہی تھا اور اس کی زندگی میں دخیل۔ دانت پیس کر اس نے کہا:

"اگر موت نے مجھے مہلت دی تو میں ابنِ منصور کو تختۂ دار پر چڑھاؤں گا۔ جس طرح میری زندگی کا واحد مقصد آج تک گمشدہ ماضی کو ایک ایک خشت کر کے تعمیر کرنا ہے بعینہٖ میں اُس آدمی کو لخت لخت قتل کروں گا۔ اذیت دے کر۔ ہاں اس نے ابنِ منصور نے حامد کی جمی جمائی زندگی کو بدمزہ کر دیا تھا۔ گلیم پوش۔ غلیظ۔ دنیا کے لحاظ سے نہایت پست جس کی تحویل میں اس دنیا کا ایک گوشہ تک نہیں تھا۔ اور وہ حامد بن عباس کو شکست پر شکست دے رہا تھا۔ کیوں۔ آخر کیوں؟"

اس کی سمجھ میں گُل رنگ کا یک بیک یوں غائب ہو جانا نہیں آتا تھا اور اسے ابھی تک یہ پتا بھی نہیں چل رہا تھا کہ یہ وہی ابن منصور تھا یا کوئی اور۔ پھر اس نے غلاموں سے کہا:

"تم اس بندۂ خدا کے کسی غلام کو میرے پاس لاؤ۔ میں اس سے صورت حال دریافت کروں۔ عمار۔" اس نے زور سے پکارا۔

"یا شیخ حاضر ہوں۔" عمار نے جھک کر زمین چومی۔

''ابنِ منصور کے غلام کو حاضر کرو اور دریافت حال کے لیے اس کو سب کچھ اُگلنے پر مجبور کرو۔'' حامد سخت برہم تھا۔

عمار نے سینے پر سیدھا ہاتھ رکھا' جھکا اور الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

باہر چاندنی رات خوابناک دجلہ پر برس رہی تھی۔ اس سے بے نیاز کہ دل پریشان ہوتے' گھبراتے اور ملول ہوتے ہیں آدمی سوالوں اور حالات میں الجھتا اور گرفتار ہوتا ہے۔ ابن آدم کے لیے دنیا میں سکون اور قرار کم ہی کم تھا۔ شاہراہوں پر قافلوں کی گھنٹیاں ان کے کُوچ اور آمد اور مراجعت کی ساعتوں میں بج رہی تھیں۔ حدی خواں اپنے گیت گاتے ہوئے چل رہے تھے اور تیز گام ساربانوں کو کوئی پکار کر نہیں کہہ سکتا تھا۔

''اے ساربان! آہستہ چل کہ میری پسلیوں میں آگ ہے۔''

شبلی نے گدڑی کو اپنے گرد لپیٹا۔

وہ ان بے پناہ سرخ انگارہ آنکھوں والے شخص سے خوفزدہ نہیں تھے' مگر اس کی جسارت پر حیران تھے جو پچھلے کئی مہینوں سے یہاں بغداد کے گلی کوچوں میں موضوعِ سخن بنا ہوا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہتا تھا ــــ آدمی پابندِ سلاسل ایام تھا ــــ آدمی غلامِ ممکنات تھا۔ اس کو کب اتنی آزادی ملی تھی کہ وہ جو اس کے جی میں تھا اس کا اعلان بھی کر سکے اور پھر امن میں رہے۔ امن و سکون اس بادشاہت میں کہاں تھا۔ وہ ریزہ ریزہ اپنی طاقت کو استعمال کر رہا تھا ــــ کیا وہ اپنے آپ کو آزما رہا تھا ــــ کیا وہ اپنے اور اپنے خدا کے رشتے کو رسوا کر رہا تھا۔ اسے ہوا دے رہا تھا۔ ایک عامیانہ پن کی وجہ سے جو اس کی طبیعت کے اندر مضمر تھا' اپنی شہرت کو ہوا دینا چاہتا تھا۔ شبلی نے بہت الجھ کر اپنے ماتھے پر غور و فکر سے ابھری لکیروں پر انگلی پھیری۔

''فنا'' ــــ انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پھول کی پنکھڑیوں کو الگ الگ کیا ــــ

"فنا"۔ انہیں اپنے گرد ہوا میں سے ایک خوشبو بھری سسکی کی طرح سنائی دیا۔ پھر آوازوں کے دائرے ان کی ذات سے نکل کر بڑھتے گئے۔ جیسے تالاب میں پھینکے گئے ذرا سے کنکر سے دائرے کنارے کی طرف پھیلتے ہیں۔ دجلہ کا پانی اور نغمہ سرا پرندے اور پہاڑوں پر برف کے اوپر برف جو سالہا سال سے' صدیوں سے تہ در تہ' روشنی کی رہائی کی منتظر تھی' بہتے ہوئے پانی پر سے روشنی اور غاروں کی ظلمت اور اندھیرے کی روحیں درختوں کی جڑوں میں زمین کی محبت سے پیوست زندگی کی لہریں اور خلاؤں میں آوارہ بھٹکی ہوئی آوازیں اس "فنا" کے کبھی ختم نہ ہونے والے غنائیے میں شامل ہوگئے۔ پھول کی پتیوں نے اپنے رنگوں کی نمو کے ساز پر اسے گایا اور شبلی اس میں شامل تھے۔ سویا ہوا بغداد اور جاگتے ہوئے ابن منصور بھی اس میں بخوشی شریک تھے۔

جب میں نہیں ہوں تو پھر کون ہے۔

"فنا کے ساتھ بقا ہے اور میں ہر لحظہ فنا ہوتا اور بقا میں سانس لیتا ہوں۔" شبلی نے سانس روک کر دم کھینچ لیا کیونکہ حسین بن منصور شیر کی پشت سے اتر کر ان کے سامنے کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

شبلی نے گدڑی کو پھر اپنے گرد سمیٹا اور آنکھیں جھکا لیں جیسے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔

"آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا۔" حسین نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

شبلی مسکرائے۔ پھول کی پنکھڑیاں اب بھی ان کے ہاتھ میں تھیں۔ پھر انہوں نے ان پر ہاتھ پھیرا اور نہایت شاداب تروتازہ مکمل گلاب حسین کی طرف بڑھا دیا۔

حسین نے پھول سونگھتے ہوئے کہا "خوب بہت خوب۔"

شبلی صرف مسکراتے رہے۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"فنا کیا ہے؟" حسین نے جھک کر ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

ایک زوردار ضرب لگا کر شبلی نے کہا: "فنا' فنا' فنا۔"

حسین نے محسوس کیا اس کے ہر طرف فنا۔ فنا کی صدائیں تھیں۔ ہر شے فنا فنا پکارتی تھی ہوا اور کائنات سب معدوم ہوئے جاتے تھے۔ زمین اور آسمان' وہ خود اور

اس کے ساتھی گھلے جاتے تھے ریزہ ریزہ ہو گئے تھے نہ سناٹا تھا نہ خاموشی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ ابدی ازلی نا مختتم بے اتھاہ' بے کنار۔ حسین کو لگا قرنیں اور صدیاں اور زمانے اور وقت سب گزر گئے تھے۔ اندھیرے اور روشنی سے بھی فزوں ایک تجلی جس کا نام اسے معلوم نہ تھا' انہیں ڈھانپے تھی اور شبلی کی ضربِ قلندرانہ لہروں کی طرح دائروں میں اس کو جھلا رہی تھی۔ فنا فنا تھی اور بقا بھی' کیونکہ خدا اول و آخر ظاہر و باطن تھا۔ وہ شاہد بھی تھا مشاہد بھی۔

کنارِ دجلہ بچوں کا ایک گروہ قہقہے لگاتا شبلی کے پیچھے تھا اور وہ ڈگمگاتے قدموں سے اپنی میلی گدڑی کو سنبھالتے لپیٹتے مڑ کر بچوں کو دیکھتے اپنے دامن کو سمیٹتے ان سے بچتے' کبھی گرتے' کبھی اٹھتے راہ چلتے خاموش اپنے آپ سے مسکرا کر منہ ہی منہ میں باتیں کرتے ہوئے کبھی تیز اور کبھی آہستہ رُو ہوتے اکثر کسی درخت کی آڑ میں چھپ کر وہ آوارہ لڑکوں کو آگے نکل جانے دیتے جیسے ان سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں اور حیران ہو کر ان کا ڈھونڈنا۔ یہاں وہاں جھاڑیوں اور پھولوں اور اونچی نیچی روشوں پر تلاش میں بھاگنا' کھلکھلانا' یہ سب ایک کھیل بن گیا تھا حسین اپنے مریدوں کے جلو میں ایک شانِ استغنا سے اپنے گوشۂ عافیت سے نکلا جیسے بادلوں کے دنوں میں سورج یک بیک کسی کنارے کو اپنی کرنوں سے جگمگاتا ہے۔

وہ سوال کرتا مگر شبلی جواب دینے کے بجائے مسکراتے۔ وہ چاہتا تھا یہ کوئی بات کریں۔ ان کو سب ان رازوں پر آگاہی تھی جو ابھی اس سے پوشیدہ تھے۔ وہ نوافل کو فرض سمجھ کر پڑھتا۔ رات رات بھر عبادت کرتا' مگر اس پر وہ اسرار کیوں عیاں نہیں ہوتے تھے اس کا مقدر آخر کیا تھا؟ وہ ہر شے کے درمیان خود کیوں تھا؟ خود موجودہ پروانہ کیوں نہیں تھا؟ اس کی آتشِ شوق اسے خود سے بیگانہ کیوں نہیں کر سکتی تھی؟

شبلی اپنے میلے مرقع کی لاتعداد ٹکڑوں کے جوڑوں کو ہاتھ سے سہلا رہے تھے اور حسین کو یاد آیا: "درویش کے لیے ضروری ہے کہ وہ سیدھا سینا جانتا ہو۔" رنگ برنگ' چوکور' گول' آڑی' سیدھی' چھوٹی' بڑی' لمبی اور چوڑی' ریشمی اور سوتی' کترنوں سے بنے اس لبادے کو شبلی نے خود سیا ہو گا۔ وہ سینا جانتے تھے۔ مختلف زاویوں سے ایک

دوسرے میں پیوست و مربوط یہ ٹکڑے ایک وحدت بناتے تھے۔ وحدت جو بظاہر بے جوڑ چیزوں سے وجود میں آئی تھی ـــــ اکائی، جس کو شبلی نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا اور لگتا تھا اس کے سوا انہیں اور کسی شے کی حاجت نہ تھی۔ سوائے مسکرانے اور مسکراتے رہنے کے وہ کسی سوال کا جواب نہ دیتے تھے۔

حسین کو اپنے ہوش و حواس پر شدید غصہ آیا۔ وہ کیوں دیوانہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا وجود اس کے سوالوں کی وجہ سے اس کی راہ میں حائل تھا۔

حسین نے مریدوں کو وہیں چھوڑ کر شبلی کے پیچھے چلنا شروع کیا اور دجلہ کے ساتھ ساتھ گھنی جھاڑیوں اور درختوں کے نیچے روئیدگی میں بھاگنے لگا کیونکہ اسے اپنے سامنے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ شبلی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

"خدایا تیرے ایک بندے کو میں پا نہیں سکتا تجھے میں کہاں تلاش کر سکتا ہوں۔" حسین نے بآواز بلند کہا۔

"جیسے تم اس کی تلاش میں ہو وہ بھی تمہاری تلاش میں سرگرداں ہے۔" حسین کے عقب سے کسی نے کہا۔

جیسے بجلی کا لہریا صحرا پر جھکے آسمان میں نیچے اترے اور بے پناہ کے کسی قافلے پر سے گزرے۔

"حسین ابنِ منصور۔" کسی قہقہے کے عقب میں اسے اپنے نام کی پکار سنائی دی۔ پھر شبلی اس کے قریب آئے۔ "صدائیں غلط بھی ہو سکتی ہیں۔"

"بخدا" اس نے ان کے لباس کا دامن تھام لیا۔ "کوئی صدا تو ہو۔"

"حسین کبھی تم نے سوچا ہے کہ ابلیس نے ایک صدا کے بعد کوئی صدا نہیں سنی۔ ایک نگاہ کے بعد کسی نظر کا محتاج نہیں ہوا۔ ایک نوا کے بعد اس نے کوئی آواز نہیں نکالی۔ وہ آوارہ بہ دل آوارہ بہ جان سرگرمِ سفر۔ وہ راندۂ درگاہ۔" شبلی پہلی بار اس کے روبرو تھے۔

"یا شیخ! مجھے اس اسرار پر آگاہ کریں۔" اس نے شبلی سے کہا۔

"کوئی اسرار نہیں صرف ہمت ہے۔ انکار کرنے کی اور اس پر کاربند رہنے کی مشیت کو قبول کرنے کی، امتحان اور آزمائش میں کھڑے رہنے کی۔ آسمانوں کی بادشاہت سے

وہ دھکیل دیا گیا مگر اس کی سرشاری نہ گئی۔ اگر یہ سرشاری عطا ہو سکے میسر آئے۔" انہوں نے اپنی دل کے مرقع کو پھر اپنے گرد سمیٹ لیا اور مسکراتے ہوئے وہیں کہیں روئید گی کے تانے بانے میں اس کی نگاہ سے گم ہو گئے۔

حسین گم صم کیفیت میں جب واپس ہوا ہے تو حامد بن عباس کے شُرطے اس کے غلام سمری کو لے کر جا چکے تھے اور خانقاہ پر عجیب سناٹے کی سی کیفیت تھی۔ اس کے باوجود کہ لوگ جمع تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ سمری کو وزیر نے کیوں بلایا تھا؟

کوئی کنیز گم ہو گئی تھی اور اس کی تلاش تھی۔

سمری لوگوں سے بہت گھل مل کر باتیں کرتا تھا اور شاید غلط بیانی سے کام لیتا تھا۔

منصور نے حسین سے کہا: "بغداد تمہارے لیے اچھی رہائش گاہ نہیں۔ بیضا میں تمہاری ضرورت ہے اور تمہیں واپس چلنا چاہیے۔"

حسین نے ہاتھ کے اشارے سے باپ کو گویا تسلی دی۔ غلام کے لیے اتنا پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ حامد بن عباس نے کسی دریافت حال کے لیے اسے طلب کیا تھا۔

حکومت کا ادنیٰ ملازم بھی تھوڑی سی حیثیت رکھنے والا کوئی بھی آدمی خلقِ خدا کے لیے مصیبت کا باعث بن سکتا تھا۔ اور پھر ایک وزیر باتدبیر کا ایک بوریا نشین کے غلام کو طلب کرنے کا مطلب۔ بغدادیوں بھی سازشوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ مذاہب اور اقوام اور مسالک اور مختلف طبقۂ فکر کے لوگوں کے ہجوم سے اس میں ایسی دلق کی سی کیفیت تھی، جس کو حاکمِ وقت کی درویشانہ صفات ہی سیدھے راہ پر لگا کر ایک خوبصورت مرقعے میں ڈھال سکتی تھیں اور تختِ خلافت خود طوفانوں کی زد میں آیا رہتا تھا۔ بغاوتوں اور بے چینیوں کے نتیجے میں پُلوں پر سر بریدہ لاشے لٹکتے تھے اور دجلہ کے پانی میں خون ٹپکتا رہتا تھا۔

"میں راضی برضا ہوں پدرِ محترم۔ کیونکہ خاتون گُل رنگ کا جسدِ خاکی عمار نے تلاش کر لیا تھا اور سمری کی یاوہ گوئی اب بے اثر تھی۔"

"عجیب معموں میں باتیں کرتے ہو حسین۔ میری مانو ہم واپس بیضا چلتے ہیں۔"
منصور پر جلالی کیفیت تھی۔

ہنس کر حسین نے کہا: "مشیت سے بچ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے۔"

"اگر تم اسی کو مشیت خیال کرتے ہو کہ حکومت کے کارپردازوں سے ٹکرایا جاتا تو یہ تمہاری غلطی تھی۔" منصور بہت مضطرب تھا۔

"حکومت صرف ایک ہے اور میں اس سے ٹکرا نہیں سکتا۔ میری یہ ہمت نہیں۔ میں راندۂ درگاہ بننا نہیں چاہتا۔"

حسین نے اپنا سجادہ بچھایا اور نوافل میں منہمک ہو گیا۔ یعقوب اقطع اگرچہ اس سے خفا تھے مگر سسری کی گرفتاری کا سن کر وہ منصور کے پاس آئے۔

"ایک کامیاب زندگی' بھرپور اور مناسب زندگی کے لیے یہ سب ضروری نہ تھا۔" انہوں نے شکایت کی۔

"خلقِ خدا کی محبت میں حسین آگے نکل گیا ہے۔" منصور نے کہا۔

"خلقِ خدا کی محبت۔" اقطع ہنسے۔ "اپنی محبت کے لیے۔ شدید خودپسندی اور اپنی طاقتوں اپنی حدود کا غلط اندازہ۔"

منصور نے کوئی جواب نہ دیا۔

"زینب اور حسن آپ کی غیر حاضری میں پریشان ہوں گے۔" اقطع اب کے ذرا اپنے پن سے پوچھنے لگے۔

"میں حسین کو واپس لے جانے کے لیے بغداد آیا ہوں۔" منصور نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

"بغداد کا انتشار آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ روحانی بھی اور دنیاوی بھی۔" اقطع نے آہستہ سے کہا۔ "مدرسہ نظامیہ میں علمائے ظاہر اور فقہا کا مباحث میں ہر روز تصادم ہوتا ہے۔ عافیت خاموش رہنے میں ہے۔ مذہب میں موشگافیاں ہوتی ہیں۔ فلسفہ اور علوم باطنی میں ایک ہنگامہ بپا رہتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ حسین مدرسہ نظامیہ والوں سے بھی ناخوش ہے۔ حضرت جنید کے ساتھ بھی اس کے مراسم نہیں ہیں۔ عمر بن عثمان مکی تو اسے راندۂ درگاہ سمجھتے ہیں اور ہر طرف اس کی تکفیر کے چرچے ہو رہے ہیں

مگر حسین کو ذرا احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس سے پہلے کسی کو غیب پر آگاہی نہیں ہوئی۔ کسی پر یہ اسرار وا نہیں کیے گئے مگر یہ دکھاوا۔ دلوں کا حال جان لینا اور اس کی تشہیر بھی کرنا لوگوں کو پریشان کر دیتا ہے۔ عوام کیا خواص بھی ان باتوں سے بچتے ہیں۔ وہ کیوں اپنے گرد دشمن جمع کر رہا ہے۔"

اس دکھاوے سے اس کی ذات کو کیا فائدہ؟

کیا صرف وہی ہے جس کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی شرم خدا رکھتا ہے۔

"آہستہ آہستہ۔" منصور نے اقطع کے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ "دعا کا ایک اپنا مقام ہے۔ دُعا جزوِ ایمان ہے۔"

"آپ مجھے یہ سب بتا رہے ہیں۔" اقطع اور بھی خفا ہو گئے۔ حسین کیوں حلاج الاسرار بنا ہوا ہے۔ اگر اسے اپنی عافیت منظور ہے اور روح کی بالیدگی میں کوشاں ہے تو اسے اپنی طرف نظر کرنا چاہیے۔ اسے اپنے آپ سے محبت کرنا چاہیے۔ ہاں اسے اپنے آپ سے سمجھنا چاہیے۔ کیا اس نے نہیں دیکھا کہ رسولؐ خدا وجہ ُوجودِ کائنات اور بشر کامل ہونے کے باوصف مشیتِ خداوندی میں کبھی دخیل نہیں ہوتے تھے۔ وہ دعائے مجسم تھے۔ لوگوں کے دلوں کے بھید ہی نہیں اسرار کائنات پر آگاہ تھے اور پھر بھی انہوں نے قلوب کے راز کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔"

"حسین کو ایسا کوئی دعویٰ نہیں۔ وہ تو اپنے آپ کو خاکِ مدینہ بھی نہیں سمجھتا۔ کہاں رسولِؐ خدا کی ذات بے ہمتا اور کہاں ایک ناقص انسان کھویا ہوا بھٹکا ہوا تلاش اور جستجو کے زینوں پر لڑھکتا ہوا، لڑکھڑاتا ہوا روشنی کی ایک کرن کے لیے پریشان۔ منزل کا نشان تک جس کو معلوم نہیں۔"

"یہ آپ بول رہے ہیں ایک باپ بیٹے کے حق میں گواہی دے رہا ہے۔" اقطع طنزاً ہنسے۔

"نہیں۔" منصور نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ کر کہا۔ "اسے میری گواہی کی ضرورت نہیں۔"

"کبھی کبھار لگتا ہے کہ آدمی کو کسی گواہی کی ضرورت نہیں ہوتی مگر پھر ایسا وقت آجاتا ہے۔" اقطع نے زچ ہو کر کہا۔

"آپ کیوں چاہتے ہیں کہ وہ یہاں نہ رہے۔ آپ کیوں اس کے مخالف ہیں۔ زینب اور حسن کی وجہ سے۔" منصور نے سرگوشی میں پوچھا۔

"یہ سب باتیں موت کو دعوت دینے کے مترادف ہیں اور میں چاہتا ہوں وہ زندہ رہے۔" اقطع نے جواب دیا۔

"لوگ مارے جاتے ہیں اور لٹکائے جاتے ہیں اور ان کی لاشیں جھولتی رہتی ہیں۔" منصور اندر سے کانپ گیا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"وہ اپنی قوتوں کو آزمارہا ہے ایک طفل مکتب کی طرح جس نے نیا نیا لکھنا سیکھا ہو اور ہر ورق کو اپنے نام سے مزین کرے۔ اپنے نام کے سحر میں گرفتار ہو۔" اقطع آج اپنے دل کی بات کہنے پر گویا مصر تھے۔

منصور نے کہا "آپ معاملے کو بالکل کسی اور ہی زاویے سے دیکھ رہے ہیں۔"

"زاویے اور پیمانے اور نقطۂ نظر کی بات نہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ سرشاری جب دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگے تو خطرناک ہو جاتی ہے۔ دیوانگی کو مکمل یکسر حرف بہ حرف دیوانگی ہونا چاہیے جیسے شبلی اور فرزانگی کو بھی مکمل ہونا چاہیے جیسے حضرت جنید ہیں۔ حسین کیا کرنا چاہتا ہے۔"

منصور نے نہایت سکون سے کہا: "اس کی سرشاری اور دیوانگی' فرزانگی اور ہوشیاری کسی کے تتبع میں نہیں ہوں گی۔ سورج تو ایک ہی ہوتا ہے۔ دھوپ بھی ہر جگہ خشک و تر، بحر و بر پر ایک ہی قوت سے برستی ہے مگر کچھ چیزیں تپش پکڑ کر دھوپ بن جاتی ہیں تمازت منعکس کرتی ہیں آئینے کی طرح اور کچھ روشنی کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں۔ اس کا مزاج بدل دیتی ہیں۔"

"آپ یہ زرتشی فلسفہ مجھے نہ پڑھائیں۔" اقطع بہت خفا تھے۔ "اس کیفیت سے جو سحر طرازی لگتی ہے حسین کو نکلنا چاہیے۔ اس کا مسلک کیا ہے۔"

"آپ حسن کے نانا اور زینب کے والد ہیں اور میں اس دشنام طرازی کو آپ کے مزاج کا حصہ سمجھ کر بھول سکتا ہوں۔" منصور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

عین اس گھڑی انہوں نے حامد بن عباس کے ملازم خاص عمار کو آتے دیکھا۔ عمار نے گھوڑے کی باگ خادم کو پکڑائی۔ وہ ننگے پاؤں اندر آیا اور اجازت چاہی کہ حسین

بن منصور سے ملاقات کرنے کا خواہشمند تھا۔

اقطع اور منصور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"ان سے ملاقات ممکن تو ہوسکتی تھی۔" اس نے استفسار کیا۔

"کیوں نہیں۔" منصور نے بہت خوشدلی سے کہا۔ اسے خوشی تھی کہ اقطع کے سوال جواب رُک گئے تھے۔

"وہ مراقبے میں ہیں اور اس وقت ملاقات شاید نہ ہوسکے۔" اقطع بغداد کے مزاج سے واقف اور امرا کے درباروں کی وضع داری سے خوب آشنا تھے۔

عمار کا اٹھا ہوا قدم رُک گیا۔ وہ نہایت حیرت سے ان دونوں بزرگوں کو دیکھنے لگا۔

"آپ انتظار کرلیں۔" اقطع نے خانقاہ کے نیم روشن اطاق کی طرف اشارہ کیا۔

پھر اقطع اور منصور اس کو حیران چھوڑ کر اندر کی طرف بڑھ گئے۔ حسین کاغذ پر جھکا ہوا نہایت تیزی سے کچھ لکھ رہا تھا۔

"یہ کیا لکھ رہے ہو؟" اقطع نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

"قرآنِ حکیم کا جواب۔" حسین نے سر اٹھائے بنا جواب دیا۔

"قرآنِ حکیم کا جواب۔" دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ "کیا دیوانے ہوئے ہو۔" منصور کی آواز میں خوف اور اقطع کے سوال میں تمسخر تھا۔

حسین نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر لکھے ہوئے اوراق کو سمیٹ کر ایک طرف رکھ کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔

"میں کلامِ پاک کی کچھ آیات کی تفسیر لکھ رہا ہوں اور یہ سوال کا جواب دینے اس کو حل کرنے ایک گتھی کو سلجھانے اور اپنی عقل سے اس اسرار تک پہنچنے کی کوشش ہی ہے۔" حسین نے کہا۔

"کیا عقلِ انسانی کی موشگافیوں میں ابھی کچھ اور اضافے باقی ہیں۔" اقطع کی آواز کانپ رہی تھی۔

"یہ اضافے نہیں ہیں عم بزرگوار۔ یہ تفاسیر ہیں۔ آپ سے زیادہ ان باتوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔"

حسین کا جواب مختصر تھا۔ منصور خاموشی سے بیٹے کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر اقطاع کی طرف بھی جو مجسم قہر نظر آ رہے تھے۔

"میں نے اپنی نہایت ہی عزیز متاع اپنی بیٹی کو تم سے بیاہ کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ تم تو زود یا بدیر اپنے انجام کو پہنچو گے مگر اس کا کیا ہوا۔ کیا عقلِ انسانی کی موشگافیوں میں سے ایک یہ نہیں کہ ایک عورت کی زندگی نوحہ بن کر رہ جائے۔ تم کوچہ بہ کوچہ قریہ بہ قریہ گھومتے ہو اور اپنی دیوانگی کی وجہ سے شہرت حاصل کر چکے ہو مگر......"

شدتِ جذبات سے ان کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔

منصور نے کہا: "جان پدر! حامد بن عباس کا غلام عمار حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔"

"بسم اللہ۔ اجازت ہے۔" حسین نے کہا۔

اقطع نے کہا: "اپنی ان تصانیف کو الگ کر لو۔ امرائے دربار کبھی کسی کے در پر نیک نیتی سے نہیں آتے۔ سواری پر نہیں اور غلاموں کی ایک نفری کے ساتھ نہیں۔ وہ تمہیں لینے آئے ہیں اور کل کا سورج پتا نہیں تمہارے لیے کہاں طلوع ہو۔"

حسین حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

"مگر میں نے ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کیا جو کسی امیر سے میرے ٹکراؤ کا باعث ہو یا میرے اور اس کے راہوں کو کاٹتا ہوا گزرے۔ میں گوشہ نشین درویش ہوں۔ وہ مجھے کیا کہیں گے۔"

اس سے پہلے کہ اقطع کوئی جواب دے سکتے منصور عمار کو لے کر اس حجرے میں داخل ہوئے۔

"حسین! یہ عمار ہیں۔"

عمار نے کتابوں کے ڈھیروں اور اوراق کے ذخیرے کی طرف دیکھا اور بیٹھ گیا۔ پھر نگاہیں جھکائے رہا جیسے اس وقفے میں بات کرنے کے لیے لفظ جمع کر رہا ہو۔

"ہمارے امیر حامد بن عباس آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔"

"میں صبح سے ہی اس طلبی کا منتظر تھا۔ چلیئے۔" حسین نے یہ بات اتنی اچانک اور بے ساختگی سے کہی کہ منصور اور اقطع عمار کے ساتھ حیران ہوئے۔

عمار نے کہا: ”میں ذاتی طور پر آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اعیانِ سلطنت کو روحانی قلم رو کے لوگوں سے تعرض نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں اور چاہوں گا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ کوئی حکم نہیں۔“

”حامد بن عباس یہاں آسکتے تھے۔ فقرأ کے آستانوں پر امرأ حاضر ہوتے ہیں۔“ اقطع نے بات کی۔

عمار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منصور اب پریشان اور مضطرب تھے مگر حسین نے عمامے کے الجھتے ہوئے پیچ بھی درست نہیں کیے اور عمار سے پہلے دہلیز پار کر گیا۔

اس کے جانے کے بعد اقطع اور منصور چپ بیٹھے رہے اور حجرے کی ٹھنڈک یں ان کے دل اندر ہی اندر کپکپاتے رہے۔

جانے کیا ہو؟ ـــــ خدا ہی جانے یہ کیسی طلبی تھی؟ ـــــ کیوں حامد بن عباس نے حسین کو بلایا تھا؟ ـــــ اقطع جانتے تھے کہ وزیرِ دولت نہایت بدمزاج، سخت گیر ور تقریباً ظالم آدمی تھا۔ اس نے بکھرے ہوئے ماضی کو جوڑ کر جو عمارت اپنے لیے میر کی تھی اس پر ظاہری صورت اسے عزیز تھی۔ مگر حسین کس طور اسے مطلوب ا؟ اس کو وہ سمجھ نہیں سکتے تھے۔ دولت و جاہ عہدہ اور دنیاوی وسائل جن کی لوگوں کو لاش رہتی تھی، حسین کے پاس نہ تھے۔ وہ نہایت کم آمیز تھا۔ دربارِ خلافت کے کسی ی امیر سے اس کی ملاقات نہ تھی۔ پھر وہ کیوں بلایا گیا تھا؟

منصور ابھی تک حیرت میں گم تھا۔

”اس کا بیٹا حسین دنیاوی طور پر نہ صرف یہ کہ قلاش تھا بلکہ اسے دولت کی تمنا ی نہ تھی۔ وہ ایک گوشہ نشیں صومعہ میں رہنے والا بے ضرر انسان تھا جس کے نائد شدید اور مطالبات شدید تر تھے۔ جو نہایت مضطرب روح رکھتا تھا اور نوافل میں ت دن منہمک تھا۔ اسے ذات خداوندی سے عشق تھا اور یہ آتش اس کی جان کو جلا تھی۔ وہ ماسوا کو ہیچ اور پوچ سمجھتا تھا اور اس کی طلب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اسے ڈر تھا دن اس کے بیٹے پر کفر کا الزام نہ لگ جائے، کیونکہ وہ اتنا مگن تھا کہ اپنے آپ کو بھی لا ہوا تھا۔ اس کے شوقِ بیکراں، اس کی منزل کیا تھی۔ اس کا سوال کیا تھا۔ اس کا یہ کس لیے تھا؟ اس کی طبع ہر شے سے بلند تھی اور اس کا مشرب ایک شفاف رودِ رواں

تھا۔ وہ جستجوئے زندگی کے صحرا میں پیاسے اور جاں بلب انسان کی طرح بھاگ رہا تھا۔ اس کی نگاہ آلودہ نہ تھی اور اس کی جان کی بے تابی راہِ شوق میں دیدنی تھی۔ ایک فروزاں شعلہ کہ جس کو دیکھ کر اس کا دل پگھل جاتا تھا اور حلق کے قریب دھڑکتا تھا۔"

منصور کو ریشم بُننے والوں کی وہ بستی یاد آ رہی تھی۔ اپنا باپ محمّی یاد آ رہا تھا۔ سیاوش اور ہندی سوداگر اور یادوں کی یورش سی تھی جو اس کو شکست دینے کے لیے اس کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

مسموم ہوا کے طوفان میں گھرا ہوا وہ اکیلا تھا اور اقطع اس کی کوئی مدد نہ کر سکتے تھے۔

"سیّدی! اب آپ آرام فرمائیں۔ حسین کی نگارشات کو جمع کر کے بند کر لیں اور اس کا انتظار نہ کریں۔" اقطع کی آواز کہیں دور سے آ رہی تھی۔

"کیوں۔ آخر کیوں؟" منصور نے تڑپ کر کہا۔

اقطع نے کہا: "آپ زینب سے بہت محبت کرتے ہیں اور حسن سے بھی' اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں اور یوں بھی مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ اوّل و آخر اس میں مَیں ہی ذمہ دار تھا اور رہوں گا۔ یہ اطلاع دینا بھی اس لیے میرا ہی فرض ہے کہ بغداد میں اب حسین کا قیام ممکن نہیں ہو گا۔"

"کیوں۔ آخر کیوں؟" منصور نے اقطع کا بازو زور سے تھام لیا تھا۔

"اس لیے کہ بغداد کا شحنہ حامد بن عباس کا خاص الخاص ساتھی ہے اور وہ نہ آدمی کی عزت کرتے ہیں اور نہ آدمیت کی۔ وہ تو خلیفۂ وقت کو بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ جو آدمی ایک بار ان کی بارگاہ میں بلایا جاتا ہے لوٹ کر نہیں آتا۔"

"کیا ایسا ہونا ممکن ہے۔" منصور نے نہایت آزردگی سے پوچھا۔

"خلافتِ عباسیہ اب اپنے وقار کے آخری سانس لے رہی ہے اور ایک نہایت بدترین شخصی طوائف الملوکی کا دور ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ دربار پر ایسے امرأ قابض ہیں جو اپنی ہر جائز اور ناجائز بات منوانے کے لیے اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔ فوج کی ابتری عمائدین سلطنت کی بے حسی اور بے بسی پھیلی ہوئی سرحدوں کی طرف سے بے رُخی حکومتوں کے زوال کی نشانیاں ہیں۔ پھر مشرق و مغرب میں نئے نئے فتنے اور ان کو ختم

کرنے کی طرف سے چشم پوشی اس بات کی دلیل ہے۔ عوام کے مسائل اوران کی حالت کی طرف سے مکمل اغماض۔" اقطع ذرا رُکے تو منصور نے پوچھا:

"مگر حسین کا تو کسی بھی شعبۂ زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ دربار کی زندگی اس کے لیے ایک بُرا خواب تھی جو اس نے بھلا دیا تھا۔ یکسر۔"

"اس کے عقائد مختلف ہیں اور کیا یہ وجہ کافی نہیں۔" اقطع نے سوال کیا۔

"میں نہیں سمجھتا جب اس کا اثر دوسروں کے عقائد کو نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کو آرزو ذاتی اور اس کے شدید اشواق بھی اس کے اپنے ہیں جو اسے آتشِ زیرپا رکھتے ہیں۔ نوافل اور عبادات میں وہ غلو کرتا ہے مگر یہ کیا قابلِ گرفت ہیں؟ ہاں البتہ حضرت عمرو بن عثمان مکی اس کے مخالف ہیں مگر ان کی وجہ عالمگیر تو نہیں۔" منصور بحث میں کبھی نہیں الجھتا تھا مگر حسین کے لیے۔

"خدا سے دعا کریں کہ زمانہ مخالف ہو تو ہو خدا مخالف نہ ہو۔" اقطع نے نیک نیتی سے کہا۔

"خدا مخالف نہ ہو۔" منصور نے بھی اسی آواز میں کہا۔ "مگر کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ زمانہ مخالف ہو جاتا ہے اور خدا راضی ہوتا ہے۔"

"خدا کو کس نے دیکھا ہے۔ ہم زمانے کو خدا کہتے ہیں۔" اقطع نے آہستہ سے کہا۔

دوپہر شام میں اور شام گہری شام میں اور پھر رات میں بدلی مگر حسین لوٹ کر نہیں آیا۔

ناموافق ہواؤں نے منصور کے دل اور دماغ میں اپنے جھکڑوں سمیت قبضہ کر لیا۔ صحرا کی زہر آلود آندھی نے بغداد کے ایک دور افتادہ نیم تاریک حجرے کو تاکا تھا۔

کیا زمانہ خدا تھا؟

"غلام سمری نے کہا ہے تم سحر جانتے ہو اور دلوں کا حال بتا سکتے ہو؟" حامد بن عباس نہایت غضب ناک اپنی نشست پر پہلو بدل رہا تھا۔

مسکرا کر حسین نے کہا: ”دلوں کا حال سوائے خدا کے کون جان سکتا ہے۔“

”مگر تمہارے غلام سمری نے ہمیشہ تمہارے متعلق یہی چرچا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے لوگ تمہارے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ تم کو خدا کہتے ہیں اور کئی باطنی علوم پر تمہیں عبور حاصل ہے؟“ حامد نے تیزی سے دوسرا سوال کیا۔

”سمری غلام ہے اور اس کے لیے تھوڑی سی خاص بات بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کا پیمانہ اور عقل معمولی ہے۔“ حسین نے نہایت قطعیت سے جواب دیا۔

”عوام اور خواص سبھی یہ کہتے ہیں جو شخص تمہارے قریب ہو تمہارے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔“ عمار نے حامد کے سامنے جھک کر کہا۔

”اگر یہ سحر اتنا زود اثر ہے تو پھر حاضرین محفل کو اب تک سوال کرنے کا وقت کہاں سے ملا۔“ حسین نے تھوڑا مسکرا کر ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

حامد نے عمار کی طرف اور عمار نے حاشیہ نشینوں کی طرف دیکھا۔ مجلس میں خاموشی چھا گئی تھی۔

جب سمری کو حاضر کیا گیا تو حسین اپنے سامنے لکیریں کھینچ رہا تھا اور لگتا تھا وہ اکیلا تھا۔ اپنے میں گم ـــــ جیسے وہ زمین کے اندر دور تک دیکھ رہا تھا۔

”تم کہتے ہو لوگ اسے سجدہ کرتے ہیں؟“ عمار نے سمری سے کہا۔

حسین نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ جیسے یہ باتیں اس سے متعلق ہی نہ ہوں۔

”بلیٰ یا سیّدی“ سمری نے آہستہ سے کہا۔

”کبھی تم نے اپنی آنکھوں سے لوگوں کو اس کے سامنے سجدہ ریز دیکھا ہے۔“ عمار نے پھر سوال کیا۔

”بلیٰ یا سیدی“ اس نے زور سے کہا۔

”کیا تم اس بات کو جھٹلا سکتے ہو۔ اگر کوئی جواب ہے تو کہو؟“ عمار نے آگے بڑھ کر کہا۔

”میں سمری کی بات کا جواب کیا دوں۔ اگر آپ لوگوں کو اس پر یقین ہے اور یہ سب سچ جانتے ہیں تو میری بات سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ حسین نے بدستور اپنے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

حامد بن عباس نے کہا: ''تمہیں اس بات کا جواب ضرور دینا ہے اس لیے کہ اس سے بڑا فتنہ روئے زمین پر اور کوئی نہیں۔''

حسین نے ہنس کر کہا: ''بس ایک سجدہ ہی تو سب سے مشکل ہے جو کسی جبیں کو صدیوں کے بعد عطا کیا جاتا ہے۔''

حامد اور عمار نے پھر نہایت گہری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''اگر تم اعتراف کر لو تو رہائی ممکن ہے۔'' عمار نے کہا۔

''اس سجدے کا اقرار جو میں ابھی کر نہیں سکا اس سجدے کا اعتراف جو ابھی یری جبیں میں خوابیدہ ہے۔ اس سجدے کا اقرار جس کے بعد یا سر رہتا ہے یا سجدہ۔'' سین بیٹھے سے کھڑا ہو گیا تھا۔

حاضرینِ محفل اور حاشیہ نشیں اور بغداد کا شحنہ اور موسیقاروں کی جماعت' ؤشامدیوں کی ٹکڑی اور قصیدہ گو شاعر سب سانس روک کر اگلے لمحے کا انتظار کرنے لگے۔

''منطق کے ان الجھاوؤں سے تم سوائے اپنے کسی کو بیوقوف نہیں بنا رہے۔'' امد نہایت بے چین تھا۔

حسین پھر اپنے آپ میں چھپ گیا جیسے بادلوں کی سیاہی مرغولوں اور پُر پیچ دبیز ‌ِاکی تہوں میں پوشیدہ ہو جائے۔

''کیا تمہیں رہائی کی ضرورت نہیں۔'' عمار نے پھر پوچھا۔

''میں جس کی قید میں ہوں وہ مجھے نہایت درجے عزیز ہے۔ اس کی ایک نگاہ ے لیے میں اس زندگی کو ہی نہیں ایسی سینکڑوں زندگیوں کو قربان کر سکتا ہوں۔ میری تی کیا شے ہے۔'' حسین کی آواز غم سے بے پناہ ہو رہی تھی جیسے اس میں گرج ہو اور ال ہو اور دبدبہ ہو۔ ''اگر میرا اپنا آپ مجھے لوٹا دیا جائے تو میں اسے پھر زیادہ شدت ِ محبت کے ساتھ اس در پر قربان کر دوں۔ بخدا مجھے رہائی نہیں چاہیے۔''

''یہ اپنے آپ میں نہیں دیوانہ ہے۔ اس کی باتوں میں کوئی مغز نہیں۔'' شمنہ ‌ِ کی باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''تم قرمطی ہو؟'' حامد نے سوال کیا۔

حسین نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

عمار نے سوال دہرایا: "حسین ابنِ منصور حلاج۔ کیا تم قرمطی ہو۔ تمہارے عقائد اور تمہاری باتوں سے کفر کی بو آتی ہے۔"

"جانتے ہو تکفیر کیا ہے؟" حسین نے سوال کیا۔

محفل میں سرگوشیاں ابھریں جیسے مکھیاں ایک دم متعفن ڈھیر پر بھنبھنائیں۔

"تمہیں خدا اور اس کے رسولؐ پر یقین کامل ہے؟" عمار نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا وہ دونوں الگ ہیں؟" حسین نے سوال کیا۔ "رسولِ خدا کی پیشانی میں کون سا نور تھا؟ کائنات کے وجود کا سبب کون تھا؟"

"تم حامد بن عباس کی بارگاہ میں ہو۔ جو پوچھا جائے اس کا مختصر جواب دو۔ سوال کرنا منع ہے۔" عمار نے اسے گویا مطلع کیا۔

"رسولِ خدا بشرِ کامل تھے۔ خدا کی ذات سے الگ۔" عمار نے کہا۔

شمنہ نے نہایت الجھ کر کہا۔ "عمار! یہ بحث طویل ہو جائے گی اور حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ اگر تم چاہتے ہو تو اسے قید خانے میں بند کر دو۔ تھوڑے دنوں میں جب اس کی طبیعت بحال ہو گی تو شاید یہ بقائمی ہوش و حواس تمہارے سوالوں کے جواب دے سکے۔"

اور انہوں نے حسین بن منصور کو بندی خانے میں بھجوا دیا۔ عمار نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا تھا:

"نامحرموں میں اسرارِ جاں کہنے کی وہی جگہ تھی۔"

حسین نے سر جھکا لیا اور حامد کے دجلہ کنارے محل کے تہ خانے میں سبک خرام رات ستاروں سے مزیّن ردا کو لہراتی تیزی سے رقص کرنے لگی تھی۔ تارِ حیات پر عشق کے مضراب سے نغمے چھیڑے جا رہے تھے۔

ان گنت دائروں کا تصور

پہلا دائرہ مشیت کا دائرہ ہے

دوسرا دائرہ ادراک کا ہے

تیسرا دائرہ قوت کا ہے
چوتھا اس کے علم کا دائرہ ہے اور ہیشگی کا
ابلیس نے کہا اگر میں پہلے دائرے میں داخل ہوتا ہوں
تو دوسرے میں میرے لیے موت ہے
اور اگر میں تیسرے میں رُک بھی جاؤں
تو انجام وہی ہو گا
اس لیے نہیں۔ نہیں۔ نہیں
میں پہلے دائرے میں ہی ٹھہرا رہوں گا
اور دوسرے سے مجھ پر لعنت برسے گی
میں تیسرے میں پھینکا گیا پٹکا گیا
اور میں نے چوتھے کو کھو دیا
مگر چوتھا تھا ہی کہاں؟ چوتھا دائرہ
اگر مجھے معلوم ہوتا کہ سجدہ میری نجات ہے
میری آزادی
تو میں آدم کو سجدہ کرتا
لیکن مجھے دائروں کے اندر دائروں اور ان کے اندر نا مختتم دائروں کا معلوم تھا
اور اس لیے میں نے اپنے دل سے کہا مجھے بخش دے۔ مجھے بخش دے
اگر میں مشیت کے پہلے دائرے سے باہر نکل سکتا
مگر اس کے بعد دائرے' اور دائرے
آہ! وہ جو یکتا ہے۔ اکیلا ہے۔ جو بھی ہے
کیسے ـــ بھلا کیسے۔ کیسے؟

حسین نے سوچا وہ جو عزازیل تھا اور فرشتوں میں صاحبِ عرفان تھا۔ مشیت کو سمجھتا تھا اور اس دائرے سے باہر نہ نکل سکا تو کون' بھلا کون؟ کیسے؟ کیسے؟ اس پہلے دائرے سے نکلا جا سکتا ہے جبکہ نا مختتم ان گنت بے شمار دائرے ہیں اور ایک سے ہی باہر

نکلنا مشکل ہے۔ رہائی کیسے ہو؟

بہر طور رہائی مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ کوئی مشیت سے کیسے بھاگ سکتا تھا۔

سوال کس سے کیا جائے۔

کون ‘کون اور جواب

ھُوا۔ ھُوا۔

اور یہ لفظوں کا گورکھ دھندا۔ لفظ بھی تخلیق ہیں۔ بھلا مخلوق سے خلق کرنے والی کی طرف اشارہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ تنہا اور یکتا ہے۔ کون سا لفظ اس کی تشریح کر سکتا ہے اور بنا لفظوں کے انسان کے مقدرات کو بھی تو سمجھا نہیں جا سکتا۔

اور حسین نے پھر تہ خانے کے نم فرش پر انگلی سے دائرے کھینچنے شروع کیے۔ نیم تاریکی میں دیواروں سے ٹکرا کر آوازیں لہروں کے ایک تسلسل کے ساتھ واپس آتیں اور ٹکراتیں اور لوٹ کر جاتیں اور آتیں اسے ان گنت لاتعداد دائروں کی طرح پھیلتی اور بڑھتی اور معدوم ہوتی اور پیدا ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہاں بہتر یہی ہے کہ پہلے دائرے سے باہر نہ نکلا جائے‘ جو مشیت کا دائرہ ہے نہیں اور نہیں اور نہیں۔ صرف ایک سجدہ اور اس کے بعد نہیں۔ نہیں اور نا مختتم ابا۔ بھلا جس نے آدم کو تخلیق کیا تھا کیا اس نے اس ہیشگی میں وہ راز پوشیدہ نہیں رکھا تھا جس تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس راز سے صرف وہی واقف تھا جس کی نگاہ نہ بھٹکی اور جس نے ادھر ادھر نہیں دیکھا۔

سوائے احمدؐ کے کسی نے اس کے یکتا ہونے پر صاد نہیں کیا

اور سوائے اس کے کسی پر رازہائے درونِ اسرار نہیں کھلے

ابلیس اپنے ہونے‘ اپنی ہستی کے غرور میں ٹھہرا رہا۔ اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا

اور احمدؐ کو دیکھنے کا

احمدؐ (خدا کی رحمتیں اُن پر ہوں) نے دائیں بائیں نہیں دیکھا نہ شمال کی طرف

ان کی نگاہ نہیں بھٹکی اور نہ انہوں نے غلط دیکھا

ابلیس نے ایک دعویٰ کیا مگر وہ اپنے آپ سے آزادی نہ حاصل کر سکا

نہ اس نے اس آتش سے رہائی حاصل کی جس سے وہ بنا تھا
اور نہ ہی اپنی ذات سے باہر آسکا
احمدؐ (خدا کی رحمتیں اُن پر ہوں) نے دعویٰ کیا اور فنا کو پار کر گئے
اور اپنی ذات کے دائرے سے نکل گئے
اور انہوں نے کوئی معاہدہ نہیں کیا

آدمی کی رہائی۔ قید و بند سے نہیں اپنے آپ سے ہونا تھی۔ فنا سے رہائی اور اپنی ہستی سے جو نیستی کی راہوں سے نکلتی تھی اور موت کی تمنا شدید تر تھی۔ جیسے ایک خوبصورت خواب ہو جنتوں اور قرب باری اور جلوۂ جاناں کا۔ آسمان کی بادشاہتوں کا۔ قلیل سے جلیل کا۔ کیونکہ سب کچھ فنا کی زد میں تھا سوائے اس کے۔

اس تہ خانے کی تاریکی میں وہ وقت کا حساب بھول گیا تھا۔ لاانتہا وقت پر کون نگران ہوا تھا؟

جب وہ باہر لایا گیا تو سیڑھیوں کی پھسلن سے اس کے قدم لت پت تھے اور حبشی اسے پیچھے سے سہارا دے کر اوپر لا رہا تھا۔ حامد بن عباس کا کمرۂ ملاقات خالی تھا جہاں شمعیں روشن تھیں اور نیم عریاں کنیزوں کے پرے دیواروں کے ساتھ تازہ گلاب کی بیلوں کی طرح آرائش محفل تھے چوکیوں اور بند دریچوں کے سامنے صراحیاں اور شیشے سجے تھے۔ حسین نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں سے یہ سب دیکھا اور نگاہیں جھکا لیں۔

"تمہیں ان سب چیزوں کا، اس زندگی کا شوق ہے؟" حامد نے حبشی کے جانے کے بعد اس سے پوچھا۔

حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم نظر اٹھا کر ہی نہیں قریب جا کر چھُو کر انہیں دیکھ سکتے ہو۔ اگر تمہیں کوئی پسند ہو تو وہ تمہاری ملکیت ہو گی۔" حامد نے کنیزوں کی طرف اپنے کوڑے سے اشارہ کیا۔

حسین پھر بھی خاموش رہا۔ جیسے کوئی بھی اس سے مخاطب نہ ہو۔

"کیا تم سننے اور دیکھنے کی قوتوں سے محروم ہو گئے ہو؟" اس سے پوچھا گیا۔

"میں سن اور دیکھ رہا ہوں مگر میری نگاہ بھٹک نہیں رہی۔ میں صرف سیدھا دیکھنے کا عادی ہوں۔" حسین کے جواب نے حامد کو چونکا ہی دیا۔

"سیدھا دیکھنے سے بہت سی ایسی چیزیں دکھائی دیتی ہیں جو دیکھی جانی نہیں چاہئیں۔" حامد نے بگڑ کر کہا۔

"مقدرات سے بھلا کون ٹکرا سکتا ہے۔" جواب نہایت صاف تھا۔

"اپنے کفر والحاد کو اب تم ان پردوں میں چھپاتے ہو۔" حامد نے مسکرا کر کہا۔

"مقدرات کی زد میں سب آتے ہیں۔ اگر یہ کفر ہے تو ایمان کیا ہے؟" حسین کا سوال کمرے میں گونجا۔۔۔ گویا در و دیوار' ساز و مضراب و شیشہ و صراحی' چراغ اور لوئیں یہ سوال دُہرا رہے تھے۔

"میں سوال پوچھنے کا عادی ہوں جواب دینے کا نہیں۔" حامد نے کنیزوں کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا جو پراسرار دروازوں سے نہایت مختصر وقت میں غائب ہو گئیں۔

"ابنِ منصور! یہ تماشا ختم ہو گیا۔ میں نے نہایت بے چین' بے خواب راتوں کے بعد آخر تم سے سوال کرنا مناسب سمجھا ہے۔۔۔ تم اغول کو کب سے جانتے تھے؟"

"موت تو آزادی ہے۔ سوالوں اور جوابوں کے تانے بانے سے ماورا۔" حسین نے پوچھا۔ "کیا کوئی ایک بار ان سرحدوں کو پار کر کے واپس آیا ہے کہ وجہ ٔنزاع بنے۔"

"میں سوالوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔" حامد بن عباس نے ٹہلتے ہوئے کہا۔
دونوں کے درمیان خاموشی کا وقفہ تکلیف دہ طوالت اختیار کر گیا تھا۔

"تم اس سے پہلی بار کب ملے تھے میں جاننا چاہوں گا؟" اس نے اس کے برابر کھڑے ہو کر کہا۔

"روحیں ازل سے اپنی پہچان میں نہایت تیز ہوتی ہیں۔ یہ ادراک ان کو ودیعت کیا جاتا ہے۔" حسین کا جواب نہایت الجھا ہوا اور نا قابلِ فہم تھا۔

"ابنِ منصور!" حامد نے درشتی سے کہا۔ "میرا صبر مت آزماؤ۔ میرے جذبہ ٔرقابت کو ہوا نہ دو۔"

حسین نے ہنس کر کہا: "ایک قیدی اور مقید کرنے والے کے درمیان رقابت

نہیں ہو سکتی ایک کے پاس اختیار اور دوسرے کے پاس مظلومیت۔"

حامد نے جھک کر حسین کے پاؤں میں سے بیڑیاں کھول دیں۔

"اب ہم دونوں برابر ہیں۔"

"حاکم و محکوم کب برابر ہوئے ہیں؟" حسین نے بیڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

حامد نے نہایت گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بیٹھ جاؤ ابنِ منصور۔"

"بارگاہوں میں جو بیٹھ گیا وہ اٹھ نہیں سکا۔ میں اگر اس جسارت کے لیے معاف کر دیا جاؤں تو بہتر ہو گا۔"

حامد عجیب بے بسی سے ایک تخت کے کنارے بیٹھ گیا۔

اب نہ کوئی حاکم ہے نہ محکوم۔ تم آزاد ہو اور یہ بارگاہ نہیں ملاقات کی جگہ ہے۔ اگر تم بھی اسی تخت کے کنارے بیٹھ جاؤ تو میرے سوالوں کے جواب بہتر طور پر دے سکو گے۔ ایک اچھی فضا میں نہایت سوچ سمجھ کر بہت کچھ یاد کر کے۔" اس نے دوسرے تخت کی طرف اشارہ کیا' جس کے قریب جام و مینا روشنی پکڑ کر اپنی شعاعوں سے جگمگا رہا تھا اور قوس و قزح سی پھیلی ہوئی تھی جو رنگوں میں ایک اور شے بن جاتی تھی۔

"اگر میں آزاد ہوں تو مجھ پر کسی سوال کا جواب دینے کی پابندی عائد نہیں ہونی چاہیے۔" حسین نے کہا۔

حامد اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"ہاں ابن منصور! تمہیں اختیار بھی ہے آزادی بھی۔ مگر ان سوالوں کے جواب بہر حال مجھے معلوم کرنا ہی ہیں۔ کوئی آزادی مکمل نہیں ہوتی۔ ہر قید و بند سے آزاد کوئی شے نہیں۔ نہ کوئی جذبہ نہ کوئی خیال نہ ہی کوئی انسان۔"

حسین اپنے سامنے مے و شیشہ کی طرف دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ صراحی اور جام آپس میں ٹکرائے اور نبیذ فرش پر بہنے لگی۔ روشنیاں بڑھ کر الاؤ بنیں اور دیواریں تمازتِ آفتاب بن گئیں۔

"تم بیشک جادوگر ہو اور بغداد میں تمہاری موجودگی دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث ہو گی۔" حامد نے تالی بجائی۔

حبشی نے حسین کو بازو سے پکڑا۔

"اسے لے جا کر عمیق ترین تہ خانے میں بند کر دو جہاں ہوا کا گزر بھی نہ ہو۔"

حامد نہایت بدمزہ ہو کر ٹوٹے ہوئے برتنوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کنیزوں کو بلائے جانے کا اشارہ کیا تاکہ نشست گاہ کو ازسرِنو آراستہ کیا جائے۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ سحر بھی ہوتا آدمی کو کون سی طاقت عطا ہوتی تھی جو عام لوگوں کو نہیں ملتی تھی کائنات کے کاروبار میں کیسے دخیل ہوا جا سکتا تھا۔ خدا کچھ لوگوں کو ایک خاص قوت کیونکر ودیعت کر دیتا تھا۔

اغول اور قہرمانہ اور گل رنگ کا معمہ اسی طرح تھا۔

یہ شخص قابلِ گردن زدنی تھا۔

حامد بن عباس کے دماغ میں گرم لہریں سی اٹھ رہی تھیں اور اسے اپنا وجود بادِ سموم کے لہریوں پر خس و خاشاک کی طرح لگتا تھا۔ جلتا ہوا اڑتا ہوا اور پھر بھی آگ کے بغیر بھسم ہونے سے ناآشنا ـــــ اس کی ساری زندگی بلکہ اس کے آبا کی زندگی برباد ہو گئی تھی۔ وہ جو آج سے پہلے اپنی کامیابی پر نازاں تھا' کیا نازاں تھا؟

حبشی نے حسین کے ساتھ پھسلواں سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا: "تم اب کبھی دن کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ تمہارا جرم کتنا سنگین تھا۔"

"سنگین!" حسین نے ہنس کر اس کے فولادی کندھے پر اپنا ناتواں ہاتھ رکھ دیا۔ حبشی کو محسوس ہوا گویا اس کے شانے کی ہڈی اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے۔ "آہ" کہہ کر وہ وہیں اندھیرے میں بیٹھ گیا اور نم ناک ہوا کے ساتھ جانے کس سوراخ سے روشنی کی کرنیں اندر داخل ہوئیں' کنیزوں کی طرح جنہیں رقص کے لیے بلایا جاتا تھا۔

جب حبشی کی ہاو ہُو بلند ہونے لگی تو حسین نے کہا: "برادر! تم اپنے شانے کو

سہلاؤ۔ خدا تمہیں شفا دے۔"

حبشی نے پیچھے مڑ کر اپنے قیدی کی طرف دیکھا۔

"سہلاؤ۔" حسین نے کہا۔

"اوہ۔اوہ" کی صدا اب سیڑھیوں میں گونجنے لگی تھی۔

حسین نے ہاتھ بڑھا کر کندھے پر رکھا۔ حبشی پلٹ کر اس کے پاؤں پر گویا گر پڑا تھا اس لیے کہ اس کا درد یک بیک غائب ہو گیا تھا۔

"تم قید و بند کے لیے نہیں پیدا کیے گئے۔ تمہاری تو پرستش ہونا چاہیے تھی۔ بخدا قید خانے سے زیادہ متعفن اور بری جگہ اور کوئی نہیں۔" حبشی اس اندھیرے میں بھی اپنے سیاہ چہرے اور سفید دانتوں کی وجہ سے دکھائی دے رہا تھا۔ گڑگڑاتا ہوا جیسے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو۔

دوست اترو اس سے پہلے کہ وزیر کا کوئی اور بلاوا تمہارے لیے آئے۔" حسین نے کہا۔

"سب چور دروازوں کی کنجیاں میرے پاس ہیں اور آزادی ایک لمحے کی بات ہے۔" حبشی نے پُر یقین نرم آواز میں کہا۔

"مجھے آزادی کی آرزو نہیں۔" حسین نے کہا۔ "نیچے اترو۔ روشنی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ محبت کو کوئی قید نہیں کر سکتا۔"

"یا شیخ! کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے۔" حبشی نے پوچھا۔

"یقیناً۔" جواب ملا۔ "تم اپنا فرض ادا کرتے ہو ___ خدایا! یہ بندہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے خدایا۔" حسین نے پکارا۔

اور بندی خانے میں روشنی قدم قدم اترنے لگی۔ تہ خانہ روشن ہونے لگا۔ راہ دکھائی دینے لگی اور باہر دجلہ اپنی لہروں اور شفاف پانیوں سمیت عجیب سرشاری کے عالم میں بہنے لگا۔ گویا صدف کی حفاظت کے لیے مستعد ہو رہا تھا جس میں ایک دُرِ یتیم پوشیدہ تھا۔

"یا شیخ! آپ بندی خانے سے باہر جانا پسند فرمائیں گے؟" حبشی نے نیاز مندی سے اس کے پاؤں چھو کر کہا۔

"بندی خانہ کہاں ہے؟" حسین نے چاروں طرف دیکھ کر پوچھا۔

حبشی نے دیکھا دیواریں ہٹ گئی تھیں اور دجلہ کا پانی خاموش اپنی حد میں مؤدب رُکا ہوا تھا اس کی نگاہ نے نہایت فاصلے پر پہاڑوں کو دیکھا اور برف کو اور جاری ندیوں کو چھوٹے چھوٹے آبشار بناتے چشموں کو سفید جھاگوں سے بھرے چاندی کے سیال نالوں کو اس نے ہواؤں کی تندی و تیزی اور برودت کو اپنی جان میں محسوس کیا۔ درخت جو غصہ ور طوفانوں میں پھنکارتے ہوئے اژدہوں کی طرح جھکتے اور سیدھے ہوتے دوہرے ہوتے اور کھڑے ہوتے تھے۔ روئیدگی اور پھول اور اُڑتے ہوئے پتے' لڑھکتے ہوئے پتھر جو بارش کی طرح نیچے وادیوں پر برس رہے تھے اور گڈریوں کی پھُوس کی جھونپڑیوں میں پناہ تھی اور آسرا تھا۔ اس نے بھیڑوں کا ممیانہ بھی سنا۔ جس کو قافلے نے نہیں روکا تھا۔ پھر چراگاہوں میں گھوڑوں کے ریوڑ دیکھے صحرا اور سمندر جیسے وہ بلندی پر ہو اور سارا تماشا اس کے سامنے ہو رہا تھا۔

خوفزدہ ہو کر اس نے حسین کی طرف دیکھا۔

"یا شیخ!" وہ اس کے قدموں میں جھک کر بولا: "آپ اس تہ خانے سے جا سکتے ہیں تو چلے کیوں نہیں جاتے؟"

"نہیں! ابھی اس کا حکم نہیں ہوا ہم جس کی قید میں ہیں اذنِ آزادی بھی تو ہو۔۔۔" حسین نے مڑ کر دیکھا۔

حبشی کی حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھیں جھک گئی تھیں۔

"خدایا۔۔۔ خدایا" حسین نے ایک سرد آہ کھینچی۔ دیواروں اور چھت' آبِ رواں اور روشنیوں اور اندھیرے' سب نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

"میں وزیر حامد بن عباس سے جا کر التجا کروں کہ آپ کو یہاں نہ روکے؟" حبشی نے کہا۔

"نہیں دوست تم ایسی کوئی التجا نہیں کرو گے قطعاً نہیں"۔ حسین نے جواب دیا۔

پھر سیڑھیوں کے سرے پر اس نے کوئی آواز سنی جو حبشی کو پکار رہی تھی۔

"عمار نے مجھے بلایا ہے خدا خیر کرے۔" حبشی تیزی سے اوپر کی طرف چڑھنے لگا اور حسین نے نوافل کے لیے کھڑا ہونے سے پہلے پھونک مار کر وہ چراغ بھی گل کر دیا

جو خدمت گزاری کی خاطر زنداں میں جلایا گیا تھا۔ زندانیوں کو روشنی اور چراغوں سے بھلا کیا تعلق؟ زندان کو عمیق ترین تاریک ترین اور متعفن ترین جگہ ہونا چاہیے۔ سیاہی کو کسی سفیدی کی حاجت نہ ہو پھر اس کی تکمیل میں سے روشنی اور خوشبو اور العصود خود ہی پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

عمار نے حسین کو بلایا تھا۔ حبشی نے اندھیرے میں ادھر ادھر ٹٹولتے ہوئے چراغ کو پھر سے روشن کیا اور منتظر رہا۔ پھر جب نماز طویل ہو گئی اور سیڑھیوں کے سرے پر عمار نے لٹکی ہوئی رسی کو پھر جھٹکا دیا اور دروازے کے اندر لگی گھنٹی بجی تو اس نے زور سے دھاڑ کر کہا:

"کیا نماز کا احترام نہ کروں؟"

اوپر خاموشی میں ایک طویل سیٹی بجی۔ حبشی بڑبڑاتا ہوا پھر سیڑھیوں کی طرف لپکا اور نمی کی شکایت کرتا ہوا بھاری قدموں سے چڑھنے لگا۔

"محبت" حسین نے سوچا۔۔۔ اشواق۔ محبت کا فاعل کون ہے؟ محبت کا منبع اور اس کی انتہا کیا ہے۔ اغول نے اتنی طویل محبت کی کیونکر؟"

اسے چشم باطن عطا کی گئی تھی۔ یہ محض اور صرف عطائے الٰہی تھا یا اس بینائی کے لیے مشقت کی گئی تھی؟

جیسے جیسے حسین سوچتا تھا اس کا دل ڈوبتا تھا۔ اس خوف سے نہیں کہ وہ حامد بن عباس کے سامنے جوابدہ تھا بلکہ یونہی کہ اب وہ نہیں تھی اور وہ اس راز کو اپنے طور پر سمجھنے کی جتنی بھی کوشش کرے کبھی آخری حتمی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے گا کہ یہ کس طرح ممکن ہوا۔ اسے بصرہ کا سفر اور قافلہ اور چاندنی رات سب یاد آ رہے تھے۔ محبت کرنے والی ایک روح، حسین نے اس سے کچھ نہیں چاہا تھا۔ کوئی فریاد نہیں کی۔ کبھی اس کی آہ بھی اس تک نہیں پہنچی۔ بہت دیر وہ خالی الذہن محض اغول کے نام کو اپنے خیالوں کی بھول بھلیوں میں پرواز کرتے دیکھتا رہا۔ جیسے اس کا وجود کچھ اور ہو وہ حسین نہ ہو اور اغول کی چاہت اس کے لیے اس کی اپنی ہی تمنا ہو۔ اغول نے اپنے آپ کو چاہا ہو وہ حسین اس سے اغول سے جدا نہ ہو اور دونوں کی آرزو ایک ہو۔ دونوں نے اپنے اپنے ندر اپنے خدا کو چاہا ہو۔ یا خدا نے ان دونوں کو چاہا ہو۔ ہاں بیشک خدا بندوں کو چاہتا

ہے۔ یہ دراصل اس کی آرزو اس کے اپنے لیے ہوتی ہے۔ آئینے میں جو دنیا ہے اس نے اپنا آپ دیکھا اور اپنے آپ پر خود ہی عاشق ہوا اور اپنے عشق میں گرفتار ہوا اور اپنی تمنا کی۔ خالق نے مخلوق کی تمنا کی۔ بے قرار ہوا۔ دوسرا تو کوئی نہیں تھا۔ وہ ہر طرف خود ہی جلوہ آرا تھا۔ ضو فگن تھا۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اغول کی طرح محبت کی جائے؟

کوئی فریاد نہ ہو۔ کوئی تمنا نہ ہو۔

محبت کا منبع بھی وہی ہو اور انتہا بھی' روح بھی وہی ہو اور تمنائے روح بھی وہی ہو۔

اس نے سوچا کہ اس کے جذبات میں صرف شدت تھی جیسے روشنی تو ہو مگر راہنمائی نہ کر سکے اور پھر وہ وقت گزر گیا تھا۔ اب اسے معلوم تھا انتہائے تخیل کی روشنی نے اسے جواب عطا کیا تھا۔ اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا' مشاہدہ کیا تھا کہ روح کو علم عطا کیا جاتا ہے اور وہ علم صرف خالق عالم عطا کرتا ہے۔ محبت بھی اللہ ہی کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ اس کی نگاہ خدا کی نگاہ ـــــ اس لیے کہ خدا انہی نگاہوں سے مخلوق کو دیکھتا ہے۔ وہ خود خدائے محبت ہے۔ روح کی نگاہ اس کی نگاہ ہے اور روح کے اشواق اس کا ثبوت ہیں۔ وہ خود ہی محبّ بھی ہے اور محبوب بھی محبت کرنے والے میں بھی وہی نگاہ ہے اور معشوق میں بھی وہی کار فرما۔ اغول کی محبت اور حسین کی محبت۔ دیوانوں اور فرزانوں کی لگاوٹیں سبھی جلوے تھے' جلوۂ جاناں۔ اب اگر حامد اس سے پوچھے اور وہ اس کے سوال کا جواب بھی دینا چاہے تو کیا دے سکتا تھا بھلا؟

وہ بندی خانوں' زندانوں کے فریبِ نظر سے اپنے آپ کو بہلاتے تھے؟

عمار نے اس سے پوچھا: "حسین ابنِ منصور حلاّج! کیا دوسروں کے دل کا حال معلوم کرنے کے شعبدے کے سوا بھی تم کچھ جانتے ہو؟"

"بخدا نہیں اور نہیں اور نہیں۔" حسین نے کہا۔

"پھر لوگ یہ فسانہ طرازیاں کیوں کرتے ہیں؟" اس نے نرمی سے کہا۔

"فسانہ طرازی کرنے والوں کے لیے کیونکر جوابدہ ہو سکتا ہوں۔"

"تمہارا مسلک کیا ہے؟"

"جو رسولِؐ خدا (میری جان اُنؐ پر قربان) لائے تھے۔"

بہت دیر عمار اور حسین کے درمیان خاموشی رہی جیسے کہنے کو بات باقی نہ رہی تھی۔

پھر عمار نے کہا: "اگر تمہیں آزاد کر دیا جائے تو کیا تم بغداد چھوڑ دو گے؟"

ابنِ منصور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

عمار نے پھر کہا: "میں سمجھتا ہوں ایسا کوئی خیال کسی کو رکھنے کا کوئی حق نہیں جو حقائق کے منافی ہو۔ شرعِ اسلامی کیا کافی نہیں کہ آدمی اس میں اضافے یا سعی کرنے لگے۔"

"آدمی کی کوئی حیثیت نہیں کہ وہ ایک ذرۂ ریگ بھی تخلیق کر سکے۔ ہم سب خالق کے محتاج ہیں۔" حسین نے کہا۔

خاتون گُل رنگ اور خاتون قہرمانہ دونوں تمہاری تلاش میں تھیں۔ گُل رنگ تو خیر مگر قہرمانہ کا ابھی تک کوئی نشان نہیں ملا۔" عمار کو گفتگو جاری رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

"گم ہونے والوں کی نشان دہی؟" حسین ہنسا۔

"تم بغداد سے چلے جاؤ۔ بغداد ہی کُل دنیا نہیں ہے۔" پھر ٹھہر کر اس نے کہا۔

"غلام سمری لوگوں سے بہت کچھ کہتا رہا تھا کہ تم مُردوں کو زندہ کر سکتے ہو۔ دلوں کا حال جانتے ہو۔ لوگ تمہیں سجدہ کرتے ہیں۔"

"قلوب کا مالک خدا ہے۔ سجدہ صرف ایک ہے اور زندگی کسی بھی آدمی کے اختیار میں کہاں ہے۔" ابنِ منصور نے آہستہ سے کہا۔

"بیشک غلام کی بات پر مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور قلوب کا مالک خدا تھا۔" عمار نے دل ہی دل میں کہا۔ "کیا محض مفروضوں کی بنا پر ایک بندۂ خدا کو قید رکھنا انصاف تھا۔" ـــــ اب کہ حامد بن عباس نے یہ کام اس کے سپرد کر دیا تھا وہ ابن منصور کو جانے دے گا۔ وہ نہ زندیق تھا نہ قرمطی۔ نہ ظہور مہدی میں یقین رکھتا تھا۔ ایک سادہ مسلمان جو محض اپنی عبادات میں غلو کی وجہ سے زیرِ عتاب تھا۔

"ابنِ منصور!" اس نے زمین پر بیٹھے ہوئے حسین سے کہا۔ "اگر تم مجھ سے وعدہ کرو کہ بغداد کو چھوڑ دو گے تو میں تمہاری رہائی کا بوجھ اپنے سر لینے کو تیار ہوں۔ وزیرِاعلیٰ حامد بن عباس پتا نہیں کیوں اتنی شدت سے تمہارے مخالف ہیں کہ جس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ اب کچھ عرصہ بعد ہی تمہارے متعلق استفسار کریں گے اور تم بغداد سے نکل جاؤ۔ اگر تمہارے پاس زادِ راہ نہیں ہے تو اس سلسلے میں بھی میں مدد کرنے کو تیار ہوں۔" اس نے اپنی لمبی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی تھیلی اس کی طرف بڑھائی۔ "چند موتی اور کچھ نقدی۔"

ابن منصور نے اس تھیلی کی طرف دیکھے بنا کہا: "نہیں۔"

"کیوں؟" عمار نے نہایت حیرت سے کہا۔ "کیوں! کیا تم حامد بن عباس کی قید سے رہائی نہیں چاہتے؟"

"میں چوروں کی طرح بھاگنا نہیں چاہتا۔ اگر میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں تو وزیرِ مملکت کو خود مجھے رہا کر دینا چاہیے تھا۔" حسین کی عجیب منطق تھی۔

عمار نے کندھے اچکا کر کہا: "وزراء عظام کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب کسی کو بے گناہ باندھیں تو پھر اس کے لیے جواز تلاش کر لیتے ہیں۔"

"ساری سلطنتیں اور سارے نظام باندھ کر پھر نہ چھوڑنے کے سہارے چلتے رہے تھے سوائے ایک شہنشاہ اور خلفاء کے۔" جواب میں ابنِ منصور نے کہا۔

"تمہارے ایسے ہی خیالات جو درویشی کے منافی اور جہاں بانی کی رسم کی نکتہ چینی ہیں تمہیں لے ڈوبیں گے۔" عمار نے مایوسی سے کہا۔ "مگر میں تمہیں یونہی رہائی کا مژدہ نہیں سنا رہا تھا۔ وزیرِ مملکت کا فرمان ہے کہ اگر ابنِ منصور وعدہ کرے کہ وہ بغداد چھوڑ دے گا تو ہم اس سے مزید تعرض نہیں کریں گے۔ اس شرط پر تمہیں رہا کیا جا سکتا تھا۔"

ابنِ منصور نے کہا: "ملک خدا کا ہے اور مجھے رہائی عزیز نہیں۔ بغداد میرا وطن نہیں۔ مگر ایسا وعدہ کیوں کروں جس کی کوئی وجہ ہی نہ ہو۔"

عمار نے حیرت سے بھنویں سکیڑ لیں۔ بہت دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا:

"بہر حال یہ میری عزت کا سوال ہے۔ میں نے وزیر حامد سے تمہاری سفارش کی تھی اور بغداد سے تمہیں کم از کم ایک سال کے لیے تو نکل جانا چاہیے تاکہ میری بات رہ جائے اور تمہیں گزند پہنچانے کی کوئی معقول وجہ اسے نہ مل سکے۔"

حبشی نگاہیں جھکائے نہایت بے تابی سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ ابنِ منصور کے قدموں میں جھک گیا اور التجا کرنے لگا کہ اس متعفن بندی خانے سے تو بہر حال رہائی بہتر تھی۔ خدا کا ملک تنگ نہ تھا۔ درویش کے لیے ہر جگہ برابر تھی اور اگر عمار نے اپنی شخصی ضمانت پر یہ اجازت حاصل کی تھی تو ابنِ منصور نہایت شفقت سے اس کی التجا پر نظرِ ثانی کر سکتا تھا۔

ابنِ منصور قافلے کے آخر میں اپنے پدرِ بزرگوار کے ساتھ بیٹھا جا رہا تھا اور سرشاری کی کیفیت جو تقریباً دیوانگی تھی اس کا احاطہ کیے تھی۔ بھلا اس کی قبولیت کیوں نہیں ہوتی؟ وہ سر جو اس کے لیے بارِ دوش تھا کیوں ہر دفعہ نہایت مہمل بہانوں سے اس کے کندھوں پر ٹکا رہتا تھا۔ یہ طویل انتظار تھا۔ سرخروئی کے لیے یہ نا مختتم انتظار تھا۔ جلوۂ جاناں کے لیے یہ شدید تڑپ تھی خواہش جس میں چین اور قرار نہ تھا کہ پردوں کے پار دیکھا جا سکے — محبوب کون ہے؟

جب پڑاؤ کی گھڑی آئی۔ چاندنی چھٹکی اور پہاڑوں کے دامن میں پھولوں سے بھرے کُنج مہکے تو قافلے نے قیام کیا۔ نَے نواز نے نغمے کا آغاز کیا۔ اونٹوں نے بلبلانا اور بچوں نے رونا بند کر دیا۔ نیند نے انہیں آلیا تھا۔ نغمہ اس کی جان کے اندر اتر رہا تھا۔ کیا روح اس کو پا سکتی تھی جو اس نغمے کی جان تھا۔

پھر بیتاب ہو کر درختوں پر سے پرندے اڑے' ریت میں سر چھپائے ہوئے حشرات الارض نے اپنے سر باہر نکالے اور ذرّوں نے اتنی چمک پکڑلی جیسے آفتاب ان کے اندر اتر آیا ہو۔ انسان اتنا بے تاب کیوں نہیں ہو سکتا کہ چمک پکڑ کر کچھ اور بن سکے۔ اپنی بے چین جان کا وہ کیا کرے۔

کائنات کے راز اس پر کیوں وا ہوں گے۔ وہ راز جو درختوں اور ذرّوں اور پرندوں پر وا ہو گئے تھے۔

منصور نے کہا:

"حسین! کیا تم ایک عام آدمی کی طرح زندگی کے دل میں پھر سے اپنی جگہ

حاصل نہیں کر سکتے۔ تم جس خدا کے لیے عبادت و ریاضت کرتے ہو وہ حضرت ابراہیمؑ کا خدا' صحابہ کرامؓ کا خدا' صدہا عظیم الشان آدمیوں کا رب اور مالک ہے۔ وہ انسان کو معمول کی زندگی گزارنے کا کہتا ہے۔ اور وہ ان سے دور کہاں ہوتا ہے؟ اسے پکارو تو وہ سنتا ہے۔ وہ تو قریب تر ہے۔ کسی سہارے کی حاجت نہیں۔ کسی واسطے کی ضرورت نہیں۔ تم کن بھول بھلیوں میں گم ہو۔"

"گم کہاں ہوں پدرِ محترم!" حسین نے باپ کی آنکھوں کی اس زخمی نگاہ کی تاب نہ لاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کہاں ہو؟" منصور نے پوچھا۔

کہیں نہیں۔ کہیں بھی نہیں۔ ہاں نہیں نہیں اور نہیں۔ اور وہ انکار کرنے والا تھا کہ اپنے انکار کو اس نے قبول کیا۔ اس پر اڑا رہا اور قانع رہا۔ حسین نے سر دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔

منصور نے کہا: "کیا تم مشیت سے لڑتے ہو۔ مقدر کو بدلنا چاہتے ہو۔ جو ہو اس سے نکل کر کہاں جاؤ گے۔"

حسین نے باپ کی طرف دیکھا جو نہ ریاضتوں میں لگا رہا تھا نہ تقدیر بدلنا چاہتا تھا۔ جو ایک معمولی ریشم کا سوداگر تھا مگر جسے زندگی کے راستے معلوم تھے۔ وہ اندھیروں اور روشنیوں کے درمیان بھٹک نہیں رہا تھا۔ جس کا سوال کوئی بڑا سوال نہیں تھا۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ اس کا کوئی سوال تھا ہی نہیں۔ منصور جانتا تھا کہ مشیت کے دائرے سے باہر نکلنا مشکل بلکہ ناممکن تھا اور اس نے حسین نے اپنی ریاضتوں سے کیا حاصل کیا تھا۔

زندگی کے دل میں پھر آباد ہونا اسے مشکل نہیں تھا' کیونکہ یہ مشیت تھی جس کا فرار ممکن نہ تھا۔

زینب اور حسن پر جیسے کسی ویران کنج پر برسوں کے بعد بہار آئی تھی۔ سرائے میں جو اب مہمان خانہ تھا' مہمان ٹھہرتے اور ریشم کے دور دراز سے آئے ہوئے سوداگر اس خاموش اور توجہ سے باتیں سننے والے منصور کے بیٹے کو حیرت سے دیکھتے جو کپڑے سے متعلق ہر گفتگو سن کر بھی سنتا ہوا نہیں لگتا تھا۔ جس کا وجود ایک بجھے ہوئے الاؤ

کی طرح تھا۔ راکھ ہونے کی سی کیفیت' بے کیف رنگ۔ ڈراڈرا مگر مضبوط جیسے پھسلواں گھاٹیوں پر سے اتر رہا ہو ـــــ پُراعتماد بھی اور بے یقین بھی۔ بے چین اور بے قرار آنکھیں بے خواب نگاہیں اور منصور اس کی خاطر داریاں کرتا تھا جیسے کوئی نہایت ہی معزز مہمان ہو۔ یہ چیستان تھی جس کی سمجھ انہیں نہیں آتی تھی۔ حسن کبھی باپ سے ہنس کر بات کرتا۔ اس سے عام معمول روزمرہ کی باتیں کرتا۔ گویاوہ ابھی اسے قدم قدم اس خارزارِ حیات میں چلا رہا تھا۔

وہ سرائے کے پرانے کمروں کو درست کر رہے تھے۔ کچھ دالانوں کو کنگوروں والے جاذبِ نظر اطاقوں میں تبدیل کر رہے تھے۔ حسن کو یہ جگہ بہت پسند تھی اور وہ یہیں پر آباد ہونا چاہتا تھا۔ بڑے صحن میں جہاں گھوڑوں کو باندھنے کے لیے سایہ تھا' اسے اٹھادیا گیا تھا۔ خانہ باغ میں تبدیل ہو کر وہ جگہ اچھی جاذب نظر ہو گئی تھی اور وسیع لگتی تھی۔ جاری پانی کے چشموں کی ایک نہر تھی' جو اس باغ کے درمیان سے گزرتی تھی اور حسن اسے ایک آبشار میں تبدیل کرنا چاہتا تھا جو پھیل کر پتھر کی سیڑھیوں پر سے گرے اور ایک حوض میں جمع ہو اور پھر چھوٹی چھوٹی نالیوں میں سے ہو کر واپس آبشار کی طرف لوٹ آئے۔

"یہ ایک اچھا معمار ہے جو کسی بھی عظیم الشان معبد کی تعمیر میں اپنے خیال سے جدت پیدا کر سکتا ہے۔" سیاوش نے کہا جو تستر سے ابھی واپس آیا تھا۔ "تستر دشتِ سُوس سے زیادہ خوبصورت تھا۔ نہروں اور جاری پانیوں اور ٹھنڈے کنجوں سے بھرا ہوا۔" سیاوش نے اعلان کیا۔

حسین نے نظر اٹھا کر اس کی مطمئن صورت کو دیکھا تو اس کے اپنے جی میں ایک ہوک اٹھی۔ کیا وہ اتنا پُرسکون ہو سکتا تھا۔ شورش بھرے زمانوں کے بعد کیا بالآخر وہ بھی سیاوش بن جائے گا۔ ہوا اور ٹھنڈے کنجوں کی محبت میں گرفتار۔ پھر اس نے اپنا جی بہلانے اور اس خیال سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے حسن سے کہا کہ وہ آبِ دژ کے کنارے ٹہلنے جانا چاہتا تھا۔

"ضرور جاؤ اور دیکھو کہ تمہاری غیر حاضری میں دنیا کتنی بدل گئی تھی۔" سیاوش نے کہا۔

بافندوں کی بستیاں دشتِ سُوس کی ریت کو دھکیلنے کے لیے بڑے بڑے بند تعمیر کر کے اب اس کنارے کے ساتھ ساتھ بس گئی تھیں جن کو نئے راعی اور نئے نقیب اپنا اپنا مرکز بنائے ہوئے تھے۔ صحرا کو عبور کر کے پہاڑوں سے اتر کر اپنے ریوڑوں کو لے کر کچھ قبائل نے آس پاس مستقل رہائش اختیار کر لی تھی اور اپنے مویشیوں کے لیے سردی کے سخت دنوں میں چارہ تلاش کرتے تھے۔ نئی نسلوں کے گھوڑے اور بھیڑیں بکریاں اور دودھ دینے والے جانوروں کی منڈیاں لگتی تھیں اور فضا بدلی بدلی تھی۔ خزاں کے دنوں میں اب بھی جھکڑ اٹھتے سرخ اور سیاہ ریگ چلتی اور اپنی جگہیں بدلتی مگر اس کی خوشبو اور انداز بدل گیا تھا۔ لہریوں میں وہ مسمومیت نہیں تھی جو جسم کو چھو کر جائے تو کھال کے ٹکڑے کر دیتی تھی۔ صحرا میں کھنڈروں کی شکست و ریخت کے ساتھ جو باریک سرخ غبار سا ہوتا تھا اب بھی تھا مگر وہ اب راہ کی رکاوٹوں کی وجہ سے سرائے تک پہنچ نہیں پاتا تھا۔ راستے چوڑے محفوظ تھے مگر کاروانوں کے لیے بڑی شاہراہ اب پرے ہٹ گئی تھی اور اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹیں خواب میں سنائی دینے والی آوازوں کی طرح دور سے آتی لگتی تھیں اور اس بدلے ہوئے ماحول میں حسن خوش تھا۔

حسین نے اسے بتایا کہ پُل کے اس پار ریشم والوں کی بستی تھی اور اس کا بچپن وہاں گزرا تھا۔ تو اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ آبِ دژ کے پانیوں کی چمک اور شاہراہ کی خاموشی۔ پچھلے پہر قافلوں کی روانگی' حدی خوانوں کے پراسرار گیت۔ یہ سب باتیں جو حسن کو نہایت حیران کیا کرتی تھیں اب اپنی اہمیت کھو بیٹھی تھیں۔ اس کے بیٹے کو آنے والے سوداگروں اور ریشم کے بدلتے بھاؤ اور کیڑوں سے زیادہ بڑے کوئے تیار کروانے کے طریقے پتا تھے۔ وہ اپنے دادا اور باپ سے بہتر دنیادار تھا۔ وہ محمی کا پڑپوتا تھا اور سیاوش کے کہنے کے مطابق نہایت عمدہ اور مکمل دنیادار تھا اس لیے اس سے زیادہ محبت کی جاتی تھی یا ہو سکتا ہے دنیا سے اس کے مطالبے ہی کم ہوں۔

حسین نے سیاوش سے کہا: ''دنیا سے میں نے کچھ چاہا تو نہیں تھا۔''

''برخوردار' پسرِ عزیز! نہ چاہنا ایک اور نادانی تھی۔ ہر آدمی اپنے ماحول سے کچھ لیتا اور اس میں کچھ جمع کر کے لوٹاتا تھا۔ اچھے معاشرے افراد کی وجہ سے ہی بہتر بنتے

تھے۔ اگر تمہارا کوئی مطالبہ ہی نہ ہو' تم کچھ لینا ہی نہ چاہو تو کیا واپس کرو گے۔ نظام حیات یوں درہم برہم نہ ہو جائے۔" سیاوش کا سر برف کا ایک تودہ لگتا تھا۔ وہ پرانی داستانوں میں رہنے والا ایک دیو تھا' جس کو اس کی قوم بھول کر پیچھے چھوڑ گئی تھی۔

خدا سے اس کا رشتہ بھی بنا کچھ دیئے مطالبہ ہی تو تھا اور اس نے اس راہ میں بھی کوئی بڑی قربانی تو نہیں دی تھی۔ آج تک اس کی ہاؤ ہو جنگل میں اکیلے پن کی چیخ و پکار تھی۔ اس نے کسی سے بھی تو کوئی رشتہ استوار نہ کیا تھا۔ ساری محبتیں اپنے آپ سے محبتیں اور ساری چاہتیں خود کی چاہتیں تھیں۔

نہیں۔ اس نے یہ بھی کہاں کیا تھا۔

یہ کھویا ہوا وقت تھا جس میں نہ تو اس نے اپنی خدمت کی تھی نہ دنیا کی۔

عمر کا زیادہ حصہ گنوا کر وہ اب اپنے ساتھ حساب کتاب کر رہا تھا اور دور تک سوائے خسارے کے اور کچھ نہ تھا۔

سیاوش نے کہا:

"برخوردار! تم جس دین کا اتباع کرتے ہو اس میں مجاہدوں کی فوج تھی۔ حوصلہ منداور بے دریغ جانوں سے بے نیاز لوگوں نے ہی تو دنیا کا نقشہ بدل ڈالا تھا۔"

اس نے اپنی جان گھلائی تھی اور حاصلِ حیات کیا تھا۔

جس دین کے راہ پر اس نے چلنا چاہا تھا اس کے لیے اس نے کیا کیا تھا۔

منصور اور حسن نہایت مصروف ہو گئے تھے کیونکہ سوداگروں کے آنے کا زمانہ قریب تھا۔ حسن ہمت اور خوشدلی میں بھی اپنے دادا سے بڑھ گیا تھا۔ خانہ باغ کے پھول مہمانوں کی تواضع' آنے جانے والوں کی ضرورتوں کا خیال اور پھیلے ہوئے کاروبار کی نگرانی اس نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ اس نے گھر پر رہ کر جو کچھ حاصل کر لیا تھا حسین نے مدرسوں' خانقاہوں' دربار اور فوجی مستقروں کے درمیان بھی نہیں سیکھا تھا۔ یہ سوجھ بوجھ جو اسے ملی تھی خون کی امانت تھی کیا وہ اس سے بہتر تھا۔۔۔

"یقیناً"۔۔۔ وہ نہایت حیرت اور مسرت سے بیٹے کو دیکھتا جو ہر کام اس سے بہتر طور پر کرتا تھا۔

آغازِ زمستان میں حریر کے خریدار ہمسایہ مملکتوں سے آنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ اور حسن مل کر تہ خانے کی صفائی میں لگے تھے اور پرانی یادداشتیں، نسخے، عبادت کی صدہا چھوٹی موٹی ضروریات جھاڑ رہے تھے۔ جب حسن نے اس سے پوچھا:

"کیا اس تہ خانے کو تھوڑی روشنی پہنچانے کے لیے باہر کی طرف سے ایک لمبا دریچہ نہ لگا دیا جائے تاکہ ہوا کا گزر بھی اس میں ہو سکے۔"

حسین بہت دیر سوچتا رہا۔ کس رُخ سے اس میں روشنی داخل کی جائے اور ہوا کے لیے کیا اہتمام ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ حسن کی آواز اسے سنائی دی۔

"یہ راکھ اور یہ چنگاریاں اور یہ سلگتی ہوئی لکڑی۔ اگر اس کی جگہ خالی ہو جائے تو اس آتش دان کو نہایت عمدہ سجاوٹ کے سامان سے آراستہ کیا جا سکتا تھا۔"

"یہ میرا ماضی ہے بچے اور بہت دور تمہارا بھی۔ ہمارے سفر کا یہ آغاز تھا۔ اس نشان کو رہنے دو۔ ورنہ ہم بھٹک جائیں گے۔ کبھی کبھار آغاز سے آدمی اپنے انجام کی طرف بہتر سفر کر سکتا ہے۔" حسین کو اپنا دادا محمی یاد آ رہا تھا۔

ہنس کر حسن نے کہا:

"تھوڑی سی راکھ ذرا سی چنگاری کو سنبھال کر رکھنا ہی اگر یادِ ماضی ہے تو عجیب یاد تھی۔"

"ہاں بیٹے! کبھی کبھار آدمی کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے اور کبھی نہیں آتی کہ آگے بڑھنے کے لیے ماضی کتنا ضروری ہوتا ہے۔" حسین کی بات کو حسن نے چیزیں ادھر ادھر کرتے ہوئے توجہ سے نہیں سنا تھا۔

"اب آباء کی امانتوں کو سنبھال کر رکھتے رہنے سے تو سوائے کباڑ اور فالتو ٹوٹی پھوٹی اشیاء کے کسی اور کے لیے جگہ ہی نہ بنے۔" حسن نے اسی ہنسی سے کہا۔ وہ بہت پر اعتماد اور تھوڑا سا خودسر تھا۔ اسے اپنی عقل پر ناز اور سارے کام اپنے طور پر نمٹانے کی صلاحیت سے بھی آگاہ تھا۔ پھر اس نے باپ کا ذکر ہی سنا تھا اور وہ اس کی زندگی میں زیادہ دخیل بھی نہیں رہا تھا۔ حسین کو اپنے قریب پا کر جہاں وہ خوش تھا وہاں کبھی کبھار

جھنجھلا بھی جاتا تھا۔ منصور میں جو سمجھ بوجھ تھی اور برداشت کا حوصلہ' دنیاداری اور بچوں کی بات سننے اور اسے سوچنے اور ماننے کی ہمت۔ دل کے اندر تک جھانکنے کی صلاحیت وہ حسین میں کہاں تھی اور اکثر یوں ہوتا کہ دونوں الجھ پڑتے اور منصور کو محسوس ہوتا کہ اس کا پوتا اس کے بیٹے کو ایک نہایت عزیز اجنبی مہمان سمجھتا ہے جسے آخر رخصت ہو جانا تھا اور جس کو چندے برداشت کیا جا سکتا تھا۔

زمستانی برف بار ہوا ہندی سوداگر کے لیے کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ چادر کو اپنے سر کے گرد لپیٹے ہوئے حسین اور اس کے بیٹے کو غلاموں کے ساتھ دیوار بناتے دیکھ رہا تھا۔ سردی میں ان کے ہاتھ سرخ ہو رہے تھے اور چہروں پر خون کی روانی تیز ہوئی جاتی تھی اور ہونٹ نیلے تھے۔ کلاہ نہ ہونے کی وجہ سے سر کے بال اڑے اڑے تھے۔

''تم لوگ کیوں اتنی محنت مشقت کرتے ہو؟'' اس نے حسین سے پوچھا۔

''یہ تو عین راحت ہے۔'' حسن نے کہا۔ ''اتنے زمانوں کے بعد میرے پدرِ بزرگوار زندگی کے کاموں میں حصہ لے رہے ہیں۔ گو مجھے معلوم ہے وہ اس زندگی کے عادی نہیں ہیں۔ صرف نہایت مضبوط سر ہی اس زمستان میں کندھوں پر ٹِکا رہ سکتا ہے۔''

حسین نے محبت اور تعجب کے ملے جلے جذبات سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

''سر کو ہوا سے بچانے کے لیے ایسی نرم اور گرم نہایت ہلکی ردا ٹھیک ہے۔ تمہیں معلوم ہے ہمارے پہاڑوں میں نہایت بلندی پر ایک پرندہ ہوتا ہے شاہ طوس۔ اس کے سینے کے پروں کے اندر روئیں ہوتے ہیں جو بے وزن اور بہت گرم ہوتے ہیں۔ اس کمیاب طائر کو کسی طرح مقید کر کے اس کے سینے کے پروں کو نوچا جاتا ہے اور جوان لڑکیاں سرد موسم کی طویل راتوں میں ان ریشوں کو سُوت بناتی ہیں۔''

''خوب۔ بہت خوب!'' حسن نے کہا۔ ''نہایت حسین خواب بھی تو اس تانے بانے میں بُنے جاتے ہوں گے۔''

ہندی نے کہا:

”آدمی نے اپنے آرام کے لیے دلچسپ اور عجیب چیزوں کا سراغ لگایا ہے۔ خدا نے دنیا بنائی تھی اور انسان اس کے ممکنات کو اپنے لیے بقدرِ توفیق فتح کرتا ہے۔ جویا رہنا غور کرنا نئے تجربات میں منہمک ہونا۔ راستوں کی تلاش' پہاڑوں کی دشوار گزار بلندیوں اور عمیق ترین گھاٹیوں میں اترنا' پانی کے اندر کی مخلوق کو زیر کرنا' ہواؤں کی حرکتوں' آسمانوں کی پہنائیوں روشنیوں اور اندھیروں' سایوں' ستاروں اور ان کی ناقابلِ تسخیر دنیاؤں کو اور پراسرار کائنات کے اندر دور تک دسترس رکھنا جس میں وہ محض ایک نکتہ ہے۔ نکتۂ پرکارِ عشق۔“

حسین کا مٹی پھیلاتا ہوا ہاتھ گویا معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ گھبرا کر ہندی نے کہا:

”تم کبھی ہندوستان آؤنا۔ وہاں ایسی برف بار ہوا تو نہیں چلتی مگر سردی میں تال اور تلیا' جوہڑ اور کنڈ سب کی سطح پر ایک باریک تہ برف کی جم جاتی ہے اور گھاس کے تنکوں پر شبنم ٹھہری رہتی ہے اور سورج ان قطروں کو سات رنگوں میں رنگ دیتا ہے۔ سارے میں قوس و قزح پھیلی رہتی ہے۔ پھر دم کے دم میں یہ رنگ ہوا میں گھل جاتے ہیں۔“

وہ دم لینے کو رُکا تو بادل کی گرج سنائی دی جیسے توپیں داغی جارہی ہوں۔ صحن میں گدھوں اور گھوڑوں نے اپنے پچھلے پاؤں زور زور سے زمین پر پٹخے۔ اونٹ بلبلائے۔

”اگر ہمارے ہاں کی برساتیں ان پر گزریں تو خدا جانے یہ کیا حشر کریں۔“ ہندی نے دریچے کو بند کرتے ہوئے کہا۔

حسین اندر آکر نشست پر ٹِک گیا۔ غلام جانوروں کو پناہ گاہوں اور محفوظ جگہ میں لیے جاتے تھے۔ اولے پڑنے لگے تھے اور چھتوں پر پردوں میں لپٹا ہوا تیز شور ہو رہا تھا۔ جیسے گیندیں لڑھکائی جارہی ہوں۔

”آپ کے ہاں برسات کا کیا مزاج ہوتا ہے؟“ حسین نے پوچھا۔

”گھٹائیں اُمنڈ کر آتی ہیں۔ باغوں پر دریاؤں پر بستیوں پر جھکتی ہیں اور گھروں میں اندھیرا گھسا چلا آتا ہے۔ انہیں ڈھانپ لیتا ہے۔ سیاہی کا طوفان سب طرف پھیل جاتا ہے۔ ہوا اپنے پراسرار راگ گاتی ہوئی چلتی ہے۔ شاندار' مان بھری' اس کے دامنوں میں جنگلوں کے پوشیدہ نغمے اور میدانوں پہاڑوں وادیوں کے گیت ملے ہوتے

ہیں۔اس کے باجے کی دھنیں سمجھ میں نہ آنے والی اور نہایت گہری ہوتی ہیں۔اس لمحے آدمی کی حیثیت ایک گھاس کی پتی سے بھی کم ہوتی ہے — کیونکہ گھپاؤں اور چوٹیوں کے اندھیرے اور روشنیاں' سرگوشیاں اور شورشیں' نرمی اور تیزی سب جمع ہو جاتے ہیں اور دل اتنے بڑے ساز پر گائے سُر اور لے سے مکمل نغمے کو اس کے آہنگ کو اپنے خون میں محسوس کرتا ہے۔ طوفان کا سارا آہنگ۔" ہندی نے بات ختم کی۔

"سارے طوفان اپنی اصل میں ایک ہوتے ہیں۔" حسین نے اپنے میلے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر سوچا۔وہ باہر جا کر انہیں صاف تو کر ہی لے۔

"طوفان دنیا کو حسین اور رہنے کے قابل بناتے ہیں۔یہ شعلوں اور صرصروں کی کشمکش سے پیدا ہوتے ہیں۔" ہندی نے گویا انکشاف کیا۔اس نے دریچہ کھول کر پھر باہر جھانکا۔باہر مسلسل سفیدی بڑھ رہی تھی۔ صحن میں درختوں کے تلے پتوں کے ڈھیروں پر شاخیں گر رہی تھیں — چیخ رہی تھیں۔

"طوفان تو گھاس کی پتی کے دل میں بلند و بالا کوہساروں کے شوقِ بے پناہ سے پیدا ہوتا ہے۔" حسین نے ہولے سے کہا۔

ہندی نے مڑ کر اسے گہری نظر سے دیکھا۔

"خوب' بہت خوب اور ناقابلِ یقین۔"

حسین مسکراتا رہا۔

اذانوں کی آوازوں سے بستی گونجتی رہی۔

"یہ گھاس کی پتی کی آرزو ہے کیا۔" ہندی نے ہنس کر کہا۔

"بیشک۔" حسین بھی دریچے میں آ کھڑا ہوا۔

"جب کوئی صدا بارگاہوں کو پار کر کے پردوں کو چاک کر کے عرشِ الٰہی کو چھو کر باریاب ہوتی ہے تو یونہی ہوتا ہے۔ ہوا کرتا ہے اور جس کی صدا نہیں سنی جاتی وہ ایسا ہوتا ہے۔" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "تھکا ہوا بھٹکا ہوا راندۂ درگاہ' محض اور صرف دیوانہ' راستوں کے کاٹنے کی جگہ پر ٹھہرا ہوا۔ ہر زاویۂ نگاہ سے بھلایا ہوا۔"

"ایسی ناامیدی کی باتیں کیوں کرتے ہو جب در بجایا جائے تو وا کیا جاتا ہے۔" ہندی کی آواز بہت نرم اور درد سے آتی ہوئی لگتی تھی۔افسوس سے بھری۔

''جواب ہی کافی نہیں۔ درد اکیوں نہیں ہوتے۔'' حسین نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''پکارنے کی لے تیز کرو۔ نوا میں اپنے آپ کو لگادو۔ گھلادو۔'' ہندی نے کہا۔

''ہم تو مٹی اور پتھر کے بتوں کو پکار لیتے ہیں اپنے ہاتھ سے اپنے خدا بنا کر اپنے رب تشکیل دے کر' انہیں سنوار کر' ان کو اس تخت پر بٹھا کر۔''

حسین اب شاید سن بھی نہیں رہا تھا۔ دریچے کے اندر اولوں کی کھٹکھٹاہٹ جاری تھی ملی جلی خوشبوئیں سب طرف سے احاطہ کیے تھیں۔

''حسین! مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کیا تم سمجھا سکو گے؟'' ہندی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کہیے؟'' اس نے بدستور باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''جمنا ہمارے یہاں پاک کرنے والی ایک ندی ہے۔ سوُرگ یعنی جنت کی ندی' بھگوان کرشن کے جسم کی روشنی لیے ہوئے اس کے کنارے دنیا کو چھوڑ کر بڑے آدمی بیٹھ جاتے ہیں' بیٹھے رہتے ہیں۔ خدا یا پر آتما جو بھی تم سمجھ لو۔ گیان یا فہم جو بھی تم اسے پکارو انہیں وہاں ملتا ہے۔ وہ بارش اور دھوپ۔ رات اور دن۔ سردی اور گرمی کی پروا کیے بنا وہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ جنگل اور آبادیاں ان کے لیے برابر ہیں۔ ان کی عبادتوں میں بڑے بھید ہوتے ہیں اور پھر بھگوان اپنی مہربانی کرتا ہے۔ ان کے من میں بستا ہے۔ ان کی آنکھوں کو عام لوگوں سے زیادہ روشنی ملتی ہے۔ انہیں بیتا وقت آنے والا اور جو ہے سب پتا رہتا ہے۔''

''یہ سب تو ہو سکتا ہے۔ ہو جایا کرتا ہے مگر اس سے زیادہ اس سے الگ۔'' حسین نے بے صبری سے کہا۔

''بندرابن میں میری ملاقات ایک مہاتما سے ہوئی تھی۔ اس سفر کے لیے ابھی میں اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔ جب میں نے ان سے دعا کی درخواست کی تو انہوں نے پوچھا' کہاں کہاں تک جاتے ہو؟''

میں نے فارس و بغداد کا نام لیا۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر انہوں نے کہا: ''روضہ'

رسولؐ کی زیارت کی ہے۔ سرزمینِ عرب کو دیکھا ہے؟''

میں نے حیرت سے کہا: ''وہ سارے مقامات میرے راستے میں نہیں ہیں اور پھر میں اس مذہب میں یقین نہیں رکھتا۔''

''وہ مذہب کوئی دوسرا نہیں ہے بیٹے۔ وہ سارے جہان کا مذہب ہے' کیونکہ رسولِ خدا رحمت للعالمین ہیں۔'' مہاتما تن کر بیٹھ گئے تھے۔ ''یہ ان کے نام کی برکت ہے کہ میں یہاں جمنا کے کنارے بیٹھا ہوں۔ یہ انہی کا فیض ہے۔ یہ کائنات ان کے لیے بنائی گئی تھی۔''

''مجھے لگا تھا میرا سانس رُک جائے گا۔ میرے فہم و خیال سے یہ بہت زیادہ تھا۔'' ہندی کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔

پھر حسین کو اپنا دل یوں دھڑکتا لگا جیسے پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل جائے گا۔

''مہاتما نے اپنے ہاتھ کو سامنے کی طرف پھیلایا۔ ''میرے حال پر جو کرم ہے جو نظر ہے وہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا اس لیے کہ میں تو روز ان کی زیارت کرتا ہوں۔ وہ تو دنیا کے لیے خدا کی محبت اور شوق کا اظہار ہیں۔''

حسین کو لگا اس کی جان لرزے سے زرد ہو رہی تھی۔ پتی کی آرزو اور اس کے خواب شدید تر اس کے اشواق نا قابلِ حصول' اپنی نارسائی پر اس کا نالہ' آتشِ سوزاں' شعلے کی کپکپاہٹ' اس کی لپک ہے۔ حسین نے سر زمین پر دے مارا۔ یہ جان کب تک اس کے راہ کو روکے گی۔ خشک اور زرد گھاس کی پتی طوفان کے دوش پر سوار ہونا چاہتی تھی۔ وہ اس بڑے نغمے کا حصہ بننا چاہتی تھی جو اسے معدوم کر دے۔ جو طوفان بن جائے۔ جو شعلہ بن جائے۔ جو اظہارِ شوق میں ساری دنیا کا احاطہ کر سکے۔ اس کے عشق کی شدت اسے اس سے ہمکنار کر دے۔

پھر حسن اور منصور اور غلام بھاگے ہوئے آئے۔

ہاں بہت دنوں با ہوش و خرد نہیں رہا جا سکتا۔ تھوڑی سرمستی ضروری ہے تاکہ آسمان کی پہنائیوں' وسعتوں اور خلاؤں میں پرواز کیا جا سکے۔ خروشِ جان نغمۂ سرمدی کا حصہ بن جائے۔ برقِ فنا کا نظارہ اس میں معدوم ہو کر ہی کیا جا سکے گا تاکہ برقِ فنا بن جا سکے۔

اے ساربان آہستہ چل کہ میری پسلیوں میں آگ ہے۔

قافلہ میں وہ دیوانہ بھی تھا جسے لوگ ابنِ منصور کہہ کر پکارتے تھے اور جس سے دور رہتے تھے وہ خاموش رہتا اور ایک ہی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا تھا۔ پھر کبھی کبھار گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ جاتا یہاں تک کہ کُوچ کا وقت آجاتا۔ منصور اسے حجاج کے قافلے کے ساتھ ارضِ حرم کی طرف لیے جاتا تھا۔ اس کی جان کی بے تابی اور شورش جو ہندی سے باتیں کرنے کے بعد سے شروع ہوئی تھی کسی طور کم نہیں ہوتی تھی۔ وہ دیواروں سے اپنا سر مارتا اور اپنے خون کو دیکھ کر خوش ہوتا۔ اس کی بڑھی ہوئی داڑھی اور بے ترشے بال خشک ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اس کے چہرے کے اطراف پہرہ دیتے ہوئے لگتے۔ کبھی جوشِ گریہ سے اس کا چہرہ آنسوؤں سے دُھل جاتا۔

"خدایا!" ــــ منصور دُعا کرتا۔ "میں تیرے حضور حاضر کرنے کے لیے اسے لیے آتا ہوں مگر تھوڑا ہوش تو دے۔"

خروش کرتی اس کی نگاہیں، بھٹکی ہوئی آنکھیں۔

وہ کیوں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مہاتما کی طرح اپنے سامنے ہاتھ پھیلا کر کیوں نہیں کہہ سکتا: "ہم تو انہیں روز ہی دیکھتے ہیں۔"

مہاتما نے دروغ بیانی سے کام لیا تھا۔

مگر وہ جو رحمت للعالمینؐ تھے۔ ٹھیک ہی تو تھا وہ دونوں جہانوں کے لیے رحمت تھے۔ بھلا کوئی تخصیص کیونکر ہو سکتی تھی۔

اونٹ پر چونکہ وہ سیدھا نہیں بیٹھ سکتا تھا اس لیے اسے ہودے میں بھی باندھ

کر بٹھایا جاتا۔ اسے کھانے پینے تک کا ہوش نہ تھا۔ کبھی وہ اپنے سر کے بال نوچتا اور سینہ کوبی کرتا۔ اس کی جانِ ناتواں طوفانوں کی زد پر گھاس کے تنکے کی طرح جانے کہاں محوِ پرواز تھی۔ جب اس کے ہاتھ کھول دیئے جاتے تو وہ آنکھ بچا کر ریت اپنے منہ اور آنکھوں میں بھر لیتا۔ اپنے بالوں میں ریت ڈالتا۔

منصور کی حالت دیدنی تھی۔ اس کو دعا کے لیے لفظ نہ ملتے تھے۔ وہ ہاتھ پھیلائے بیٹھا رہتا اور آسمان کی طرف دیکھتا۔ زمانے نے اس کے سر پر کیا خاک ڈالی تھی۔ وہ حسین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چپ چاپ خلا میں تکتا کیونکہ اس سے بات کرنے' جواب پانے اور ہوش میں لانے کی سب کوششیں بیکار تھیں۔ شورشِ ہاؤہو بھی نہیں۔ سانس روکے حسین اور بارگاہِ الٰہی میں بے لفظوں کی دعا کرتا منصور کرب سے اس کا اڑا ہوا چہرہ اور ڈوبتا ہوا دل۔ زندگی سے اس نے جو پایا تھا اسے کھو نہ دینے کا خوف' پتا نہیں وہ کون سی منزل تھی جب آدمی کو نہ خوف ہو گا اور نہ ڈر۔

یا ہو سکتا ہے اب حسین اس منزل پر ہو! قلب و نظر' ہوش و خرد' سب سے آگے نکلا ہوا۔

اور قافلہ رواں تھا۔ جاری پانیوں اور لبریز ذخیروں اور چاندنی رات میں زرد دکھائی دینے والے حوضوں پر سے گزرتا ہوا۔ جب یہ بستی دم لینے کو رکتی تو کوئی گانے والا اپنا طنبور نکالتا اور موت کی مدح میں اشعار گاتا۔

موت کے لیے اولاد پیدا کرو
اور ویرانہ بننے کے لیے عمارتیں تعمیر کرتے رہو
اور یاد رکھو تم سب فنا سے ہمکنار ہونے والے ہو
اے موت! تجھ سے کوئی مفر نہیں۔ تو آ کر رہتی ہے
تو میرے بڑھاپے پر اسی طرح حملہ آور ہو رہی ہے
جس طرح بڑھاپا میری جوانی پر حملہ آور ہوا تھا
اولادِ آدم منتظر ہے' منتظر'
تاکہ موت کی آندھی اس پر چھا جائے!

منصور اب خوشی اور زندگی کے انتظار میں نہیں تھا۔ مایوسی کفر تھی۔ وہ کہاں جائے۔

"مسلم کے درخت کے صدقے نواحِ کاظمہ میں ریشمی ریت کے ذرات کے صدقے' بادِ صبا اور بوئے مشکبو کے صدقے' میرے حالِ زار پر رحم کر۔"

منصور کو جو دعائیں یاد تھیں وہ پڑھ کر بیٹے پر پھونکتا۔

وہ رسولِ خدا کے حضور جا رہا تھا۔ حاضر ہونے اس در پر' ناصیہ فرسائی کرنے تستر میں حضرت شیخ کی انگلی کی سیدھ میں دیکھنے سے جو نظارہ اس نے کیا تھا وہ اس کے مقدر اور خوش بختی سے بڑھ کر تھا' اس کی دیرینہ آرزو پوری ہونے جا رہی تھی مگر کس طرح! اس نے ہمیشہ چاہا تھا وہ سر کے بل وہاں پہنچے۔

کاظمہ کی طرف سے ہوا چل رہی ہے

یا شبِ تاریک میں کوہِ اضم سے بجلی چمک رہی ہے

یہ ہوا آتش شوق کو دہکا رہی ہے' بجلی کی چمک دلِ دیوانہ کو شیفتہ بنا رہی ہے

قافلے والے ان سے دور ہی دور رہتے۔

وہ پیغمبروں کے لشکر کے پیشرو اور سردار کے حضور حاضری کے لیے تیار تھا۔

منارۃ القرون کے بیاباں میں عمود کی شکل کا ایک مینارہ تھا جس پر ہرن کے سینگ ہشت پہل عمارت پر جا بجا لگے تھے اور دور سے یہ شیر کی پشت کی طرح نظر آتا تھا۔ چُونے کا پختہ قصر اور اس کے دو برج تھے۔ فسانوں کی سی فضا تھی۔ مسافر طرح طرح کی کہانیاں کہہ رہے تھے۔ منصور نے چاہا حسین بھی حیران ہو مگر وہ اسی طرح سے بے پروا خاموش اور زمین کی طرف دیکھتا رہا۔ پانی کے لبریز حوضوں کی طرف دیکھ کر اس کے بدن میں کپکپاہٹ سی ہوئی مگر پھر وہی اداسی تھی۔

ثربالہ سے بھی وہ گزر گئے۔ بدویوں کے مکانوں میں انہوں نے آرام کیا۔

برکتہ المرقوم کے اونچے ٹیلے پر حوض سے نیچے چوبچے میں پانی گر رہا تھا۔ یہ راہیں جو پانی کی کثرت سے نہایت آباد تھیں زبیدہ بنت سفاح منصور پہلے عباسی خلیفہ کی دختر نیک اختر ہارون کی بیوی کی بنوائی ہوئی تھیں۔ شفاخانے اور آبادیاں اور معمورے اور زاویے اس نے زرِ کثیر کے خرچ سے بنوائے تھے اور مسجدیں تاکہ حجاج کو اور سوداگروں کے قافلوں کو کسی زحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ پھر عباسی حکومت کمزور ہو گئی۔ راہیں پُر خطر ہو گئیں مگر یہ نیکی کے کام اپنی ساری شفاعتوں سمیت قائم رہے۔ اب مکتفی باللہ

کے دور میں یہاں حسنی، حسینی، علوی، جعفری آباد تھے اور سقائی کر کے لوگوں کے کام کر کے اہلِ قافلہ کی خدمت سے اپنا روزگار حاصل کرتے تھے۔ دنیا سوائے عبرت کے اور کچھ نہیں۔

ہاں۔ اے نجد کی ہواؤ!

تمہارے سرور اور خنکی نے مجھے شاد کام کیا۔

مقام یسیرہ سے پانی کنویں کھود کر نکالا گیا مگر پانی کھاری تھا۔ صرف لوگ دودھ اور گھی اور گوشت لائے تھے اور منصور نے بھی کچھ خریداری کی۔ دام و درہم کے بدلے نہیں، صرف کپڑے کے بدلے۔ ریشم کے تھان لے کر وہ لوگ حیرت سے دیکھتے تھے اس لیے کہ اس نواح میں تو سادہ سوتی کپڑا بھی بہت محبت سے پہنا جاتا تھا۔

ان کی اگلی منزل دشتِ نجد کا وسط تھی۔

خوشگوار آب و ہوا۔ ٹھہری ہوئی دھلی ہوئی فضا، پاکیزہ موسم، صحت نفس اور قوت بدن کے لیے مفید۔ قافلے والوں نے سرشاری کی کیفیت محسوس کی۔ منصور نے سوچا شاید اس فضا کی برکت سے اس کے حسین کی جان بھی اپنے خروش میں کمی پائے اور دیوانگی سے باہر آئے۔ مقام قروری میں چوبچے اور تالاب بارش کے پانی سے بھرے تھے۔ قافلے والوں نے نہانے دھونے سے اپنی جان میں امن محسوس کیا۔ پانی کے سوتے پوشیدہ تھے اور خرچ کرنے کے باوجود اس میں کمی نہیں ہوتی تھی۔

وادیٔ عروس سے لگا ہوا ایک کشادہ میدان تھا اور نگاہ اس کی دوسری حد کو پا نہ سکتی تھی۔ اس دشت کے آخر میں وہ مبارک بستی تھی جس کو آسمان سے زیادہ شرف ہے جہاں شرافت کی باگوں اور مہاروں کے مالک، ازل کے بھیدوں سے واقف، علم و حکمت کا سرچشمہ دونوں جہانوں کے جسم و جان کی روح اللہ کے دوست سرداروں کے سردار، اللہ کے دلدار رسولِ کریمؐ مقیم تھے۔

منصور نے حسین کو روضۂ رسولؐ کی زیارت کے لیے لے جانا چاہا اور اس کے بیٹے نے یوں چھپنا چاہا جیسے وہ ان سب کچھ دیکھتی اور جانتی نگاہوں سے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ خرمے کے باغوں میں خوب رونق تھی اور آسمان سورج کی تپش کو تھامے ہوئے تھا۔ ہوائیں حدت تو تھی مگر دشت کی جسم کو جان کو جلانے والی لہروں

سے یہاں امن تھا۔ فرحت بخش جھونکوں سے صبح دم قلب و روح کو راحت ملتی تھی اور حسین کی شورشِ جان اور ہیجان میں سکون آگیا' مگر منصور کی نہایت عاجزی سے کہنے کے باوجود اس نے دشت سے بستی میں قدم نہیں رکھا۔ قافلے والوں نے بھی اپنی سی کوشش کی اور پھر شام کی نیلاہٹوں اور فضا میں نیچے اترتے اندھیرے اور اُفق پر دیر تک ٹھہری رہنے والی سرخی میں وہ سب آگے چلے گئے تھے۔

"یہاں سے آگے جانے کا اذن نہیں ہے کیا؟" منصور نے حسین سے پوچھا۔

اس نے سر کو نفی میں ہلایا۔ آنکھیں جھکا لیں۔ اپنے بکھرے ہوئے خشک بالوں پر ہاتھ پھیرا اور میل سے تقریباً نیلے ناخنوں کو اپنے جسم پر رگڑنے لگا۔

منصور نے اس کے ناخن تراشے۔ بہت دنوں کی گردِ سفر کو دھویا اور پھر وہ اسے دشت کے کنارے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ سفر جاری رہنا چاہیے۔ چلتے جانا ہی شرطِ زندگی ہے۔

دعاؤں سے معمور فضائیں امن کا شہر جس کی گلیوں میں خوشبوئے حرم نبویؐ ہے۔ منصور اس آتش سوزاں سے اس تشنگی سے اس انتظار سے بالآخر زندگی کی سب سے بڑی تمنا کی تکمیل تک پہنچا مگر کس طرح!

اس نے سوچا تھا جب وہ شہر میں داخل ہو تو پنبۂ پراں کی طرح اس کا وجود بکھر جائے۔ وہ نہ رہے۔ ہیبت و جلال والے اس مقام پر اس کی ہستی معدوم ہو جائے۔ وہ نہ رہے تو جی کا زیاں نہ رہے۔ ساقیٔ کوثر کی سخاوت سے وہ نوازا جائے تو سوچیں اور پریشانیاں حیران کرنے والے یہ معاملے سب ہی خود بخود سلجھ جائیں۔ شہنشاہ کے دربار میں وہ حاضر ہو تو ہیبت سے وہ گھاس کی پتی کی طرح تیز ہوا میں کانپے۔

اس نے وفورِ شوق سے اس سرزمین کو بوسہ دیا۔ اس کا جی چاہا ہر ذرے پر جبینِ نیاز جھکائے دربارِ شہنشاہ میں پہنچے تو سب کا سب سجدۂ شوق ہو۔ اسے زندگی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اور اس کو بہت زیادہ کی طلب نہ تھی۔ وہ تو بس حاضر ہو گیا تھا اور قبولیت دعا کے لیے عرض گزار تھا۔ اس کے لیے یہ سعادت بہت تھی کہ پیاسی جان کو ساقیٔ کوثر کے حضور باریابی کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ سیراب ہوا تھا۔ پہروں وہ روضۂ مبارک کی جالی کے سامنے دستِ سوال دراز کیے بیٹھا رہتا مگر مطمئن' وہ کوئی

بات نہ کہتا۔ الحاح و زاری نہیں کوئی خواہش نہیں۔ ایک لفظ نہیں دانائے سبلؐ ختم الرسلؐ سب جانتے ہیں۔

اسے اپنے مقدر پر رشک آتا تھا۔ وہ ایک گبر' آتش پرست' مظاہرِ قدرت کی پرستش کرنے والا' یک بیک ان شعلوں کی مستعار روشنی سے نکل کر نورِ مبین سے سینچی گئی کھیتی بن گیا تھا۔ مزرعِ گلاب۔

نواحِ نجد سے نہایت مخدوش خبریں آ رہی تھیں۔ قرمطی جو پہلے خلفاء کے عہد میں خاموش تھے اب مکتفی کے عہد میں پھر لوٹ مار مچا رہے تھے۔ قافلے لٹ جاتے تھے اور مسافروں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ وہ حوضوں کو پھٹے پیٹ والے اونٹوں کی لاشوں سے پاٹ دیتے اور سوتوں جاری پانیوں چو بچوں کو بند کر دیتے تھے۔ حجاج کے قافلوں کا سامان ان کے لیے بہت بڑی کشش تھا' کیونکہ منزلوں کے لیے وہ سامانِ تجارت بھی ساتھ رکھتے تھے۔ پھر جن چھوٹی حکومتوں اور صوبوں کو خراج کی رقم مرکز کی طرف بھجوانا ہوتی تھی وہ بھی ایسے قافلوں کو محفوظ سمجھ کر ان کے ہمراہ کر دیتے تھے سوداگر اور عام لوگ بہت بڑے بڑے قافلے بنا کر چلتے اور مسلح ہو کر حفاظت اور احتیاطی تدابیر اختیار کر کے۔ مگر اکثر یوں ہوتا تھا کہ قرمطیوں کے آوارہ ٹولے جمع ہو کر ایک لشکر کی صورت میں ایسے بڑے قافلوں پر شب خون مارتے۔ ان میں معزول شدہ حاکم' مفرور ملزم' قرمطی اور ان کے ماننے والے شامل ہوتے۔

زکرویہ باغی کی خبر ملی کہ مکے کی طرف بڑھا چلا آتا تھا۔

حکام نے اس قافلے کو جس میں منصور جا رہا تھا حکم بھیجا تھا کہ وہ اپنے رئیسوں اور کاتبوں' سرداروں اور قاصدوں سمیت سیدھے راستے سے ہٹ کر فید یا مدینے کی طرف لوٹ جائے کہ لشکر خلافت پہنچ جائے تو پھر بڑھے' مگر قافلہ سالاروں نے جن کے ساتھ مبارک القمی تھا اور احمد بن نصر بھی تھا' احکامات کی کوئی پروانہ کی اور بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ فاجروں سے ان کا آمنا سامنا ہو گیا۔ سخت لڑائی ہوئی اور قریب تھا کہ اہلِ قافلہ فتح یاب ہو جائیں' مگر قافلے کے درمیانی حصے میں جہاں عورتیں اور بچے جمع

تھے غفلت تھی اور قرمطیوں نے اپنے نیزے اونٹوں کی پسلیوں اور پیٹوں میں مارے۔ اونٹوں نے گھبرا کر اس موت کے سامنے حاجیوں کو کچل ڈالا' حملہ آوروں نے خوب تلوار چلائی اور سب کو قتل کر ڈالا۔ عورتوں کو جنہیں پسند کیا قتل کر دیا۔ مقتولین کو جمع کر کے ایک کو دوسرے پر رکھا اور بہت بڑا ٹیلہ تعمیر کر دیا۔ جن مردوں نے مزاحمت کی تھی اور ان کو شکست دینا چاہی تھی انہیں ایک قطار میں کھڑا کر کے انہوں نے پہلے دونوں ہاتھ اور پھر دونوں پاؤں کاٹے اور آخر میں ان کی گردن مار دی۔ قاتلوں کی عورتیں اور بچے پانی لے کر مقتولین کے درمیان گھومتے تھے اور جو پانی مانگتا یا جس میں زندگی کی ذرا سی رمق بھی ہوتی اس پر مطلع ہو کر قتل کر دیتے۔

منصور اونٹوں اور ہودوں' عماریوں کے ایک ڈھیر میں تقریباً دبا ہوا تھا۔ نیزہ اس کو کاٹتا ہوا آر پار ہو گیا تھا۔ مگر حیرت ہے وہ پھر بھی زندہ تھا۔ اس کی سانس چل رہی تھی اور وہ صحرا کی مشکبو ہوا کو یوں محسوس کر رہا تھا گویا کسی لمبی سرنگ کے آخری بند سرے پر وہ ہو اور ایک آدھ آوارہ جھونکے کی سانس اس تک پہنچے۔ ستاروں جڑا آسمان اور اس کی نیلاہٹ اس کی آنکھوں میں گھسی چلی آتی تھی۔

بالآخر وہ سکون سے روبرو تھا۔ اس نے زندگی کی سب سے بڑی آرزو کے مطابق روضۂ رسولؐ کی زیارت کر لی تھی۔ وہ حسین کے لیے متردّد نہیں تھا کہ اسے بارگاہوں سے باہر جب تک اذن باریابی نہ ہو ٹھہرے رہنا تھا۔ حسین آقائے نامدارؐ کے در پر تھا۔ اسے اپنی قسمت پر نازاں ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس بستی کے باہر تھا۔ حاضر تو تھا۔

ہوش و خرد کا معاملہ بالکل دوسرا معاملہ تھا۔

آگہی اور عشق۔

کیا کبھی آدمی آگاہ ہو پاتا ہے؟

یہ مکمل ترین خوبصورت ترین عشق تھا جو بالآخر اس تک پہنچا تھا۔ اسے ریشم بننے والوں کی بستی میں یک بیک جو لمحۂ فیض نصیب ہوا تھا ساری زندگی اس کی طویل سرگزشت تھی اور اب ان اونٹوں کے درمیان جیسے عرش نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کے لیے انہیں کھڑا کیا ہو پھر آسمان دھواں دھواں ہونے لگا۔ لمحۂ فیض اس کے پاس

ایک مغنیٔ آتش نفس کی طرح آکر کھڑا ہو گیا اور صدا دینے لگا اور چاروں طرف سے نغمہ ہائے شیریں اس کی طرف بڑھنے لگے اور شمعیں روشن ہوئیں اور چراغوں کی لو تیز ہو گئی اور پروانہ لپک کر شعلے کے اندر درّانہ گھس گیا۔ تاکہ اس کا راز معلوم کر لے اور بے کراں نینداس کے اوپر سے دائیں بائیں سے گزرنے لگی۔ جیسے فرشتے بارگاہوں اور ایوانوں پر سے تیز تیز گزریں اور ان کے پروں کی ہوا کو منصور نے اپنے اندر اور باہر محسوس کیا۔

اور پھر وہ سو گیا!

صحرا پر سورج کی آخری شعاعیں خرمے کے باغوں میں سایوں کو طوالت اور بُعد عطا کر رہی تھیں۔ ہوا ان کو جُھلاتی اور پُرہیبت بناتی تھی۔ مٹتی ہوئی سرخی میں اندھیرا مل رہا تھا اور خیموں سے دھواں آسمان کی طرف مائل پرواز' نیلاہٹ میں گہرا اور شام کے واحد نجمِ مغرب کو زیادہ روشن کر رہا تھا جب ـــــ حسین نے اناالحق کہا۔ بستی کے جوان اس کے پاس سے ہنستے ہوئے گزر گئے۔

ایک نے کہا: "یا سیّدی! یہ ذرہ کیا کہتا ہے۔" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

دوسرے نے اس کے قریب آکر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی جو مچ مچاتی ہوئی اور غلیظ تھیں۔ پھر ایک دم دور ہٹ گیا اور زور زور سے قہقہے لگانے لگا:

"خدا اتنا کمزور اور نحیف و نزار بھی ہو سکتا ہے۔ یہ اب پتا چلا ہے۔"

حسین کی خروش کرتی ہوئی آواز ـــــ ضرب لگا کر اس نے کہا: "اناالحق"

بچوں نے اس کے گرد گھیرا بنا لیا۔ گدڑی کو کھینچنے لگے اور اناالحق' اناالحق کا شور مچانے لگے۔

"اناالحق۔" حسین نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

قہقہوں اور شور و غوغا کی صداؤں سے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ایک نیا کھیل بچوں کے ہاتھ آیا ہے اور وہ اس کو پورے جوش اور ولولے اور ہمت سے سیکھ رہے ہیں۔

جو بہت شریر تھے انہوں نے اس کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی کو ذرا سا کھینچا:
"پھر کہو انا الحق۔"

وہ خاموش ہوتا تو اسے دیوانہ سمجھ کر وہ پھر اس کا مذاق اڑاتے۔ گہری شام میں جب صحرا کی طرف سے ہوا چلتی اور اس میں خنکی بڑھتی۔ ریت میں سے تمازتِ آفتاب کم ہوتی اور جھونکے شفق کی سرخی کو اڑائے لاتے۔ ذرے چمک پکڑ کر ننھے ننھے آفتاب بن جاتے تو وہ جو ذرا جوان تھے اور صحرا میں گھومنے پھرنے کو آزاد تھے' کچھ سمجھ رکھتے تھے اسے کہتے: "تم روضۂ رسولؐ کے قریب حرم نبویؐ کے پاس یہ کیونکر کہہ سکتے ہو۔"

"انا الحق۔" وہ سہمی سہمی سی' ڈری ڈری' بمشکل کھلتی آنکھیں جھکائے کہتا۔

مسجدوں میں اذانیں بلند ہوتیں جیسے وادیوں سے لہریا ریت تک پہنچنے کے لیے صرصر رعنائیوں کے ساتھ اٹھے اور اپنی بے پناہی کا ثبوت دے۔

"یہ تمہاری تقدیس ہو رہی ہے۔" اس کی گدڑی کو جھٹکا دے کر وہ کہتے۔

"بیشک بیشک۔" وہ سر کے اشارے سے کہتا "یہ میں ہوں۔"

"جب ہم تمہیں چھو رہے ہیں تو خدا کو چھو رہے ہیں۔" وہ نہایت بے صبری سے کہتے۔

"بیشک' بیشک۔ جو ہوا مجھے مَس کرتی ہے تو اُسے مَس کرتی ہے۔" وہ اپنے بالوں کو کھجاتے ہوئے کہتا۔

"واہ واہ۔ سبحان اللہ۔ سیّدی مولائی۔ آپ خدا ہیں۔" وہ چڑ جاتے اور ان کا جی چاہتا اس کے ساتھ اٹھکیلیاں کریں۔ اسے کھینچ کر دائرے میں لا کر اس کے گرد بے پناہ شور اور رقص کریں۔

"بیشک بیشک۔ جس طرح شراب اور پانی مل جاتے ہیں اسی طرح سے میں اور وہ مل گئے ہیں۔"

اس کی پیشانی پر کوئی شکن نہ تھی۔ آواز صاف تھی اور گرجدار جیسے اس پر کسی عظیم طاقت کا غلبہ ہو۔

وہ تھوڑا سا ڈرے اور پیچھے ہٹے تو وہ ہنسا: ''انا الحق۔''

وہ خندق کے کنارے کھڑا تھا جسے دشمنانِ دین کے ہجوم کے وقت رسولؐ خدا نے بنوایا تھا۔ کبھی کبھار وہ جھک کر اس کی گہرائیوں میں دیکھتا تو وہاں مجمع کیے ہوئے لوگ سوچتے وہ اب اس میں کود جائے گا۔ جیسے کشف ہو۔ اس نے ان کے خیالات پڑھ لیے اور زور زور سے سر سے اوپر لے جا کر بازو ہلانے لگا۔

''ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ پوری زندگی تو میں خندق میں رہا ہوں۔ اس میں سے ڈوب کر نکلا ہوں۔ کھلی فضا میں سانس لے رہا ہوں۔ ہر قید و بند سے آزاد ہوا ہوں۔ بھلا اب میں کیوں اس خندق میں کودوں گا۔''

لوگ حیرت زدہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

تھوڑی دیر خاموش رہ کر اس نے پھر کہا: ''انا الحق' انا الحق۔'' جیسے اسے ضد ہو اور نادیدہ طاقتوں کو یقین دلا رہا ہو۔ اس کے آتشِ شوق سے تپتے ہوئے جسم' بے پناہ روشنی سے بند ہوتی آنکھوں اور شدتِ احساس سے کانپتے ہاتھوں' راہِ محبت میں ادھر ادھر بھٹکتے قدموں کی لغزش دیکھ کر لوگوں نے کہا:

''پتا نہیں اس کا انجام کیا ہو۔ اس کا سودائے خام اسے کہاں لے جائے۔''

''انا الحق۔'' حسین نے خندق کے کنارے سے واپس آتے ہوئے کہا۔

''یہ کلمۂ کفر ہے دیوانے۔'' کانپ کر ایک کتاب اللہ کے حافظ نے کہا۔

''یہ نور جو تمہارے سینے میں ہے کیا اس کی روشنی میں بھی تم دیکھ نہیں سکتے کہ یہ کلمۂ کفر نہیں ہے۔'' حسین نے کہا۔

بہت دیر غور کرنے اور ٹھہرے رہنے کے بعد حافظ قرآن نے اس بات کو محض اتفاق سمجھا اور اپنے راہ پر چلا گیا۔ بھیڑ ہولے ہولے اس کے گرد سے چھٹ گئی اور وہ چشمے کے پانیوں خندق اور آسمان کی نظر کے سامنے اکیلا رہ گیا۔

نہیں۔ یہ کفر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقتِ الٰہیہ ہے کہ!
تمہارے اور میرے درمیان سوائے اس کے کوئی فرق نہیں
کہ تم خدا ہو اور مالک الملک (اِل الٰہیہ و ربوبیہ)
وہ تم جو میں ہوں

اور میں جو تم ہو
کوئی فرق نہیں تمہارے تُو اور میرے عین میں۔
سوائے ناسوت ولاہوت کے

اور یوں مدینہ منورہ کے باب الحدید کے سامنے اس نے نہایت عاجزی سے اس راز کو جو اس پر آشکار ہوا تھا اپنے لیے قبول کیا۔ ذرہ اپنی دانست میں آفتاب ہی نہیں آفتابوں کا خالق بن گیا تھا۔

وہ میری ثنا کرتا ہے اور میں اس کی ثنا کرتا ہوں
وہ میری حمد کرتا ہے اور میں اس کی حمد کوتا ہوں
ایک حالت میں مَیں اس کو قبول کرتا ہوں
اور اعیان میں مَیں اس کا انکار کرتا ہوں
وہ مجھے جانتا ہے مگر میں اسے نہیں جانتا
میں اسے جانتا ہوں اور اسے دیکھتا ہوں
وہ مجھ سے کیسے دستبردار ہو سکتا ہے جب
میں اس کی مدد کرتا ہوں۔ اس کی حمایت کرتا ہوں
اپنے علم سے میں اس کی تخلیق کرتا ہوں
اور ہم روایت پر اطلاع پاتے ہیں۔
میں اس کی تخلیقی منتہا ہوں

وادیٔ فاطمہ میں پتھروں کو تراشا جاتا تھا ان کو چھوٹی اور بڑی خشت سازی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور تیس فرسخ کا فاصلہ طے کرنے کے لیے مسجد نبویؐ تک جو اونٹ منتخب کیے جاتے تھے وہ نہایت خوبصورت ہوتے تھے اور بار برداری کے کسی اور کام میں انہیں نہیں لگایا جاتا تھا۔ ایسے ساربانوں کو ان کی خدمت سپرد تھی جن کا حسب نسب اعلیٰ تھا جو حافظِ قرآن تھے اور جو کاذب و فاجر نہیں ہوتے تھے۔ ان قبیلوں کے فرد معمار تھے جن کو شریف النفس ماؤں نے کبھی بے وضو دودھ نہیں پلایا تھا۔ جن کے

اسلاف نے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی تھیں۔

ترکوں کو رسول پاکؐ کی ذات سے جو انتہائی محبت اور بے پناہ عقیدت تھی حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد ان کی اجتماعی زندگی میں اس اسم مبارک سے جو تبدیلی آئی تھی اس کا انہیں اعتراف تھا۔ یہ عجز وانکساری بھی اس کا حصہ تھی کہ وہ قبول کیے گئے تھے۔ خلافت کے نہایت منصب ان کے لیے مختص ہوتے تھے اور اس سرزمین پر اجنبی ہونے کے باوجود دربار میں وہ سلطنت کے رکنِ رکیں اور بادشاہ گر تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ خاک کے ذروں کو حسن جاودانی بخشنے والا اور کوئی نہ تھا۔ وہ اپنی اصل کو بھولے نہیں تھے اور اس لیے خاص اجازت حاصل کر کے وہ مسجد نبویؐ کی تعمیر از سرنو کر رہے تھے۔

مدینہ منورہ امن کی بستی تھی اور وہ اس تعمیر کے باوجود پُرامن تھی۔ پتھروں کو دھویا پاک کیا جاتا تھا اور اگر کسی پتھر کو تراشنے کے لیے، کم و بیش کرنے کے لیے اٹھانا پڑتا تو اس کی تراش خراش وادیٔ فاطمہ میں ہوتی تھی تاکہ نواحِ حرم نبویؐ میں کوئی شور نہ ہو۔ معمار ہر ذرے پر دل باندھ رہے تھے۔

حسین اب وادیٔ فاطمہ سے دور صحرا میں نکل گیا تھا۔ اس کو یہ جرأت کہاں سے ملتی سوائے فیضِ الٰہی کے کہ وہ آستانۂ رسالتؐ پر حاضری دیتا۔ وہ تو بس دروازوں سے باہر ٹھہرا رہے گا تا آنکہ اسے اذن باریابی ہو کوئی اشارہ کوئی حکم اس کے لیے ضروری تھا۔ بارگاہ رسالتؐ مآب میں درّانہ گھسنے کا اس کا حوصلہ نہ تھا۔ لوگ چاہتے تھے کہ اسے باندھ کر ہی کیوں نہ ہو اس کے جنوں کی کمی کے لیے روضۂ رسولؐ کے قرب میں لے جائیں اور ان کنوؤں کے پانی سے اس کے سر کو پاک کریں تاکہ یہ شورش اس کی جان سے باہر آئے۔ وہ شفا پائے اور اپنا مقام عبودیت پہچانے اور انا الحق کہنے سے باز رہے۔ یہ کلمہ جس کو ادا کرنے کی سرخوشی نے اس سے ہوش و خرد چھین لیے تھے، وہ ہنستا چلا جاتا اور بھاگتا ہوا صحرا کی لہریا ریت پر گر جاتا جو ہوا کے دامنوں نے اس پر بنائے تھے۔

جب اکیلا ہوتا تو خاموش رہتا، ہجوم خلق میں اسے اپنا آپ منوانے کے لیے ہستی کو نیستی سے نکالنے کے لیے لاہوت وناسوت کا جھگڑا مٹانے کے لیے کچھ کہنا پڑتا تھا۔ وہ شمع تھا گویا جس سے وجود میں روشنی تھی وہ پروانہ تھا جو اس شمع کے گرد نثار ہوتا تھا۔ یہاں وہاں سب جگہ وہ تھا اور داخلی خارجی دنیا اس سے معمور تھی۔ وہ عقبیٰ تھا۔ وہ قیامت

تھا۔ وہ طوفان تھا جو ہستی پر نہایت شدت سے محیط تھا۔ وہ کنارے پر بھی تھا اور ڈوب بھی رہا تھا۔ کائنات اور تخلیق سب وہ تھا۔

انا الحق

اصل حیات و ممات۔

وادیٔ فاطمہ کے پتھروں نے کہا: "ہم حرمِ نبویؐ ہیں۔ تم بھاگ کر جہاں بھی جاؤ تمہیں امان یہیں ملے گی۔ ہم اس پاک اور عظمت دیئے گئے مکان کے جس کونے میں بھی ہوں گے ہم پر امان ہو گی۔ تم امان نہیں چاہتے اور صرف انا الحق کہتے ہو۔ حق تو خود اس ذکر کو بلند کرتا ہے۔ رات اور دن کی گزری ہوئی اور آنے والی سب ساعتیں اور ریزہ ریزہ گزرتا اور گزرنے والا وقت اور تخلیقِ آدم سے وضع کی گئی ساری محبتیں اس ایک نام کے لیے ہیں۔ ساری بینائیاں اور سارے کان اسی ایک اسم کی تقدیس کو دیکھنے اور سننے کے لیے بنائے گئے ہیں۔

وہ کل مقربانِ الٰہی اور اہلِ شہود پر مقدم ہیں وہ منزلت کے اعتبار سے مقدم ہیں اور توانا ترین ہیں اور اس لیے بشرِ کامل ہیں۔

وادیٔ فاطمہ میں سب طرف پتھر پتھروں سے محوِ گفتگو تھے اور اکیلا حسین اپنے آپ سے محوِ تکلم تھا۔

میں وہ ہوں جسے میں چاہتا ہوں اور جس کو میں چاہتا ہوں وہ میں ہی تو ہوں۔

ہم دو روحیں ایک جسم میں مقیم ہیں

جب تم مجھے دیکھتے ہو تو گویا اسے دیکھتے ہو

اور اگر تم اسے دیکھو تو ہم دونوں کو دیکھ لو گے

پھر ہوائیں اور مظاہر قدرت چاند' ستاروں' آسمان' زمین' فضاؤں میں سے آواز آنے لگی۔

خدا نے آدم کو اپنی صورت پر تخلیق کیا ہے؟

حسین نے مسکرا کر گرد و پیش دیکھا۔ اس کا دل ہر شے میں دھڑک رہا تھا۔ یہ اس کی آواز تھی کہ اطراف سے اسے احاطہ کیے تھی۔ ہاں خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا تھا بیشک!

حمد و ثنا میں کھوئی ہوئی' اپنے آپ سے آشنا بھی اور اپنے سے گم بھی۔ پر تو بھی اور اصل بھی۔ انا الحق۔

معماروں اور پتھر تراشنے والوں نے اس کو وادیٔ فاطمہ سے دور بھگا دیا۔ بھلا یہ کلمہ کوئی کہنے والا تھا؟ انسان اور دعویٔ ربوبیت' الوہیت۔ یہ دیوانگی کا مذہب تھا اور اس پر جو کیفیت طاری تھی اس سے باہر آنے کا اسے کوئی شوق نہ تھا۔ نہیں اسے کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ یہ وادیٔ پُر خار تھی کہ جس کی طرف سب راہیں آتی تو ہیں مگر یہاں سے آگے کوئی جا نہیں سکتا' جایا نہیں کرتا۔ اس کے نیم روشن راستوں سے اوپر آسمان دکھائی دیتا ہے اور انسان کا جی چاہتا ہے کہ وہ پر کھول کر فضا میں غوطے لگائے اور ستاروں کو چھو لے۔ مگر پھر ستارے نیچے اتر آتے ہیں اور قلب انسانی عرش معلیٰ بن جاتا ہے۔

رجب کا چاند دکھائی دیا تو سنگ تراشوں نے صحرا کی ریت کو ان پر سے بہنے دیا اور آندھیوں کی شورشوں میں وہ سنگِ رخام کو یونہی چھوڑ کر جانب حرمِ کعبہ روانہ ہونے لگے۔

اور حسین تو حرم نبویؐ کا پتھر بھی نہیں تھا جس پر سے وادیٔ فاطمہ کی ریت اور گرد باد کے طوفان ہی اسے ڈھانپ سکیں۔

بنو اسد کے چرواہوں نے ریوڑوں کو روئیدگی اور کانٹے دار بوٹیوں اور ریت میں سے سر نکال کر جھانکنے والے چھوٹے پودوں کی طرف چھوڑ دیا اور ٹیلے پر بیٹھ کر سورج کی تپش کے باوجود کھیلنے لگے۔ وہ سب ننھے لڑکے تھے جو اونٹوں اور بھیڑوں کے رکھوالے تھے اور جانوروں کی رمزوں کو پہچانتے تھے اور موسموں کے مزاج شناس تھے۔ انہوں نے صحرا میں اس دیوانے کو دیکھا تھا جو انا الحق کہتا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا جو ان کے قریب آکر کھڑا رہتا اور ہنس کر انا الحق کا نعرہ لگاتا۔ جو دھوپ سے کسی پناہ اور اوٹ میں نہیں جاتا تھا۔ جو ہوا کو حکم دیتا کہ چلے' جو دھوپ اور روشنی کو روک دیتا مگر پھر ہنس کر غائب ہو جاتا۔

یک بیک ان میں سے ایک نے کہا: ”میں وہ دیوانہ بنتا ہوں۔“

تالیاں بجا کر انہوں نے کہا: ”خوب بہت خوب۔ مگر تمہیں مکمل دیوانہ بننے کے لیے اسی طرح انا الحق بھی کہنا پڑے گا۔“

”میں انا الحق کہوں تو تم مجھے خدا مان لو گے۔ پھر بہت مزہ آئے گا۔ میں تمہیں حکم دوں گا اور تمہیں ریت کے ٹیلوں پر ادھر ادھر بھگاؤں گا۔ تم میرے بندے ہو گے تو تم میری نظر کرم کے محتاج ہو گے۔ میں تم پر خوب سختیاں کروں گا اور تم کچھ کر نہ پاؤ گے۔“

”تم سمجھتے ہو خدا صرف قہار ہے اور وہ محبت نہیں کرتا۔ اب دیکھو ہم اس سے بارش اور پانی کی دعا کرتے ہیں اور وہ سنتا ہے۔“ انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ دھر کر کہا۔

”مگر میں دوسری قسم کا خدا بنوں گا۔ میں صرف سزا دوں گا۔“ اس نے ہنس کر کہا۔ ”اگر تم کو یہ منظور ہو تو کھیل شروع کرتے ہیں۔“

”ٹھہرو اور سنو۔“ دوسرے ننھے لڑکے نے کہا۔ ”تم خدا نہیں ہو تم تو صرف بہانہ کرو گے۔ جھوٹ کہو گے کہ تم آدمی نہیں ہو۔ پھر ہم سب اس جھوٹ کی سزا تم کو دیں گے اور جو فیصلہ کریں تم کو وہ ماننا پڑے گا۔“

انا الحق کہنے والے نے سر کھجا کر کہا: ”دیکھو کوئی سخت سزا نہ دینا۔ میرے خدا ہونے کا خیال رکھنا۔ جب ایک بار دیوانہ خدا بن گیا تو اس میں دوسروں سے زیادہ طاقت ہو گی۔ ٹھیک ہے ناں۔ تو اب میں دیوانہ ہوں — انا الحق' انا الحق۔“ اس نے ایک نعرۂ مستانہ لگایا اور ریت کے ٹیلے پر سے بازو پھیلا کر اترا جیسے کوئی پرندہ پروں کو جھٹکا کر فضا میں پرواز کرے۔ نیلگوں عرش اور دھواں دھواں بے ستونوں کے آسمان تلے اڑان میں لگ جائے۔

وہ بھی اس کے پیچھے ٹیلے سے اترنے اور بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ ذرا ذرا سی جھاڑیوں خشک زرد گھاس میں سے آواز سنائی دیتی۔ چھوٹا سا چمکتا ہوا چہرہ کسی شاخ کی اوٹ سے دکھائی پڑتا۔ پھر کسی ٹیلے کے عقب سے وہ کمزور سی گرجدار بننے کی کوشش کرتی صدا انا الحق سنائی دیتی۔ ہنستے ہوئے چرواہے ان کی عبائیں گرم ہوا سے بھری ہوئیں

جیسے حلاج نے روئی کو دھن کر ان میں بھر دیا ہو اور رف رف بھی سنائی دے۔ وہ سب بازو پھیلائے ہوئے صحرا کی ان وسعتوں میں جو ان کے سامنے بیکراں سمندر کی طرح پھیلی تھیں اس ایک "انا الحق" کو ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ سب سیٹیاں بجا رہے تھے۔ بھیڑیوں اور سگانِ ہوشیار کی طرح بول رہے تھے اور دشتِ نجد کی لطیف ہوائیں ان کی آنکھ مچولی میں شریک تھیں۔ٹیلے اور ذراتِ خاک چھوٹی گھاس پر اڑتے ہوئے سفید پروں والے پرندے اور خلا کی پنہائیوں میں ڈبکیاں لگاتے ڈوبتے اور تیرتے نظر نہ آنے والے صدہا جاندار انا الحق۔

جب بالآخر وہ پکڑا گیا اور چاروں طرف سے اس کے ساتھیوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہ وحشی جانور کی طرح ہونکتا' تیز سانس لیتا اور پتھرائی ہوئی سی آنکھوں سے اپنے گرد دیکھتا۔ جب وہ اسے چھوتے تو نہایت زخمی اور اداس نگاہ سے ان کی طرف متوجہ ہوتا مگر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوئی سعی نہ کرتا۔ شاید اونچے نیچے ٹیلوں کی بلندیوں اور دامنوں میں بھاگ بھاگ کر اس کا جی بھر گیا تھا اور اس کی دیوانگی کا یہی تقاضا تھا کہ اب وہ پکڑا جائے اور اپنے دوستوں کی عدالت میں ایک گنہ گار کی طرح حاضر کیا جائے۔ آخر انا الحق کہنے والے کو سزا تو ملنا ہی چاہیے۔

سب سے چھوٹے چرواہے نے جب انصاف کی جگہ سنبھالی تو ہوا بھاری اور نم آلود سی ہو گئی تھی اور فضا میں جھونکوں کے آگے آگے دشت نجد کے پرندے نقیبوں کی طرح اڑ رہے تھے۔ اس کے دوش پر سوار بھی اور اس سے بے پروا بھی۔

پیش کرنے والے نے کہا:

"یا شیخ! یہ دیوانہ کہتا ہے کہ "وہ خدا ہے"۔ وہ اسے آگے دھکیل رہا تھا اور ڈھیلے سربند کے نیچے سے اس کی زلفیں بکھری جا رہی تھیں۔

سننے والے نے تھوڑی دیر توقف کیا اور پھر کہا:

"کیا یہ سچ میں دیوانہ ہے یا محض شہرت کے لیے اس نے اپنے کو دیوانہ بنایا ہے۔"

دیوانے نے آنکھیں گھمائیں اور پتلیوں کو یوں پھرایا کہ باقی ساتھیوں کو شک ہوا ہو سکتا ہے وہ اصل میں دیوانہ ہو۔

"یا سیّدی! یہ اصل دیوانہ نہیں ہے۔ اپنے کو خدا کہتا ہے اور ہم اسے دیوانہ کہتے ہیں۔"

"جواب دو۔" منصف نے ذرا گرجدار آواز میں کہا۔

"ہر چیز کو خدا نے بنایا ہے۔"

"بیشک۔"

"مجھے بھی خدا نے بنایا ہے۔"

"بیشک۔"

"اس کا نور اور جلوہ ہر شے میں ہے۔ وہ زمینوں آسمانوں کا مالک ہے۔"

"بیشک۔"

"وہ بندوں کے اندر رہتا ہے۔"

"بیشک۔"

"میرے اس حصے نے انا الحق کہا ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ آدمی اس لیے حق ہے کہ وہ حق ہے۔"

"لغو۔ جھوٹ۔ دیوانگی۔" پاس کھڑے دوستوں نے تالی بجا کر کہا: "آدمی کو بنایا گیا ہے اللہ کی مخلوق۔"

"تم سب چپ رہو۔" چھوٹے گڈریے نے کہا۔ "ہمیں سوچنے دو۔"

"ضرور۔ ضرور! مگر اس دیوانے کو سزا دو تاکہ ہمارا جی خوش ہو۔ ہم اس رست خیز سے تھک گئے ہیں۔"

"بات تو یہ بھی صحیح ہے کہ ہر آدمی کے اندر وہ خود موجود ہے اور آدمی اگر بندہ ہو کر یہ بھی کہہ دے کہ ...." وہ رُک گیا۔ "میرے فہم میں یہ اسرار الجھ گیا ہے۔ بندہ تو اس نے بنایا ہے جیسے ہم مٹی کا کھلونا بناتے ہیں اور کھلونا ہم تو نہیں ہو جاتا۔ گیند یہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ وہ بھی بنانے والے کے کام میں شریک ہے۔ آدمی سچ ضرور ہے حق مگر حق بن نہیں سکتا۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔"

باقی بچے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور دیوانہ ہنس ہنس کر دوہرا ہوا جاتا تھا۔ وہ انہیں بتا رہا تھا کہ ٹیلوں پر سے اترتے اور پرواز کرتے ہوئے اسے کتنا مزہ آیا___ لگتا

تھاپاؤں میں پر لگ گئے ہیں۔ وہ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اڑ کر بیٹھنے والا پرندہ ہے۔ وہ پھر قریب کے ٹیلوں کی طرف بھاگا اور اس نے زور سے اناالحق کہا۔ اپنے پیچھے آنے والوں کو گویا للکارا۔ بھاگا اور چھپ گیا۔ پھر اس نے انگلیاں منہ میں رکھ کر سیٹی بجائی جو سسکاریاں بھرتی ہوئی ہوا کے دوش پر سوار ہو کر دور دور فضاؤں میں گونجی۔ سیاہ بادل جھکے چلے آتے تھے جیسے اصحابِ فیل نے حملہ کر دیا ہو۔ سیاہِ سیاہ پوش' کڑک اور بجلی اور آفاق کو گھیرے ہوئے گھٹائیں اور پانی کے بوجھ سے جھکے ہوئے تہ در تہ ابر پارے جو گھتے ہوئے پہلوانوں کی طرح ایک دوسرے کو روندتے' رگیدتے ہوئے خلا میں جھکتے' اٹھتے اور پچھاڑے جا رہے تھے۔ بچے پناہیں ڈھونڈنے لگے کیونکہ اونٹوں نے بلبلانا شروع کر دیا تھا۔ بھیڑیں ممیارہی تھیں۔

"سنو۔ واپس آؤ۔" منصف چرواہے نے کہا۔ "اگر دیوانہ اناالحق کہتا ہے تو کوئی بات نہیں اس کی مجبوری ہے اس کا ذہن حدّت پکڑ گیا ہے۔"

"یہ بنا ہوا دیوانہ ہے۔ سب سمجھتا ہے۔" ایک اور ساتھی نے اسے یاد دلایا۔

"جب کوئی آدمی بن کر کوئی بات کہے تو اسے سچ ہی سمجھ لینا چاہیے۔ اگر وہ نقصان نہیں کرتا تو اسے رہنے دو۔"

پھر جیسے کوئی مشکیزہ الٹ دے۔ ایک دم بادل امنڈ کر آیا اور ایک لمحہ میں جل تھل ہو گیا۔

"اسے رہنے دو۔ اسے چھوڑ دو۔ اناالحق کہنا کوئی جرم نہیں۔ اس کی کوئی سزا نہیں۔"

سب بھاگ گئے۔

دیوانے نے کہا: "کیا مزہ آیا۔ کچھ بھی نہیں۔"

"کیوں یہ کھیل تمہیں پسند نہیں تھا؟" ننھے منصف نے پوچھا۔

بھیگے ہوئے کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے اس نے جواب دیا: "دیوانہ ہونے میں بہت مزہ ہے مگر لوگ بس اسے بیکار سمجھ لیتے ہیں اور اسے سزا بھی نہیں دیتے۔ سزا پانے میں ہی تو سب کچھ ہے۔ دھکیلے جانے اور تعاقب کیے جانے میں تو سب جان ہے۔ ورنہ لوگ دیوانہ کیوں ہوں۔"

"تم کیا دار پر لٹکنا پسند کرو گے۔ تمہاری تسلی اس طرح ہوتی۔ عجیب خواہش ہے تمہاری۔"

دشتِ نجد پر بجلیاں کڑکیں' بلندیوں اور پستیوں پر سے پانی بہا اور دیوانے نے دور کسی ٹیلے پر بیٹھے اپنے بدن میں کسمساہٹ محسوس کی۔ گویا طوفان اس کے خون کے اندر تھا اور وہ گزرگاہ تھا۔ نہیں وہ طوفانوں کا بنانے والا تھا۔ شعلہ بھی اور شمع بھی۔ پروانہ بھی اور دودِ چراغ بھی۔ خلاؤں میں بھی وہی تھا اور ہواؤں میں بھی۔ اس کی کوئی سمت نہ تھی اور سب سمتوں میں وہ تھا۔ وہی حرم نبویؐ سے حرم کعبہ تک۔ عرش معلیٰ سے لے کر زمین کی گہرائیوں پانی کی اتھاہ میں، ہوا اور فضا میں' انفس و آفاق میں' زمان و مکاں میں۔ فاصلے مٹ گئے تھے۔ وہ یعنی حسین بن منصور حلاج سب طرف تھا۔ انا الحق۔ انا الحق۔

حسین سفرِ ہندوستان پر نکلا تو اس کے بیٹے حسن نے کھوے ہوئے دادا اور گمشدہ باپ پر صبر کر لیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو علمِ دین کے ساتھ علمِ دنیا بھی سکھاتا تھا۔ وہ ریشم کے سوداگر ہونے کے ساتھ ساتھ عمدہ مسلمان تھے جو خارزارِ حیات میں اترتے ڈرتے نہ تھے جنہیں چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں مضبوط قدم جمانے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا جو سیاست دنیا کو بہتر سمجھ بوجھ سے نباہنے کے قابل تھے اور جن کو اپنی عقلوں پر بجا ناز تھا۔ انکی آرزوئیں حبِّ جاہ کے لیے شدید نہ تھیں اور ان کی امیدیں زندگی سے قلیل ہونے کے ساتھ ساتھ جلیل تھیں جب وہ چین اور ہندوستان اور ترکستان کی سیاحت سے واپس بیضا پہنچا ہے تو سرائے میں اجنبی لوگوں کی بھیڑ تھی۔ اس کے باوجود کہ سوداگروں کا موسم گزر چکا تھا اور عید نوروز کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سارا ملک پھولوں سے مشکبو ہو رہا تھا۔ درختوں کی سبزی میں ایک عجیب شان دلربائی تھی۔ پانیوں کی چمک بڑھی ہوئی اور روانی تیز تھی اور آبِ دژ کے ساتھ دشتِ سُوس میں قافلوں کی روانگی کے طبل بجائے جا رہے تھے۔ نقاروں پر چوٹیں پڑ رہی تھیں۔ آبادی کتنی بڑھ گئی تھی۔

رونق زیادہ ہو گئی تھی۔ اس گہما گہمی میں سکون کہاں تھا؟

حسین نے دیکھا کہ اس کے پوتے رنگین ریشمی عبائیں پہنے تھے اور ان کے اندازِ گفتگو میں ایک نرمی اور ملائمت کے ساتھ اندازِ تفاخر تھا جس میں مردانگی کم تھی۔ وہ چھوٹی حکومتوں کے فرستادہ سوداگروں کو چینی دیبا اور حریر و ریشم ایک بے نیازی سے دے رہے تھے۔ اور نئے حاکموں کی ذرا ذرا سی خستوں پر بھی بحث کرتے جاتے تھے۔ ان میں سے جو بڑا تھا وہ لاپرواہ اور شہزادگی کے اطوار رکھتا تھا اور چھوٹا نہایت چالاک' ذہین و فطین اور فوراً بات کی تہ تک پہنچنے والا تھا۔ وہ سیاست کی رمزیں سمجھتا تھا۔

جب بھیڑ کم ہوئی تو حسن کے پسر مہتر نے پوچھا:

''بزرگوار! آپ رات قیام کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

حسین کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہے:

کبھی کوئی اپنے گھر میں بھی اجنبی ہو جاتا تھا ـــــ آدمی کی شناخت کیا ہوتی ہے۔ اپنائیت اور غیریت کیا ہوتی ہے ـــــ کیا خون کی پہچان بھی کوئی شے ہے۔

اس کے سامنے سوال کو دُہرایا گیا۔ مبادا وہ سن نہ سکتا ہو۔

پھر ایک غلام نے قریب آ کر کہا: ''آپ رات یہاں قیام کریں گے۔''

''حسن کہاں ہے؟''

''وہ خلیفۂ وقت کی بیعت کے لیے بغداد تشریف لے گئے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں ہے امیر المومنین مکتفی باللہ کا انتقال ہو گیا تھا اور نقیب نئے نئے لوگوں کی بیعت کی دعوت دے رہے تھے۔ دارالسلطنت میں حالات مخدوش تھے۔ کئی داعیٔ خلافت تھے اور مقتدر باللہ ابھی کم سن تھا جو اپنی ترکی ماں اور ترکی سردار مونس کی نظرِ کرم کا محتاج تھا۔''

''کیا تم حسن کی ماں تک میری رہنمائی کرو گے۔ وہ مجھے پہچانتی ہیں۔''

غلام نے غور سے جھک کر حسین کی طرف دیکھا۔ دیر تک دیکھتا رہا اور پھر ''آقائے حسین'' کہہ کر اس سے لپٹ گیا۔

پھر بھاگا اور چیختا ہوا آقائے حسین' آقائے حسین کہتا ہوا دالانوں اور صحنوں میں بندھے ہوئے گھوڑوں اور اونٹوں کے پاس سے گزرتا ہوا اندرونی مکان کی طرف چلا گیا۔ اس کی سانس سینے میں سما نہیں رہی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کا نہایت مضبوط حبشی

تھا مگر اب تنکے کی طرح لرز رہا تھا اور اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی جیسے اس نے کوئی جن دیکھ لیا تھا۔

زینب نے اس زندگی میں اپنی امیدوں کو حسین سے دوبارہ ملنے سے خالی رکھا تھا۔ اس نے ابویعقوب اقطع کی بیماری سے اب تک جو کچھ اٹھایا تھا وہ اٹھایا تھا۔ حسن نے اس کو نازک آبگینے کی طرح حفاظت اور محبت سے سنبھال کر رکھا تھا۔ وہ اس کے لیے بچپن اور جوانی اور محبت رہی تھی۔ اور دادا کے گم ہونے کے بعد سے ان دونوں نے ایک لمبا سفر کیا تھا۔۔۔ گم ہوؤں کی جستجو تھی بھی اور نہیں بھی۔ جب شام گھری ہوتی اور دن کے قافلے رات کے سفر پر نکلتے اور ستاروں کی طرح محوِ خرام ہوتے۔ زینب امید بھرے خیالوں سے دعاؤں میں ان کو یاد کرتی جو بس بغیر کوئی اطلاع دیئے کوئی نشان چھوڑے ٹوٹنے والے ستاروں کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ پتا نہیں یہ رشتوں اور خون اور محبتوں' وطنوں اور انسانوں کی محبت خدا نے کیوں بنائی تھی۔ اسے یہ خوب لگتا تھا کہ سینے حدت ہجر سے تپاں رہیں اور شعلوں کی شدت کوئی محسوس نہ کر سکے۔ خدا نے اس کا مقدر کیوں ایسا بنایا تھا۔ کوئی لمحہ اتنا فیصلہ کن کیوں ہوتا ہے۔

غلام کو یوں ہانپتا اور بات کرنے سے عاجز دیکھ کر اس نے ایک کنیز سے کہا کہ وہ اس سے معلوم کرے۔

"آقا حسین۔ آقا حسین۔۔۔ بس یہی کہہ رہا ہے۔"

زینب کو لگا اس کا سارا وجود سن ہو رہا تھا۔ خون ایک دم دل کی طرف بڑھا جیسے طوفان کا ریلہ کسی پرانے بند سے ٹکرائے اور چوہوں کے چھلنی کیے ہوئے سوراخوں میں سے اندر ہی اندر بنیادوں میں جا گھسے۔ اسے منہدم کر دے۔

چمڑے پر نہایت عمدہ خط میں ایک عبارت تھی جس کو حامد بن عباس بار بار پڑھ رہا تھا اور فارس سے آیا ہوا آدمی اس ملاقات کے کمرے میں ایک کونے میں زانو تہہ کیے بیٹھا تھا اور بہت دلگیر لگتا تھا۔ حامد نے ڈوبتے سورج کی روشنی میں جب ابھی کنیزوں نے چراغ روشن نہیں کیے تھے اس ٹکڑے کو اٹھا کر پھر پڑھا۔

درودوسلام!
ابلیس اور محمدؐ کے سوا اور کسی کا خاص مقام نہیں
عزازیل اپنے مقام سے گر گیا جبکہ محمدؐ (ان پر درودوسلام)
انہوں نے معانی کے معانی کو پالیا
ابلیس سے کہا گیا تھا سجدہ کرو
اور محمدؐ سے کہا گیا تھا دیکھو
ان کی آنکھوں نے دائیں بائیں نہیں دیکھا اور دھوکا نہیں کھایا اور نہ ہی گم راہ ہوئیں۔
ابلیس نے اپنے انکار پر صاد کیا
اور اپنی پہلی حالت پر واپس نہیں ہوا
محمدؐ دیکھنے کے بعد اپنی حالت پر لوٹے
میں تم میں اپنی حیات پاتا ہوں اور تم پر تکیہ کرتا ہوں۔ تُو دلوں کو پھیرنے والا ہے۔
تیری حمد کیسے کروں جبکہ تیری ثنا ہونی چاہیے
عرش کے مکینوں میں ابلیس سے بڑھ کر کون عابد تھا
وہ آگاہی سے پلک جھپکنے کی مہلت بھی آگاہ نہ ہوا۔ وہ شدید اشواق سے پُر تنہائی میں اس کی حمد کرتا رہا۔
اس پر تہمت کی گئی جب وہ دوسری تنہائی تک پہنچا۔ اور اس سے سوال کیا گیا جب اس نے لامتناہی تنہائی مانگی۔
خدا نے کہا سجدہ کرو ___ ابلیس نے کہا تمہارے سوا کسی کو نہیں
خدا نے کہا چاہے تم پر میرا عذاب پڑے
ابلیس نے کہا تیرے دیئے ہوئے عذاب سے مجھے تکلیف نہیں ہو گی
میرا انکار تمہاری تقدیس کی وجہ سے ہے اور میری عقل تم میں سرگرداں ہے
آدم تمہارے مقابلے میں کیا ہے۔ اور میں کیا ہوں کہ تم سے ماسوا کی طرف دیکھوں

وہ غرورِ جلالت کے سمندر میں گرا اور اندھا ہو گیا
اس نے کہا میرے لیے سوائے تیرے اور کوئی راستہ نہیں۔ میں ایک افتادہ عاشق ہوں۔
تم مغرور ہو گئے ہو۔ جواب ملا۔
لامتناہی وقت سے پہلے میں صرف تم سے آشنا تھا اور یہ آدم سے بہت پہلے تھا
اب اگر تم مجھے چھوڑ دو تو جدائی اور عشق ایک ہی تو ہیں
فاصلہ اور قرب بھی ایک ہی ہیں
میں تم سے یاد کیا جاؤں گا اور ہم دونوں لامتناہی وقت کے ساتھی'
ہم ایک ہی تو ہیں!

کم سیاہ لفظ روشنی پکڑ کر خاکی اور سنہری ہو رہے تھے اور چھیل کر ملائم کیے ہوئے کھال کے ٹکڑے پر خوب چھیلے ہوئے پرت در پرت قطار اندر قطار فوجوں کی طرح جو غنیم پر حملہ کو تیار ہوں۔ قدم ایک ساتھ ملائے' شام کی سرخی میں فاصلے اور راستے طے کریں۔

اس نے تالی بجائی۔ پردوں کے عقب سے حبشی نے سر نکال کر آقا کے حکم کے لیے سر خم کر دیا۔

حامد بن عباس اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ کام حبشی کا نہیں تھا۔
"تم واپس جاؤ۔"

کنیز جو چراغ روشن کرتی پھر رہی تھی اس سے اس نے کہا: "کسی محافظ سے کہو عمار کو میرے پاس بھجوائے۔"

بغداد میں حالات بہت مخدوش تھے۔ خلافت کی کشتی ابھرتی ڈوبتی مکتفی باللہ کی وفات کے بعد سے تھپیڑے کھا رہی تھی۔ مقتدر باللہ کو تختِ خلافت پر رونق افروز کرنے کا صلۂ بیعت عباس بن حسن نے ایک بڑی رقم خزانے سے نکال کر حاصل کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ فتنہ کبھی بھی ظاہر نہیں ہوا تھا اور جو شغب (مقتدر کی ماں) کا حکم تھا وہی ہوتا تھا۔ وہ بیٹے کی کم سنی سے فائدہ اٹھا کر جو چاہتی کرتی تھی۔ دربار کے معاملات

میں اس کا عمل دخل بہت زیادہ تھا۔ اور پھر اس کی منظورِ نظر کنیزوں اور لونڈیوں اور الجھے ہوئے بالوں کی طرح کے معاملات تھے۔ ترک اندر اور بغداد سے پرے تک قرامطہ پھیلے تھے۔ زندگی درہم برہم تھی اور ایسے میں جب ہر وزیر اپنی گردن کی فکر میں تھا' ابن منصور کے اس طویل مکالمے کو جو اس نے ابلیس کی شان میں تصنیف کیا تھا' کون درخورِ اعتنا سمجھتا۔ مگر حامد بن عباس کو ابنِ منصور کی فکر تھی۔

بغداد کی حکومت کے مقابلے میں فاطمی حکومت مغرب میں مضبوط واسطوں سے قائم ہو چکی تھی۔ گو مکتفی باللہ نے عیسیٰ نوشری عبید اللہ المہدی کے گرفتار کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ یہ حضرت جعفر صادق کے بیٹے امام اسماعیل کی امامت کے قائل تھے اور یہ دعوت کوئی نئی نہ تھی اس لیے مغرب میں اس کے قیام کے ساتھ ہی یمن' بحرین' عراق اور خراسان میں مدتوں سے مصروف مبلغین نے بھی اپنے قفس کے بند دروازے کھولے اور فضا میں زقندیں لگانا شروع کر دیں۔

مونس بہت ہی طاقتور تھا۔ اس ترکی غلام نے عروج پایا تھا اور وہ دربار کے سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا تھا۔ حامد بن عباس کو اس سے بہت چڑ تھی مگر فتنے سے نبرد آزما ہونے اور اسے شکست دینے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سیاست ایک ایسی دلدل تھی' جس میں وہ دھنستا چلا گیا تھا اور ایسے میں جبکہ نئے عقائد اور پرانی رغبتوں دعوؤں نے اپنی جگہ بنالی تھی مذاہب اور فرقوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ ابن منصور کے ان رسائل اور خطوط سے کیا نقصان پہنچ سکتا تھا۔

عمار جب اندر آیا تو حامد بن عباس نے اس پارچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''یہ ابلیس کی ختوت سے متعلق ایک دستاویز ہے۔'' اس نے ہنس کر اوپر دیکھا۔

''آقائے سیدی! کل محلّہ جلابیہ میں ایک عورت کے پاس بھی ایسی دستاویزات ملی ہیں آدمی جب گھبرا جاتا ہے اور دار و گیر میں اسے کچھ نہیں سوجھتا تو وہ اپنی تسلی کے لیے سہاروں کی تلاش میں نکلتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی انسان خدا ہونے کا دعویٰ بھی کرے اور یہ بھی وعدہ کرے کہ وہ نجات دلا سکے گا تو کون ہے جو اس پر یقین نہ کرے گا۔''

وہ چپ ہو گیا تو وزیر نے کہا:

"مگر بخدا یہ شخص نہیں۔ یہ نہیں۔ نہیں نہیں اور ہرگز نہیں۔" اس نے جوش سے کہا۔ اور کھڑا ہو گیا۔

"آقائے! مغرب میں ایک پوری سلطنت ان فتنوں سے عالمِ وجود میں آئی ہے۔ یہ ابنِ منصور تو کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس کے خطوط اور رسائل آپ کو کیوں مضطرب کرتے ہیں۔" عمار مقرب ہونے کی وجہ سے ذاتی سوال کر رہا تھا۔

حامد بن عباس پشت پر ہاتھ باندھے ٹہل رہا تھا اور پہلی رات کا چاند دریچے کی اوٹ سے لہریا ریت میں دبے سِکے کے کنارے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

"تم پوچھتے ہو یہ بات مجھے مضطرب کیوں کرتی ہے ــــ بخدا اس کا جواب میرے پاس بھی نہیں، مگر اس ہنگامِ رست خیز میں بھی اس دیوانے کا خیال مجھے تکلیف دیتا ہے ــــ عمار! تم کبھی اپنی جان سے عزیز شے، خواب سے بھی خوبصورت شے کے متعلق سنو کہ اس پر تمہارا نہیں کسی اور کا قبضہ تھا تو تم کیا کرو گے؟"

عمار یک بیک اس سوال سے گھبرا گیا۔ یہ عجیب پر اسرار سوال تھا۔ اسے جان سے عزیز اس کی وہ عزت تھی جو اس نے حامد کی ملازمت اور رفاقت میں پائی تھی۔ وہ کسی طور اسے برباد کرنا پسند نہیں کرے گا۔ پتا نہیں اس کا آقا اپنے جی میں کیا دُکھ رکھتا تھا۔ اس کے سوز اور انتشار، اس کی سوچ کو وہ کیسے پا سکتا تھا۔ اور یہ باتیں نہایت بے ربط تھیں وہ تو ابھی ابنِ منصور کی بات کر رہے تھے اور اس نے بڑھیا کے پاس جو پایا تھا وہ ابنِ منصور کو گرفتار کرانے کے لیے کافی تھا۔

بڑھیا کے پاس تھیلے میں چند خطوط تھے جو اسے ترکستان سے ابنِ منصور نے لکھے تھے۔ ان تحریروں نے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہے۔ دیوانہ، مخبوط الحواس! مگر یہ کیسے ــــ اسے وہ رات یاد آ رہی تھی جب اسے قید خانے سے زبردستی نکالا گیا تھا اور پھر وہ تقریباً بغداد میں کبھی دکھائی نہیں دیا!

اور اب!

پتا نہیں وہ کس فرقے کا مبلغ اور کون سے امام کا داعی تھا۔

عمار کو پھر وہی فضا اپنے گرد محسوس ہوئی جس کے بوجھ سے اس کا دل بیٹھنے لگا

تھا۔ جیسے پہاڑ لڑھکائے جارہے ہوں۔ اردگرد کی آوازیں اور خوشبوئیں اور نظارے اس سے بند ہونے لگے ہوں۔ وہ قید خانے میں کھڑا ہو۔

اس نے سر کو جھٹکا تو وزیرِ اعلیٰ نے پوچھا:

"گم کیوں ہوگئے ہو عمار! میں چاہتا ہوں چند نہایت باہوش جوانوں کو بھیج کر اس کی خبر لو۔ اسے گرفتار کر کے یہاں بغداد کے بندی خانوں کو زینت بخشی جائے۔ جو ہماری رسائی سے دور ہیں انہیں بھول جاؤ لیکن جو ہماری دسترس میں ہیں انہیں کیوں آزاد چھوڑا جائے۔" اس نے نگاہ اٹھا کر عمار کی طرف دیکھا۔ "تمہارا جی تو اچھا ہے؟"

عمار کھڑے سے بیٹھ گیا جیسے اسے سانس لینے میں دشواری پیش آرہی ہو۔ روشنیاں اور اندھیرے اور ہر شے جو اس کے گرد تھی اس پر بارگراں بن کر مسلط ہوتی چلی گئی اور اس نے سانس لینے کے لیے منہ کھولا تو ہوا بھی اس پر بند تھی۔

وہ اپنے آقا کے قدموں میں بے ہوش ہو گیا۔

"موت بھی عجیب چیز ہے۔" حامد بن عباس نے کہا۔ "عرش کی بلندیوں سے زمین کی پہنائیوں پر جاری و ساری ہے۔ کہاں سے آتی ہے فلک کج رفتار یہ کہاں سے آتی ہے۔ کون اسے بھیجتا ہے۔" اس نے عمار کو پکارا "عمار' عمار!"

باہر رات کا پرندہ چیختا ہوا دجلہ کے پانیوں پر سے لمبی اڑان لگا کر زقند سی بھر کر گزر گیا۔ اس نے پردے کو ہٹا کر دیکھا۔ بغداد میں دریا کے دوسرے کنارے پر محلات کے دریچے روشن تھے اور موسیقی کی دلنواز تانیں رقص کی دُھنوں میں ڈھل رہی تھیں جیسے برف پگھل کر شفاف پانی میں بدل رہی ہو جیسے زندگی گھل کر موت کے دھارے پر بہتی جائے۔

ریشم بُننے والوں کی بستیوں کے آخری سرے پر اس زاویے میں جس سے حدِ نظر تک دشتِ سوس کی سرخی مائل زرد سیاہ ریت پھیلی تھی انہوں نے حسین ابنِ منصور کو ڈھونڈ نکالا۔ انہوں نے ہر شے کو الٹ پلٹ کر دیا تھا تاکہ کاغذ کا ایک پرزہ بھی جو وہاں سے ملے قبضے میں کر لیا جائے۔ ان کے لیے یہی حکم تھا۔

حسین نے اپنی بے پناہ آنکھیں اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ذکر کی محفل درہم برہم ہونے کے بعد انہوں نے مریدوں' درویشوں' مقلدوں' کبھی کبھار اس میں شریک ہونے والوں کو گرفتار کر لیا اور خانہ تلاشیاں شروع ہوئیں۔ حسین کے سب رسائل' ہندوستان سے اس کے نام آئے ہوئے خطوط' دعا کے لیے درخواستیں جو ترکستان اور چین سے کبھی کوئی آتش پرست اور کبھی کوئی سوداگر لے کر آتا تھا' دنیا کے کناروں تک کاروانوں کے ساتھ پھرنے والے درویشوں اور مغنی اور زمانے کے ستائے ہوئے درباروں کے لیے جانے والی طالع آزما لوگ بھی یہ پیغامات لاتے تھے۔

ہندوستان والے اسے مغیث' ترکستان والے مقیت' خراساں والے ممیّز' خراسان والے ابوعبداللہ زاہد' خوزستان والے شیخ حلاج الاسرار اور بغداد سے آئے ہوئے خطوں میں مصطلم لکھا تھا۔

خانہ تلاشی کے لیے آنے والوں میں سے ایک حسین کو گھیرے تھا اور دوسرے زاویے کو درہم برہم کر رہے تھے۔ کلام پاک کے حواشی اور تفاسیر اور غیر مانوس زبانوں میں لکھے ہوئے الفاظ ___ انہوں نے اس کی گدڑی کو اتروایا اور جھٹکا۔ مگر اس میں سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔

"حیرت ہے اس مفلوک الحال شخص کے لیے ہمیں اتنے فاصلے پر بھیجا گیا جس کے زاویے میں بھی کوئی شے سلامت نہیں۔ مہمانوں کے لیے کوئی بندوبست نہیں اور ہر وارد و صادر کو کھانا کھلایا جاتا ہے تو بندوبست کیسے ممکن تھا؟"

پھر دشتِ سوس کی آندھیاں بے وقت اٹھیں اور فنا کی ہوا بن کر تیز گونج کے ساتھ سب طرف پھیلنے لگیں۔ حسین نے اپنے مہمانوں کی طرف دیکھا۔ خوف سے ان کے رنگ زرد تھے اور وہ لرز رہے تھے۔ ایسی خوفناک صحرائی صدائیں انہوں نے پہلے کبھی نہ سنی تھیں۔

حسین نے انگلی اٹھائی اور دنیا کا سانس رُک گیا۔ اسے گرفتار کرنے والوں نے اور کچھ نہیں دیکھا صرف یہ محسوس کیا کہ یک لخت صرصروں اور طوفانوں نے اپنے دامن سمیٹ لیے تھے۔

پھر وہی بغداد اور اس کی رونقیں تھیں جیسے فنا کی ہوا کے عادی لوگ اس میں سانس لیتے ہوئے ہی اپنی بقا پاتے ہیں اسی طرح شورشوں اور بغاوتوں' ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے ماحول میں بھی دجلہ نہایت سکون سے اپنے دونوں کناروں کے محلات اور باغوں اور رعنائیوں کو دامن میں لیے بہ رہا تھا۔ اس آئینے میں جو بھی تھا اس کا عکس لرزاں' ترساں' گزراں تھا۔

معتضد کے زمانے میں شہد رنگ طیلساں پہننے والے لوگ اب خال خال نظر آتے تھے۔ یہ نہیں کہ اب شہر ذمیوں' نصرانیوں' مجوسیوں' یہودیوں سے خالی ہو گیا تھا بلکہ اس کے جانشینوں نے ان ساری پابندیوں کو غیر ضروری سمجھ کر ان کی طرف سے چشم پوشی شروع کر دی تھی۔ خلقت کا اژدھام چاروں طرف سے ایک بے پیندے کے پیالے میں پانی کی طرح مسلسل شہر میں در آتا اور کسی نہ کسی طور اپنی جگہ بنانے میں جُت جاتا۔ سوداگروں اور قافلوں کی دھوم اور آمدورفت سے ایک ایسے میلے کا سا سماں تھا جس میں لوگ آخری تماشا دیکھنے کے لیے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے مگر ایک دوسرے کو برداشت بھی کرتے تھے۔

مدرسہ نظامیہ میں جنید درس دیتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے سب شاگردوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ خالی درسگاہ میں وہ خالی الذہن بیٹھے تھے اور ان کا دل ایک نئی وحشت کو پا کر دھڑک رہا تھا۔

حسین ابنِ منصور کو وہ پابجولاں لائے تھے اور بندی خانے میں ڈال دیا تھا۔ جب وہ مجنون تھا اور وادیٔ فاطمہ کے نواح میں دشت نوردی کرتا تھا تو انہوں نے ایک قافلے والوں کی زبانی سنا تھا کہ انا الحق کہتا تھا۔ پھر مدتوں اس کی کوئی خبر نہیں آئی کشف سے انہیں یہ خبر بھی تھی کہ وہ جہاں بھی ہے خیریت سے ہے۔ پھر یک بیک اسے دارالسطنت میں لایا گیا۔ دیوانگی اور ہوش کی درمیانی کڑیاں ان کی نظر سے حجابات میں تھیں۔ اس دوران کیا ہوا تھا——— دیوانگی سے وہ ہوش میں آیا تھا۔ وہ لے لیا گیا تھا اور پھر لوٹایا گیا تھا۔ وہ اپنے سے گم تھا اور اس میں قائم تھا۔ پھر وہ اپنے میں قائم کیا گیا تھا اور بندۂ خدا تھا۔ دنیا میں رہنے کے قابل۔ یہ منزلیں تھیں جن سے گزرنا اپنے دروس اپنے لیے خود پسند کرنا اور اپنی تعلیم اپنی تربیت شامل تھی۔ مرشد ایسی راہوں میں دستِ شفقت سر پر رکھتے

تھے اور تاریک راہیں روشن ہوتی تھیں مگر اس نورِ مبین کی روشنی تو آدمی کو اندر اور باہر سے ہمہ روشن بنا دیتی تھی۔ حسین کو کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

جب شام کی اذانیں ڈوبتے سورج کی سرخی میں لعل گوں پانی پر تیز لہروں کی طرح پھیلیں۔ دشت و جبل میں ہوا کے ساتھ لمبے دامنوں سمیت اڑیں تو جنید اٹھے تاکہ بندی خانے میں کسی کو دریافتِ حال کے لیے بھیجیں۔

شبلی پھول کی پتیاں نوچتے ہوئے درس گاہ کے دروازے میں انہیں مل گئے۔ انہوں نے کوئی بات نہیں کی مگر ہنسے اور دیر تک ہنستے رہے جیسے کیف و سرور کی کسی نہایت کیفیت میں تھے۔ پھر انہوں نے وہ گلاب اپنے کان کے پیچھے اڑس لیا اور رقص کناں ستونوں اور دالانوں میں پھرنے لگے۔ پھر انہوں نے اپنا سر پتھروں سے ٹکرایا اور روتے رہے۔ جنید نماز کے لیے مسجد میں داخل ہو گئے تھے۔

حسین زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ جب شبلی نے جھروکوں پار سے اسے آواز دی:

"ابنِ منصور۔"

ابنِ منصور نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا تو انہوں نے کان کے پیچھے اڑسا ہوا گلاب اس کی طرف پھینکا:

"جو تمہارا حال ہے وہی میرا ہے مگر تم نے اسے لوگوں پر ظاہر کر دیا۔ تمہاری عقل نے تمہیں اس حال تک پہنچایا۔"

حسین نے وہ پھول شبلی کو دیتے ہوئے کہا:

"برادر وقت کا انتظار کرو۔"

"بخدا ابنِ منصور۔ میں اس لمحے سے خوفزدہ نہیں ہوں مگر مجھے رشک آتا ہے۔" شبلی نے پھول پھر کان کے پیچھے اڑس لیا۔

"شبلی۔ میرے ایک سوال کا جواب دیں — جب مولا نے ایک شخص کو اس کے نفس کے قبضہ سے لے لیا اور اس کو اپنی بساطِ انس تک پہنچا دیا۔ اس کو تم کیا سمجھتے ہو۔" حسین کی نظریں شبلی کے چہرے کی متلاشی تھیں۔

ایک نورانی مسکراہٹ شبلی کے خالی چہرے پر پھیلی جو ان کے وجود میں سے یوں ظاہر ہو رہی تھی جیسے لہریں کچھ چمک پکڑ رہی ہوں۔ وہ کھڑے سے بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے اپنی انگلی سے سامنے کی زمین پر لکیریں کھینچیں۔

"انس مع اللہ سے بڑھ کر کون سی جنت ہو گی۔ جنت بھی اسی انس کی وجہ سے جنت بنی ہے۔ خوش حالی ہے اور مبارک ہے ایسے نفس کے لیے جو مولیٰ کا مطیع ہو اور حقیقت کے آفتاب اس کے قلب میں چمک رہے ہوں۔"

حسین نے کہا: "شیخِ کامل سے کہیے گا میرے لیے دعا کریں کیونکہ لوگوں نے راہیں پُر خار کر دی ہیں اور میرے گرد فسانے بنا لیے ہیں۔"

"نہیں۔ لوگ فسانے نہیں بناتے صرف اپنے خیالوں کو نئے جامے پہناتے ہیں جو خود انہوں نے تیار کیے ہوتے ہیں۔" شبلی پھر ہنسے۔

"شاید۔" حسین نے نہایت عاجزی سے کہا۔ "شاید۔"

"تم نے مغلوب الحال ہو کر جو کہا تھا جو کیا تھا اس کو انہوں نے حال سے قال تک حرف بہ حرف تسلیم کر لیا تھا۔ اس میں ان کی بھی تھوڑی دیوانگی شامل تھی اور عام لوگ کسی خیال کی پرچھائیں کو پر اور پُرزے خود ہی لگا لیتے ہیں۔" شبلی حسین کی بنائی ہوئی زمین پر کھینچی لکیروں کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔

"شاید۔" حسین نے پھر کہا۔ "شاید۔"

"حامد بن عباس نہایت سخت گیر آدمی ہے۔ رہائی اور خلاصی ذرا دیر میں ہو گی ـــــ" شبلی نے دالانوں سے پرے ان آوازوں پر دھیان دیا جو بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ "یہ لکیریں ابھی مٹا دو۔ یہ سوال قبل از وقت ہے اور بہت زیادہ ہے ـــــ تم یوں سرخروئی کیوں چاہتے ہو۔ دشت بے دروازہ ہے۔ اور کون بروئے کار آئے۔"

حسین نے بے پناہ آنکھوں سے شبلی کی طرف دیکھا جن میں نہ زندگی کی محبت تھی نہ جینے کے لیے منت تھی نہ دعا کے لیے اضطراب تھا۔ صرف بے پایاں تپش تھی اور عشق و ہجر کی مسلسل داستان کا ایک باب رقم ہو رہا تھا۔

شبلی نے منہ پھیر لیا اور لوٹ آئے۔ "دیوانہ ہمیشہ دیوانہ رہتا تھا۔"

بغداد میں یہ وباؤں اور آسمانی آفتوں کا سال تھا۔

اس دن صبح سے برف باری ہو رہی تھی۔ مکانات سفید ردا میں ڈھانپے جا رہے تھے۔ جیسے ان پر کفن پھیلایا جا رہا تھا۔ درخت اپنی شاخوں سمیت جھک کر سجدہ ریز ہونے کی کوشش میں ایسے آدمیوں کی طرح لگ رہے تھے جنھوں نے پہلی بار نماز کے لیے جھکنا چاہا تھا مگر رکوع کی حالت میں ان پر جمود طاری ہو گیا تھا۔

گزشتہ شام عجیب پُر ہیبت تھی۔ ہوا کی یخ بستگی میں بے چین پرندے بسیرا کرنے کی بجائے چیختے اور اڑتے تھے اور شام کی سرخی غبار کی طرح اوپر چڑھتی، پھیلتی، بیٹھتی، اڑتی لگتی تھی۔

کاذیں دریا پر نیچے تک اتر آتیں اور پھر فضا میں گھومنے اور دائرے بنانے اور چکر کاٹنے لگتیں۔ کوّے سینکڑوں کی تعداد میں کائیں کائیں شور مچا رہے تھے اور چیلیں کتیں، کتیں چلاّتی گرتیں، اٹھتیں اور منحوس آوازوں سے آبادیوں پر منڈلا رہی تھیں۔

جب اذانوں کی آوازیں رعب و جلال کے ساتھ فضا میں بلند ہوئیں تو گویا ہوا ایک قرار پکڑنے والے بے چین بیمار کی طرح ذرا تھمی، رکی، اپنا سانس ٹھیک کیا پھر مار سیاہ کے بادلوں کے مرغولوں نے شہر کے روشن اور زندگی کی گہما گہمی سے پُر، خالی جگہوں اور ویرانوں کو یوں ڈھانپ لیا جیسے نیند پپوٹوں کو بوجھل کر کے آنکھوں پر چھا جائے۔

حامد بن عباس سیاست کی بساط پر ایک پٹتے ہوئے مہرے کی طرح تھا۔ اس کا بیٹا حسین اسے چھوڑ کر مغرب میں عبید اللہ المہدی کے پاس جا چکا تھا۔ اس کی تربیت کے لیے حامد کی ساری پریشانیاں آخر شکست ہو گئی تھیں۔ راہِ محبت میں اس کی مایوسیاں المناک تھیں۔ اسے معلوم تھا انھوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی اسے نہیں چاہا تھا۔ چاہت کیا شے ہے۔ قہرمانہ اور گُل رنگ اور صدہا ترکی کنیزیں جن سے اس کا حرم بھرا تھا۔ یہودی اور نصرانی اور نسطوری عورتیں جن کی وجہ سے اس کے محلات میں قوس و قزح اتری ہوئی لگتی تھی۔ وہ ان کے بیش بہا لباسوں میں چھپے سراپوں سے بھی آشنا تھا۔ مگر ان کے دل ـــــ دل تک کبھی کوئی پہنچ نہیں پاتا۔ دل کی دنیا کن ناموں سے آباد

ہوتی ہے، کسے خبر ہو سکتی ہے۔

اس سے کسی نے کبھی محبت نہیں کی تھی۔

بنانے اور بگاڑنے، دربار کی سیاستوں میں دوستوں اور دشمنوں کی تعداد کا حساب رکھنے ترقی کرتے رہنے اور اپنی جگہ پر برقرار رہنے میں ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ اس کے بالوں کی سیاہی میں راکھ نے اپنے دامن جھاڑے تھے اور دجلہ کے کنارے اس محل میں جہاں بے شمار داروغے اور محافظ تھے وہ تقریباً اکیلا تھا۔ تنہا۔۔۔ وہ کیوں تنہا تھا۔

عذاب کے ایک جانکاہ خیال سے اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ یہ ساری دولتِ دنیا، جاہ و جلال وہ کس لیے اپنے گرد سمیٹ رہا تھا جبکہ وہ خود اس ڈھیر میں دفن ہوا جا رہا تھا۔ آہ اس کی ساری ناکامیوں اور نامرادیوں کا ذمہ دار صرف ایک شخص تھا۔ ایک گدڑی پوش۔ وہ اس کی ذلت سے اپنا انتقام لے سکتا تھا۔

اس نے تالی بجائی۔

"دشتِ سُوس کے قریے سے جو قیدی لائے گئے ہیں، ان میں سے ابنِ منصور کو حاضر کرو مگر اس کی بیڑیاں کھول دو۔ میں اس سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔"

پُر پیچ راہداریوں اور ان گنت سرنگوں اور ٹیڑھے میڑھے راہوں سے جب اسے لایا گیا تو وہ نہ ہراساں تھا، نہ ہارا ہوا۔ نہ ہی پژمردہ اور نہ ہی نادم۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب بے نیازی تھی جو اپنے انجام سے بے پرواہ ہونے والے کے آس پاس ہوتی ہے۔ ایک فضائے آزادی جس کو قید اور عذاب کبھی نہیں مٹا سکتے۔ ایسی صورتیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔

"تمہیں اس طلبی کا مطلب معلوم ہے؟" حامد نے نہایت نخوت سے کہا۔

حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم کیا ابلیس کے پرستار ہو اور کسی پُراسرار مذہب کے داعی ہو؟"

وہاں وہی خاموشی تھی۔

"خدا تمہارے چہرے کو تاریک کرے۔ کیا تم میری بات سن نہیں سکتے یا بہرے ہو؟" حامد کی ہنسی اس کے چہرے پر برف کے نوکیلے ٹکڑے کی طرح تکلیف دہ اور ٹھہری ہوئی تھی۔

"شیطان پرست اور جادوگر۔ خلق خدا کو خراب کرنے والے۔ خدا کے بھلائے ہوئے۔" حامد نے دانت پیس کر کہا۔ وہ ٹہل رہا تھا اور کوڑے کو ایک سے دوسرے ہاتھ میں بدل رہا تھا اور بہت مضطرب تھا۔

"وزیر اعلیٰ حامد بن عباس! کیا اس دار و گیر زمانہ میں یہ مسلک اتنا اہم مسئلہ ہے کہ اس کے لیے میں نصف شب کو بلایا جاؤں؟" حسین کی آواز خالی کمرے میں گونج گئی۔

"تمہاری جگہ صرف اور صرف جہنم ہے۔" حامد نے زور سے کہا۔

"میں تو یہاں بلایا ہوا آیا ہوں۔" حسین نے نہایت آہستگی سے کہا۔

حامد نے حلق سے عجیب آوازیں نکالیں مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔

"تمہیں معلوم ہے ابلیس کی پرستش کی کیا سزا ہے؟" کافی دیر کے بعد وزیر اعلیٰ نے کہا۔

"میں ابلیس کا پرستار نہیں' اس کی ہمت کا قائل ہوں مگر سزا اگر مقدر میں ہے تو اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

"تم سزا کا مفہوم اگر جانتے تو اس سے پناہ چاہنے کی استدعا کرتے۔ عمیق ترین جہنموں سے بھی زیادہ تکلیف دہ۔ بخدا تمہارا ایک ایک جوڑ کاٹا جائے گا۔ پارچہ پارچہ گوشت علیحدہ کیا جائے گا۔ روئیں روئیں سے الگ الگ جان نکلے گی۔ کیا اس اذیت کی برداشت ہو گی؟"

حسین کا چہرہ کِھل اٹھا مگر اس نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

"کیا تم دیوانے ہو؟"

حسین کا قہقہہ اپنی صدائے بازگشت سے دیواروں اور پردوں' چھت اور دریچوں میں سرایت کر گیا۔ ساز' جام و مینا' سب نے اس ہنسی کو گویا پکڑ لیا تھا۔ باہر دجلہ کی لہریں بھی سرخوشی سے دستک دینے لگیں جیسے اس بے پناہ ہنسی کے سیلاب میں شریک ہونا چاہتی ہوں۔

حامد بن عباس کو پچھلی ملاقات بھی یاد تھی۔ اس لیے دروازے کو جو صرف اس کے لیے مخصوص اور تقریباً پوشیدہ تھا۔ کھول کر برف بار رات میں اس نے حسین کو باہر دھکیل دیا۔

"جاؤ۔ خدا تمہارا چہرہ تاریک کرے۔ میں پھر تمہیں بغداد میں نہ دیکھوں ورنہ ان شعبدوں کے باوجود میں تمہیں ضرور قتل کر دوں گا۔ تمہارا انجام اچھا نہ ہو گا۔"

"تمہاری مشکل میری سمجھ میں آتی بھی ہے اور نہیں بھی۔" خراسانی نانبائی نے تنور پر جھکے جھکے روٹیوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔ "تم کہتے ہو کہ بغداد میں رہنا تمہارے لیے ضروری تھا۔" اس نے تمتمائے ہوئے چہرے سے پسینہ پونچھا۔

"جب تم وزیرِ اعلیٰ سے پوشیدہ رہو گے تو شہر میں کیونکر رہو گے۔ قاضی عمرو جو شحنہ ہے' اس کا بہت عزیز دوست ہے۔ وہ تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم یمن چلے جاؤ یا فارس یا عراق۔ خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ ہر ملک ہمارا ملک ہے کہ ہمارے خدا کا ملک ہے۔" اس نے ہنس کر نان ایک ریشمی کپڑے میں لپیٹے۔

"نہیں میرے احکامات یہیں کے ہیں۔" حسین نے چاروں طرف نظر ڈالی۔

"تمہارے لیے یہ حکم کون دیتا ہے۔" نانبائی نے حیرت سے پوچھا۔ وہ دیر تک بڑی سوچتی ہوئی گہری نظروں سے حسین کی طرف دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ تنور میں سے نیلا دھواں نکلنے لگا اور جلن کی خوشبو سے ہوا بھر گئی۔

یہ دارالحربیہ اور باہر کے مکانات سے دور جنگل کے قریب ایک قلعہ نما مکان تھا جو اب سرائے بنایا گیا تھا۔ اس سمت سے کاروانوں کا گزر بہت کم ہوتا تھا کیونکہ آباد شاہراہ دوسری طرف اور صاف تھی۔ جس شخص نے پہلے پہل اس کو خریدا' وہ تھوڑے دنوں بعد ہی بھیڑیئے کے کاٹنے سے مر گیا تھا۔ اس کے بیٹے نے اس جگہ کو منحوس خیال کرتے ہوئے کبھی اس میں رہنا پسند نہ کیا۔ یوں بھی وہ دربار میں کاتب تھا اور شہر کی زندگی کا عادی۔

تہہ خانوں میں تاریک چکر دار سیڑھیوں سے داخل ہوتے تھے اور پُر پیچ گھٹے ہوئے راستے جنگل میں غاروں میں کھلتے تھے۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سازشیں اور بغاوتیں جنم لیتی پروان چڑھتی اور پرورش پاتی ہیں۔ کارواں سرائے بن کر اس ویرانے

میں زندگی اور رونق لوٹ آئی۔ خراسانی کا مزاج عمدہ اور معلومات لاانتہاء تھیں۔ وہ ایک داستان طراز اور مغنی ہی نہیں شاعر بھی تھا۔ اس لیے بغداد کے ناکام مغنی دربار کی امید میں عمر گزارنے والے شاعر' بے ٹھکانہ آوارہ گرد سپاہی' خوابوں اور سایوں میں پناہ لینے والے نیم دیوانے' سیاست سے بیزار اور ناکام ہو کر گوشہ نشین ہونے والے طالع آزما یہاں اکثر شامیں گزارتے۔ یہ محفلِ جانانہ یوں آباد تھی۔

تہہ خانہ حسین کے لیے ایک عمدہ جائے پناہ تھی۔ پانی کی ذمہ داری علی بن احمد نانبائی نے اٹھائی تھی اور ایک دریچہ اس نے ہوا کے لیے چند اینٹیں نکال کر اس میں بنادیا تھا جسے بند بھی کیا جا سکتا تھا۔ روشنی کے لیے چراغ بھی اس نے مہیا کیا اور بوریا نشین درویش کے وجود کو اس نے اپنی سرائے کے لیے بابرکت سمجھ کر ساری خدمات اپنے ذمہ لے لی تھیں۔ خدا سے محبت کرنا' اس کے بندوں سے محبت کرنا ہے اور اسے خدا سے کوئی خاص شکایت بھی نہیں تھی۔ کاروبار میں حسین کے آنے کے بعد سے بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ یک بیک خراسانی سرائے کی روٹیوں کی مانگ بغداد میں بڑھ گئی تھی۔ کاروان بڑی شاہراہ چھوڑ کر ادھر سے نکلنے اور یہاں ٹھکانہ کرنے لگے تھے اور راتوں کو چہل پہل سے ایک نہایت آباد میلے کا گمان ہوتا تھا۔ پاس کے دیہات سے لوگ کارواں والوں کے لیے روٹی اور مکھن اور ضروریات کی دوسری چیزیں لاتے۔ باتوں اور ہنسی اور قہقہوں کا شور کبھی دالانوں میں سے ہو کر دیواروں کو پار کر کے ہوا کے لیے بنے ذرا سے دریچے کو پھلانگ کر اندر حسین تک جا پہنچتا اور اسے بیضا یاد آنے لگتا۔ جہاں اس کے دادا کے زمانے میں ایسی رونقیں رہی ہوں گی۔ منصور کا قوسِ زندگی جس کے دونوں کنارے نامعلوم تھے اور نصف دائرہ اس کے سامنے تھا۔ اس کا باپ یکایک لاپتہ ہو گیا تھا۔

مدتوں اسے اپنی خبر بھی تو نہیں ملی تھی۔

اور اب اسے اپنی خبر کب تھی' جیسے بجلی کا لہریا بادلوں کی سیاہی کو چند لمحوں کے لیے زیادہ نمایاں کر دیتا ہے۔ اس کے احوال' حجابات' ہوش اور سُکر' وہ ایک کوڑے کی طرح لہرایا جاتا تھا مگر لہرانے والے ہاتھ سے باخبر ہونا حاصلِ حیات تھا۔

۱۰۰ ایک عاشق تھا جسے شرابِ محبت نے مدہوش کر دیا تھا۔

اس نے لباس ظاہری کو تار تار کر دیا تھا اور خودی کا پیرہن چاک کر ڈالا تھا۔
اس کی ایک نام کی بازگشت
نغمۂ محبت تھی۔

بغداد اپنی جولانیوں اور رنگینیوں اپنی کثافتوں اور دلآویزیوں سمیت اس کے لیے حکم تھا اور یہیں اسے منتظر رہنا تھا۔ وہ دشتِ سُوس سے یہاں لایا گیا تھا۔ گریہ کناں وہ راہِ محبت میں رفیقوں کو تلاش کرے' اپنے نغمے میں ان کو ہمنوا بنائے اور درس محبت کو عام کرے مگر سمنون محبّ اسے کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ اس کے پردۂ دل پر ان کی تصویر منعکس نہیں ہوئی۔ شبلی اس کی بساطِ انس سے دور تھے۔ جنید جانتے ہوں گے جیسے بایزید جانتے تھے ـــــ ابن عطار کا دل بھی اس نغمہ عشق کو اس کی ہمنوائی میں گاتے ہوئے ایسا ہی تھا جیسے پرنیاں میں شعلہ لپٹ جائے اور اس کو شعلہ بنادے۔ راہ محبت میں بھلا کون کسی کا رفیق ہو سکتا تھا۔

فضا میں اتنا اضطراب تھا اور اتنی خاموشی جیسے طوفان سے پہلے کا سناٹا ہو۔

خراسانی سرائے میں لوگوں کا مجمع' کاروانوں کی آمدورفت اور میلے کی سی کیفیت میں کمی آگئی تھی جیسے یہ اتار کی تاریخیں تھیں اور چاند گھٹ رہا تھا۔ سمندر ساحل سے دور ہٹ گیا تھا اور اس کے شور میں کمی آگئی تھی کیونکہ حسین پر ایک گمشدگی کی کیفیت تھی اور خراسانی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ زیادہ وقت تہہ خانے میں گزارتا تھا۔

حسین کا اناالحق اب ایک الہامی کیفیت بن کر ان کے درمیان گونجتا۔ یہ ان کی امانت تھا جس لفظ کی حفاظت وہ اپنی جان سے کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے عرش ان کے درمیان اتر آیا تھا اور دل آئینے کی طرح اس کے عکس کو اپنے میں دیکھ رہا تھا۔ جیسے مکہ کی پہاڑیوں کے درمیان خلیل ابراہیم کی بیوی ہاجرہ اور چھوٹے بچے اسمٰعیل کے ساتھ عرش اترا تھا۔ صفا اور مروہ کے درمیان اور قبۂ زمزم میں آباد ہو گیا تھا۔ حسین کے دل میں بھی عرش معلیٰ اتر آیا تھا۔ وہ اپنے مکین سے مزین ستاروں' سمیت آفتابوں اور ماہتابوں سے ضو فگن!

نصر قشوری نے جب اجازت چاہی کہ وہ اس سال امیر حج بنا کر حرمِ کعبہ جا رہا ہے تو حسین نے ہنس کر کہا:

"تم میرا طواف کرلو۔ سات بار میرے گرد چکر لگالو۔"

نصر کی آنکھوں میں شدت جذبات سے آنسو تھے۔ اس نے جھک کر زمین پر سجدہ کیا تھا۔ اس درماندہ حالت میں جب ہر لمحہ باہر والوں کے در آنے کا خطرہ تھا' وہ بھلا حسین کو چھوڑ کر جاسکتا تھا؟ ذکر کی محفل میں وہ سب اپنا آپ بھول کر منہمک ہوگئے تھے اور انہوں نے سرائے کے دروازوں کو بند کر دیا تھا۔ خراسانی کے پاس وقت کہاں تھا؟

وہ بے پناہ آنکھیں بیدار اور ہوشیار ہولے ہولے انا الحق کہہ رہی تھیں۔ ہر بنِ مُو سے انا الحق کی صدا آنے لگی تھی اور پھر خراسانی سرائے اور سب کچھ جو اس میں تھا' جیسے ساری کائنات اس گونج میں سما جائے۔ ہوش و خرد' قلب و نظر ــــ

اگر میں خلق ہو کر "میں" کہوں

اور وہ بھی "میں" کہے

تو یہ میری توحید ہوئی

وہ میری توحید اور مجھ سے منزّہ ہے

اگر توحید اس کی طرف لوٹ جاتی ہے' میں کہتا ہوں اسے واحد کی طرف لوٹنا ہے

تو میں توحید کو بھی خلق کیا ہوا کہوں

اور پھر بنانے والے کا بنائی ہوئی تخلیق کی شے سے رشتہ؟

توحید تو اللہ سے علیحدہ ہے

ایک ذرا سی آبِ جُو اپنے اشواق شدید میں بڑھ کر بحرِ بیکراں بن گئی تھی

زرد رُو لوگ حیرت زدہ گنگ بے حس و حرکت منتظر رہے تاکہ حسین اپنی اس حالت سے باہر آئے

اس کا یہ نعرۂ مستانہ!

شبلی تہ خانے کے دروازے میں کھڑے تھے اور پھول سونگھ رہے تھے۔

"حسین! تم تو جری اور بہادر ہو۔ جو کچھ تمہیں سپرد کیا گیا ہے' اسے پردۂ راز میں رکھو۔ تمہاری فہم و فراست سے یہ سب بالاتر ہیں۔ اس کو لفظ نہ دو۔ ہاں لفظ لامحدود کو محدود کر دیتے ہیں۔ لفظ ــــ اور یہ افشائے راز ہے۔ اس کی سزا سخت ہے حسین ــــ گمراہی سے بچو۔"

لق و دق صحرا کا سا تہ خانہ تھا اور لوگ دم بخود تھے۔ وہ زانو تہ کیے بیٹھے تھے اور حسین کی خونِ کبوتر سے بھی سرخ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس کے وجود پر رعشہ تھا۔ جیسے زور کے لرزے سے بخار چڑھ رہا ہو۔ اس کی جان اتنی بے تاب تھی اور تپش کی لپیٹیں دوسرے دلوں تک یوں جا رہی تھیں جیسے سورج کی جلانے والی حدت و حرارت ہو۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس کا وجود یوں ہلایا جاتا جیسے بچے درخت کو پھلوں کے لیے شاخوں سے پکڑ کر جھول جائیں اور جب اس شاخ کو آزاد کریں تو وہ پورے زور سے دوسری شاخوں میں ملے۔

تڑپ کی یہ کیفیت دیکھ کر شبلی آگے بڑھے۔

"حسین۔" انہوں نے پکارا۔

بجلی کے لہریئے نے اس کے وجود کو چھو لیا۔ بے قراری میں اس کو موت کے سانس کی ٹھنڈک اپنے گرد محسوس ہوئی۔

"انا الحق۔" اس نے آنکھیں جھکا کر کہا۔ وہ نہایت تن کر بیٹھ گیا اور شبلی کی موجودگی کو نظر انداز کرنے کی کوشش میں اپنے آپ کو سمیٹنے لگا۔

"یہ تڑپ تو دیدنی تھی مگر رازِ عرش اپنی زبان سے کیوں کہتے ہو۔" شبلی پھول کو ایک سے دوسرے ہاتھ میں بدل رہے تھے۔

"انا الحق" ـــــ خراسانی سرائے کے در و دیوار کہہ رہے تھے۔ نیچی چھتوں کے راستوں سے لمبی سرنگوں سے جو جنگل میں کھلتی تھیں، یہی صدا آرہی تھی۔ عرش و فرش اور درخت یہی کہہ رہے تھے۔ دنیا جیسی کہ وہ تھی اور قریۂ بغداد اپنی رونقوں میں گم، رودِ دجلہ اور ہر ذرۂ ریگ پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ "انا الحق"

جنید اپنے مدرسے میں درس دیتے ہوئے کچھ سوچنے لگے۔ دروس میں شامل طالب علم، خرقہ پوش، گدڑی پہننے والے اور فقیر و غنی۔ سبھی دلوں کو سنبھالتے اپنے ساتھ کشمکش اور حالتِ جنگ میں تھے۔

سارے سناٹوں اور دو پہروں کی خمیدہ ساعت میں وقت رک گیا تھا اور صدائیں ٹھہر گئی تھیں۔ صرف "انا الحق" سنائی دے رہا تھا۔ بانگ کی طرح سماعت میں گھلا ہوا صحرا میں جرسِ کارواں۔

مدرسہ نظامیہ کے علماء اور فقہاء، متوحش اور سراسیمہ اپنے آپ کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے آہوئے ختن نافے کی خوشبو کو ژولیدہ سوریت کے لہریوں پر رمیدہ اپنے گرداگرد پھرے اور اس بوئے خوش کے منبع کو تلاش کرے۔ تیز دیوانی دوڑ میں وہ اس کے تعاقب میں شکاری بن کر بھاگے اور اٹھی ہوئی دم اس کے نہایت حیران اور خوفزدہ ہونے کا پتہ دے۔ لمبی اڑان کی سی جست لگا کر وہ بڑی بڑی آنکھوں سے پیچھے بھی نگاہ رکھے۔

جنید کسی الجھے ہوئے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے یکایک چپ ہو گئے تھے اور اس جان کے خروش کو سن رہے تھے جس کی بے حوصلگی، بے ترتیبی، عنقریب اس سارے فرقۂ درویشاں کو مبتلائے عذاب کرنے والی تھی۔ صوفیائے بغداد جو جرأت و بے باکی کو پردوں میں پوشیدہ رکھتے تھے اور جن کے علم کی کوئی انتہا نہ تھی جو اپنی کھال کو بچانے کی نہیں، حرمتِ توحید کے گرداگرد نثار ہونے کو حاصلِ حیات سمجھتے تھے۔ یہ مبتدیوں کی توحید تھی کہ اپنی ذات کے وساوس اور خوف بھی قائم رہیں اور آدمی اس کو اپنا واحدِ واحد خدا سمجھے۔ اپنے یقین کی ڈوری اس سے باندھ کر رکھے۔ اپنی امیدیں اور ارادے اس کو سمجھنے خوف و رجا میں بھی گرفتار ہو۔ پھر اس کی واحدنیت کا اقرار کرے۔ اس سے محبت کرے اور اس کی محبت میں غرق ہونا چاہیے۔ ہو جائے اس بحر کی شناوری کرنے کے قابل بنایا جائے اور جلوۂ جاناں سے شادکام ہو اور میثاق عہد یاد کرے تو اپنے خدا سے اپنا اقرار بھی اسے یاد آئے مگر یہ کلمہ انا الحق۔۔۔۔ منصور کے بیٹے حسین کو کیا ہو گیا تھا۔

اس شام مدرسہ نظامیہ کے حضرت جنید کے ہاں ایک مجلس مشاورت ہوئی۔ ابنِ عطا دوئم اور شبلی اور لوگوں کے ساتھ حاضرِ مجلس تھے مگر ان تینوں میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی۔ جنید اس پہلے مقدمے کا ذکر کر رہے تھے جس میں غلام الخلیل نے خلیفہ کی عدالت میں صوفیاء پر الزامات عائد کیے تھے اور ان کی تعلیمات کو نوجوانوں اور نو داسلام کے لیے زہرِ قاتل قرار دیا تھا۔ اگر خدا کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو چھٹکارا مشکل ہو جاتا۔ اس لیے لوگوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں احتیاط کرنی چاہیے۔

''اے سردارِ طائفہ۔'' سمنون محبّ نے کہا ''حسین دیوانہ نہیں، صرف خدا کبھی کبھار اسے اس سے لے لیتا ہے۔''

"شدت اسے لے ڈوبے گی۔ یوں عوام کے درمیان نشست جمانا اور خدا سے اپنا رشتہ بے حجابانہ اعلان نہیں کرنا چاہیے۔ خدا بہت غیور ہے۔ پردوں میں رہتا ہے اور رازوں کو سرِ عام کہنے کی سزا دیتا ہے۔" ابو حمزہ نے کہا۔

فاطمہ نیشاپوری ایک تیز دھار تلوار کی طرح خفگی اور جلالت میں تھیں۔ "خدا اور آدمی کا عشق لوگوں کو کیوں چونکا دیتا ہے۔"

"لوگوں کی غیرت کہ وہ صوفیوں کا خدا کے نام کے ساتھ وہ سب منسوب کرنا پسند نہیں کرتے جو صوفیا کہتے ہیں۔ ان کی عقلیں ان حدوں سے ادھر ادھر کہاں دیکھ سکتی ہیں۔ لوگ ان مناجاتوں' عبادتوں' ریاضتوں کو نہیں سمجھ سکتے جن سے جان خروش میں گرفتار ہوتی ہے۔" جریری نے فاطمہ نیشاپوری کی طرف منہ کر کے کہا۔

"حسین ابنِ منصور سب کو کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا کریں گے۔" شبلی نے مسکرا کر چاروں طرف دیکھا۔

"کیا ان کو روکا نہیں جا سکتا۔ باز رکھا جائے تو کیا وہ ہوش و خرد کی طرف لوٹ نہ آئیں گے۔" دائرے میں سے کسی نے پوچھا۔

شبلی مسکرائے اور پھول کو اس کے ڈنٹھل سے گھماتے رہے۔

ہولے ہولے یہ نہایت نرم رو لوگ مباحث میں الجھ گئے اور نشست طویل ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ حضرت جنید کی خادمہ زیتونہ نے اعلان کیا کہ ہمسائے میں کوئی وفات پا گیا تھا۔ لوگ منتظر تھے کہ جنازہ اٹھے اور اس کے لیے وہ ان کی شرکت چاہتے تھے۔

اٹھتے ہوئے جنید کہنے لگے۔ "میں تو مدرسے کا استاد اور فقیہ ہوں' صرف حسین کو دیوانگی اور اس کا اعلانِ حق مجھے نہایت بد صورت لگے ہیں۔ میں چاہوں گا کہ اگر معاملہ آگے بڑھے تو میں دربار کی حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جاؤں۔"

دوئم' عطا اور شبلی نے پوچھا "اگر طلبی ہوئی تو کیا جواب ہوگا؟"

"طلبی ـــــ" جنید جاتے ہوئے کہنے لگے "حسین کا اعلان دیوانگی ہی نہیں شریعت میں رخنہ اندازی تھی اور خلق اس سے فساد میں مبتلا ہو سکتی تھی۔ خلق کی خاطر اسلام کے لیے ہمیں وہی کچھ کہنا تھا جو شرع کا حکم تھا۔"

خلقت حسین کی وجہ سے فتنے میں مبتلا ہوئی جاتی تھی۔ ذرّوں کی ممکنات! ہر ذرہ ایک مکمل جہان "انا الحق"

اس کا حلقۂ عقیدت منداں اور اس سے حسنِ ظن رکھنے والے لوگ خراسانی سرائے کے باہر جمع ہو کر اس سے دعا کے طالب ہوتے تھے۔ ذکر کی محفلوں میں شرکت کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی اور ایک اژدھام اس کی ذات سے مستفیض ہونے کے لیے منتظر رہتا۔ بغداد میں ایک سیلاب افواہوں کا اُبلا پڑتا تھا۔

لوگ اس کے "انا الحق" کو شک و شبہ سے دیکھتے اور پھر اس کے معتقد ہو جاتے تھے۔ وہ تماشا بن گیا تھا۔ اسرارِ جہاں اور اسرارِ حال کی سمجھ نہ رکھنے والے مرد اور عورتیں امنڈے پڑتے تھے۔ وہ اس صورتِ حال سے بے خبر' بے نیاز' اپنا تارِ حیات پر مضراب بے خودی سے نغمہ الست سنتا تھا۔ اس کا دھنکا ہوا وجود ہوائے الوہیت کے دوش پر جانے کن جہانوں' کون سی دنیاؤں میں محوِ پرواز تھا۔ خراسانی نانبائی ایک بڑے راز کی طرح اس کی حفاظت کرتا مگر سیلاب کو بھلا بند کیا جا سکتا تھا۔ پہاڑی پر شور ندی کی طرح اس کی آواز ہر بند کو پھلانگ کر صورِ اسرافیل بن گئی تھی۔

قاضئ بغداد کے حکم سے وہ اسے خراسانی سرائے سے بندی خانے میں لے آئے۔

نوری خفا تھے کہ حسین نے ان سب کو رسوا کر دیا تھا۔

سمنون مسکرائے

"بھلا راہِ محبت میں کوئی کسی کا رفیق ہوا کرتا ہے۔ حسین اس نعرۂ مستانہ انا الحق سے کسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا تھا۔"

ابو حمزہ نہایت غمزدہ حضرت جنید کے پاس آئے۔ بہت دیر خاموش بیٹھے رہے۔

"یہ آتشِ شوق جو سیلِ بے پناہ بن کر بغداد کے اوپر بہہ رہی ہے' حسین کی لتہابِ ذات تک ہی محدود نہیں ہو سکتی تھی۔"

مدرسہ نظامیہ کے علماء اور فقیہہ اور مدرس اس اسرار سے آگے کوئی بند نہیں اندھ سکتے تھے کہ یہ راز افشانہ ہونے پائے۔

جنید سوچتے ہوئے اور بہت افسردہ بیٹھے تھے۔ جب زیتونہ نے انہیں یاد دلایا کہ

ہمسائے میں لوگ جنازہ اٹھائے جانے کے لیے ان کے منتظر ہیں تو وہ گویا مراقبے سے باہر آئے۔ ابو حمزہ سے کہا:

"کبھی ایک قطرہ بھی لبریز پیالے کے لیے بہت ہوتا ہے' بہت زیادہ اور یہ کون بتا سکتا ہے کہ حدود کہاں ہیں۔ میں نے اصول وضع کرنے اور اسرار کو اپنے طور پر سمجھنے کی بہت کوشش کی ہے۔ یہ توفیق کہ کون اس چشمۂ حیواں سے آبِ حیات کی تلاش کے بعد واپس آسکتا ہے' میں جان نہیں سکا۔ ابو حمزہ' حسین کے لیے اس کا حال کیوں ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔"

پاس کی مسجد میں اذان خشک زمین پر بارش کے قطرے کی طرح سننے والوں کے دلوں پر ایک سنسناہٹ پیدا کرتی ہوئی روح و قلب' دل و جگر کو رحمتوں کا پیغام دیتی ہوئی برسنے لگی تھی۔ وضو خانوں میں جاری پانی پر لوگوں کا ہجوم تھا اور درود و سلام کی تکرار سے فضا معمور تھی۔۔۔ حق' حق' انا الحق۔

حسین کا جرم کیا تھا۔

یہ اس کے نعرۂ انا الحق کی آزمائش کی گھڑی تھی۔

ابو یعقوب اقطع اور عثمان مکی میں زینب کے بعد وہ تلخی آہستہ آہستہ کم ہو گئی تھی۔ پھر وقت نے بھی اس دراڑ کو پُر کیا۔ وہ دونوں کسی نہ کسی طور حسین سے وابستہ تھے اور لفظ انا الحق کو سن کر نہایت پریشان ہوئے تھے۔ عثمان سوچتے تھے' یہ تربیت اور تہذیبِ نفس کی کمی تھی۔ حسین نے کبھی کسی مرشد کے سامنے اپنے آپ کو پیش نہیں کیا تھا۔ جیسے درخت کی فالتو شاخوں کا کاٹنا اور سنوارنا ضروری ہوتا تھا' بعینہٖ راہِ ہدایت پر چلنے والے کو قدم قدم پر دعاؤں اور نظرِ التفات کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ رہنما کے بغیر اس دشتِ بے در میں آدمی بھٹک جاتا تھا اور حسین بھٹک گیا تھا۔ جن تجلّیوں تک پہنچ کر وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا' ان کی برداشت کے قابل اسے بنایا جا سکتا تھا۔ اگر وہ کسی واقفِ راز سے خیر و برکت حاصل کرتا مگر وہ گنج نامہ کو اپنے طور پر سمجھنے میں گم کرد

راہ تھااور آندھیوں کی زد پر ایک ذرۂ ناچیز کی طرح اٹھایا' گرایا' پٹخا جارہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر کوئی دسترس نہ تھی۔ سب سے بڑی سعادت تو راہ حق میں احوال کو پہچاننا تھا۔ ابلیس نے انا خیر کہا تھااور عرش کی بارگاہوں' جنت کے مرغزاروں اور قربِ الٰہی سے راندۂ درگاہ بن گیا تھا۔ انا الحق کہنے والے کا حشر معلوم؟

اقطع کو اس کی آزاد روی پسند تھی۔ اپنے طور پر فیصلے کرنے کی صلاحیت۔ اپنی ممکنات کی نہایت کو سمجھنے کی تڑپ اور بے قراری۔ اس راہ میں مشقت اٹھانے کا حوصلہ۔ یہ باتیں کسی اور میں نہ تھیں یا انہوں نے حسین کو جن مقامات سے گزرتے پایا تھا' زینب کے گزر جانے کی خبر انہیں بہت زمانوں کے بعد ملی تھی۔ منصور کے پوتے دولت دنیا اور طلب جاہ کے عام راستے پر چل نکلے تھے تو یہ باعثِ فخر بات تھی۔ بہر حال دنیا اتنی ناکارہ شے تو نہ تھی کہ اسے بیکار سمجھ کر دھتکار دیا جائے۔ خراسان کی روز روز بدلتی حکومتوں کے لیے حسین کے بیٹے معتبر رفقائے کار تھے کیونکہ وہ اپنے کام سے وابستگی رکھتے تھے اور کسی دربار کے عہدے کے منتظر نہ تھے۔ وہ نہایت معزز مسلمان' جن کے خون کی آبیاری میں آتش پرستوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کو لگا دیا تھااور بیاض کی خوشبو سے بھری ہواؤں نے ان کی چمن بندی کی تھی۔ اقطع نواسوں کی طرف سے مطمئن تھے مگر حسین یہاں وہاں ایک اجنبی کی صورت ہی رہا جس کی وارداتِ دل اسے رسوائی کی طرف لے گئی تھی۔ پتہ نہیں اسے حوصلہ اور برداشت کی نعمتوں سے محروم کیوں رکھا گیا تھا۔ خدا اس سے کیا چاہتا تھا۔۔۔ کچھ زندگیاں دوسروں کے لیے باعث عبرت بنائی جاتی ہیں۔ نہایت دشوار راہوں سے پُراسرار قوتوں کے عقب میں وہ درد اٹھانے کی لذت سے آشنائی کی تو جاتی ہیں مگر درد کو عام نہ کرنے کی وجہ سے انہیں لوگوں سے بیگانہ بنا دیا جاتا ہے۔ ہوش و خرد سے اور اپنے آپ سے۔

حسین تو بندی خانے میں ہمیشہ سے تھا۔ اپنی ذات کے قید خانے سے نکل کر وہ جس کی قید میں تھا' وہاں سے نکلنا صرف خیال اور محال تھا محض جنوں!

اقطع نے اپنے سر کو جھٹکا اور نماز کے لیے خانقاہ کے طویل دالانوں کی طرف بڑھ گئے جہاں تسبیح و تہلیل سے فضا معطر تھی۔

یخ بستہ ہواؤں کے چلنے سے موسم نے بغداد کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ کوہ البرز سے چلنے والی برف بار آندھیاں زندگی کو معطل کر دیتیں۔ دجلہ میں لہریں آہستہ خرام ناقاؤں کی طرح ناز سے اٹھلاتی ہوئی کشتیوں کو محملوں کی طرح (جن میں نازک آبگینوں کسی سی کنواریاں ہوں) اپنی پشت پر بلند کرتیں جبکہ ٹھٹھرے ہوئے درخت آب رواں میں اپنے تاریک سایوں کا لرزنا بھی برداشت نہ کرپاتے۔ راتوں کو مغربی کنارے کے محلات کے باہر محافظ دبکے ہوئے نیم خوابیدہ سطح آب پر نظریں جمائے گرم بادِ دشت کے خواب دیکھتے اور اونگھتے تھے۔ شاہراہیں ویران' راستے خاموش اور محلے چپ ہوتے تھے۔ لوگوں کا سیلِ رواں جو بازاروں میں' خانقاہوں' مدرسوں' مسجدوں' نصرانی عبادت گاہوں کی طرف جاتا تھا' نہ ہونے کے برابر تھا اور ستارے بے ستونوں کے دھواں دھواں آسمان کی نیلاہٹ میں تیزی سے چمکتے۔

حسین نصر حاجب کے زندان میں اسیر تھا۔

ام مقتدر کی سبک رفتار کشتی کنارے سے لگی اور پچھلے گلیاروں سے ہو کر جو بڑی راہوں پر کھلتے تھے' وہ اپنی کنیزوں کے ہمراہ (جنھوں نے اپنے روشن چہرے نقابوں کے پیچھے چھپا رکھے تھے) اس طرف رواں ہوئی۔ ان کا نصرانی غلام راستہ دکھاتا آگے جا رہا تھا اور پہچانے جانے کے ڈر سے وہ سب سیاہ رداؤں میں لپٹی تھیں۔ یخ بستہ تاریک رات کا حصہ بنی ہوئیں۔

شغب کا دل انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔ اسے حسین کے اس تصرف کا بتایا گیا تھا کہ مستقبل میں جو پوشیدہ ہو تو وہ جان لیتا تھا۔ مستقبل میں اس کے لیے اس کے بیٹے کے لیے اور عباسی خلافت کے لیے کیا تھا۔ جاننے کی خواہش اسے زنداں کی طرف لیے جاتی تھی۔ ترک بادشاہ گروں کی نظرِ التفات کدھر ہو گی۔ غلام مونس جس نے چند سالوں میں نہایت اہم عہدوں پر ترقی حاصل کر لی تھی' وقتی مغائرت کے بعد اب کیا کرنا چاہے گا۔ خود مقتدر جو ماں کے اثر سے آزاد ہونے کے لیے کروٹیں لے رہا تھا' کیا ایک پُرخلوص اولاد ثابت ہو گا۔ خلیفہ کے مزاج میں بہت زیادہ دخیل حامد بن عباس کہیں وزارتِ عظمیٰ کا خواب تو نہیں لے رہا۔ آنے والا زمانہ کیا آفتیں یا مسرتیں

لانے والا تھا۔ وہ آتش فشاں کے دہانے پر تھی اور وسوسوں، وہموں، خوف سے پریشان رہا کرتی تھی۔ گزرے زمانوں کے فسانوں میں اسے اپنے آنے والے دنوں کی پرچھائیں دکھائی دیتی تھیں۔ ہر آہٹ پر کان رکھے، چوکنی صحراؤں میں گھومنے والی ہرنی کی طرح وہ سایوں سے بھی بدگمان ہو جاتی تھی۔ شاہی زندگی میں سکون کے سوا سب کچھ تھا اور شاید حسین اسے اس متاعِ گرانمایہ کا نشان دے سکے۔ وہ سوتے اور جاگتے میں جو خواب دیکھتی تھی، ان کی اصل کیا تھی، یہ جاننا اس کے لیے ضروری تھا۔

برف پوش وادیوں میں چراگاہوں اور شفاف پانیوں کے ساتھ گزرا بچپن اسے یاد آتا تھا جہاں غاروں میں اس کا کنبہ سرد موسموں میں تقریباً بند ہو کر بھیڑوں کے ساتھ ایک ہی چھت تلے گزارا کرتا۔ بھیڑوں کے جسموں سے نکلتی ان کے مُوت اور گوبر کی بُو ان کے سانسوں میں بھی رچ جاتی۔ مینگنوں سے جلائی گئی آگ پر پکایا ہوا شوربہ اس دھوئیں کی بساند لیے ہوتا اور چربی کے ساتھ مزے میں بھی ملا رہتا۔ مدھم روشنی میں وہ اور اس کی ماں رنگین تاگوں سے لباسوں پر اور ٹوپیوں پر موتی ٹانکتیں اور بیل بوٹے بناتیں۔ شوخ اور زندہ رنگ جن کی ترتیب ان کے تصور سے پھولوں کا مرقع بن جاتی تھی۔

آزادی کے دنوں کا انجام آخر آ پہنچا۔ کنیزوں کے سوداگر جب ان دور دراز پہاڑی علاقوں میں آئے تو انہوں نے اس کی بہنوں میں سے اسے چن لیا۔ چشمے اور مرغزار، پہاڑوں کی نیلی ہوائیں اور وادیوں میں گونجتی صدائیں سب کسی اور زندگی کی طرح فراموش ہو گئے۔ تربیت گاہوں سے نکل کر جب وہ بغداد لائی گئی اور مقتدر کی ماں بنی تو اس نے اپنے مقدر سے صلح کر لی تھی۔ دربار اور اس کی ریشہ دوانیاں، سازشیں، طاقت، سیاست سب ایک رنگین ردا کی طرح اس کے سامنے پھیلے تھے تاآنکہ وقت نے اس کو تاکا اور مقدر اس پر مہربان ہوا۔ مکتفی نے اپنے کمسن بھائی کے حق میں وصیت کی اور وہ تختِ خلافت پر لایا گیا۔ اسے عہدوں اور حکومت کی ہوس تو نہ تھی مگر جب قسمت اس پر مہربان ہوئی تو اس کو سر جھکانا اور لوگوں کی فرشِ راہ نظروں پر قدم دھرنا بہت اچھا لگا۔

قید خانے میں اندھیرا تھا اور صرف چراغ کی کمزور لو لرزاں تھی۔ وہ سلاخوں سے

پرے روشنی کے دائرے سے باہر رک گئی۔

تاریکی کی طرف اشارہ کر کے حسین نے کہا۔

"آگے آؤ۔"

شغب نے چیخ کو روکنے کے لیے ہاتھ اپنے منہ پر بھینچ لیا۔

وہ نہایت عاجزی سے جھک گئی۔ اسے سب وقتوں سے زیادہ اس گھڑی خدا اور اس کے مقربین کی نظرِ کرم کی ضرورت تھی۔ اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے سینے کی حدوں کو توڑ کر باہر نکل جائے گا۔

"پردۂ غیب میں جو ہے' وہ سوائے خدا کے کون جان سکتا ہے امِ امیر المومنین"

"میں صرف دعا کی طالب ہوں۔" اس نے سلاخوں کو تھام لیا تھا۔

"امِ مقتدر! کیا آدمی مقدر سے لڑ سکتا ہے؟" حسین نے چھت کی طرف دیکھا

"بخدا نہیں ابنِ منصور! میں اسی لیے دعا کی طالب ہوں کہ مجھے مستقبل کی تاریکی سے خوف آتا ہے۔" شغب کی آواز آنسوؤں سے بھاری تھی۔

پھر اس نے دیکھا کہ حسین کا وجود آندھی کے دوش پر سوار گھاس کے تنکے کی طرح کانپ رہا تھا۔ شعلے کی طرح لرزاں چراغ کی لو کی طرح ترساں۔ امِ مقتدر نے ایک جلانے والی تپش کو اپنا احاطہ کرتے پایا۔ تیز گرم ہوا کے جھونکے جو سلاخوں کو ناقابلِ برداشت حدت سے پگھلا رہے تھے۔ پھر وہ ہلکی ہوتی چلی گئی اور بے وزنی کی کیفیت میں اوپر اٹھا لی گئی تھی۔ بلندی سے سارا بغداد اس کے قدموں تلے تھا اور اس کی نگاہیں گھروں' گلیاروں' عبادت گاہوں' محلات و بارگاہوں کو دیکھ سکتی تھیں۔ اس کے سارے خوف اور سوال اسے ہیچ اور فضول لگ رہے تھے۔ آدمی اتنے ذرا ذرا سے اور نہایت ہی کمزور حشرات الارض تھے۔ پھر وہ اور بلند ہوئی تو بغداد دھوپ میں چھپ گیا۔ نتھری ہوئی فضا سے اس نے نیچے کی طرف نظر کی۔ سب دھول تھا بے معنی لایعنی۔ لاحاصل!

اغول کے بیٹے حسین کی گمشدگی کو ایک زمانہ ہو گیا تھا۔ عبید اللہ المہدی کی

سلطنت کی سرحدیں اس عرصہ میں پھیل گئی تھیں۔ اس نے اپنے اس رفیق اور جانثار کو جس نے بغداد کی خلافت کے مقابلے میں ایک بڑی خلافت کی بشارت دی‘ کوشش کی، اپنی محنتیں اور محبتیں قربان کی تھیں۔ نامعلوم وجوہ کی بنا پر قتل کروادیا تھا اور حسین کو عبداللہ کے ساتھیوں میں شامل ہونے کی وجہ سے موت کا پیالہ چکھنا پڑا جو امام کی طرف سے آئے!

حامد بن عباس کی طرف اس خبر کا سفر بہت ہی آہستہ ہوا۔ جو آدمی یہ خبر لایا‘ وہ اس گروہ میں تھا۔ کسی نہ کسی طرح جان بچا کر بھاگا تھا اور کئی سال ادھر ادھر بھٹکتے رہنے کے بعد چھپتا چھپاتا یہاں پہنچا تھا۔ وہ مہدی کے باپ الحبیب کے مقربین میں سے تھا اور ان کے حکم سے اس نے عبداللہ کے ساتھ مغرب کی طرف مراجعت کی تھی۔ اسے عبداللہ کی بے قراری دیوانگی‘ خلوص اور عاجزی کا بہت احترام تھا۔ وہ برہنہ پا عبیداللہ المہدی کے استقبال کے لیے نکلا تھا اور سلجماسہ میں قید کیے جانے کے دوران رہائی کے لیے کوشاں رہا تھا۔ مختلف علاقوں سے داعی جو رقم جمع کر کے لائے تھے‘ وہ اس نے مہدی کی نظر کی تھی اور اس کا خون تک آبیاری کے کام آیا تھا۔ دیوانوں کا انجام دار ہی تھا۔

اس دار و گیر کی گھڑی جب اس نے حسین سے بھاگنے کا کہا تو اس نے نہایت خوش دلی سے کہا تھا۔

”موت کو آخر آنا ہی تھا۔ کسی طور کسی رنگ‘ کیا تم زندگی کے اتنے شیدائی ہو؟“

”یاسیدی! اس وقت تو مجھے فرار میں نہایت خفت محسوس ہوئی مگر زندہ رہنا اور ایک کھلی فضا میں سانس لینا بہر طور خدا کی رحمت ہے ___ میں ایک تنگ دریچے سے نکلا تھا اور ستاروں کو دیکھ کر میرا دل زندگی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ زندہ رہنا بہر طور ایک عظیم فتح ہے۔ جب چاروں طرف سے موت کی یورش ہو۔“

حامد کے منہ میں راکھ کا مزہ تھا اور بلند شعلے اس کے گرد ناچنے والے جنون کی طرح محوِ رقص تھے۔

تو سب لایعنی‘ بے معنی‘ لاحاصل!

وہ ایک دشت تنہائی میں کھڑا تھا اور ریگ رواں کے بھنور میں نہایت آہستگی

سے ڈوب رہا تھا۔ وہ آگ کے بحرِ ذخار پر ایک آتش گرفتہ تنکے کی طرح اپنے وجود کی حدت سے جل رہا تھا۔ اس کی عمرِ عزیز لاحاصل تمناؤں میں گزری سوختہ جان' دل گرفتہ' رنجور و مہجور' عہدوں اور طاقت اور دربارِ خلافت میں اس کی رسائی سے اسے منفعت نہیں ہوئی ـــــ آخر کیوں؟ ـــــ ایوان اس کے سامنے منہدم ہو گئے تھے۔ اب وہ کیا کرے۔ احساس شکست خوردگی ہی باقی رہا تھا۔ وقت اس کے ہاتھوں سے ریگ رواں کا دھارا بن کر پھیل گیا تھا۔ سارا جاہ و جلال' کنیزوں سے آباد قصر کا ہر کونہ' حکم دینے اور منوانے کی قوتیں سب لاحاصل' لایعنی۔

وہ خانہ باغ کی روشوں پر ٹہلتا رہا۔ تاریک رات میں جب محافظوں کی آوازیں اور چاپیں ہر کونے کو آباد کیے تھیں' وہ وحشت زدہ دیوانہ بنا اپنے ہی گرد طواف کرنے والا پروانہ تھا۔ اس نے آغاز میں ایک لائحہ عمل اپنے لیے تیار کیا تھا۔ سارے زاویئے صعود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سارے خطوط بالترتیب مائلِ پرواز نقطوں سے جو نقشہ بنتا تھا' اس میں کہیں جھکاؤ نہ تھا۔ پھر یک بیک قطب نما کی سوئی گر کیوں گئی تھی۔ لایعنی' لاحاصل!

اس نے حسین کی تربیت کرنے اور اسے شہزادوں کی صفات سے متصف کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ کلام پاک کے رموز و اسرار' تفاسیر' فقہ' حدیث' فلسفہ' ایک عمدہ سپاہی کی سی برداشت سب اس میں موجود تھیں۔ فنِ حرب اور یہاں تک کہ علم الکلام مذاہب کا تقابلی مطالعہ' کئی زبانیں جن پر سوائے اس کے اور کسی کو عبور نہ تھا' وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ پھر یک بیک کہیں تو کوئی غلطی رہ گئی تھی جس رخنے سے موت اور ہجر کی ہواؤں نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔ وہ چپکے چپکے عبید اللہ المہدی کے فرقے میں داخل ہوا اور آخر مغرب کی طرف چلا گیا۔ یہاں تک کہ موت نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ موت سے کسی کو مفر نہیں مگر موت نے اس کا گھر کیوں تاک لیا تھا۔ وہی حامد بن عباس اس کی نظروں میں کیوں تھا!

اغول کے چہرے پر ٹھنڈی زردی کے ساتھ ایک صبر کی جھلک ہوتی تھی۔ اتنے زمانوں کی دوری سے اب اسے سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ اپنی حالت پر راضی ہوتے اور خدا کی مرضی کو تقدیرِ الٰہی جان لینے کے بعد کی طمانیت تھی جس میں کوئی گِلہ یا شکایت نہ

تھی۔ اپنے آپ سے کوئی ہمدردی یا مقدر پر غم نہ تھا۔ اسے یاد آرہا تھا کہ اغول اپنی نہایت خلوتوں میں بھی اپنا آپ سمیٹے رہتی تھی۔ محلات اور چمک دمک اسے کبھی پکڑ نہ سکے۔ دو انسان اس کی زندگی میں داخل ہوئے اور دونوں اب موت کی آغوش میں پناہ گیر تھے۔ عالمِ جاوداں میں! اس کے سوالوں اور طوفانوں سے نا آشنا وہ اجنبیوں کی طرح اس کے دروازوں کے سامنے سے رخصت ہو گئے تھے کیونکہ اس کا دل ہر طرف سے بند تھا جس کا کوئی دریچہ بھی ان پر وا نہ ہوا تھا۔ ہاں اس گھڑی جب وہ اپنے آپ سے حساب فہمی کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سیلن اور بُو کی اس کیفیت میں کوئی ذی روح وہاں قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ نہ کوئی خیال اور نہ ہی کوئی محبت!

حسین اور امِ حسین دونوں اس کی دسترس سے باہر رہے ہمیشہ اور آدمی کا اختیار کس پر تھا۔

اغول عجیب سایوں اور روشنیوں کی سی زندگی گزار کر وہاں دشتِ سماویہ میں سو گئی تھی۔ وہ ابنِ منصور کو روح اللہ سمجھتی تھی۔ مثیلِ مسیح، مہدی آخر الزماں، موعودہ نبی جو مُردوں کو دوبارہ زندہ کرے گا اور وہی ابنِ نصر حاجب کے زندان میں کئی سال سے تھا۔ اغول کا روح اللہ قید میں تھا ـــــ غم کے باوجود ہنسی کا دورہ سا اس پر پڑا۔ جیسے دالان اندر دالان گوشے اور اونچی چھتوں والے کشادہ ایوان صناعی کا نمونہ، بارگاہیں اور طویل و عریض غلام گردشیں سب اس کے ساتھ مل کر اس روح اللہ کی ہنسی اڑا رہے تھے۔ پھر اس کا دل ایک خلا سے معمور ہو گیا اور خلا نے اس پر محیط ہو کر اس پر طاری ہونا شروع کر دیا۔ کوئی اس طلسم سے پرے کہہ رہا تھا۔

"حامد بن عباس کہاں ہے؟"

یہ گونج ایک تیز چیخ کی طرح اس محیط کے اندر سے ابھری۔ اسے اپنے چاروں طرف تمسخر اڑاتی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ خالی ایوانوں اور کھلے دریچوں اور بند کمروں اور نیلے آسمان تلے شور مچاتے پرندے فضا میں ڈبکیاں لگاتے کوے سب کہہ رہے تھے۔ کہاں ـــــ کہاں ـــــ کہاں ـــــ!

مہمانوں کی آمد آمد تھی۔ قصر کے راستوں پر روشنیاں درختوں کی گھنی شاخوں اور پتوں کے اندر پوشیدہ تھیں۔ جیسے ستارے ضوفشاں تو ہوں مگر ظاہر نہ ہوں۔ لمبی راہداریاں اور ایوان پُراسرار رنگوں سے آراستہ تھے اور ستونوں پر لپٹے پھولوں اور بلند و بالا چھتوں میں سے آبشار کی طرح گرتے نور کی وجہ سے یہ نشست گاہ جہاں حامد بن عباس لوگوں کا استقبال کر رہا تھا' نہایت پُرکشش تھی۔ کنیزیں ساقی تھیں اور ان پر خُلد کی حوروں کا گمان ہوتا تھا۔ وہ چلتی نہیں اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ بالوں میں چھوٹے چھوٹے گل رنگ سجائے وہ کسی اور سیارے کی مخلوق تھیں۔ شوخ اور دلیر' خاموش اور خوفزدہ' دلربا اور نظرباز' آہستہ خرام اور شرمیلی۔ لوگ باتیں کرتے اور نگاہِ غلط انداز سے ان کی طرف دیکھ لیتے۔ شمشاد قد اور ہوش و خرد شکار کرنے والی حرم کی یہ ساری آبادی خدا معلوم کہاں سے آئی تھی۔ دور دراز ملکوں کی نہایت حسین عورتیں جن کو آسمان کی نظریں بھی دیکھنا چاہیں مگر حامد کا دل اسے یاد کرتا تھا جو اب نہ تھی۔ جوان مجمعوں میں کبھی نہ تھی مگر پس پردہ روشنی کی طرح ہر چہرے کے پرتو میں شامل رہی تھی۔ رہنے والی تھی۔ اس لیے وہ کبھی اسے فراموش نہ کر سکتا تھا۔ پُرسکون' مکمل خاموش باوقار تمکنت۔ وہ ایک مکمل خاتون تھی اور اس لیے اس کا دل ایک عجیب ہیجان اور اذیت کی کیفیت میں سے گزرتا رہتا تھا۔

نصر حاجب کو بہت نمایاں جگہ پر بٹھایا گیا اور اس پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ لوگوں نے محسوس کیا تھا کہ صاحبِ خانہ اس کی طرف بہت مہربان تھا۔ سب سے عمدہ غلام نے نہایت مؤدب طریقے سے اسے بنیذ پیش کی تھی اور نقرئی جام جن میں قیمتی پتھروں سے میناکاری کی گئی تھی' اسے پیش کیے گئے۔ نصر کا دل گھبرایا ہوا تھا—— آخر اس سے یہ خصوصی سلوک کیوں جبکہ محفل میں تقریباً عہدیدار اور اکثر وزراء جو بغداد میں حاضر تھے' موجود تھے۔

موسیقی خوشبو کی طرح ہر سُو پھیلی تھی جیسے دیواروں اور فرش اور چھتوں سے پھوٹ بہی ہو۔ فضا اس سے معمور تھی اور گفتگو کو روک کر اسے سننے کی زحمت اٹھانا نہیں پڑتی تھی۔ خورد و نوش کا انتظام نہایت عمدہ تھا۔ شاہی دعوت کی طرح مکمل اور ہر

نقص سے بالاتر۔ لوگ گروہوں میں منتشر ہو کر فراغت کے بعد باتیں کر رہے تھے۔ جب حامد نے نصر کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"سیدی! آپ کا خانہ باغ بہت خوبصورت ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ ان روشوں کا ملاحظہ کریں جو میں نے اپنے چمن میں ابھی ترتیب دی ہیں۔"

دجلہ کا پانی چھوٹی چھوٹی نہروں میں رواں تھا اور پھر آبشار کی صورت میں نیچے گلستاں کی طرف گرتا تھا۔ حامد اور نصر آبِ رواں کے درمیان گھومنے لگے۔ عرش تاروں سے مزین اور نیلاہٹ قریب آ گئی تھی۔ خیمے کی طرح تنا ہوا آسمان زمین کو ڈھانپے ہوئے اور نارسائی کی حد تک دور نہیں تھا۔

ٹہلتے ہوئے وہ ایک پھولوں سے ڈھکی پہاڑی کے زینوں پر بیٹھ گئے۔

نصر نے کہا "میں تو اس خوبصورتی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا سیدی۔"

حامد کچھ سوچتا ہوا خاموش اور نہایت اداس تھا جیسے یکلخت ایک عجیب تھکن اس کو گھیر لے۔

نصر نے اس کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

حامد نے بہت دیر کے بعد کہا "مگر سب لاحاصل' لایعنی' بیکار۔"

"کیوں؟" نصر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ ساری بے نظیر خوبصورتی بیکار کیوں ہے؟ جب اس سے ایک دل بھی مسرت محسوس کرے تو یہ بیکار نہیں۔"

"میں اس ایک دل کی بات کر رہا تھا جو اس مسرت کو محسوس نہیں کر سکتا۔" حامد نے منہ نصر کی طرف کر کے کہا۔

"سیدی! آپ کے پاس کیا نہیں ہے۔ جاہ و دولت' صحت و مسرت' تقریباً ایک مکمل زندگی۔"

"تقریباً ایک مکمل زندگی۔" حامد نے نصر کے لفظ دہرائے۔ "کیا یہ مکمل زندگی ہے کہ جس شے کو چھو لو' وہ راکھ بن جائے۔ تمہارا سراپا ایسا زہر آلود ہو کہ تمہاری ذات سے متعلق سب کچھ اندھیرا ہو جائے۔"

نصر کے لیے یہ انکشافات بہت تھے۔ اسے سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا دل حامد کی محبت سے بھر گیا اور اتنے بڑے جہاندیدہ سپہ سالار' وزیر' عہدیدار اور عمدہ

دنیادار کی زندگی کا یہ پہلو اسے نہایت عجیب لگا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ حامد کی ایک خوبرو کنیز مسافت طویل کے دوران نہیں رہی تھی مگر یہ قصر تو روشنیوں کی سی رنگارنگ صورتوں اور غیر ملکی لونڈیوں سے پُر ایک حرم پر بھی مشتمل تھا اور وہ ساری داستانیں جو یہاں وہاں سے اس تک پہنچی تھیں' غلط تو نہ تھیں۔

"کیا کوئی ایسا نہیں جو اپنی دعا سے یہ مقدر پھیر سکے۔ صاحبِ نظر' مردِ خدا جس کی نگاہ سے تقدیر بدل جائے۔"

حامد کی آواز میں عاجزی' درماندگی' خستگی' بیچارگی تھی۔ کسی روباہی کا شائبہ تک نہیں تھا جس کے لیے وہ نہایت مشہور تھا۔

نصر سوچنے لگا۔ "کیا وہ اس سے حسین کی بات کہے۔ حسین' جو صاحبِ نظر تھا اور جس کی دعائیں مقدر پھیر دیتی تھیں" ___ اسے وہ بے پناہ آنکھیں یاد آئیں وہ نحیف و نزار قیدی جو اس کے سپرد کیا گیا تھا کہ انا الحق کہتا اور نہایت جنون و تشنج کی حالت میں لرزہ براندام ہوتا تھا اور جب ان کیفیات سے باہر ہوتا تو نوافل میں خشوع و خضوع اور الحاح وزاری سے گریہ کناں نہایت خاموش لگا رہتا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے باقی بندیوں کو کیسے آزاد کر دیا تھا۔ بس نظر بھر کر کسی کی طرف دیکھ لیناہی سب کچھ بدل دیتا تھا مگر صبر و سکون سے وہ اپنی عبادات' مجاہدوں اور ریاضتوں میں لگا رہتا۔ پھر اسے حامد کی وہ صفت یاد آئی کہ وہ ہر خوبصورت اچھی شے کو اپنا حق سمجھتا تھا اور اگر حسین کی صفات اور تفرقات کا اسے پتہ چل جائے تو وہ اسے ہمیشہ اپنے بندی خانے میں مقید رکھے گا تاکہ وہ اس کی دعا پر بھی بااختیار ہو ___ حامد صرف بااختیار ہونا چاہتا تھا اور یک بیک اس پر انکشاف ہوا کہ ہمیشہ سفر میں رہنے والی اس کی کنیز کیوں اس سے فاصلے پر تھی اور اس کا بیٹا حسین کیوں اس سے دور زندگی کے بوجھ سے آزاد ہوا تھا۔ حامد کا سانس موت کا سانس تھا اور اس کا اتنا بااختیار ہونا قہر تھا۔ وہ اسے ہرگز حسین بن منصور حلاج پر دسترس نہیں ہونا چاہیے اور اسے یہ خبر بھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کہاں تھا۔

"کوزہ گروں کے محلے کی طرف سنا ہے کوئی صاحبِ نظر ہے۔" حامد نے خود ہی نصر سے کہا۔ نصر کا گھر وہاں سے قریب تھا۔

"نہیں سیدی! میں نے کسی ایسے تذکرے کا تذکرہ نہیں سنا اور پھر میں سمجھتا

ہوں کہ خدا انسان سے اتنا دور کہاں ہے کہ واسطے تلاش کیے جائیں۔ آدمی دعا کرے اور صدقِ دل سے دعا مانگے۔ نالہ تو عرش سے بھی پرے جاتا ہے۔"

حامد نے عجیب نظروں سے نصر کو گھورا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی اور ایک فیصلہ' جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔

پھر اس نے آہ بھرا اپنے ساتھی سے کہا "ایسے مقدر سے انتقام لینا چاہیے۔ اس سے بے نیاز ہو جانا چاہیے۔ ہم دنیاداروں کو کہاں اتنی فرصت ہے کہ خدا سے سیدھا تعلق پیدا کریں۔ مجاہدوں اور ریاضتوں کے لیے تو ایک اور زندگی چاہیے۔ سب کچھ چھوڑ دینے کی بے نیاز ہو جانے کی زبردست خواہش۔ موت کی آرزو تاکہ حیات ابدی مل سکے اور میں مستقبل میں دور تک دیکھ کر کوئی معاملہ نہیں کرنا چاہتا۔ چاہے وہ مالک الملک سے ہی کیوں نہ ہو۔"—— وہ ہنسا اور اس کا قہقہہ نہایت کھوکھلا اور بے وقت پریشان کرنے والا تھا۔

جب وہ دونوں ایوان میں واپس آئے ہیں تو ہر آنکھ نے انہیں دیکھا اور سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ سب کونوں سے ابھری۔

لوگوں نے نصر سے مختلف سوال کیے کیونکہ دربار کی سیاست میں مونس کے بعد حامد ہی تھا اور یہ خاص الخاص سلوک تعجب خیز تھا۔ نصر حاجب تھا' بغداد کے دربار کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی لہروں پر اس کی نظر رہتی تھی اور خلیفہ کے نزدیک اس کا درجہ جو کچھ بھی ہو مگر مقدر کی مادرِ ہوشیار اس پر نظر کرم رکھتی تھی۔ وہ اکثر حرم کے دربار کے باہر سراپردوں کو تھام کر کھڑا رہتا تھا اور احکامات حاصل کر کے ان پر مہر ثبت کرواتا تھا۔ گویا ایسے احکامات جن کا تعلق براہ راست حرم سے ہو' حاجب کی وجہ سے اسی کے واسطے سے پایہ تکمیل کو پہنچتے تھے اور یوں دربار کی خبروں کو حرم تک پہنچانے کا بھی وہ براہِ راست ذریعہ تھا۔ حامد اور حاجب کو ایک جگہ جمع دیکھ کر اور دوستی کا تعلق سمجھ کر لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ خود نصر اپنے کندھوں کو سر پر بمشکل سنبھالے تھا اور دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ حامد نے یک بیک اپنا دل اس کے سامنے کھول کر کیوں رکھ دیا تھا۔

وزیر جو مکمل دنیادار اور دنیاوی جاہ و جلال میں نہایت کو پہنچا ہوا تھا' جس کا حکم

عدالتوں اور دربار یہاں تک کہ ترک سرداروں پر بھی بھاری تھا۔ اس مکمل شام میں روشنیوں سے مزین ایوانوں سے باہر اسے کیا کہنا چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

ساز ندوں نے ساز درست کیے اور مدعو شاعروں نے اپنا کلام انہیں مرحمت کیا کہ بھیگی ہوئی شب ماہتاب کی نیلاہٹ میں روشن ستاروں کی خواب ناکیوں کی باتیں سنائی جائیں۔ گانے والے نے گایا:

خالص شراب پلا کر میرے غم و فکر نابود کر دو
اور زمانہ کو چھوڑ دو کہ جو ہونا ہو گا وہ ہو کر رہے گا
اسے ملامت کرنے والے میں عتاب کے باوجود بوڑھا ہو گیا ہوں
اور اب جوانی پر بڑھاپا نہیں رہا ہے
میں نے اپنے نفس کو خدا پرستی پر مائل کر لیا ہے
اور اسے اسی طرح قرار آ گیا ہے جیسے تلوار کو میان میں سکون ملتا ہے
حاسد مجھے دیکھ کر بے تکلف ہنستے ہیں
جیسے بتی بیک وقت جلتی بھی ہے اور ہنستی بھی ہے

ہولے ہولے جب شمعوں کو نیند آتی گئی۔ کنیزوں کے لباسوں کی چمک میں ستاروں کی روشنی ملتی گئی اور ماہتاب آسمان کے واژگوں پیالے کی تلچھٹ میں آخری جرعہ بے ہوشی کی تلاش میں ڈوبنے لگا تو حامد بن عباس نے ایک ایک مہمان کو رخصت کرتے ہوئے نصر کو اپنے پہلو میں منتظر رکھا۔ نسیم سحر 'خوشبوئیں' دجلہ کی نمی' باغوں کی مہک اور بھولی یادوں کو تھکی ہوئی روشنیوں کے گرد پھیلا رہی تھی۔ گویا کوئی دوشیزہ نہ آنے والے محبوب کے انتظار میں بے قرار ہو کر ماتم کناں دھڑکتے دل سے اپنا دامن ہاتھوں پر اٹھائے دعا گو ہو اور اس کی بے تاب جان لرز رہی ہو۔

نصر کئی روز سے تقریباً گوشہ نشین ہو گیا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ حامد بن عباس کی درخواست کا کیا جواب دے۔ اس نے خلیفہ مقتدر کے اجازت نامے کے ساتھ اسے

کہلوایا تھا کہ اپنے ذاتی زندان سے حسین بن منصور حلاج کو اس کے پاس منتقل کر دے۔ حسین دریتیم تھا کہ اسے حامد بن عباس کے پاس ایک تحفے کی صورت میں بھجوایا جائے۔

وہ حاجب تھا مگر یہ حکم اس سے بالا بالا کیسے حاصل کر لیا گیا تھا۔

حامد اس انا الحق کہنے والے کی ذات میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا تھا۔

نصر جانتا تھا کہ جب حسین پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی تو اسے اپنے آپ کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ عام زندگی میں نہایت شریف النفس' متقی' پرہیز گار' عبادت گزار' متوکل' کم گو' کمخواب' شب زندہ دار' عابدان لمحوں میں اپنے حواس کے اختیار میں ہوتا تھا۔ ایسی حالتوں میں وہ جس امر کا حکم دیتا' وہ ہو جاتا تھا۔ چہرہ بازوؤں کے حلقے میں چھپائے اپنی بے پناہ آنکھوں کو بند کیے وہ جانے عرشِ معلٰی پر ہوتا تھا کہ تحت الثریٰ میں ـــــ خشک گھاس کی پتی کا سا جسم بے پناہ طاقت کا سرچشمہ معلوم ہوتا جیسے پوری کائنات سمٹ کر ایک ذرے میں سما جائے۔ وہ آواز اس مرکز سے یوں پھیلتی جیسے سورج کی کرنیں' لاتعداد' ان گنت ذروں کو قوس و قزح کے رنگوں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

وہ' نصر حاجب کیا کرے؟

مایوسی میں اسے شغب کا خیال آیا۔ اس کے باوجود کہ وہ جانتا تھا کہ حامد بن عباس ام المومنین کے حکم سے اکثر سرتابی کرتا تھا۔ حرم کے دربار سے جو احکامات صادر ہوتے' وہ کبھی پسِ پشت ڈال دیئے جاتے تھے اور کبھی وہ فرمان اتنی مسخ شدہ شکل میں عمل کے عمل سے نکلتے کہ ان کے معانی بدل جاتے۔ امِ خلیفہ کی رقابت سے صرف حامد خوفزدہ نہیں تھا ـــ جانے کیوں؟

حسین کے پاس شغب کے پیغامات اور تحائف اکثر پہنچتے تھے۔ شغب نے اس کی رہائی کی آج تک کوئی کوشش کیوں نہ کی تھی۔ وہ بہت دیر سوچتا رہا۔ خلیفہ مقتدر اپنی ماں کے اثر سے آزاد ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ترک بچوں کے ساتھ کھیلتے ایک سلطنت اسے ملی تھی اور وہ اپنی ماں کا رہینِ منت تھا جو نہایت طرحدار اور خود سر بلکہ خود پرست عورت تھی۔ اس نے خطرات میں گھرے ہوئے اس تخت پر اپنے کمسن بچے کو ایک قابل حکمران اور فاتح حاکم' مضبوط اور ناقابل شکست بادشاہ بنانے کے لیے

جانفشانی سے مگر نہایت خاموشی سے لائحہ عمل تیار کیا تھا اور اس کے راستے کی ہر دشواری پر اپنی تدبیر سے اس نے ہمیشہ قابو پالیا تھا۔ اس سے نجات حاصل کر لی تھی۔

نہایت آغاز میں مقتدر نے بھی ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح ماں کا احترام کیا۔ اس کے انتہائی احکامات کو خندہ پیشانی سے سر جھکا کر ہمیشہ مانتا رہا تھا مگر اب شعور کے ساتھ ساتھ سن و سال کا تقاضا خود اس کے دربار میں مختلف الخیال لوگوں کا مجمع تھا اور مونس امِ خلیفہ سے بیزار ہو چلا تھا کیونکہ وہ ہر بات میں دخیل تھی۔ یہاں تک کہ امرائے دربار کی ذاتی زندگیوں پر بھی اس کی نظر رہتی تھی۔ ان معلومات کے لیے اس کے ذرائع ناقابلِ فہم تھے۔ لوگوں کی خلوتوں میں بھی اس کے جاسوس در آئے تھے اور ترکی سردار اپنی تمکنت کے باوجود ذرا خوفزدہ رہنے لگے تھے اور جب وہ اس کے سامنے حاضر ہوتے تو اکثر نظریں جھکائے رکھتے۔ مبادا اس کی دلوں کو ٹٹولتی ہوئی نگاہیں اس احتساب کے خلاف شکایت کو پڑھ لیں۔ اس سے بحث مباحثہ بیکار تھا کیونکہ اسے کسی کی بات سننے کی تاب نہ تھی۔ وہ ٹھنڈے دل سے کسی بات پر غور کرنے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کبھی نہیں کرتی تھی۔ بجلی کے کوڑے کی سی اس کی آواز لہراتی اور جھکنے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہتا تھا مگر لوگ جھکنا پسند نہیں کرتے اور اندر ہی اندر امراء اس دوہری دربار کی حاضری سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔ کسی نہایت نجی محفل میں جب خلیفہ سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کی کوشش کی جاتی تو وہ سر جھکا کر کہتا۔

"امِ محترم جو مناسب سمجھیں۔"

حامد بن عباس نے جب سرتابی کرنے میں پہل کی تو اسے خاص مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

"کاروبارِ جہانبانی میں کبھی کبھار جو بہتر ہو' وہ کرنے کی اجازت ہے۔"

خلیفہ کے یہ احکامات کافی سے زیادہ تھے اور حامد عمال اور حسابات اور اخراجات میں اکثر اپنی سی کرتا تھا۔ پھر یہ شکایت عام ہوتی گئی۔ شغب کے دربار سے خلیفہ کی مہر سے جو احکامات دیئے جاتے' انہیں اکثر درخور اعتنا نہ سمجھا جاتا۔ دبی دبی سرگوشیاں اور بلند آوازیں' احتجاج' سختی' درشتی ــــ مقتدر کی حرم میں اکثر طلبی سے معاملات کو شغب کے ہاتھ سے تقریباً نکال دیا جاتا۔ جھنجلا کر وہ ان ترک امیروں کو اپنے گرد جمع کرنے

کی کوشش کرنے لگی تھی جو اس کے دربار کے باہر سراپردوں کو پکڑے ۔ ، لشر منتظر رہا کرتے تھے مگر اب وزرائے بااختیار کے گرد مجمع کیے رہتے تھے اور سازشوں' تحریکوں میں کسی نہ کسی طور شریک تھے اور مقتدر کی نگاہوں کو پھیرنے کے لیے بھی کوشاں تھے۔ شغب شیرنی کی طرح گھات میں منتظر اپنے زخموں کو چاٹ رہی تھی اور پھر اس نے حسین کی طرف رجوع کیا تھا۔ دعا کسی بندۂ خدا کی دعا' اس کی طوفانوں کی زد پر آئی ہوئی کشتی کو بھنور سے نکال سکے۔ اندھیری راتوں میں وہ رازدان لونڈیوں کے ہمراہ بھیس بدل کر مختلف راستوں سے کوزہ گروں کے محلے سے گزرتی اور نصر کے بندی خانے میں حاضر ہوتی۔ جھکتی اور خاموشی سے دعا کی طالب رہتی۔ وہ حسین کے مراتب سے آگاہ تو نہ تھی مگر یہ سمجھتی تھی کہ وہ اگر اپنی خاص حالت میں نہ ہو اور چاہے تو ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے تو وہ ضرور سنی جائے گی۔ بارگاہِ خداوندی سے حکم صادر ہو سکتا تھا' مقدر بدل سکتا تھا۔ شغب نے جب اس امر پر اطلاع پائی تو وہ بہت رنجور ہوئی اور اس نے اپنے بیٹے سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مقتدر کے محل خاص میں اس کی والدہ کی آمد کی اطلاع کوئی معمولی سانحہ نہ تھا۔ غلام اور کنیزیں بدحواس انتظاموں میں لگے تھے۔ مستعد' چاک و چوبند' ہوشیار' باخبر سرداروں نے انتظام اپنے ذمے لیا تھا اور ہر طرف رونق اور چہل پہل تھی۔ روشیں اور گلستاں آراستہ کیے جا رہے تھے۔ پھولوں کے پودے عمدہ تراش خراش کی وجہ سے سنورے ہوئے اور صحن چمن کی رونق میں رنگ برنگ لہریوں کی طرح بکھرے تھے۔ جیسے سر پر کلاہِ رنگین پہنے دورویہ استقبال کے لیے کھڑے ہوئے جنگجو سپاہی ہوں۔ سائے اور دھوپ مرقعوں کی طرح سبزے پر بکھرے تھے اور فوارے ترل ترل سطحِ آب پر موتی بکھیرتے تھے۔ کہیں پانی سفید جھاگوں سے دیوانہ بنا اپنے سب کچھ ہونے کا ظہورِ ذات کا پرتو ہونے کا سناتا تھا اور پُرپیچ تاریک کنجوں میں کبھی چمکتا کبھی چھپتا مار سیاہ کی طرح مستی میں کنڈلی مارے سویا ہوا لگتا تھا۔ ذرا ذرا سی آب جو اپنے اندر آسمان کے بادلوں کے سائبان لیے کائنات کو سمیٹے رواں تھیں اور خوشبوئیں اپنی آوارگی میں پُرکشش اور مشام جان کو معطر کر رہی تھیں اور زندگی کی قوس کو چھو کر نکلتی ہوئی ہوائیں اپنے ابدی دائروں میں پریشان تھیں اور حکایت زمانہ کہتے ہوئے درودیوار ہمہ تن گوش تھے۔

مگر شغب کی پیشانی شکن در شکن جیسے موج در موج خیالوں کی یورشوں کو تھامے ہوئے اقصائے عالم سے جمع کنیزیں اپنے حسن و جمال اور بے مثالی میں لاجواب اس کے عقب میں حبشی غلام رنگین لبادوں میں عصا تھامے دورویہ قطاریں بنائے جیسے زرِ گل کی حفاظت کو آبنوسی شاخیں ہوں۔

"امِ عزیز! آپ کی آمد میرے لیے باعثِ مسرت ہے۔"

شغب خاموش مگر دلچسپی سے اس محل میں دائیں بائیں نظریں دوڑاتی بیٹے کے ساتھ ایوانِ نشست میں آئی۔ اس کا دل مسرت سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے خواب جن کی پرچھائیاں بھی کسی نے نہیں دیکھی تھیں' بالآخر پورے ہو رہے تھے۔ وہ عظیم پھیلی ہوئی عباسی سلطنت کے خلیفہ کی ماں تھی جو نہایت الجھے ہوئے راستوں سے اپنے مقدر تک پہنچی تھی اور شاداں تھی کہ ایک فرمانبردار بیٹا جو اس کے اشاروں پر عمل پیرا ہو رہا تھا اور جس کی شکل پر اب بھی کھلنڈرا پن تھا' جو ڈرا اور سہا ہوا اس کے حکم کا منتظر تو نہیں مگر اس کی ہر بات پر سر جھکا کر صاد کہنے کو سعادت سمجھتا رہا تھا۔

خیال کی طرح نازک اور خوبصورت کنیزیں نظریں جھکائے بے حس و حرکت ایستادہ تھیں اور دور کہیں موسیقی گویا فضا میں سے برس رہی تھی جو ان دونوں کی گفتگو میں حائل نہیں تھی۔ یہ اس خواب کی نہایت تعبیر تھی جو اس ترکی کنیز نے دیکھا تھا۔ خلافت کے ایوانوں میں شطرنج کے مہروں کی طرح وہ بھی تھی۔ پھر کسی کھیلنے والے نے اسے اٹھا کر جیت کے تخت پر بٹھا دیا مگر اس درمیان میں صدہا دل آزار باتیں بھی ہوئیں جنہیں بھلانے کو وہ تیار تھی۔ شرط یہ تھی کہ مقتدر اسی طرح اس کی طرف حکم کے لیے دیکھتا رہے اور اس کا اپنا دربار' دربارِ حرم اتنا ہی فعال رہے کیا ایسا ہونا ممکن تھا؟ بہت دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ مقتدر کی حبل متین اس کی انگلیوں کے درمیان سے پھسل گئی تھی۔

ہنس کر اس نے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"جانِ اُم! کیا تم خیریت سے ہو؟"

"بے شک' بے شک امِ عزیز۔" اس نے حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے ابرو اٹھا کر دیکھا۔

شغب نے محسوس کیا کہ اس حیرت میں وہ خلیفہ بھی کہیں موجود ہے جو خود سر اور برسرِ اقتدار ہے اور بہت دنوں تک اس کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا۔ جس کو احکامات دینے اور اپنی بات منوانے کی عادت تھی اور جو اس کا بیٹا ہی نہیں' مقتدر باللہ بغداد کی سلطنت کا وارث اور تختِ خلافت پر متمکن تھا اور ترک' عرب سردار اس کے اشاروں کے منتظر تھے اور اس کی آواز مشرق سے مغرب تک سنی جا سکتی تھی۔ اس نے سوچا' کیا وہ حسین کے لیے بات کرے۔ اقتدار کے مرکز میں کیا اسے یہ بات دہرانا چاہیے۔

فصیل اندر فیصل یہ قصر تھے اور باہر وسیع و عریض دنیا' اس جگہ سے ایک ایک لفظ اور اشارے کے لیے ٹھہری رہتی تھی۔ کیا اسے وہ بات کرنا چاہیے۔ کہنا چاہیے۔ کیا اسے دخیل ہونا چاہیے۔ وہ حالات کے دھارے کو اسی طرح بہنے نہ دے۔

"آپ کسی گہری سوچ میں ہیں۔" مقتدر نے پوچھا۔

"ابنِ عزیز! سوچیں مجھے بے چین رکھتی تھیں۔ آتش زیر پا مگر اب نہیں۔ میں پرانے مضطرب دنوں کو بھلا دینا چاہتی ہوں۔" اس نے نیچی نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

بہت بے چین ہو کر مقتدر نے پہلو بدلا۔

"تلخ دنوں کی یاد ہمیں آئندہ سے محتاط بنا دیتی ہے۔ وہ ساری غلطیاں دہرائی نہ جائیں۔" اس نے ہولے سے کہا۔

"بے شک' بے شک۔" شغب نے بڑی گہری نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا اور گزرے ہوئے سارے زمانے منصور سفاح سے لے کر اس گھڑی تک کے اس کی نگاہوں کے سامنے گزر گئے۔ جیسے متحرک تصویریں ہوں۔ جمی جمائی سلطنت جس کو معتضد نے پھر سے ایک حصنِ حصین بنایا تھا' پھر آندھیوں کی زد پر تھی۔ وزراء اور امراء بادل نخواستہ اور اپنے اپنے مستقبل کی خاطر اس کا اور مقتدر کا ساتھ دیتے رہے تھے۔ بغداد کی پھیلی ہوئی آبادی اور محلے اور دریا کے دونوں کنارے اور مختلف النوع خیالوں کو لیے مختلف النسل لوگ عربی اور عجمی مغرب اقصیٰ کے مسافر چین اور وسطی ایشیائی لوگ' تاتاری اور ترک اور ان سب سے بلند اس کا بیٹا مقتدر بھلا اس کا حکم کیوں قابلِ قبول نہ

ہو۔۔۔اگر وہ حسین بن منصور کو حامد بن عباس کی تحویل میں دینے پر راضی ہے تو وہ اسے کیا کہے۔ خدا ہر طرح اس مردِ عجیب کی حفاظت کرے گا۔ ہاں ضرور۔۔۔ بھلا کیوں نہیں!

سر کو جھٹک کر اس نے متانت سے کہا۔

"میں تمہاری کامیابی اور درازئ عمر کے لیے دعا گو ہوں۔"

کنیزیں ہوا پر کھنچی تصویروں کی طرح ایوان سے محو ہو گئیں اور وہ دونوں اکیلے رہ گئے۔ مقتدر نے شغب کی گود میں سر رکھ لیا۔

"امِ عزیز! یہ نہایت تھکا دینے والا، ہوش و خرد سے بیگانہ کر دینے والا کام ہے۔۔۔"

"کار جہانبانی کے لیے جو سر بنایا جاتا ہے، اسے بوجھ برداشت کرنے کی بھی عظیم قوت عطا کی جاتی ہے۔" شغب نے بیٹے کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"زندگی ایک ہی بار دی جاتی ہے۔ کیا آدمی بار بار پیدا ہو سکتا ہے۔ بادشاہ ہو یا درویش سب ہوا کی راہ میں ہے۔" اس نے ماں کے چہرے کو چھوا۔ اس ملیح چہرے کو جو اس پر جھک کر اسے لوریاں سناتا تھا۔ اس کی ماں کی آواز میں رس تھا اور نغمہ جو سلانے کے لیے تھا مگر اس میں ایک اور بات بھی تھی۔ بے رحم سنجیدگی اور بے پناہ عزم جو اس کی رگوں میں توانائی بن کر دوڑنے والے خون میں ملا تھا، شغب کے حکم میں قطعیت ہوتی تھی اور اس میں لچک نہ تھی۔ اس کی تربیت میں اس نے اپنی طبع کی ساری سختی کو استعمال کیا تھا تاکہ اس کے کردار کی عمارت جن بنیادوں پر تعمیر ہو، اس پر ثریا تک ایک مضبوط قلعہ تعمیر ہو سکے۔ شغب ایک پر عزم ماں تھی جس نے اس کے لیے ایک سلطنت حاصل کی تھی۔ وہ اول تا آخر اس کا احسان مند تھا۔

دعائے نیم شبی میں وہ ہمیشہ اپنے بیٹے کے لیے اپنے خوابوں کی تعبیر چاہتی تھی۔ زندگی تو گزر جایا کرتی ہے مگر جینے اور زندہ رہنے میں بھی فرق ہے۔

اسے ہمیشہ یہی پڑھایا جاتا تھا کہ صفتِ روباہی بھی بادشاہ کے لیے ضروری ہے۔ اس کی نظر آدمیوں پر نہیں ان یافتوں پر ہونی چاہیے جو اس کا مطمعٔ نظر ہیں۔ اس میں سفاکی کی صفت بلاامتیاز ہونا چاہیے تاکہ وہ فیصلے کرتے ہوئے شخصی پسند اور ناپسند

میں الجھ نہ جائے۔ لوگوں کو اپنی تعمیر میں اینٹ اور چونے کی طرح استعمال کرنا چاہیے۔ چاہے یہ چونا ان کی ہڈیوں کو پیس کر ہی کیوں نہ بنایا جائے۔ نرم خوئی' خوش دلی اور رحم بے شک اچھی صفات ہیں مگر اچھے گلستان کی پرورش کے لیے نہایت بڑھی ہوئی شاخوں کو کاٹنا بھی انتہائی ضروری ہے۔ ریاض جنت! خدا نے کچھ لوگوں کو پیدا کیا تھا کہ وہ حاکموں کے لیے سیڑھیوں کی طرح ہوں جن پر قدم بہ قدم بامِ عروج تک پہنچا جا سکے۔ خلیفہ قوت کا سر چشمہ ہے۔ اپنے بیشۂ حیات کا شیر' جس سے لوگ ترساں رہتے ہیں۔ خوف کھاتے ہیں اور جس کی اطاعت میں بھی عافیت سمجھتے ہیں۔ وہ انگڑائی لیتا ہے اور دکھائی دے تو اوسان خطا کر دے۔ لوگ کندھوں پر اپنے سر کو اس کی مہربانی سمجھیں۔ اس کی امانت خیال کریں اور کوشاں رہیں کہ اسے خوش رکھ سکیں۔ سر چشمہ قوت! ہاں خلیفہ کو ایسا ہونا چاہیے۔

مقتدر کو اپنی تعلیمات میں یہ سب یاد تھا۔ وہ دونوں خوش دنوں کی بُرے دنوں کی باتیں کرتے رہے۔ تخت کی بازیا فتگی کی باتیں' مونس کی ہمدردیاں اور دلیری کی باتیں اور کسی نہ کسی طور حامد بن عباس کا ذکر بھی آ گیا۔

"حامد سے محتاط رہا کرو بیٹے۔ نخوت پسند اور پُر غرور شخص ہے۔"

"ام عزیز! ایسے ہی لوگ تو سلطنت کو مضبوط بنا سکتے ہیں جو اپنے زور میں کسی سے بھی لڑ جائیں۔"

"کسی سے بھی؟" شغب نے کانپ کر کہا۔ "بخدا ہرگز نہیں۔ ایسے شخص کی سزا تو دار ہے۔"

"دار پر لٹکے ہوئے سر بہر طور کوئی نفع بخش کام نہیں کر سکتے۔ نہ ہی خدمت اور نہ ہی نیک نامی لاتے ہیں۔ حامد کی نخوت اور کم آمیزی اس کی تلخی اور خود پسندی اسے دوسروں سے الگ رکھتی ہے۔ وہ کسی سازش میں ملوث نہیں ہو سکتا۔"

مقتدر کی بات غور سے سن کر شغب نے نہایت گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا بیٹا فہم و خرد میں سفر کر رہا تھا۔ اپنے تجربے کو اپنی نبضوں پر جانچ سکتا تھا۔ بیان کر سکتا تھا۔ وہ ایک عمدہ حاکم کی طرح لوگوں کی قیمت جانتا تھا اور مہروں کی طرح ان سے کھیل کو کامیاب بنانے کا گُر جان گیا تھا۔

"حامد بن عباس سے میں ذراسی مہربانی اور محبت زیادہ رکھتا ہوں۔ کبھی کبھار اس کی جاو بے بجا درخواستیں بھی سن لیتا ہوں۔ یہ بھی بہت ضروری ہے۔ وہ میرے لیے ایک کار آمد شخص ہے اور ایسے میں جب مغرب میں ایک وسیع سلطنت پھیل رہی ہے' مہدی نے اپنے پاؤں پھیلانے شروع کر دیئے ہیں۔ مجھے دربار کو زیادہ سمیٹ کر اپنے قریب رکھنا چاہیے۔"

"بے شک بے شک۔" شغب جی ہی جی میں حامد کی گستاخیوں کو یاد کر رہی تھی مگر مقتدر سے وہ کیا کہے۔ ایسے میں جب وہ نئے عزائم اور نئے ساتھیوں کے ساتھ خوش تھا' وہ اسے کچھ نہیں کہے گی۔ نہ کوئی حکم' نہ کوئی سفارش تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ حائل ہو رہی ہے! ہرگز نہیں۔ وہ اس کے راستے کے لیے دیوار نہیں بنے گی۔ اس کا دل کیسا بھی خون خون ہو رہا ہو مگر وہ اپنے احسانات نہیں جتائے گی۔ اس نے جو کچھ کیا' اولاد کے لیے کیا اور یک بیک اس پر اتنی تھکن طاری ہو گئی جیسے زندگی میں کہنے سننے سوچنے اور خواہش کرنے کے لیے کچھ باقی نہ رہا ہو۔ اس گھڑی اگر موت اسے آ لے تو اس کے سینے میں کوئی حسرت نہ ہو گی۔۔۔۔ پھر حسین کے لیے وہ کیا کہے۔ عام حالات میں وہ ایک قیدی تھا اور ایک سے دوسرے زندان میں منتقل ہونا اتنا بڑا سانحہ نہیں تھا کہ اس کے لیے رنجیدہ ہوا جائے۔ حسین کی اپنی ہستی اور طاقتیں بھی تو تھیں۔ وہ جس جگہ ہو گا' اپنے لیے سہولتیں پیدا کر لے گا۔ لوگ اس کے گرد نثار ہوں گے۔ دعا کے طالب اپنی آرزوؤں کے لیے بے تاب ہوں گے۔ کوئی بھی ہو' اس کے مقناطیسی اثر اور شخصیت کے سحر سے بچ نہیں سکتا۔ وہ آخر اتنی پریشان کیوں تھی۔ خدا اپنی رحمتوں کی ردائے محبت اس پر پھیلائے ہوئے تھا۔ ہمیشہ سے ورنہ بغداد تو ایک عرشِ منور تھا اور صوفیائے کرام سے معمور تھا۔

"اُمِ مہربان! آپ میرے لیے فکر مند نہ ہوا کریں۔ وقت بے وقت کے زلزلوں نے مجھے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ عطا کر دیا ہے۔"

وہ ایک ٹک اپنے بیٹے کی طرف دیکھتی رہی۔

کیا یہ وہی مقتدر تھا جو دریچوں سے باہر جھانکتے ہوئے بھی خوفزدہ ہو جایا کرتا تھا۔ رات میں قدموں کی چاپ اسے بے قرار کر دیا کرتی تھی۔ سہما ہوا بے یقین سا نوجوان جو اب ایک اندازِ بے پرواہی سے اس کے قریب بیٹھا تھا اور اسے فکر مند نہ ہونے کی تلقین کر رہا تھا۔ کیا بالآخر اس پر بڑھاپے نے چھاپہ مارا تھا۔ ہر عام عورت کی طرح اس کے بالوں میں سفیدی نے ڈیرا جما لیا تھا؟ خاکستری دھول اس کے سر پر بھی انڈیل دی گئی تھی۔ وہ آنکھیں جن میں بحرِ ذخار کی سی لہریں اور طوفان پوشیدہ تھے' دھندلا گئی تھیں۔ اس نے خیالوں میں کم ہوتی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ انکشافات تھے جو اس پر ہوئے تھے۔ رازوں کے بند دروازے اس پر کھلے تھے اسے کار جہانبانی سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ اسے مقتدر کے لیے صرف دعا کرتے رہنا چاہیے۔ حسین ابنِ منصور اگر کسی اور زندان میں ہو گا تو بھی اس سے دعا کا طالب ہوا جا سکتا تھا۔

وہ مردِ عجیب تھا کہ عاجزی اور خاکساری میں بالکل ذرہ ناچیز' گرد و پیش سے بے خبر یا نہایت باخبر خاموش اپنی آنکھوں کو بند کیے مناجاتوں میں منہمک۔ گویا وہ کہیں تھا ہی نہیں۔ معدوم! اور یک بیک تیز حدتوں کی لپیٹ میں آیا ہوا اس کا وجود گھلتا ہوا سراپا' طاقتوں کو نمود عطا کرتا ہوا۔ یہ عالمِ فنا و بقا تھا جس کی مسافتوں کی اسے شغب کو خبر نہ تھی۔ یہ مملکتِ باطن جس کا ربط ظاہر سے تھا اور نہیں بھی' مگر حکمران کون تھا؟— دنیاوی جاہ و جلال کے دوام کے لیے اس کی ضرورت پڑتی تھی۔ آخر کیوں؟

کیا دنیا خدا نے نہیں بنائی تھی؟ اسے ثبات کیوں نہیں تھا؟ انجام ہمیشہ ایک ہی کیوں ہے؟ فنا اور فنا؟— اور بگولوں کی طرح خیالات کی تیز آندھی سی اس کے دماغ میں اٹھنے لگی۔ زرد اور سیاہ اور سرخ جیسے دشتِ سُوس پر سے آ رہی ہو۔

"آپ کا مزاج تو اچھا ہے؟" مقتدر نے گھبرا کر ماں کی طرف دیکھا جس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جگمگا رہے تھے۔ جیسے پھول پر صبح دم شبنم ہو۔ متغیر ہوتے چہرے کا اتر تا رنگ جیسے آہستہ آہستہ سفیدی میں بدلتی ہوئی شفق کی سرخی رات کے دامن میں پناہ لیتی ہوئی چاندنی کی ردا تلے چھپتی ہوئی بجلی کا لہرایا بادلوں میں گم ہوتا ہوا اور برسے ہوئے سحابِ سبک رفتار نیلاہٹ تلے ٹھہرے ہوئے۔ پھر وہ چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔ شغب کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ گویا اسے نیند کے جھکڑوں میں اڑایا جا رہا ہو اور

ریت اس کے پپوٹوں کو بوجھل کر رہی ہو۔ وہ بے ہوش ہو کر وہیں مسند پر ڈھلک گئی۔ مقتدر نے تالی بجائی۔ کنیزوں نے ام المومنین کو اندر کے وسیع و عریض ایوانوں میں پہنچا دیا۔ یہاں سے وہاں تک طبیبوں کے لیے دوڑ ہونے لگی۔ شہد رنگ طیلساں پہنے ہوئے نصرانی اور یہودی اطباء کا ایک ہجوم اس ترکی کنیز کے لیے سرگوشیوں میں صلاح مشورہ کرنے لگا جو مقتدر کی یاوری سے عباسی سلطنت کے لیے مادرِ مہربان بن گئی تھی۔

حامد بن عباس جب مغرب سے لوٹا ہے تو حسین بن منصور کو اس کے زنداں میں منتقل ہوئے ساتواں سال تھا۔ مغرب میں عبید اللہ المہدی کے مقابلے میں شکستوں اور ذلت آمیز ہزیمتوں نے اس کا ذہنی توازن تقریباً خراب کر دیا تھا۔ وہ اپنی ناکامیوں سے سخت دلبرداشتہ اور پریشان تھا۔ اس کی زندگی میں زمانوں پہلے شکست اغول کی صورت میں داخل ہوئی تھی اور بغداد کے سوق العامہ سے اس نہایت مکمل دوپہر میں اس کے گرد نحوست کا سایہ بن کر پھیلی تھی۔ خوابوں کی سی صورت جو اصل نہیں پرچھائیں تھی ـــــ اس صورت کو وہ کبھی زیر نہ کر سکا' پکڑ نہ سکا تھا کیونکہ اس کے عقب میں ہمیشہ حسین بن منصور کا خیال رہا تھا' رہا ہو گا۔ خلوتوں' جلوتوں' تنہائیوں' مجلسوں میں جیسا کہ کنیز نے اسے بتایا تھا' وہ ہمیشہ اس کے خیال میں غلطاں رہی تھی۔ ژولیدہ خیالوں کے پیچ و خم میں الجھی۔

اگر اغول نے اس سے محبت کی ہوتی' وہ ذہنی طور پر آزاد ہوتی تو دنیاوی جاہ و جلال کی ساری برکتیں جو اس کے لیے مہیا کی جاتی تھیں' اسے خوش کرنے کو کافی ہوتیں۔ وہ عجیب گم کردۂ راہ روح کی طرح بھول بھلیوں میں بھٹکتی پھری۔

کیا حسین بن منصور کا عشق اتنا فتنہ انگیز اور آتشیں تھا۔

وہ زور زور سے قہقہے لگاتا۔ اپنے پر ہنستا۔ اپنی نامرادی پر خندہ زن ہوتا۔

یہاں تک کہ اپنے بیٹے حسین کی موت اس پر وارد ہوتی۔ جانے کس میدان میں کن لوگوں کے درمیان کن سایوں مین وہ کھیت رہا۔ پھر اسے یاد آتا ہر ہر لمحہ اور ایک ایک گزرا پل اور اپنی نامرادی پر' اپنے مٹ جانے پر اسے بے حد کوفت ہوتی۔ اس

کے منہ میں راکھ کا سا مزہ ہوتا۔ دنیا کا ہر عیش اور دنیاوی فوق سب خاک تھے۔ وہ مٹ چکا تھا۔ ناکام اور اب شکست خوردہ نامراد وہ خلیفہ کو کیا جواب دے۔

ماتمِ یک شہر آرزو اس کا مقدر تھا۔

حسین بن منصور حلاج کی طرح عبید اللہ المہدی بھی ناقابلِ تسخیر تھا۔ وہ نہایت درویش صفت حاکم' پہاڑوں کا سا حوصلہ رکھنے والا اس کی فوجوں کے لیے ایک آتشیں دیوار ثابت ہوا جس سے ٹکرا کر سب فوج خاک ہو گئی۔ خود حامد نہایت مشکل سے جان بچا کر بغداد کی طرف پلٹا تھا۔ وہ ان کا بدلہ کس سے لے۔ ملامتوں کا ہدف کس کو بنائے۔ رسوائی کا ذمہ دار کون تھا۔ نامرادیوں کا مواخذہ کس سے کرے؟

وہ دانت کچکچاتا اور پہروں لق و دق نشست گاہ میں ٹہلتا یہاں تک کہ دجلہ کے کنارے پر کھلنے والے دریچوں کے پردے ساکت چاندنی میں بادِ صبا کے دزدیدہ در آنے والے کسی جھونکے کی شوخی سے ہلتے۔ اس دن اور رات کی بے خوابی نے اسے چڑچڑا اور نہایت غصیل بنا دیا تھا۔

وہ آخر کس سے خفا تھا؟

اس کے خون میں حدت بڑھتی یہاں تک کہ کنپٹیاں تپنے لگیں۔ وہ ایک ہاتھ کو نہایت بے بسی سے دوسرے پر مارتا۔ وہ آخر کیوں اتنا بے بس تھا۔

"جعفر مقتدر کی ماں شغب۔"

اور اسے نئے سرے سے غصہ آیا۔ وہ عورت تھی جو بغداد سے اس کی غیر حاضری کے دنوں میں برابر زندان میں حسین بن منصور کے پاس حاضر ہوتی رہی تھی۔

ہر طرف وہی تھا۔ چار سو اسے گھیرے ہوئے۔ اول و آخر۔ اس کی ناکامیوں کی عمارت کی تہ میں وہی تھا۔

ایک بے بضاعت کرم جو لجلجاتا ہوا مٹی کی تاریکیوں میں ان پر خندہ زن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بے بسی کیا تھی اور اس کا باعث وہ خود تھا۔ زندان کے اندر بند سلاخوں کے پیچھے بیڑیاں پہنے ہوئے' عبادات میں منہمک اپنے نعرۂ انا الحق کو اپنی آہوں میں بدائے اپنی خاک نشینی میں اپنی برتری کو سمجھتا ہوا۔ اپنے ہونے پر فخر کرتا ہوا۔ وہ جس کی آنکھیں بے پناہ تھیں مگر جنھیں روشنی سے حجاب آتا تھا۔

خرقہ پوش جس کو اپنی دلقِ مرقع میں پلی ہوئی جوؤں تک کی خبر نہ تھی۔

دیوانہ جس کو ہوش و خرد کی خبر تک نہ تھی۔

خدا رسیدہ جو عبادات سے دوتا ہو گیا تھا جس کی کجروی کج کلاہی کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

جب اپنے سفرِ مغرب کے بعد وہ زندانیوں کو دیکھنے گیا تو اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ حسین بن منصور تو آزاد تھا۔ دراصل زندانی تو وہ تھا' حامد بن عباس!

کلام اللہ کو پڑھتے ہوئے جس پر یوں لرزہ طاری تھا جیسے وہ تیز و تند ہواؤں کے دوش پر اڑتی ہوئی ایک گھاس کی خشک پتی ہو جس کی اپنی کوئی بساط ہی نہ ہو اور ہوا اسے آسمانوں کے اوج کی طرف لیے جا رہی ہو۔

لو دیتی ہوئی اس کی پیشانی سختیوں کے باوجود اسی طرح تھی جیسے اس میں سے شعاعیں نکل رہی ہوں۔ آفتاب طلوع ہوتے ہی گُل رنگ اور شفیق روشنی سے جہان کو منور کر رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا یا شاید یہ نظر کا دھوکا تھا کہ زندان اس سے لبریز تھا۔ جیسے مئے ناب سے پیمانہ!

وہ لوٹ آیا تھا اور در و دیوار دیدۂ بینا کی طرح اس کے ضمیر بے ضمیر کو تک رہے تھے۔ گویا اسے سرزنش کر رہے ہوں۔ وہ گھبرایا جاتا تھا اور اس کے ہر بنِ مُو سے پسینہ پھوٹ بہا تھا۔ گویا اغول اور اس کا بیٹا حسین ہنس رہے ہوں۔ اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ خون اس کو اپنے سر کی طرف جاتا ہوا لگا تھا۔ سنسناہٹ اور کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں اور کوئی آہستہ خرام اس کے دماغ کی بھول بھلیوں میں رواں تھا جیسے ہوا خالی ایوانوں میں ـــــ دریچوں اور دروں کو چھیڑتی چل رہی تھی۔ آتشیں ہیولے اور مدھم مدھم پرچھائیں سی اس کی آگ سے لبریز آنکھوں کے سامنے تیر رہی تھیں۔ یہ ہیولے کبھی شعلوں کی طرح لرزاں رقصاں اور کبھی منجمد آتشِ نمرود کی طرح اپنی سردی سے کپکپا رہے تھے۔

دشمن اگر برابر کا ہو تو آدمی مقابلہ کرتا ہوا جی میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اگر کمتر ہو تو اس پر رحم کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس کو معاف کر دیا جائے تو انسان کی حسِ نرم خوئی کو تسکین ملتی ہے مگر یہاں تو دشمن یکسر بیگانہ تھا اور نہایت فرزانہ بھی۔ وہ تو کسی ترازو کے

پلڑے میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ کمتر بھی نہیں کہ یہاں پر بھی کوئی نہ کوئی مقابلہ ہونا چاہیے۔ بدتر بھی نہیں اور برابری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قابلِ رحم بھی نہیں کہ اس نے تو کبھی کوئی درخواست ہی نہ کی تھی۔

وہ کیا کرے کہ وہ ہر پیمانے سے ماورا تھا اور اس کے لیے کوئی لفظ نہ تھا۔ لفظ حامد کی اس کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر تھے۔ بے بضاعت تھے' لفظ کیا تھے؟

مدرسہ نظامیہ کے استاد اور فقیہ' شیخِ کامل اور فلسفی یہ سارے "اربابِ توحید" جو لفظوں کے اندر اتر کر ایک جہانِ معانی کی طرح نو ڈال رہے تھے۔ یہ کیا کر رہے تھے۔ کوئی ایک جوف جو اس کی کیفیت کی ترجمانی کرے' اسے مل نہیں رہا تھا۔

وہ سخت جھنجھلا گیا اور اس نے تالی بجائی۔

لمبے حریری پردوں کے پیچھے سے کنیزوں نے متوحش نظروں سے اسے دیکھا۔

دریچوں کے باہر کھڑے غلاموں نے اندر جھانکا۔

کیا حکم کیا گیا تھا؟

چہروں' آوازوں اور سراپوں سے وہ گھر گیا تھا۔ جیسے یک بیک وہ ایک بڑی فوج کے ہمراہ اسیری کی حالت میں زندان میں ہو۔ اپنے گرد گھوم گھوم کر وہ دیکھ رہا تھا۔ کیا وہ دیوانہ تھا؟

وہ کھڑے سے بیٹھ گیا اور اس نے اپنا سر تھام لیا۔ کیا وہ گر رہا تھا۔ نشست گاہ کی ہر شے محوِ رقص تھی۔ کنیزوں کے چہرے چھت میں آویزاں تھے اور قندیلوں کی طرح جو طوفان میں دائیں بائیں حرکت کریں' تیزی سے قریب آتے اور دور جاتے تھے۔ گرداب میں مبتلا کشتی ڈوبنے سے پہلے دائروں میں گرفتار تھی اور پھر آہستگی سے ڈوب گئی۔ لہریں اور موجیں اس پر سے گزر گئیں۔

مدرسہ نظامیہ کے اربابِ توحید اس کے ہاں مدعو تھے اور آج محفل کا رنگ دوسرا تھا۔ مسندوں پر شیوخ متمکن تھے اور گفتگو نہایت محتاط طریقے پر بڑھائی جا رہی تھی۔

حامد بن عباس کی ایک مسند کے سامنے زمین بوس ہوتا اور کبھی دوسری کے پاس جا کر سر نیاز جھکاتا' پھر تیسری طرف نہایت مودب خادم کی طرح منتظر ہوتا تو کسی اور کے سامنے زبان گنگ کیے کھڑا رہتا۔

یہ اس کی نہایت سعادت اور خوش بختی تھی کہ حضرت جنید نے اس کی دعوت قبول کر لی تھی اور چونکہ وہ مدرسہ نظامیہ کے لیے بمنزلہ شیخ کامل کے تھے' اس لیے ان کے اتباع میں سب لوگوں نے یہاں آنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ کنیزیں اور خادم نہایت احترام سے جو عام مہمانوں بلکہ خواص کے لیے بھی مخصوص نہیں تھا' یہاں ملحوظ رکھے ہوئے تھے جیسے دیواریں بھی ہمہ تن گوش ہوں اور سانس روکے کھڑی ہوں۔

حضرت جنید کے پاس جب حامد حاضر ہوا تھا تو انہوں نے فرمایا تھا۔

''میں گوشہ نشین فقیہ ہوں۔ شاہی بارگاہوں میں میرا آنا جانا ٹھیک نہیں رہتا۔ آپ کس لیے ہمیں بلانے کے لیے مضطرب ہیں؟''

''میرے گھر کی ویرانی میں آپ کے قدم رنجہ فرمانے سے بہار آ جائے گی۔'' اس نے دوہرا ہوتے ہوئے کہا تھا۔

حضرت سوچنے لگے۔ سوچتے رہے تھے۔ دنیا کی ساری رونقوں اور خوشیوں تک رسائی رکھنے کے باوجود اس نے یہ کیوں کہا تھا۔

''حضور! کسی چیز سے دل بستگی نہیں ہوتی۔ سیدی میں بے نوا ہوں۔ میرے اندر سوائے پر شور آندھیوں کے اور کچھ نہیں۔''

حضرت اس کی طرف دیکھتے رہے۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ زانو تہ کیے' سر جھکائے۔ یہ عمائد سلطنت جو مغرب کی مہم سے ناکام لوٹا تھا مگر جس نے دعا کے لیے نہیں کہا تھا' پتہ نہیں سوالیوں کے سوال کیا ہوتے ہیں؟ دل کے اندھیروں میں جب چراغ بجھ جائیں تو پھر سوائے نہایت عظیم قوتِ ایمانی کے انہیں کسی طرح روشن نہیں کیا جا سکتا ــــ اس کا سوال صرف ان کے قدم کی برکت حاصل کرنا تھا۔ وہ اتنا شکست خوردہ' بکھرا ہوا اور غمزدہ تھا' زرد رو اور بوڑھا ہوا کہ انہیں اس پر ترس آ گیا۔

''حامد بن عباس! گو ہمارا دستور نہیں کہ ہم شاہوں کے ایوانوں میں حاضر ہوں،

مگر تمہارے ہاں آئیں گے۔ پورے مدرسے کے اساتذہ۔"
حضرت کسی نئے کتابت شدہ نسخے کی تصحیح میں لگ گئے تھے۔

اور اب اپنی قسمت پر نازاں وہ دلقِ مرقع پہنے ہوئے لوگوں کے درمیان غلاموں کی طرح خدمت میں محو تھا۔ عقیدت اور محبت کے جذبات سے سرشار اس کے نہایت خاص دوست بھی فرش پر بیٹھے تھے۔ کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ یہ عام دعوت نہ تھی۔ یہ عام مہمان نہ تھے۔ مے و مینا سے بے نیاز سرشار اور سرمست لوگ جو ساری زمین کو اپنی ٹھوکر پر سمجھتے تھے اور عیش و عشرت' جاہ و جلال جن کے لیے پرکاہ سے بھی کم حیثیت رکھتے تھے۔ مقربینِ خداوندِ عالم!

جب وقتِ رخصت قریب آیا تو حامد بن عباس دوزانو ہوا۔ سر کو جھکایا اور گویا ہوا۔

"میرا ایک سوال ہے۔ کیا اجازت مل سکے گی کہ میں پیش کروں؟"

حضرت جنید نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ان کی پیشانی پر دونوں ابروؤں کے درمیان ایک لکیر سی ابھری۔

وہ جب حیران یا محظوظ ہوتے تو یہ گہرا خط ان کے چہرے کو روشنی کی لو بن کر نورانی بنا دیتا تھا۔ ان کے جلال و جمال میں مسکراہٹ کی تابانی سی گھل جاتی جیسے ہوا میں پھولوں کے رنگ اور خوشبو ہوں۔

اساتذہ اور فقیہ' فقراء اور فلسفی سب حضرت جنید کی مسند کے قریب کھڑے تھے اور حامد مرکزِ توجہ تھا۔ میزبان کا کیا سوال ہو سکتا ہے۔ وہ طالبِ دعا ہی ہوگا اور اس کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر' اس کی عاجزی دیکھ کر سبھی اس کے لیے دعاگو تھے۔ یہ سادہ لوگ اس کے لیے اپنے دل میں جگہ رکھتے تھے۔

"ایک دستاویز ہے شیخ کامل جس کے حسن و قبح پر آپ کی اعانت چاہتا ہوں۔"

مدرسہ نظامیہ کے ہی نہیں بغداد کے ہی نہیں' سارے عالم اسلام کے آفتابوں اور ماہتابوں نے حامد کی طرف نہایت غور سے دیکھا۔ وہ کسی دستاویز پر رائے معلوم کرنا چاہتا تھا اور اس کی عاجزی بے غرض نہ تھی۔ سارے چہرے اس سوال کے لیے منتظر تھے ـــــ اور پیشانیاں شکن در شکن تھیں۔

حامد نے تالی بجائی تو غلام نے ایک طلائی طشت میں کاغذوں کا ایک پلندہ پیش کیا۔ شمعیں اور قریب لائی گئیں تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔

حضرت جنید نے وہ کاغذ الجریری کی طرف بڑھادیا۔ ان کا چہرہ کسی بھی جذبے سے خالی تھا۔

سب علماء نے وہ پرت ایک نظر دیکھ کر واپس اس طشت میں رکھ دیئے۔ کسی نے کچھ بھی نہیں کہا۔ ان سب کے چہرے بھی شیخِ کامل کی طرح تھے۔

"شیوخِ مکرمین! میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" حامد بن عباس نے بہت ہی جھک کر کہا۔

"کسی دیوانگی پر سند کی کیا ضرورت ہے وزیر مملکت۔" حضرت جنید اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"اگر دیوانگی کفر کی حدوں کو چھونے لگے تو اس پر باز پرس ضروری ہوتی ہے۔" اس نے نہایت نرمی سے کہا۔

"جو دیوانہ ہے' وہ کفر اور ایمان کو نہیں جانتا اور جو دیوانہ نہیں' وہ فرزانہ بھی نہیں ہو سکتا۔" جریری دہلیز کے پار اتر گئے۔

حامد ان کو رخصت کر کے واپس آیا۔ خالی نشست گاہ میں چپ چاپ کھڑا رہا اور طشت میں رکھے کاغذوں کو دریچوں سے آنے والی دجلہ کی نم آلود بوئے خوش رکھنے والی ہوا بکھیرتی رہی جیسے خزاں زرد پتوں کو مزاروں کے گرد یک پھیریاں دیتی ہے۔

قہوہ خانے کے دھوئاں دھوئاں اور تقریباً نیم تاریک گوشے میں بیٹھے ہوئے ایک شاعر نے کہا۔

"ابو بکر صولی اور حامد بن عباس میں آج کل خوب گاڑھی چھن رہی ہے۔"

"یہ تقریباً دنیا کی سب سے اہم خبر ہے۔ اس لیے خلیفہ کے ندیموں اور حاشیہ نشینوں سے وزیر مملکت کو سب سے زیادہ کدّ تو صولی سے تھا۔ خود صولی کو ہیں ...نے کسی

سے کہتے سنا ہے کہ حامد کے اور اس کے تعلقات میں سرد مہری ہے۔ اب شاید مغرب سے لوٹنے کے بعد حامد کو دربار میں ایسے دوستوں کی ضرورت محسوس ہوئی ہو گی جو کسی وقت خلیفہ سے اس کی سفارش کر سکیں۔"

"اگر اسے اصل ساتھیوں اور بہی خواہوں کی ضرورت ہے تو خاتون شغب کے دربار میں حاضری کیا بُری ہے۔" اس نے اپنی میلی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

"یہ واسطہ ذرا طویل ہے اور اس رشتے میں دو چار سخت گرہیں ہیں۔ پھر ہو سکتا ہے مادر مقتدر کسی وجہ سے حامد کو دیکھنا بھی پسند نہ کرتی ہوں کیونکہ ماضی بعید میں عبید المہدی کے واقعہ سے ذرا پہلے اس نے انہیں دربار کے کاموں میں بے جا دخل اندازی کا الزام دے کر سخت خفا کر دیا تھا۔"

دوسرے نے ماتھا بجاتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو پھر ابو بکر صولی بھی ذرا طویل تر مسافت ہو گی۔"

"سیاست کی بساط پر مہرے صرف استعمال کیے جاتے ہیں بغیر اس امتیاز کے۔" انہوں نے قہوے کے ترکی فنجان خالی کر کے اپنے سامنے رکھ لیے۔

"کیا صولی خلیفہ کے مزاج میں اس حد تک دخیل ہے؟" واصف نے پھر پوچھا۔

"یقیناً۔ ورنہ حامد کو کیا مصیبت تھی کہ ہر شام اسے اپنے ہاں مدعو کرے اور بہترین لے سے زریں نشست گاہوں میں اس کی تواضع کرے۔"

"مقتدر نے اسے طلب نہیں کیا۔"

"کیا تھا مگر دونوں آ کے رُکے رہے۔ دفتر امورِ خارجہ کے وزیر نے تو یہی کہا تھا۔"

"شاہوں کے مزاج پر موسموں کا اثر ہوتا ہے شاید۔ اس دن آسمان گرد آلود ہوا ہوا تیز ہو یا آندھی خوفناک ہو یا خلیفہ نے اپنی مادرِ مہربان سے کسی اصولی بات پر زک اٹھائی ہو یا اور صد ہا باتیں ہو سکتی ہیں۔"

اس نے غلام کو اشارہ کیا جو گرم قہوہ فنجانوں میں بھر رہا تھا۔

"مگر حامد نے کچھ دن پہلے مدرسہ نظامیہ کے مشائخ اور علماء کو مدعو کیا تھا۔ یہ تمہیں معلوم ہوا۔"

''گوشہ نشین علماء سے اسے کیا فائدہ ہو گا۔ حامد کی طبیعت میں پُراسراریت البتہ ہے۔ جو اسے لوگوں کے لیے ذرا قابلِ توجہ اور خوف انگیز بناتی ہے۔ لوگ نہ اس کی محبت پر اعتبار کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی توجہ کو درِخوراعتنا سمجھتے ہیں۔ وہ عجیب سا پلٹ جانے والا مسموم آدمی ہے۔ البتہ دشمن سخت ہے اور اس کی طبیعت میں ضد نے جو استواری پیدا کی ہے' وہ لوگوں کو خائف کر دیتی ہے۔ امراء اس کے راستے کاٹتے ہی نہیں۔ دربار میں اکثر لوگ اس سے بچ کر رہتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اپنے حسب ضرورت استعمال کر لیتا ہے۔ جیسے چھتے میں سے شہد حاصل کر کے اسے بیکار کر دیا جاتا ہے۔''

''اس سے خوبصورت توجیہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔'' اسُ نے فنجان میں سے جرعہ جرعہ قہوہ پیتے ہوئے سوچا۔

قاضی ابو عمر نے کہا ''سیدی حامد! آپ مدرسہ نظامیہ کے صوفیا اور اساتذہ سے کوئی امید وابستہ نہ کریں کہ وہ خود شکوک و شبہات کا شکار رہتے ہیں۔ ان کا مذہب اسرار و رموز کا ایک جنگل ہے جس کو انہوں نے خود اپنے گرد آباد کیا ہے اور خود ہی اس میں راہیں تلاش کرتے ہیں۔ میں پورے وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا مگر اصل معاملہ وہاں پر بھی کچھ اور ہے۔ فلسفہ اور الٰہیات اور علوم کی اتنی گرد وہاں اڑتی ہے۔ ''توحید'' کے موضوع پر ایسی ایسی موشگافیاں ہوتی ہیں کہ آدمی ان مباحث کو سن کر ہی گمراہ ہو جائے۔''

''کیا ان سے باز پرس نہیں کی جا سکتی؟'' حامد نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ایسے مخفی عقائد رکھنے والے لوگ اس عظیم سلطنت کے طول و عرض میں ہر جگہ موجود ہیں۔ آپ کس کس سے باز پرس کیجئے گا۔ کہاں کہاں قدغن لگائیے گا۔ کون ون اس میں ملوث ہے' کیا معلوم اور پھر یہ وبا جو عقائد میں طوفان بپا کرتی ہے۔''

ا ضی ابو عمر کافی سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"ابلیس کو محرم راز سمجھتے ہیں یہ لوگ۔ موحد اور خدا کا چاہنے والا۔ کیا یہ کفر نہیں؟" حامد نے ذرا جوش سے کہا۔

"صریحاً کفر۔" ابو عمر نے نشست پر پہلو بدلا۔

"پھر ان لوگوں پر کوئی گرفت نہیں۔ کوئی حد نہیں۔ کوئی احتساب نہیں۔" حامد اٹھ کر کمرۂ نشست میں ٹہلنے لگا۔

"میں پھر عرض کروں گا وزیرِ اعلیٰ کہ احتساب ممکن نہیں۔ یوں بھی بغداد نئے خیالوں، نئے عقیدوں اور مختلف النوع لوگوں سے بھرا ایک جنگل ہے جہاں ہر درخت کی اوٹ میں ایک نیا چہرہ ہے۔ ہر اجنبی گھات میں ہے۔ سب سے زیادہ آزادہ روی تو یہیں پر ہے۔ یہاں کے سارے ذاتی حکومت کے بندی خانے بھی کم ہوں۔ اگر گرفت مضبوط کی جائے۔ پھر خلیفہ کی والدہ ام المومنین، شغب کا غیر ملکی خون اسے اڑائے اڑائے پھرتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی درازیٔ عمر کے لیے طالب دعا رہتی ہیں اور جس شخص کے متعلق انہیں ذرا سا علم ہو جائے کہ وہ مستجاب الدعوات ہے، وہ اس تک رسائی حاصل کرتی ہیں۔ ایسے ضعیف العقیدہ لوگوں سے جو خوفزدہ اور ہراساں ہیں، بغداد کے گلی کوچے آباد ہیں۔" وہ دم لینے کو رکا۔

"ظاہر تو کوئی چارہ نہیں۔ خلیفۃ المسلمین کی مادرِ مہربان جو دربار پر اپنی کنیزوں اور اپنے غلاموں اور ترکی سرداروں کی وجہ سے قابض ہیں، عقائد کی اس گرد میں نہ ایمان کے لیے پریشان ہیں اور نہ ہی کفر کے لیے مضطرب۔"

دونوں نبیذ پیتے رہے۔

حلبی شیشے کے جام روشنی پکڑ کر طلائی لگ رہے تھے اور دریچوں میں سے بہار کی ہوا دجلہ کی لہروں کی بوئے خوش اور دوسرے کنارے سے آوارہ مغنیوں کی آوازیں کبھی کبھار اندر لاتی تھیں۔ راہداریوں کے دوسرے سرے پر غلام چپ چاپ گوش بر آواز تھے اور کنیزوں کے آنے جانے کا دروازہ بند تھا۔

"میں سمجھتا ہوں، اب وقت آگیا ہے کہ خاتون شغب کی اس بے راہروی اور کفر کی حوصلہ شکنی کی جائے۔" حامد نے جام طشت میں ایک آواز سے رکھا۔

قاضی ابو عمر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ گہری سوچ میں ڈوبا تھا اور جام

مضبوطی سے پکڑے تھا۔

حامد نے نشست گاہ کے طویل فرش پر ایک دیوار سے دوسری دیوار کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے سوچنا شروع کیا۔

"شب خون ہونا چاہیے۔ مکمل یلغار ہونی چاہیے۔ فتح کے یقین کے ساتھ۔ طبلِ جنگ بجانے کی ضرورت نہیں۔ یورش اتنی مخفی ہو کہ اس اسرار کو کوئی پا نہ سکے۔ دشمن کو سنبھلنے کا موقع ہی کیوں دیا جائے۔ وہ اپنی برات میں کچھ کہہ ہی نہ سکے۔ مغرب میں جنگ اور شکست ہر جگہ میرا مقدر نہیں ہو سکتی۔ بخدا یوں نہیں ہو گا۔ عبداللہ المہدی جس طرح ایک نئے مذہب کا داعی ہو کر ایک بغداد سے مماثل سلطنت کا مالک بن بیٹھا ہے۔"

قاضی ابو عمر اور وہ دسترخوان پر بھی تنہا تھے۔

"آپ کو میری اعانت کرنا ہو گی۔"

حامد نے گوشت کا ایک بڑا سرخ پارچہ ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"میں کفر کے لیے صاعقہ قہر بلا ہوں۔ جہاں الحاد کو دیکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ میں اس پر حاوی ہو سکتا ہوں' وہاں پر میں اپنے سارے وسائل آزماتا ہوں۔ آپ کسی جگہ بھی مجھے خوفزدہ نہیں پائیں گے۔" اس نے ایک بڑا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت اکثر پڑے گی۔" حامد نے جام بھرا۔

"میں دوست ہوں' مجھ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے مگر" قاضی بہت انہماک سے کھانے میں لگا تھا۔ "خاتون شغب کے جاسوس بہت خبردار ہیں۔" اس نے بات ختم کی۔

"ہمارا ان سے واسطہ۔ ہم تو کفر کے لیے لڑیں گے تاکہ ایمان سلامت رہے۔ اس پر کوئی آنچ نہ آئے اور آپ نے دیکھا اسی چشم پوشی' اغماض اور لاپروائی کا نتیجہ تھا کہ مغرب میں ایک مقابل پیدا ہوا۔ مہدی موعود اس کی سلطنت میں روز بروز وسعت ہو رہی ہے۔ ہم سب کی زندگی اور نجات اسی میں ہے کہ ہم بغداد میں کسی آوارہ خیال کو رہنے نہ دیں۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا!"

"بالکل بالکل۔" قاضی نے جام اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہمارا کام نہایت آہستہ رو ہونا چاہیے۔ ایک ایک الگ الگ تاکہ لوگوں کو یہ خبر پہنچ ہی نہ پائے کہ اصل ارادہ کیا ہے اور ہماری منزل کیا ہو گی۔ اس کام میں سوائے آپ کے دوسرا شریک نہیں ہو گا۔ شرکت سے راز طشت از بام ہو جایا کرتے ہیں۔"
وہ خاموش ہو گیا۔

یوسف بن الحسین نے کہا:
"آج حامد بن عباس کے ہاں میری طلبی ہوئی تھی۔ گو بلاوے کا طریقہ دوستانہ تھا مگر سر تابی کی مجال اس قطعیت میں نہیں ہوتی۔ مجھ سے ایک تحریر پر رائے مانگی گئی تھی۔"
جنید نے سنہری روشنائی میں ڈوبا ہوا قلم رکھ دیا اور ان کے دونوں ابروؤں کے درمیان ایک گہری خندق کی سی لکیر تھی جیسے دو فوجوں کے درمیان حدِ فاصل۔
"ایسی تحریریں اس سے پہلے بھی لکھی گئی ہیں۔ لوگوں نے یوں بھی سوچا تھا۔"
انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"مگر مجھ سے قطعاً رائے مانگی گئی تھی اور میں نے کہا۔ عزازیل کی شان میں یہ قصیدہ کسی ابلیس پرست کے سوا اور کوئی نہیں لکھ سکتا۔" یوسف ذرا گھبرا سے گئے تھے۔
"آپ کا مبلغ علم یہی کہتا تھا۔" پیشانی پر لکیریں گہری ہو گئیں۔ آواز نہایت نرم تھی۔
یوسف قریب آئے۔ تقریباً جھکے اور معذرت چاہنے والوں کے سے انداز میں انہوں نے سر جھکا لیا۔
"جو ہو چکا اور کہا جا چکا' اس کو آپ لوٹا نہیں سکتے۔ حامد فتنوں کی تلاش میں ہے۔ وہ مغرب میں اپنی شکست کی ذلت کو یوں مٹانا چاہتا ہے۔ عبید اللہ المہدی میں اور اس میں کوئی مماثلت نہیں۔"
جنید قلم اٹھا کر چوڑے حاشیے میں کچھ لکھنے لگے۔

"اس کے نزدیک بغداد کا مدرسہ نظامیہ مشرکوں، زندیقوں اور آواگون میں یقین رکھنے والوں کا مسکن ہے۔ ہر طرف وہ آنکھ کفر دیکھتی ہے اور اس کا ہاتھ رسائی کی تلاش میں ہے۔ وہ مقتدر باللہ کی نظروں میں سرخروئی چاہتا ہے اور اس کے عزائم خطرناک ہیں۔" یوسف نے ذرا تیزی میں بات ختم کی۔

"آنکھ جو دیکھتی ہے سو دیکھتی ہے۔" جنید نے حاشیے میں خوشخط نہایت باریک لکھ کر قلم ہاتھ سے رکھ دیا تھا— "اور پھر میں سمجھتا ہوں سروخروئی حاصل کرنے کے اور ہزاروں طریقے ہیں۔ مقتدر کو خوش کرنا اور اپنی انگلی کے گرد گھمانا حامد کے لیے ناممکن بات نہیں۔"

پھر انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔ بہت دیر خاموش رہے۔

"صرف کسی بے گناہ کا زیاں نہ ہو۔ یہ وقت نہایت نازک ہے۔" انہوں نے لکھے ہوئے صفحات کو پھر سے پلٹا اور کہیں کہیں تصحیح کی۔

"یہی وقت نازک کیوں؟" یوسف بن الحسین نے استفسار کیا۔

"تصوف کی بساط آج سے بیس سال پہلے لپیٹی جا چکی ہے اور کوئی بھی طرزِ نگارش آدمی کو گرفتار کروانے کے لیے کافی ہے۔ اگر حامد کسی تحریر پر آپ کی رائے چاہتا ہے تو وہ اس کی نظروں میں تکفیر ہونا چاہیے اور کفر کے لیے کوئی بھی سزا تجویز کی جا سکتی ہے۔"

"مگر کیوں؟" یوسف خوفزدہ سے ہو کر ایک دم اپنی جگہ سے آگے کو جھکے۔

"اشاراتی زبان اور رازداری، کم آمیزی اور خاموشی۔ یہی اس زمانے میں عمدہ ہتھیار ہیں۔" جنید نے اپنی کتاب میں سے چند اور لفظوں کو قلم زد کیا اور ان پر روشنائی کی لکیر ایک کرن کی طرح جو دو زاویوں کے درمیان پکڑی جائے، ماند ماند چمکی۔

"کوئی بیچارہ ابلیس کی عالی ہمتی کو جانے کیوں قابلِ تعریف سمجھتا تھا کہ میں نے اسے کفر کہہ کر اس پر گویا مہر لگا دی۔ اب وہ سب تعریفیں کفر شمار ہوں گے اور میں کچھ کر نہ پاؤں گا۔"

"رائے یا فتوے بہت عظیم ذمہ داریاں ہیں۔" جنید نے کتاب کسی اور وقت کے لیے بند کر دی۔ وہ اطمینان سے بیٹھے اور یوسف سے گویا ہوئے۔

ابلیس سے موسیٰ سینا میں ملے
اور پوچھا تھا کہ کس شے نے تمہیں آدم کو سجدہ کرنے سے روکا۔
ابلیس نے جواب دیا اگر میں سجدہ کرتا تو اپنی فطرت کے خلاف کرتا۔
تمہیں کوہِ طور کی طرف نظر کرنے کا حکم ملا اور تم نے دیکھا
اور میں بار بار سجدے کے لیے پکارا گیا تھا
اور میں نے تسلیم نہیں کیا
یوسف بن الحسین نے کہا——"اسے بار بار سجدے کے لیے پکارا گیا تھا"
"ہاں اسے بار بار سجدے کے لیے پکارا گیا تھا"
"مگر اسے کیوں بار بار سجدے کے لیے پکارا گیا تھا"
"اس کی فطرت ابا کرنا تھی"
"پھر وہ راندۂ درگاہِ خداوندی کیوں۔"
"شیخِ کامل کوئی فطرت کے خلاف تو نہیں جا سکتا۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ ازل سے ابد تک۔" وہ نہایت مضطرب تھے۔

جنید نے نشست پر پہلو بدلا اور ہنسے نہیں صرف مسکرائے۔ یوسف بن الحسین کے اضطراب کو سمجھ کر ان کی طرف نہایت دلچسپی سے دیکھتے رہے۔

"آپ کیا کہتے ہیں۔ اس مسئلہ کا کوئی تو حل ہونا چاہیے۔" یوسف نے بڑے غیر یقینی انداز میں پوچھا۔

"عقلِ مہربان کا ساتھ جب تک رہے گا یہ مسائل سمجھ میں نہیں آسکتے اور توفیق تو اس کی عطا ہے۔ اس کی رضا سے اور رضا پر وہ خود قادر ہے اور انسان کی فہم کی قوتیں ہی کیا ہیں؟"

یوسف بن الحسین کو ماوراء کے ماورا سے بھی ماورا کے الفاظ یاد آرہے تھے۔ آدمی کا اختیار ہی کیا تھا۔ ریاضتوں' عبادتوں' مناجاتوں سے ایک روشنی کی کرن کبھی کبھار ذہن کا اجالا بنتی ہے۔ وہ خواب میں دیکھا گیا خواب ہوتا ہے۔ جیسے تازہ کٹی لکڑی کی مہک سے بھرا جنگل ہو اور اس میں راستہ تلاش کرنا خواب کے سائے کے ساتھ چلنے جیسا ہوتا ہے۔

ایک طویل خاموشی کے بعد یوسف نے پوچھا "حامد پتہ نہیں کس کے در پے ہے اور کیوں اس تحریر پر گواہی حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"یہ بھی رازِ درونِ مملکت ہے۔ ہو سکتا ہے اس تحریر کی اصل کچھ بھی نہ ہو اور معتوب پر محض گواہی حاصل کر کے اس کو گرفتارِ بلا کرنا مقصود ہو۔ بقائمی ہوش و حواس اس خطرناک دور میں کون اپنے اسرار و رموزِ انکشافات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی جرأت کر سکتا تھا۔"

اذان کی آواز خوشبو کی طرح ہر دریچے اور در میں سے چھت کے خلا میں ہر گوشے اور ہر کونے کو معمور کرتی ہوئی دالانوں اور نشست گاہوں' درس گاہوں اور زاویوں' گنبدوں اور اطاقوں میں پھیل گئی تھی۔

نماز کے لیے اٹھتے ہوئے جنید نے کہا۔

"تم پھر طلب کیے جاؤ گے۔"

"میں اسی طلبی سے بچنے کے لیے کل خراسان روانہ ہو رہا ہوں اور حامد کے گرد مجھ سے کہیں زیادہ مستعد لوگ جمع ہیں جو اس کی بات کو اپنے لیے نشانِ راہ بنالیں۔"

ستونوں کے پیچھے نیم تاریک قبے میں خواتین بھی جماعت میں شامل ہونے کی غرض سے موجود تھیں۔ خلیفہ کے خاندان کی مستورات اور مقتدر کی ماں شغب جب کبھی مضطرب ہوتی یا اسے خصوصی دعاؤں کی حاجت ہوتی یا پھر اسے کوئی سخت مہم درپیش ہوتی۔ دربار کے امرا اس کے احکامات سے شاکی ہوتے اور وہ اپنے ارادوں میں ناکام ہونے لگتی۔ لوگ سرگوشیوں میں اس دولت کا تذکرہ کرتے جو اس کے پاس تھی اور لاانتہاء تصرف جو سلطنت کے ہر کام میں اسے حاصل تھا' خطرے میں پڑنے لگتا تو وہ مشائخ کے پاس طالب دعا ہوتی —— "جعفر کی زندگی اور اس کی طاقت" —— اس کے دو ہی سوال تھے۔

کئی اور اجنبی چہرے بھی تھے جو ایک نظر میں کبھی کبھار دیکھے ہوئے لگتے تھے مگر ان کی پہچان مشکل تھی۔ ابنِ صولی نے کبھی مدرسے کا رخ نہیں کیا تھا۔ دربار سے وابستگی اسے اتنی فرصت ہی کب دیتی تھی کہ وہ دجلہ کے پلوں کو پار کرے اور کوچوں میں سے گزر کر یہاں پہنچے۔ وہ ان شاعروں میں سے تھا جو اپنے علم کا زور بادشاہوں کی

مدح و ثناء کو سمجھتے تھے اور امراء کی دلداری بھی کرتے رہتے تھے۔ مبادا کسی آڑے وقت میں انہیں مدد کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑے۔ وہ صاحبِ طرز فسانہ طراز داستان گو تھا اور اسے کسی دعا کی بھی ضرورت نہ تھی۔ دنیاوی نعمتوں میں سے جو اس نے چاہا تھا' پالیا تھا اور جس چیز کی خواہش کرتا تھا' پالیتا تھا۔ مدرسہ نظامیہ کے مشائخ اور اساتذہ سے اس کا رشتہ تفاخر کا تھا جیسے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے یا ہو سکتا ہے کسی خاص اطلاع کے لیے وہ مغرب کی نماز میں شامل ہو جایا کرتا تھا۔

ابوذر طبری' عریب بن سعد قرطبی اور خطیب تھے اور ان کے ساتھ گروہ در گروہ اور لوگ بھی تھے۔ ہاشمیوں کی ایک جماعت تھی اور عراقیوں کی ایک بھیڑ تھی جو شہر میں نئے وارد معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کے کلاہ گرد آلود اور کپڑے میلے تھے۔ شاید کوئی قافلہ کہیں قریب ہی ٹھہرا تھا اور سوق الثلاثہ کی طرف سے آیا تھا۔ وضو خانوں میں ہجوم تھا اور طالب علم تیز تیز جاری پانی کے سوتوں کی طرف جو اقامت گاہوں میں تھے' بھاگ رہے تھے۔

"میرے ایک عزیز کے لیے خصوصی دعا کیجئے کہ خدا اسے فتنوں اور دشمنوں سے محفوظ رکھے۔"

شغب کا پرچہ پڑھ کر جنید نے دوبارہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے اور دیر تک اپنی خصوصی توجہ اس شخص کی طرف مبذول کر کے الحاح وزاری سے سوالی رہے مگر وہ ایک گونہ سرخوشی محسوس نہیں کر پائے تھے جو دعا کی قبولیت کے طور پر دل میں آتی ہے۔ جو قلب و نظر کو ایک کیفیت سے دوچار کرتی ہے۔ جو خدا کی طرف سے پیغام بن کر روح میں اترتی ہے کہ تمہاری التجا سنی گئی۔ رحمتوں کی تنی ہوئی چادر کا احساس فضل و کرم کی بارش کے امطارِ انوار یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دیواریں حائل ہیں جو لفظوں کے ساتھ ساتھ بلند ہو رہی تھیں اور ان کو گھیرے میں لے کر ہر صعود کی پرواز کی قبولیت کی کوشش کو ناکام بنا رہی تھیں۔

وہ نشست گاہ کی طرف لوٹے ہیں تو انہوں نے صولی کو دروازے کے باہر منتظر پایا۔ آسمان پر نیلاہٹ میں تارے نہایت مدھم ٹمٹما رہے تھے۔ جیسے نئے جلے ہوئے چراغ ہوں۔

''یا شیخ! میرا ایک سوال ہے۔'' صولی نے سر جھکا کر کہا۔

اس کے باوجود کہ شیخ کامل کی طبیعت رکی رکی اور بوجھل تھی' انہوں نے سر کے اشارے سے سوال کے لیے اذن دے دیا۔

''حضور کیا حکم ہے' اس شخص کے لیے جو جاہل ہو اور عاقل بنے۔ گفتگو سے عاجز ہو مگر فصاحت اختیار کر سکتا ہو۔ جو لوگوں کے رنگ میں رنگا جائے اعتزال دیکھے تو مائل بہ معتزل ہو جائے۔ امامیہ لوگوں میں امامیہ ہو اور اہلسنّت کے طریق پر ہو تو سُنی بن جائے۔ جو بڑے بڑے دعوے کرے اور کیمیا گر ہو اور خبیث بھی۔''

جنید مسکرائے ''ابو بکر صولی! کیا ایسے تضادات ایک آدمی میں جمع ہیں؟''

''یا شیخ! وہ ایسا ہی ہے بالکل۔'' صولی نے ہاتھ پیچھے باندھ رکھے تھے اور سر کو جھکائے ہوئے تھا۔

''کیا کسی فتنے کے کھڑے ہونے کا امکان ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اگر اس کے دعوؤں پر لوگوں کا یقین بڑھ جائے اور عوام اس کی راہ اختیار کریں تو کفر کا فتنہ پیدا ہو جائے۔''

''مفروضوں پر تو کسی شخص کو معتوب نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ آدمی دیوانہ ہو جیسا کہ وہ ہو گا تو قابلِ معافی ہے۔ دنیا دیوانوں اور فرزانوں سے مل کر ہی تو بنی ہے۔''

جنید خاموش ہوئے تورات کا پرندہ زور زور سے بولنے لگا۔ پھر سیاہ پروں والی بڑی سی چڑیا طویل چیخ کے بعد زاویے کے باہر درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی۔ شاہراہ پر قافلے کی گھنٹیاں سنائی دیں۔ اقامت گاہوں میں چراغوں کی روشنیاں ظاہر ہوئیں اور نسطوری عیسائیوں کی عبادت گاہوں میں شام کی عبادت کا گھنٹہ مسلسل بجنے لگا۔

ابو بکر صولی جو خلفاء ہم نشین اور دربار میں ایک مقام رکھتا تھا' خاموشی سے جھکا اور آداب بجالا کر بڑے دروازے کی طرف چلنے لگا۔

جنید یہ سوچتے ہوئے کہ فتنوں کے خیالی ہیولوں سے گھبرا کر حکام کیا کیا مضحکہ خیز حرکتیں کرتے اور ان کے رفقاء کس تفصیل سے اپنی کارکردگی اور مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہیں' اپنی نشست گاہ میں داخل ہوئے۔ غلام نے لکڑی کے چراغ دان کو لا کر

برابر رکھا اور سنہری روشنائی میں ڈبو کر وہ حاشیے میں نہایت باریک قلم سے لکھنے لگے۔

"انفرادیت کے مکمل طور پر مٹ جانے اور انسان کی رضا کا خدا کی رضا میں مل جانے کا نام ہے فنا۔ انسان کا مشاہدہ اور بصیرت اس سے الگ ہو جاتی ہے اور خدائے تعالیٰ شان و شوکت کے ساتھ قائم رہتا ہے۔"

غلام نے دوبارہ اندر داخل ہو کر کہا۔ "حضرت شبلی تشریف لائے ہیں۔"

اور اس سے پہلے کہ وہ حجرے سے باہر نکلتا' وہ تقریباً دروازے میں ہی داخل ہو رہے تھے۔

شبلی نے غوغا کیا۔ "وہ ــــ وہ ــــ وہ"

دیواروں کی طرف مضطربانہ دیکھتے ہوئے آسمان کی طرف انگلی اٹھائے ہوئے۔

جنید نے چاہا انہیں تھامیں اور انتہائی کرب اور درد کی اس کیفیت کا معلوم کریں مگر وہ مدرسے کے ستونوں اور دالانوں میں بھاگنے لگے۔ جیسے کوئی آتشِ جہنم لے کر ان کا تعاقب کر رہا ہو۔ پھر تھک کر ایک ستون سے ٹیک لگا کر رونے لگے۔ انہیں ہوش آ رہا تھا۔

جنید انہیں شانے سے پکڑ کر کشاں کشاں حجرے میں لائے۔

"شہادت میرا مقدر کیوں نہیں؟" انہوں نے ضدی بچے کی طرح سوال کیا۔ "مجھے شہادت چاہیے۔"

"مشیت۔" جنید نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شہادت ــــ شہادت ــــ شہادت ــــ سعادت و رفعت ــــ مقدر ــــ مشیت۔" وہ اپنے آپ سے کلام کر رہے تھے۔

"ازل سے جو لکھا گیا۔" جنید زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔

شبلی نے آسمان کی طرف منہ کیا اور کہا "محبت اور مقدر۔"

وہ اٹھے اور باہر نکل گئے۔

اس حوض کی طرف گئے جہاں پانی پوشیدہ سوتوں سے اُبلتا ہے۔ مسجد اور وضو خانوں اور زاویوں کی نہروں میں داخل ہو کر لوٹ جاتا ہے۔ گنبدوں کا عکس اس میں لہروں کے ساتھ یوں مضطرب ہوتا ہے جیسے توحید کے موضوع پر عارفوں کے دلوں کے آئینے اپنے ہی پرتو سے کانپتے تھے۔ کارِ شیشہ گراں مشکل اور مقامِ شیشہ مشکل تر

تھا۔ اس کا تعین کون کرے۔

جنید نے آہ بھری اور کہا۔

"آئینہ تمثال دار مگر جس آئینے کا مقدر کرچیوں میں بٹنا ہو' اس کے لیے افسوس کیوں' آخر کیوں؟"

ہوا کا جھونکا کہیں سے آیا اور کھلے دریچوں کے سامنے شمع کو بجھا کر نکل گیا۔ غلام کو پکارنے کے لیے حجرے سے باہر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ آسمان ستاروں سے مزین اپنی رفعتوں میں نہایت پُرسکون تھا۔

نیلگوں سیاہ رات اپنی ٹمٹماہٹوں سمیت بہت حسین اور آراستہ۔ انہیں بھولے ہوئے اشعار یاد آئے۔

اس کے دم سے صحرا آباد ہیں اور سراب پانیوں میں بدل جاتے ہیں
چراگاہوں کے سبزے کی لہریں ہوا میں چمکتی ہیں
وہ نگاہیں مے کو خوش رنگ بنا دیتی ہیں
رات اس کے چہرے کی ضیاء سے درخشندہ ہے
مگر میرا مقدر اس کی زلفوں کی طرح سیاہ ہے
مشاقی سے چلائے گئے نگاہوں کے تیر میرے دل کے پار ہو گئے ہیں
اور میری پسلیوں میں آگ ہے!

حسین بن منصور اور اغول۔ پھر ایک گزرا وقت اور ایک ٹھہرا ہوا وقت ایک ماورا وقت جیسے بجلی کا کوندا جاری پانیوں کو روشن کرتا' ان کی بے پناہی اور اسرار پر مطلع کرتا گرجتے دھارے کو دور تک سیلِ نور بنا دیتا ہے۔

حامد خراسان سے دستاویزات کا منتظر تھا اور بے قراری سے ان روشوں پر ٹہل رہا تھا جو خوشگوار ہوا کے رنگ آلود جھونکوں سے معطر تھیں۔ درختوں کے مہکے ہوئے سائے ڈوبتے سورج کی سرخی میں ایسے حنائی تھے جیسے کسی عروسِ نوبہار کے عکس سے محل کی دیواریں۔

حواس باختہ غلام نے بھاگ کر اس کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ وہ سخت سہا ہوا پریشان تھا۔ جیسے اس نے کوئی بہت ہی خوفناک منظر دیکھا ہو۔ اس کی آنکھیں وحشت سے ابلی پڑتی تھیں۔ منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی اور سانس حداد کی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' حامد نے ذرا دور ہوتے ہوئے پوچھا۔

''وہ ___ وہ ___ وہ ___'' غلام کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

حامد نے ذرا گھبرا کر ارد گرد نظر کی۔ شام کے دوش پر رات اتر رہی تھی۔ پتوں اور شاخوں میں چھپے ٹڈوں نے یک بیک مسلسل چرچر بند کر دی تھی۔ سناٹا بوجھ بن کر دل پر گرنے لگا تھا۔

''کیا بات ہے؟ بتاؤ۔'' حامد نے ذرا خفگی سے کہا۔

''وہ ___ وہ ___ زندان ___ وہ ___'' اس نے بات کرنے کی کوشش کی۔ کانپتا ہوا گرا اور سجدہ ریز ہو گیا۔

پھر اور غلاموں کو اس نے دیکھا کہ بھاگے آتے ہیں۔ شرطے اور پہریداروں کی ایک بھیڑ اس کی طرف چلی آتی تھی جیسے آسمان گر گیا ہو۔

''کیا فساد و فتنہ ہے؟'' اس نے زور سے پوچھا۔

''ہم اس کے تعاقب میں آئے ہیں کہ زندان میں کھانا لیے جاتا تھا کہ چیخ کر پلٹا۔ طباق کو پھینک دیا اور سیدھا آپ کی تلاش میں ہوا۔'' وہ سر جھکا کر مؤدب کھڑے ہو گئے۔

''زندان میں کون ہے؟ کون سے زندان کی بات کرتے ہو؟'' حامد نے بے نیازی سے پوچھا۔

''جس کے دروازے محلّہ کرخ کی طرف کھلتے ہیں۔ زندانی وہی ہے جس کی دعا میں بہت اثر ہے۔ جو ہاتھ اٹھا کر کسی کے لیے کچھ مانگے تو مل جایا کرتا ہے۔''

''بس بس۔ یہ وہی شخص نہیں جو خبیث کیمیاگر اور حیلہ جو عبادت گزار ہے۔ ابلیس کا پرستار؟''

حبشی پہرہ داروں کو لگا انہیں غش آ جائے گا۔

"اس کے کسی شعبدے نے اس غریب کو مبتلائے مصیبت کر دیا ہو گا۔ اسے اٹھا کر لے جاؤ اور صورتحال سے مجھے فوراً مطلع کرو' فوراً۔"

اب رات ستاروں بھری چادر کے دامنوں کو گھسیٹتی ہولے ہولے دریاؤں اور پہاڑوں' وادیوں اور صحراؤں' روشنی اور اندھیرے پر محوِ پرواز ہونے کے بعد نیچے اتر آئی تھی اور حامد اس تلخی کے سوا کچھ محسوس نہیں کر رہا تھا جو اس کی روح میں شکست بن کر رہتی تھی۔ یہ احساس کہ وہ ناکام و نامراد آدمی ہے۔ محبت اور زندگی میں روندا جانے والا' ہر محاذ پر پچھاڑا گیا شہسوار' بد قسمت محض اور صرف بد نصیب اور اس ساری شکست خوردگی کا باعث ایک شخص جو بے بضاعت تھا' دنیاوی لحاظ سے ایک نفی—— مگر اس کا تمسخر اڑانے والا۔ لوگ سمجھتے تھے وہ خدا کا مقرب ہے۔ اس کے غلام سمجھتے تھے کہ وہ جس کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کرے' قبول ہو جاتی ہے۔

"ہاں' اس کی دعائیں صرف دوسروں کے لیے قبول ہوتی ہیں۔ جب اس کی اپنی باری آئے گی تو دعا کے دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔" اس کا قہقہہ نشست گاہ میں دیر تک گونجتا رہا—— وہ عمار سے سب صورت حال سمجھ سکتا تھا۔

اس نے تالی بجائی۔

کنیزیں اندرونی راہداریوں سے طویل نشست گاہ میں داخل ہوئیں۔ یہ ایک عجیب رقص تھا۔ نیم ترکی نیم ہندی۔ کچھ ایرانی اور ایامِ جاہلیت کی عربی موسیقی کی دلنواز دھنوں پر ترتیب دیا گیا۔ ہر در جب وا ہوتا اور پردہ اٹھتا تو ایک جہانِ دیگر سامنے آتا۔ یہ رقصاں عورتیں اسے آج اغول کی یاد دلا رہی تھیں۔ جیسے وہ سب اغول کے مختلف چہرے ہوں۔ اس کے سراپے ہوں۔ اس کے وجود ہوں جیسے وہ آئینہ خانے کا نظارہ کر رہا ہو اور آئینوں سے گھرا ہو اور یہ رقصاں ہیولے دراصل اس ایک کے پرتو ہوں۔ سارا کرشمہ نظارگی کا تھا۔ قریب آ کے لرزاں سائے دور ہٹتے ترساں سائے' وہ سب وہی تھی۔ رنگوں میں لپٹی ہمیشہ گریزاں گریزاں اور وہ خود دشتِ سماویہ میں تھا۔ جہاں آندھیاں آدمی کو دیوانہ بنا دیتی تھیں۔ راستہ کھو جاتا تھا۔ ٹیلے سفر میں رہتے تھے' پھر اسے اموی شاعر کے اشعار یاد آئے۔

ہمارے درمیان ایسے لق و دق صحرا ہیں جن میں قافلے چلتے چلتے تھک جائیں۔

اے عزّہ! تم نے ہمارے ساتھ برا سلوک کر دیا بھلا
ہماری طرف سے تم کو ملامت نہیں کی جائے گی
اور اگر تم دشمنی کرو تو بھی ہم تم سے دشمنی نہیں کریں گے
ہمارے درمیان ایسے لق ودق صحرا ہیں
ہمارے درمیان لق ودق صحرا ہیں
ہاں صرف لق ودق صحرا
میں کبھی اس تک پہنچ ہی نہیں پایا۔
یہ ایک خواب تھا کہ وہ تھی
اور جب آنکھ کھلی تو ہمارے درمیان لق ودق صحرا تھے!

"بخدا وہ دشتِ سماویہ کے ایک کونے میں سوتی ہے اور میں یہاں ہوں۔ حسین بن منصور یہاں ہے۔ کتنا ستم ہے کہ حسین رہے اور اغول نہ رہے۔ روح نہ رہے اور روح اللہ رہے۔"

اس نے بازو لہرا کر اشارہ کیا۔

موسیقی تھم گئی۔ کنیزیں سر خم کر کے کھڑی ہو گئیں اور پھر الٹے قدموں انہی پردوں کے پیچھے غائب ہو گئیں۔

خالی نشست گاہ میں وہ دیوانوں کی طرح پھرتا رہا۔۔۔ کیوں' آخر کیوں؟ حسین رہے اور اغول نہ رہے۔ وہ شعبدہ باز حیلہ جُو رہے اور وہ جو سچائی تھی' مٹ جائے۔ وہ ہر اس نقش کو مٹا دے گا جو اغول کے اور اس کے درمیان تھا۔ اس کے' حامد بن عباس کے نصیب میں محبت نہیں نفرت تو تھی۔ شدید عمیق نفرت۔ سب چارہ گر ناکام ہو چکے تھے۔ زہر آلود نیزے کی انی' دل میں چبھ رہی تھی۔ وہ آخری کوشش کرے گا۔ ساری شکستوں کا انتقام لے گا۔ اگر محبت اس کا حق نہیں تو نہ سہی۔ نفرت کرنا' مٹانا' معدوم کرنا تو اس کے اختیار میں تھا۔ ہاں وہ ہمیشہ ان لق و دق صحراؤں میں آوارہ ہواؤں کی طرح سرگرداں نہیں رہے گا۔ وہ قرار پائے گا۔

"عمار۔ عمار۔" اس نے زور سے پکارا۔ "کوئی ہے؟"

اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ شدید پیاس اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔

اب ایسا اکثر ہوا کرتا تھا۔ وہ جب بھی سوچتا' پریشان ہوتا' پیاس اس پر غلبہ پالیتی۔ پھر کوئی مئے لالہ' کوئی شرابِ ناب' کوئی شربتِ خوش ذائقہ اسے تسکین نہ دے سکتا۔ حکیم اس کی اس بیماری کا علاج کرنے سے عاجز تھے۔ یخ پانیوں اور نبیذ سے یہ اور بھڑکتی' یہودی اور نصرانی اطباء دربار کے نہایت معزز معالج خود خلیفہ مقتدر کے ذاتی طبیب ناکام ہو چکے تھے۔ مغرب سے لوٹنے کے بعد سے اس کا حملہ اکثر ہوتا اور دوائیں اس کی کوئی مدد نہ کر سکتیں۔ یہ کس قسم کی پیاس تھی۔

"عمار۔ عمار۔" حامد نے پھر پکارا۔ اس کے حلق میں کانٹے تھے اور اندر صحرائے لق ودق میں بگولے جیسے آندھیوں کی صورت اختیار کر رہے تھے۔ کنیزیں دم بخود سہی ہوئی پردوں کے پیچھے کھڑی تھیں۔

حبشی غلام نے کہا "سیّدی عمار ایک خراسانی مہمان کو لے کر ابھی ابھی قصر کے زیریں حصے کی طرف گئے ہیں۔"

"بھاگو اور اسے کہو حکیم بختیشوع کو بلائے۔" حامد کو بے دم کرنے والی ایک خشکی جو زبان کو جکڑ رہی تھی' اپنے اندر سے غبار کی طرح بڑھتی محسوس ہوئی۔

پردوں کے پیچھے دیواروں سے پرے دالانوں اور راہداریوں میں بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی جیسے دفاع کی تیاریاں ہو رہی ہوں۔ حکیم بختیشوع تقریباً خانہ نشین تھا' نہایت ضعیف اور چلنے پھرنے کے تقریباً ناقابل۔ بھلا اسے کس طرح سے لایا جا سکتا تھا۔ یہ عجیب مرض تھا کہ سب چارہ گر عاجز تھے۔ کوئی تو چارہ ہوا ے چارہ گراں!

وہ بے حال ہو چکا تھا' سوچ اور ذہن' دل اور جسم سب سلامت تھے' صرف منہ میں ریت کا مزہ تھا اور زبان لکڑی کے ٹکڑے کی طرح تھی۔ خشک اور ٹکڑے ہوتی ہوئی۔ "دوائیں تو آزمائی جا چکی ہیں۔" کوئی کہہ رہا تھا۔ "اب دعا کی ضرورت ہے' دعا کی۔"

دوسری سرگوشی سناٹے میں ابھری۔ "زندانی حسین بن منصور اگر دعا کرے تو مشکل آسان ہو سکتی ہے۔"

خود اس کے قصر میں اس کے گرداگرد حسین بن منصور تھا۔ زندان میں اسیر ہی نہیں۔ اور یوں تھا کہ وہ خود اسیر تھا اور وہ جو اسیر تھا' آزاد تھا۔

کیا یہ ستم نہیں تھا؟
قدرت اس سے کیا کھیل کھیل رہی تھی؟
اس کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر کہے کہ میں اس کھیل میں جیتنا چاہتا ہوں۔ سب کچھ داؤ پر لگا کر یہاں تک کہ اپنا آپ بھی۔ اغول کے بعد' اپنے حسین کے بعد وہ اب خود' حامد بن عباس وزیر مملکت اور خلیفہ کا نہایت معتمد خاص اپنے آپ کو اس آگ میں جھونکنا چاہتا تھا۔ اب برداشت کی آخری حدوں کو چھو چکی تھی اس کی قوتِ برداشت۔ وہ ایک بے بضاعت آدمی سے جو دیوانہ تھا' کیوں شکست اٹھائے؟ اسے دوا کی ضرورت تھی' دعا کی تھی چاہے اس کا جسم ٹکڑے ہو کر سوکھ کر اس کی ہڈیوں سے گر جائے' وہ حسین بن منصور کو مٹا کر رہے گا۔ ہاں وہ اسے مٹائے گا' چاہے اس پر کچھ ہی کیوں نہ بیتے!

قاضی ابو عمر نے خراسان سے آئے ہوئے مکاتیب اور دستاویزات کا معائنہ کیا۔ خراسانی سرائے سے کتابوں کے مسودات اور رسائل کو اپنے ماتحت قاضی یحییٰ کو بھجوا دیا۔ حامد کی خاص ہدایت تھی کہ ان سب دفاتر کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے۔ ذاتی خطوط' عقیدت مندوں کے مراسلے' دعا کے لیے درخواستیں' حکایاتِ جنون' القابات سے مزین عبارتوں کے لحاظ سے سمجھ میں نہ آنے والے گنجلک' الجھے ہوئے حیران کن خیرہ کن انکشافات' عاجزی' الحاح وزاری' دردمندی' غم و سوز کی روداد ِسیاہ۔ آدمی ان خطوط میں کتنا بے بس' سہما ہوا پریشان اور خوفزدہ تھا۔
انسان کو خوف سے کوئی نجات نہیں دلا سکتا۔ جب تک زندگی ہے اور اس کے فتنے ہیں' تماشے ہیں' بازی گری ہے' یہ خوف رہے گا۔ آدمی گناہ کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ توبہ واستغفار اختیار کرتا ہے مگر پھر بھی لرزاں ترساں افتاں و خیزاں' امید و رجا کے راستوں پر چلتا رہتا ہے۔
قاضی ابو عمر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ خطوط خود انہوں نے لکھے ہوں۔ ایسا تو کبھی انہوں نے سوچا نہیں تھا مگر اب جبکہ ترتیب وار یہ اجنبی انجان معروضے انہوں

نے دیکھے تو لگا یہ ان کی اپنی آواز ہے۔ خدشات ' وسوسے سب اس دل میں بھی تھے۔ کیا وہ ہر دل میں تھے؟ کیا سب انسان ازلی ' بنیادی سطح پر ایک ہی ہیں؟

کیا وہ ایک ہی کل کے جُزو نہیں ہیں؟

''توبہ توبہ۔'' انہوں نے سر کو جھٹکا۔ کیسے کافرانہ خیالات کا ہجوم انہیں گھیرے تھا۔ کُل کا جزو! انسان تو اتنا زار و زبوں و درد مند تھا۔

آرام میں گھرا ہوا ' شکوک و شبہات کا شکار۔

کبھی یوں بھی ہوتا کہ پے در پے حادثات و واقعات آدمی کے حواس پر چھاپہ مارتے اور وہ اس سے منکر ہو جاتا۔ سوال کرنے لگتا۔ باغی ہو جاتا۔ کیوں ' آخر کیوں؟

وہ اپنی مرضی کے بناء پیدا کیا گیا تھا۔ دنیا میں بھیجا گیا تھا جیسے گہرائیوں میں پھینکا گیا تھا۔ وقت کی موجیں اور لہریں اس پر سے گزرتی تھیں۔ حالات و واقعات ' زمانہ اس پر اپنے طوفانوں سمیت ایک بڑے آبشار کی طرح وارد ہوتا تھا۔

کیا آدمی بے بضاعت نہیں تھا؟

قاضی ابو عمر اپنے خانہ باغ میں ٹہلتے رہے اور ان کی کنیز زہرہ جھانکتی رہی۔ شاید وہ وضو کے لیے تازہ پانی طلب کریں۔ شاید کوئی حکم دیں۔ اکثر یوں ہوتا کہ یک بیک وہ اٹھ کر بیٹھ جاتے اور کسی کتاب کی اصل جگہ بتا کر اسے کتاب نکال لانے کا حکم دیتے۔ یہ کتابوں کی دنیا تھا جس میں انہوں نے اسے ایک کتاب کی ہی حیثیت دی تھی اور جس کے اوراق کو انہوں نے کبھی کھولنے اور اس میں لکھی عبارتوں کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ نہایت عمدہ دربار دار ہونے کے ساتھ ساتھ متقی اور پرہیز گار بھی تھے۔ انہوں نے سوائے نبیذ کے مے کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ راتوں کو بیدار رہنے والے ' سوچ میں ڈوبے رہنے والے —— غور و فکر کرنے والے۔ زہرہ نے صبر و شکر سے اپنے آپ کو ان حالات کا عادی بنا لیا تھا۔ ان کی عادتوں سے وہ یونہی واقف تھی جیسے اپنے ہاتھ کی لکیروں سے مگر اس دفتر کی ورق گردانی کرتے ہوئے ان کی بے چینی کیوں دیدنی تھی؟

کیا تھا ' آخر کیا تھا؟—— وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھی۔

قاضی کبھی اندر آتے ' پھر گھبرا کر باہر نکل جاتے۔ ہوا پھولوں سے لدی بیلوں

کو ہولے ہولے جھلا رہی تھی۔ دیواروں پر سرخ اور سفید گلاب مہک رہے تھے اور فضا چاندنی اور ستاروں کی ضیاء اور رات کو بولنے والے تیز چیخ کی سی سیٹی بجا کر گم ہونے والے پرندے کی صدا سے لبریز لگ رہی تھی۔

''زہرہ'' انہوں نے بالآخر پکارا۔

وہ پردہ اٹھا کر اندر آئی۔

''یہ سارا دفتر اٹھا کر کسی خالی صندوق میں بند کر دو۔ ہو سکتا ہے میں کچھ عرصے کے بعد انہیں طلب کروں مگر ان کی حفاظت ضروری ہے اور انہیں دوسری دستاویزات کے ساتھ خلط ملط نہ کر دینا۔''

وہ رات انہوں نے خانہ باغ میں ٹہلتے ہوئے گزاری۔

حامد کیا چاہتا تھا؟

وہ کیوں اس شخص کے درپے تھا؟

دعا طلب کرنا کفر نہیں تھا۔۔۔ کفر کیا تھا؟

حدِ فاصل اتنا باریک تلوار کی طرح تیز ایک پل صراط تھا اور اس کی دھار پر چلنا ہی تو زندگی تھا۔۔۔ وہی خوف وہی ڈر' گھات میں لگے ہوئے گناہ سے خائف رہنا۔۔۔ ہر ذی روح اس قید میں ہے۔ بلا تخصیص ہر ذی روح۔۔۔ اور جو اس سے آزاد ہے' وہ قابلِ گرفت ہے۔ گرفت آزادی پر تھی' اسیری پر نہ تھی۔ بازپرس یہ تھی کہ جو آزاد ہو گیا' وہ کس طرح اور کیونکر ہو گیا!

قید میں کوئی قدغن نہیں تھا۔ حدِ ادراک سے پرے کون چالاک' گستاخ اور بے پرواہ جانے کی جرأت کر سکتا تھا۔ کون اتنا آزاد تھا؟

ایسی آزادی کی سزا تھی۔ ایسی آزادی کی قیمت تھی۔ جو جس کے پاس ہو' بیش قیمت ترین متاع۔۔۔!

قاضی ابو عمر نہایت مضطرب ٹہلتے رہے۔ یہاں تک کہ گھاس کا وہ قطع شبنم سے نم تختے پر الگ دکھائی دے رہا تھا۔

انہیں کہا گیا تھا کہ وہ حسین بن منصور کے خلاف شواہد اور دلائل جمع کر کے پیش کریں۔۔۔ اس کے باوجود کہ ہر لفظ کے مطالب کو مسخ کر کے پیش کیا جا سکتا تھا' وہ

ان سے اس کے خلاف کچھ ثبوت مہیا نہیں کر سکتے تھے۔ پھر وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ حامد اس زندانی کے ساتھ کرنا کیا چاہتا تھا۔

انہوں نے صدہا لوگوں کو ایسے معاملات میں معذور سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ اگر اتنی بڑی خدائی میں ایک آدمی آزاد ہے۔ وہ تو ایک دُرِ بے بہا تھا۔ اس کی حفاظت کرنا چاہیے۔

وہ حامد کو یہ سب بتانا چاہیں گے!

زمزمۂ موت

حسین بن منصور چاند کی سلاخوں سے چھن کر آتی روشنی میں زندان کی نم زمین پر محوِ سجدہ تھا اور دوسری طرف عمار نے اسے دیکھ کر سوچا۔ ”جانے سجدہ اتنا طویل کیوں ہو گیا ہے“ ــــ پھر خوف نے اسے گھیر لیا۔ اگر زندانی کو اس حالت میں موت نے آلیا تو وہ حامد کے لیے، اپنے آقا کے لیے کس سے دعا کا طالب ہو گا۔ العطش العطش پکارنے والے کے لیے حوضِ کوثر کا پانی چاہیے مگر اس کے لیے تو جان سے گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کے میدان کی دوسری اوٹ میں ہے وہ چشمۂ حیات۔ یخ مزاج آبِ سرد لسے تسکین کیوں نہیں دیتا؟

حامد، ان کا آقائے نامدار، اس کے ہونے سے ان کی پہچان تھی۔ ہر مولٰے اپنے مالک سے پہچانا جاتا تھا۔ اور وہ مہربان آدمی تھا۔ کینہ پروری، غصہ اس کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ اب اتنے لمبے عرصے میں عمار کو اس سے نپٹنے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔ اور وہ وزیر کے مزاج میں بہت دخیل تھا۔ اس کے باوجود کچھ اسرار تھے جن پر اس کو آگاہی نہیں ہو پاتی تھی۔ آدمی کو سمجھنا مشکل کام ہے۔ بہت ہی مشکل!

عمار کو یقین تھا کہ اگر حسین بن منصور دعا کرے تو حامد کا مرض جاتا رہے گا چاہے مرض الموت ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے یہاں زندان میں لوگوں کو نہایت دشواری سے رسائی حاصل کرتے اور لاعلاج امراض سے محض دعا سے نجات حاصل کرتے دیکھا تھا۔

عمار نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ سجدہ سے سر اٹھا کر حسین نے کہا:

”جو پیاس خون سے بجھ سکے گی اُسے آبِ زمزم نہیں بجھا سکتا۔“

"کسی پرندے کا خون!" عمار نے نہایت مؤدب پوچھا۔

باہر قریب ہی زندان کے احاطے میں کوئی پرندہ آشیاں میں بے چینی سے چیخا اور سناٹے میں وہ دیر تک گونجتی چیخ تیز سیٹی کی سنسناہٹ لگی۔

حسین اور عمار اس زردی میں جو پتوں اور ہوا کے ساتھ پرّاں تھی۔ شہپروں کو اڑتا ہوا دیکھتے رہے۔

"یا شیخ۔ کس چڑیا کا خون۔" اس نے سلاخوں کے ساتھ اپنا چہرہ لگا دیا تھا۔ یوں کہ وہ اس کے چہرے کو تین حصوں میں تقسیم کر رہی تھیں بالکل چسپاں۔

"کسی پیاسے کی پیاس چڑیا کے خون سے نہیں بجھ سکتی۔" حسین نے مسکرا کر کہا اور مراقبہ میں چلا گیا۔

کوچے میں دوسری طرف قدموں کی چاپ پتھریلے فرش پر گونجی۔ کوئی گنگناتا ہوا گزر رہا تھا۔

وہ جو پیہم سفر کرنے والا
زمین کی مسافتیں طے کرنے والا ہے
جنگلوں جنگلوں پھرنے سے اس کے بال
پریشاں اور گرآلود ہیں!

عمار نے اس کے گزرنے کا انتظار کیا۔ جب وہ آواز دور خاموشی میں گم ہو گئی اور چاپ کو پتھر نگل چکے تو وہ واپس پلٹا یہ سوچتا ہوا کہ عجیب علاج ہے؟ خون سے بجھنے والی اس پیاس کے لیے آخر کونسا خون ہو۔ شیخ زندانی کا اشارہ کس طرف تھا۔ یہ اتنا پار سا اور بے ضرر انسان تھا کہ سارے فسانے جو لوگوں نے اس کے گرد بُن لیے تھے کذب و اختراع سے زیادہ نہ تھے۔ یہ کہ وہ اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہے۔ خدا کہتا ہے انا الحق! وہ دیوانہ بھی نہیں لگتا اور دیوانہ بھی ہے! بھلا کسی بیماری کا علاج خون آشامی ہو سکتا ہے۔ حامد بن عباس کے لیے اس نے چلتے ہوئے یاد کرنا شروع کیا۔ ذہن پر زور دے کر۔ اس کے آقا کی عادات نہایت نفیس تھیں۔ بہترین کی بھی معراج۔ وہ قصرِ خانہ کا نگہبان تھا اور جانتا تھا کہ ہر عام شے سے انہیں رغبت ہی نہ ہوتی تھی۔ آرائش و زیبائش میں یہ گھر بغداد کے بہترین گھروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ باغیچے اور پودے اور نظارے 'ترتیب'

سب انوکھی۔ حیران کن۔

کنیزیں اور ان کے لباس اور اس کی تراش خراش سب بے مثال۔

اور سب سے لاجواب تو خاتون اغول تھی۔ اغول کو جہاں سے گزرے زمانے گزر گئے تھے۔ مگر حامد کے دل نے کسی کو اتنا قریب قبول نہیں کیا تھا۔ دل سے گزرنے ہی نہیں دیا تھا۔ کسی میں وہ تمکین ہی نہ تھی۔ نہیں تھی۔ اغول کے بعد سے زندگی گویا تھم کر رک رک کر چلتی تھی بلکہ چل ہی نہیں رہی تھی۔ عمار کو اس کا خریدا جانا اور نکاح کے لیے منتخب کیا جانا اب بھی یاد تھا۔

موسم کا خوشگوار ترین دن تھا جب خاتون اغول کو تیار رہنے کا کہلوایا گیا تھا۔ محلّہ عشابیہ کی طرف سے ہوا ماتم کی آوازیں لا رہی تھی۔ پتہ نہیں لوگ کیوں رو رہے تھے۔ کوئی نصرانی فوت ہو گیا تھا۔ باجے بجائے جا رہے تھے اور بین بھی ہو رہا تھا۔ اغول کانپ رہی تھی اور اپنے سفید پاؤں تک کے لبادے میں اور بھی دراز قد معلوم ہوتی تھی جیسے سروِ میجہ ہو۔ اس کے سنہری بالوں میں مانگ کے قریب ایک بڑا سا ہیرا چمک پکڑ کر ماتھے پر آفتاب کی طرح روشنی اور نور تھا۔ وہ آنکھیں جھپکائے بنا جانے کہاں دیکھتی ہوئی لگتی تھی۔ کسی اور ہی سرزمین کی طرف۔ اور وہ صحراؤں اور پہاڑوں سے لائی گئی مخلوق تھی جو بغداد کی سرزمین پر گویا ہوا سے اتر کر وارد ہوئی تھی۔ چہرے پر پڑے باریک نقاب میں سے وہ سپاٹ چہرہ جھلکتا تھا جس پر نہ غم تھا اور نہ خوشی۔ باقی کنیزیں اس کی خوش بختی پر حیران تھیں مگر وہ ایسی عروسِ نو بہار تھی جسے نہ اپنے عروس ہونے پر آگاہی تھی اور نہ ہی مکمل ہونے پر۔

عمار کو پھر وہ دعوت یاد آئی جس میں نفیس ترین گوشت' بہترین نبیذ اور عمدہ روٹیاں باافراط تھیں اور ہر مہمان کی تواضع ایسے کی گئی تھی گویا وہ اکیلا ہی مدعو تھا۔ رقص کی محفل حامد کے جانے کے بعد دیر تک جمی رہی اور صبح تک جاری رہی۔ یہ عمائدین سلطنت میں سے ایسی کبھی نہ بھلائی جانے والی محفل تھی جس کو لوگوں نے مدتوں یاد رکھا کیونکہ بعد میں عمائدین دربار کے لیے یہ حکم تھا کہ وہ زرتشتی اور یہودی عورتوں سے شادیاں نہ کریں اور کنیزوں سے بھی نہیں کہ وہ تو خرید و فروخت کی شے تھیں مگر رگوں میں خلط ملط خون سے کئی اور فتنے اٹھتے تھے۔ خلیفہ کی بات جدا تھی کہ وہ اپنے

طاقتور سرخ خون کی وجہ سے حاکم بن سکتے تھے اور ترکی کنیزوں نے قصرِ خلافت میں ہمیشہ حکم چلایا تھا۔ کم سن عباسی خلفاء اپنی ماؤں کے سائے میں تخت پر جلوہ افروز ہوتے تھے اور اس سے پہلے وہ ترک سرداروں کے بچوں کے ساتھ کھیلتے' دھکیلے جاتے اور پٹتے تھے۔

اس نے اس ہجومِ بے پناہ کو جو یورش کر کے اس کے گرد جمع ہو رہا تھا' پیشانی پر ہاتھ پھیر کر جھٹکا اور سوچا۔ آقا کے لیے اس مردِ زنداں نے جو دوا کہی ہے وہ سرخ شراب ہونی چاہیے۔ خون سے کبھی کسی کا علاج کیا گیا ہے۔ یقیناً سرخ شراب ہی ٹھیک ہے۔ مگر اس شدت اور قہر کی پیاس آخر کیوں؟

شکست اور ناکامی کا علاج خون کیوں؟

وہ لرز گیا۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ ہاں مئے ارغوانی کو اگر نہایت ٹھنڈا کیا جائے بالکل یخ بستہ تو وہ خون کی رنگ کی مئے ناب تسکین دے سکے گی۔ اس کے جی کے اندر کوئی کہہ رہا تھا۔ "مردِ اسیر کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ یہ توجیہ غلط ہے۔ یہ مطلب فضول ہے۔ یہ بات کذب ہے۔" —— شاید وہ خود کلامی میں اس حد تک منہمک اور اپنے ساتھ مباحثے میں الجھا ہوا تھا کہ اسے اپنی بات کا جواب اپنے عقب میں آتی ہوئی اندھیرے ہیولے کی سی ایک صورت نے دیا۔

"خون اور شراب دو الگ چیزیں ہیں اور جو پیاس خون سے بجھے گی وہ خون ہی سے مٹے گی۔ بشرطیکہ یہ خون' خونِ ناحق ہو کہ اس میں صدیوں تک پکارنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔"

عمار کے پاؤں اس گلیارے کے وسط میں جم گئے۔

پھر وہ سایہ قریب آیا—— اور قریب—— عمار کو اپنا سانس گھٹتا ہوا لگا۔ اس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔

"ڈرنے کی بات نہیں دوست۔ خونِ ناحق میں موت کا زمزمہ ہوتا ہے۔ فنا کا نشہ ہوتا ہے۔ جاودانی زندگی کی طرف ایک ہی جست میں پہنچ جانے کی صلاحیت ہوتی ہے اور اس لیے وہی خون عود کر آنے والی پیاس کو' تشنگی کو تسکین دے سکتا ہے۔"

"کون ہو تم جو ایسی ناروا کہانیاں سناتے ہو۔" عمار کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"کوئی بھی۔ کوئی بھی۔ مگر تمہاری پریشانی اس تفصیل کی منتظر تھی۔ جاؤ اور

حامد بن عباس سے کہہ دو کہ پیاس کسی چڑیا کے خون سے نہیں' خونِ ناحق سے بجھے گی۔ اس پر اس شدت کی تشنگی کے دورے پڑتے رہیں گے تا آنکہ وہ کسی بے گناہ کے خون کو مباح سمجھے۔"

"یہ بادشاہوں اور شہنشاہوں کا کھیل ہے۔" عمار اب ذرا سنبھل گیا تھا۔

"حامد بن عباس اس کھیل میں پٹے ہوئے مہرے کی طرح ہے وہ موت کی بازی کو کیا سمجھے گا۔" سائے نے پھر کہا۔

"کیا مغرب کے محاذ پر ناکام ہونے کا مطلب پِٹ جانا ہے۔ فتح و شکست تو جنگ میں کسی نہ کسی کا مقدر ہوا کرتی ہے۔" عمار گویا دیوار کے ساتھ جم کر کھڑا تھا اور پشت کی طرف سے محفوظ محسوس کرتے ہوئے دشمن کے وار لوٹا رہا تھا۔

"وہ ناکامی کا مطلب نہیں سمجھتا۔ وہ شکست کیا جانے۔ شکست۔ شکست ہر کسی کے مقدر میں کہاں۔" کہنے والے نے گویا نہایت مسرت سے اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ شکست کے ذائقے کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

عمار اب عجیب سحر زدہ تھا۔ سنتا رہا۔

"مشیت کو سمجھتے ہو۔" سوال کیا گیا۔

"نہیں تم مشیت کو کیا سمجھو گے۔ یوں سمجھو گویا لکھنے والے نے لکھ دیا۔ اپنے قلم سے اس لوح پر رقم کر دیا۔ اب اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ کوئی مٹا سکتا ہے بھلا۔ وہ جو میثاقِ ازل کی رُو سے مقرر ہوا۔ اس پر خوش ہونا' اسے برداشت کرنا' اس کے لیے تیار رہنا ـــــ مگر نہیں۔ میں تم پر اپنا مطلب واضح نہیں کر سکتا۔ اس لیے جاؤ اور اپنے آقا سے کہہ دو کہ اس کی پیاس کا علاج خونِ ناحق ہے۔"

میرے آقا ہی کو کیوں منتخب کیا گیا ہے۔ عمار نے یک بیک پوچھا۔

"یہی تو اسرار ہے۔ جو جس چیز کے قابل ہو۔"

"جو جس چیز کے قابل ہو۔" عمار نے نہایت بے بسی سے کہا۔ "جب مشیت ہے اور ازل سے طے ہے اور آدمی کا اختیار نہیں ہے تو پھر؟" بہت دیر خاموش رہ کر اس نے کہا۔ "تو پھر سب وہی ہے جو چاہا گیا۔ اور انسان کہاں سے اس سارے اصول میں در آیا۔"

لمبی خاموشی کا ایک وقفہ تھا۔

''مگر تم کون ہو۔'' عمار نے سوال کیا۔

''کوئی بھی۔ کوئی بھی۔'' نہایت آہستہ سے جواب دیا گیا۔

گلیارے میں جھک کر تقریباً راستے پر چھائے ہوئے درخت کی شاخوں میں پھڑ پھڑاہٹ ہوئی۔ پرندے نے خوابِ پریشاں سے ڈر کر چیخنا شروع کیا۔ اور سیٹی کی سی یہ صدا فضائے بسیط میں ایک نقارے کی طرح گونجی ــــ پھر وہ چیخ پھیلی اور اس کی گہرائی زمزمے کی سی ہر شے پر جاری و ساری ہو گئی جیسے فنا کا طبل بج رہا ہو۔ بولنے لگی اور اس کی گویائی میں ہر ذرہ شامل ہو گیا۔ ہوتا چلا گیا نشّے کی سی صورت مدہوشی لانے والا موت کا زمزمہ ــــ فنا ــــ فنا ــــ فنا!

''قاضی ابو عمر نے وضو کا پانی مانگا اور نمازِ تہجد کے لیے کھڑے ہو رہے تھے کہ ایک عجیب سنسناہٹ سی محسوس کی جیسے تیز شوریدہ لہریں طوفان کی رفتار سے بڑھتی چلی آتی ہوں۔ ایک ایسی آواز جیسے صُور پھونکا جا رہا ہو ــــ ہر شے فنا ہو رہی ہو ــــ سمندر اور آسمان اور زمین اور کائنات اور ہر سیارہ اور ستارہ ٹوٹ کر جل کر راکھ میں تبدیل ہو رہا ہو ــــ یہ کیسا نغمہ تھا جو انہیں اپنے اندر اپنے باہر سنائی دے رہا تھا۔

ایک ہی صدا لمبی تان کی طرح بہتی ہوئی ان کو لپیٹ رہی تھی۔

انہوں نے کنیز کو پکارنا چاہا۔ نماز کا ایک لفظ بھی انہیں یاد نہیں آ رہا تھا۔

ایک گنگناہٹ سی جیسے تحت الثریٰ میں کوئی ہولے ہولے کچھ کہہ رہا ہو۔ بہت دور نیچے زمین کی تہوں کے اندر سے۔

یہ کیسا زمزمہ تھا ــــ زمزمۂ موت!

فنا ــــ فنا ــــ فنا ــــ

ایک نامختتم سُر تھا کہ پھیلتا چلا گیا۔ پھر چاروں طرف سکون بھری ہنسی پھیل گئی۔

جانے کون نیستی اور ہستی کا مذاق اڑا رہا تھا۔

جانے کون!

رات کا پچھلا پہر زمزمۂ موت سے معمور تھا۔

موت زندگی کی تلاش میں رہتی ہے کہ اسے جاوداں بنا سکے۔

زندگی موت کی گھات میں ہوتی ہے کہ اسے فنا کا مزہ چکھا سکے۔ اسے معدوم کردے اور آدمی زندگی اور موت دونوں کے لیے سرگرداں رہتا ہے کہ ان سے آزادی حاصل کر کے اسے پا سکے جو مقصود بالذّات ہے۔ جو آئینوں میں جوہر ہے اور جوہر کا جوہر ہے۔ جو ماورأ ہے اور ماورا کا ماورا ہے۔ جانے آدمی موہوم تلاش میں کیوں دیوانہ ہوتا ہے۔ اپنی بے بضاعتی پر نازاں رہتا ہے۔

زنداں میں حسین بن منصور نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ مشیت سے راندۂ درگاہ قرار دیا گیا وہ اور اس کے انجام کے لیے اس کی اعانت کر رہا تھا۔

سراپردۂ اسرار سے پرے تک جس کی نگاہ رازِ دروں تک رسائی رکھتی تھی۔ وہ جھٹکا گیا تھا ـــــ !

زمین' آسمانوں اور کائنات میں آوارہ قرار دیا گیا وہ دھکیلا گیا تھا۔ نکالا گیا تھا۔ اپنے عشق میں بے باک اور اپنے مسلک پر قائم وہ۔

اس کے ساتھ وہ بھی تو یاد کیا جاتا تھا۔ اس کا ناز پسندیدہ نہیں تھا مگر وہ اپنے ناز پر نازاں تھا۔ دوسرا کوئی کہاں تھا؟

یہ عالم تو وہم و طلسم و مجاز تھا۔

آتشِ شوق سے پگھلتا ہوا اس کا یہ سراپا لوگوں میں سیال آتش۔ اگر وہ آہ کرے تو اس کی گرمی ہر طرف آتش فشاں بن جائے۔ اپنے سوال کے ساتھ اپنی منزلِ شوق کی طرح وہ نظر جھکائے منتظر تھا۔

فانی بھی اور باقی بھی!

اسے زندان کے باہر پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی جیسے رات کا پرندہ

ویرانوں کی تلاش میں ہو۔ پھر گلیارے پر جھکے درخت کی شاخوں میں نہایت مضطرب ہو کر سوتے سے چونک کر کسی چڑیا نے شور مچایا۔

قیامت قائم ہو گئی ـــــ ابد آن پہنچا ہے۔

فنا ـــــ فنا ـــــ فنا

حسین نے دیکھا سلاخوں میں سے جو آسمان دکھائی دیتا تھا وہ زرد اور سفید تھا جیسے بے ستونوں کے دھوئاں دھوئاں کسی انجانی ہوا نے اسے اڑایا ہو۔

وہ ہنسا۔ بھلا اب عرشیاں کہاں جائیں گے۔ ساتوں آسماں نظر کے سامنے ہوں گے اور وہ اپنی بارگاہوں کے باہر ہمیشہ منتظر رکھنے والا اب تو سامنے ہو گا۔ وہ اتنی بے تاب نگاہوں اور وفورِ شوق سے دیکھا جائے گا تو اسے کیسا لگے گا۔ تپاں نگاہیں بے حجاب دیکھنے کی آرزومند پردوں سے پرے کی خواہش لیے ہوئے بالآخر نغمۂ محبت اور زمزمۂ موت اور اشواقِ زندگی کا اسیر ہو گا۔ انا الحق۔ انا الحق۔

قاضی ابو عمر نے دعائے کرب بار بار پڑھی اور پانی پر پھونک کر حامد بن عباس کے لیے ایک چینی کے پیالے میں رکھ لیا۔ انہوں نے وہ تمام ملفوظات اور دفتر کا مطالعہ کر لیا تھا اور الزامات کی لمبی فہرست تیار کر لی تھی۔ آدمی کیا شے ہے کہ وہ خدائی کا دعویٰ کرے۔ غیب دان ہو۔ مہدیٔ موعود ہو۔ موسموں پر تصرف رکھتا ہو۔ دلوں کے حال جان لیتا ہو۔ تقدیریں بدل دینے پر قادر ہو۔ اس کی پرستش کی جاتی ہو۔ اصل میں عام آدمی، معمولی آدمی اندھیرے میں بھٹکتا، ملتجی، مایوس ہی تو اصل میں آدمی ہے۔ وہ جو اپنے خوف پر قادر ہو گیا۔ جو قانع ہو گیا۔ جو راضی برضائے الٰہی ہو گیا وہ ان سارے قید و بند سے آزاد ہو گیا۔ وہ زندگی کے دل میں کس طرح سے اقامت گزیں ہو سکتا!

حسین ابن منصور کو وہ یعنی قاضی ابو عمر سمجھ نہیں سکے تھے۔

فردِ جرم تیار کر لینے کے باوجود وہ سرخروئی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ شریعت و طریقت دونوں سے بری الذمہ۔ وہ تو ان سارے حواشی کی روشنی میں جو انہوں نے ترتیب دیئے تھے اس زندانی کو معتوب کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے وہ حامد بن عباس

سے بھی بحمد للہ آنکھ ملا کر بات کر سکیں اور دین میں جو رخنہ اندازیاں ان کے سامنے آئی ہیں ان کے لئے بھی باز پُرس ہو تو ان پر زیادتی یا طرفداری کا کوئی الزام نہ آئے ـــــ اور اسی لیے انہوں نے ایک مجلسِ مباحثہ وہ مناظرہ بپا کرنے کا اہتمام کیا جس میں مدِ مقابل جو ہو سو ہو مگر جواب دینے کے لئے بہر حال ایک ہی ہو گا ـــــ حسین بن منصور حلاج۔

از پئے جاناں جاں ہم رفت
ایں ہم رفت و آں ہم رفت
رف۔ رف۔ رفتن دے۔

محلّہ عشابیہ کے ایک گلیارے میں دھنکی کا یہ گیت ان کے کانوں میں یوں پڑ رہا تھا جیسے سارے گیت اور نغمے جمع ہو کر رف۔ رف۔ رفتن کر رہے ہوں۔

حامد بن عباس نے کہا تھا کہ وہ اس مجلسِ مباہلہ میں شریک نہیں ہو گا اور قاضی ابو عمر کو اپنے طور پر فیصلہ کرنا ہو گا کہ کون کیا کہتا ہے۔ کیوں کہتا ہے ـــــ اور عروس البلاد بغداد کے گلی کوچوں میں یہ کلمۂ کفر جو رواج پا گیا ہے تو اس کا ذمہ دار جو بھی ہو بلا تخصیص وہ قابلِ گردن زدنی ہو گا کہ اسلام میں رخنہ اندازیاں نہ ہوں۔ انا الحق کا نعرۂ مستانہ جو دیوانے اور فرزانے اپنے اپنے طور پر اپنے مسائل کے لئے یا مذاقاً استعمال کرتے تھے۔ ان دنوں بغداد کے گلی کوچوں میں فقیروں اور بے نواؤں کے درمیان لوگ یہ لفظ بطورِ خاص کہتے تھے۔ بازاروں میں پھرنے والے آوارہ لونڈے اور مغنی اور گداگر سبھی اس کو تکیہ کلام بنائے ہوئے تھے ـــــ انا الحق ـــــ انا الحق! ـــــ

قاضی ابو عمر نے مدرسۂ نظامیہ کے کسی فقیہ و استاد کو اس مباحثے میں شریک ہونے کی دعوت نہیں دی۔ وہ جانتے تھے کہ عقائد اور مخفی مجالس اور نہایت اسرار کی باتوں میں وہ لوگ اتنی دور نکل گئے تھے کہ گو ان پر کوئی گرفت نہیں ہو سکتی تھی مگر انہیں عام مجالس میں آنے کی زحمت دے کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ مدرسے کی دنیا ایک الگ دنیا تھی کہ سختی سے شریعت کے پابند ہونے کے باوجود آزاد تھے اور ان پر کوئی گرفت نہ تھی۔ یہ نظامِ تعلیم اس آزادیٔ رائے کی دلیل تھا جو ہر زمانے میں سوچنے والوں اور تصنیف و تالیف کرنے والوں کے حصے میں آیا تھا۔ یہ لوگ مورخ نہیں تھے۔ ادیب نہیں تھے۔ تاریخ دان نہ تھے۔ فلسفی نہ تھے اور ان کے باوجود یہودی اور نصرانی مدرسوں

کی طرح ان پر کوئی قید نہ تھی۔ منصور کے بیٹے اور محمی کے پوتے کے ایمان کا میزان‘ اس کی شوریدہ سری کا جائزہ یہ لوگ نہیں لے سکتے تھے۔ جب اسباب و شواہد سب جمع تھے تو کوئی بھی آدمی جو روحِ اسلام سے آشنا ہو اس مجلس میں بیٹھ سکتا اور شریک ہو سکتا تھا۔ ہاں حکم لگانے کا اختیار تو سوائے خلیفہ مقتدر باللہ کے کسی کو نہیں ہو سکتا جو ان دنوں روم سے آنے والی ایک سفارت کی وجہ سے سخت مصروف تھا کیونکہ سفراء تقریباً چھ ماہ سے باریابی کے منتظر تھے اور محلات‘ قصر دجلہ پر ختم ہونے والی شاہراہیں اور مختلف دفاتر درست کئے جا رہے تھے کہ جس شوکت و جلالت کے لئے بغداد اقصائے عالم میں ایک خاص شہرت رکھتا تھا اس کا کوئی تو مظاہرہ ہو سکے۔

اُمِ جعفر (مقتدر کی ماں) کی پریشانی دیدنی تھی جو اپنی ساری جلالت مآبی کے باوجود چاہتی تھی کہ حسین ابن منصور کسی نہ کسی طور حامد بن عباس کے زندان سے نکال لیا جائے اور پھر نصر حاجب کے پاس واپس کیا جائے۔ یہ نہایت معمولی بات تھی جس کے لئے وہ وزیرِ مملکت سے ٹکرانا اور اس کا زیر بارِ احسان نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ جو چاہتی تھی عام طور پر ہو جایا کرتا تھا مگر اب۔

اب خدا جانے کیا بات تھی کہ وہ حامد سے کہنا نہیں چاہتی تھی۔

قاضی ابو عمر یہ سب جانتے تھے اور صرف شغب کو شکست دینے اور بے بس کرنے کے لئے انہوں نے اس کے معاملات میں اور زیادہ سختی برتنا شروع کر دی تھی۔ وہ اکثر حسین کو اپنے سامنے بلاتے اور اس سے گفتگو کرتے۔ وہ پابجولاں زندان سے لایا جاتا اور کبھی کبھار بغیر کسی پُرسشِ احوال کے لوٹایا جاتا رہا تھا۔ لوگ ان کی عدالت میں بھی چپکے چپکے اس سے دعا کے طالب ہوتے تھے۔ ان کے کاتب اور وہ شرطے جو اسے زندان سے لاتے تھے سب اس کے اسیر لگتے تھے۔ صرف وہ اکیلا تنہا الگ ہر قید سے آزاد دکھائی دیتا تھا۔ وہ اتنا بے نیاز کیوں تھا اس نے قید و بند کی شکایت کیوں نہ کی تھی۔

جب تین سو قیدی زندان سے فرار ہو گئے تھے تو انہوں نے اسے بلایا تھا:

''یہ قیدی تم نے آزاد کئے ہیں۔ وہ جو پکڑ کر واپس لائے گئے ہیں کہتے ہیں کہ انہیں تم نے اشارہ کیا تھا اور دیواریں اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھیں۔''

''قاضی قضا! بھلا میں اس پر کیسے قادر ہو سکتا ہوں۔''

"تو پھر وہ جو کہتے ہیں اس کا کیا جواب ہے۔" پوچھا گیا۔

"میں جو اسیر ہوں بھلا کسی کو رہا کرنے کا کیا اختیار رکھ سکتا ہوں۔" حسین نے کہا۔

پھر پوچھا گیا: "تم شعبدہ باز ہو۔"

"میں کیا ہوں۔ کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو ذرّہ ناچیز بھی نہیں ہوں۔" اس نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

"مگر زندانیوں نے جو کہا ہے تم پر جو الزام ہے؟"

"الزامات اس لئے لگائے جاتے ہیں کہ ان کے جواب نہیں دیئے جا سکتے۔" نہایت نرمی سے کہا گیا۔

"تم نے حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر ان کو آزاد کر دیا۔" سختی سے پوچھا گیا۔

"جس حکومت میں میرا یقین ہے اسے کون ہاتھ میں لے سکتا ہے۔"

"تم گستاخ اور بے ادب ہو۔ جھوٹے اور غلط آدمی ہو۔ شعبدہ باز اور جادوگر ہو" ایک ایک لفظ کو الگ الگ کہا گیا تھا۔

حسین ابن منصور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بہت دیر کے بعد جب قاضی ابو عمر اپنی عدالت برخواست کر رہے تھے انہوں نے اسے واپس بندی خانے میں لے جائے جانے اور قیدِ تنہائی میں ڈالے جانے کی ہدایت کی۔ دل ہی دل میں وہ الجھ رہے تھے — یہ عجیب قیدی ہے جو قیدی نہیں لگتا۔ جو عدالت میں ہو تو روشنی بڑھ جاتی ہے اور لوگوں کو یارائے گویائی نہیں رہتا۔ زبان گنگ ہونے لگتی ہے۔

ان خطوط سے ثابت ہوتا تھا لوگ اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس میں بے پناہ قوتیں تھیں مگر پھر بھی وہ نہایت صبر و سکون سے تقریباً آٹھ سالوں سے اسیر تھا اور اپنی رہائی کے لئے کوشاں نہیں تھا۔ اس نے کسی سے کبھی درخواست نہیں کی کہ اس کی بات خلیفہ تک پہنچائی جائے۔ نبیوں کے سے حوصلے سے وہ بے پناہ برداشت سے یہ سب اٹھا رہا تھا۔ وہ کسی اشارے کا منتظر تھا۔

انہیں سورۂ یوسف کے بعض مطالب یاد آئے۔ عجیب بات تھی۔

وہ معتوب تھا تو سہی مگر کس پاداش میں وہ پکڑا گیا تھا۔

قاضی ابو عمر نے فقہ کی کوئی نہایت ادق کتاب کھول کر اپنے سامنے رکھی اور خیالات کے دھارے میں بہنے لگے کیونکہ جو فہرست انہوں نے مرتب کی تھی وہ بس مفروضے تھے کہ دونوں طرف ثابت ہو سکتے تھے۔ انہوں نے حامد کو کسی قسم کی اطلاع دینے سے پہلے خود زندان میں اس سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

اندھیری رات میں گلیاں اور کوچے روشن تھے۔ چہل پہل سے بازار بھرے تھے۔ آوازوں کا طلسم سا بنتی ہوئی فضا ایک ریشمی ردا تھی کہ مختلف الوان سے تیار کی گئی قوس و قزح کی سی لگتی تھی۔ دجلہ پر کشتیوں کا بنا پُل' چپوؤں کی چپ چپ' سواریوں کا شور' اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کا بجنا' مغنیوں کی آتش نوائی' دور کسی نصرانی عبادت گاہ میں کسی ہنگامی صورت کے لئے بڑے سے گھنٹے کی بلاتی ہوئے صدا' مشرقی اور مغربی کنارے پر بنے قصر' روشنیوں کے دھارے پر خواب ناک سے قہقہوں اور مے نوشی کی رنگین ساعتوں کا عکس بنے ہوئے۔ مسجدوں میں درود و سلام کی نغمگی عرش کی طرف مائل پرواز' اور شہر کے سارے دروازے جو دجلہ کے پُلوں پر کھلتے تھے ان پر آرائش کرتے ہوئے ہنستے بولتے لوگ' رقص کی محفلوں کی چھن چھناہٹ' پُر سوز لے میں شہادتِ حسین کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ذاکر' آہ و بکا نالہ و شیون سے معمور قریے ــــــ یہ کیا دلربا شہر تھا جس کی سرائیں قافلوں کی رونقوں کی جگہیں تھیں اور اقصائے عالم سے یہ لوگ یہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ ترک سرداروں کے گھیرے میں کوئی شاندار جلوس کسی طرف رواں تھا اور وہ کوزہ گروں کے محلے سے گزر رہا تھا جہاں کہیں کہیں آگ کے شعلے نئے کوزوں کے پکنے کا پتہ دیتے تھے۔ اس کے باوجود کہ ہر کوزے کے مقدر میں شکست ہے اسے کسی قابل بنانے کے لئے آگ میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کسی قابل بننے سے پہلے اَن گنت مراحل ہوتے ہیں اور کسی ایک مرحلے میں سے نہ گزرے بناء کچھ بھی تو نہیں بنا جا سکتا۔ مقدر نے نہایت سخت قدغن لگا دیا ہر شے پر۔ ناپختگی سے پختگی تک مراحل ہی مراحل تھے ــــــ عجیب قانونِ قدرت تھا۔

زندان کی سلاخوں کے باہر کھڑے قاضی ابو عمر نے حسین کو پکارا:

"ابنِ منصور!"

حسین کی ہنسی اسے سنائی دی۔ پھر اس کے دانت چمکے جیسے بجلی کا کوندا۔ اس نے دیکھا تو اس کی بے پناہ آنکھیں اور نگاہ آنے والے سے ٹکرائی:۔۔۔ "قاضی ابو عمر! یہ پاداشِ عمل ہے۔۔۔ !"

وہ حیرت زدہ تھا۔ تھوڑا خوف زدہ سا۔ سلاخوں کے پاس سے دور ہٹ گیا۔ دیوانوں سے احتراز ہی مناسب ہے فاصلہ ضروری ہے۔

قاضی ابو عمر نے پھر کہا: "ابنِ منصور۔"

"اس طویل فہرست کا ایک ایک حرف، درست ہے اور میرا خون مباح ہے۔ آپ شریعت کے مطابق کام کریں۔" حسین نے سلاخوں کے قریب آ کر کہا۔

"کیا تمہیں اپنی بریت میں کچھ نہیں کہنا۔" پوچھا گیا۔

"نہیں۔ کچھ نہیں۔ میں صرف منتظر ہوں۔"

"منتظر۔ رہائی کے طالب۔ زندان سے باہر کھلی فضا میں آنے کے۔ اپنے مریدوں اور پیچھے چلنے والوں' پرستش کرنے والوں' خدا اور مہدی ماننے والوں کے درمیان لوٹ جانے کے۔" سانس لئے بنا سوال کیا گیا۔

حسین سلاخوں کے قریب آیا۔ بہت دیر تک وہ قاضی ابو عمر کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بہت آہستہ سے اس نے کہا:

"نہیں۔ میں صرف منتظر ہوں۔"

"کس شے کے۔ کس واقعے کے۔ کس روشنی کے۔" قاضی نے گھبرا کر پوچھا۔

"حامد کی پیاس بجھانے کا۔" حسین بن منصور حلاج نے متانت سے جواب دیا۔

"نہیں۔ بخدا نہیں۔ اس کے باوجود کہ سینکڑوں بے گناہوں کا خون انصاف کے تقاضوں کے لئے بہایا جاتا ہے مگر تمہارے خون کی حفاظت اب مجھ پر فرض ہو گئی ہے۔ کیا تم بغداد کے قاضیوں اور فقیہوں سے اتنے ناامید ہو۔"

"نہیں۔ میں نہایت پُرامید ہوں۔ آخر "اناالحق" کی سزا کچھ تو ہو۔"

"یہ سب تم دیوانگی کے عالم میں کہتے ہو اور یہ نعرۂ مستانہ تمہارے خون کو مجھ پر مباح نہیں قرار دیتا۔" قاضی ابو عمر نے سلاخیں چھوڑ دیں تھیں اور مقدمے میں شہادت دینے' سچ کہنے اور سچ کے سوا کچھ نہ کہنے والے کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی سیاہ

ڈاڑھی میں سفید بال روشنی کی کرنوں کی طرح گلیارے میں عقب سے آنے والی روشنی کی وجہ سے چمک رہے تھے۔

وہ جب اس کی تشہیر کر چکے تو انہوں نے خچروں کو سائے میں باندھا اور حامد بن عباس کو احوال سنانے کے لئے بارگاہوں میں بار دیئے گئے۔

"وہ جو اپنے آپ کو عالمِ ربانی اور صوفی کہتا تھا اب اس کا جی کیسا ہے۔"

ہنس کر انہوں نے جواب دیا: "بغداد کے گلی کوچوں میں کمسن بچوں اور آوارہ جوانوں بیکار شُہدوں، کتّوں اور فقیروں کا ایک لشکر تھا جو اس پر پتھراؤ کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے اور وہ اپنے آپ کو نبی اور مہدی اور خدا سمجھنے والا تن کر یوں بیٹھا تھا اور اتنا خوش تھا گویا دو جہان کی دولت اسے مل گئی تھی۔"

"تعجب ہے۔" پھر طویل وقفے کے بعد حامد نے کہا۔ "دیوانہ لگتا تو نہیں مگر دیوانہ ہے — زندیق۔"

"کچھ مدرسوں سے نکالے ہوئے لڑکے اس کے پاس اپنے مرے ہوئے جانور لے کر آئے کہ وہ انہیں زندہ کر دے۔ انہوں نے وہ تقریباً اس کے سر پر دے مارے۔ اس کی جھولی میں ڈال دیئے۔"

"پھر!" حامد نے نہایت مسرور ہو کر پوچھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو مل رہا تھا جیسے بہت مزے میں ہو۔

"اس نے انہیں اپنے سامنے رکھ لیا اور یوں دیکھتا رہا جیسے ابھی پھونک دے گا تو وہ زندہ ہو جائیں گے۔ مگر بہت دیر تک وہ انہیں یونہی دیکھتا رہا پھر اٹھا کر انہیں لوٹا دیئے۔"

"پھر" پوچھا گیا۔

بھیڑ مایوس ہوئی تو انہوں نے اسے گالیاں دیں۔ کاذب کہا اور اس کے گرد جمع ہو کر ناچتے اور شور مچاتے رہے۔ وہ اپنی آنکھیں میچ میچا تا رہا اور انہیں دیکھ کر ہنستا رہا جیسے بہت مزے میں ہو۔

"اچھا" حامد نے نہایت مایوسی سے کہا۔ "جب اس پر سنگباری کی گئی تو اس نے احتجاج نہیں کیا۔"

"بالکل نہیں۔ وہ پتھروں کو یوں دبوچ لیتا جیسے بچوں کے کھیل میں شریک ہو۔ پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور اس نے تالیاں بجائیں۔ یا سیّدی! ہم نے اس سے عمدہ مکمل دیوانہ کبھی نہیں دیکھا۔ بغداد کی رونقیں بڑھ گئی ہیں۔ قرنوں بعد ایسا تماشا ہاتھ آیا ہے۔ اس کے ماتھے پر ایک شکن تک نہ تھی۔ اسے کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ ژولیدہ مُو وہ بس محو تھا یہاں تک کہ اذان کی آوازیں مسجدوں سے بلند ہوئیں اور پھیلیں۔ اس نے نیت باندھی اور نماز پڑھی۔"

حامد اپنی نشست گاہ میں' قصر کے سب سے شاندار کمرے میں ایک زخمی جانور کی طرح گھوم رہا تھا۔

"کیا اسے اذیت نہیں ہوئی۔ وہ خفا نہیں ہوا۔" اس نے استفسار کیا۔

"یا سیّدی! جو لوگ اس دیوانگی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ راہِ خدا میں تکلیف اٹھا رہے ہیں ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ بس راضی برضا ہو جاتے ہیں اور یہ دیوانہ تو کچھ زیادہ ہی راضی برضا ہے۔" ایک شرطے نے کہا۔

"خاموش رہو اور جتنی بات پوچھی جائے اس کا جواب دو۔" عمار نے حامد کی طبیعت کو بگڑتے محسوس کر لیا تھا۔

شرطے نے جو فخر سے سر اونچا کئے اور سینہ تانے کھڑا تھا اپنا قد اندر کھینچ لیا اور ہاتھ باندھ کر مؤدب کھڑا ہو گیا اور اس نے گردن جھکا لی۔

حامد بن عباس نے کہا:

"قاضی ابوالحسین سے کہو صبح ان سب الزامات کی فہرست مرتب کرے اور عدالت میں حسین بن منصور کا مقدمہ پیش ہو۔"

عمار سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ حامد کی طبیعت بہت بدمزہ تھی۔ اس کا ہم سبق اور ساتھی اور زندگی کی دوڑ میں اس سے بہت پیچھے رہ جانے والا کہاں سے کہاں تک جا پہنچا تھا اور وہ اپنے طوفانوں کا اسیر' اپنے جذبات کا قیدی' اپنے طالع کا منتظر' اپنی شکست سے ہراساں' اپنے کچھ ہونے پر نازاں مگر ٹوٹا ہوا' جس کے اندر نوحوں کی گونج تھی۔ جو خالی

سناٹوں سے ٹکرا کر لوٹ لوٹ آتی تھی۔

اغول اور حسین!

ہاں اغول اور پھر اس کا بیٹا حسین ـــــ زندگی نے اس کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ بھلا اس کا دل کسی بھی کنیز میں کیوں نہیں لگا۔ اسے ایک خلا کا احساس کیوں رہا اور وہ ''روح اللہ'' کہنے والی اسے اس دیوانے کو' زندیق کو' جاہل اور کاذب کو' ناکام اور نامراد کو کیا سمجھتی رہی۔

کوئی منجم کوئی ستارہ شناس کوئی پیش گوئی کرنے والا اُسے کبھی بتا نہ سکا کہ جو ہوا وہ کیوں ہوا۔ کیونکر ہوا۔ وہی اس کا نشانہ کیوں بنا۔ راحت اور آسودگی اس کے لئے کیوں نہ تھی۔ اس کی روح کبھی کبھار تپ کر اس کے اندر پیاس ہی پیاس بن جاتی تھی۔

پھر اس پر شدید پیاس کا دورہ پڑا۔ اور اس کے اندر کسی نے کہا ـــــ جب تک حسین بن منصور زندہ ہے تمہاری پیاس نہیں بجھ سکتی۔ نامراد اور تشنہ تم زندگی کے صحرا میں بھٹکتے رہو گے تا آنکہ موت تمہیں اپنی آغوش میں لے لے۔ تم فنا ہو جاؤ۔ تم نہ رہو۔ حامد بن عباس وزیر مملکت عباسی جاہ و جلال اور شان و شوکت لازوال ہے مگر تم تو لازوال نہیں ہو اور اس سے پہلے کہ وقت تمہاری گرفت سے پھسل جائے تم اپنی تشنگی مٹا لو۔

نقیب نے بآوازِ بلند کہا:

''حسین بن منصور عدالت میں حاضر ہو۔''

لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا جو جگہ کی کمی کی وجہ سے لبِ آب کو چھوتی ہوئی شاہراہ پر امنڈ آیا تھا جیسے لبالب بھرا ہوا جام ہو کہ چھلکتا جائے۔

دونوں طرف شرطے تھے اور بغداد کا شحنہ قاضی کی نشست کے قریب ایک اونچی مسند پر جلوہ افروز تھا۔ پھر پاس کی عدالتوں کے قاضی تھے جو اس خاص الخاص مقدمے کی سماعت میں شریک ہونے کی غرض سے آئے تھے۔ کچھ فقیہ اور ملّا۔ پاس کے محلوں سے اساتذہ' روز عدالتوں کے چکر لگانے والے دلال' کاتب' پھر ہر تماشے کی جگہ پر سب سے پہلے پہنچنے والے اور زندہ ہونے کا ثبوت دینے والے پھکّڑ باز اور آوارہ لوگ۔ قافلۂ کے سالار جو اپنے سامان کے ساتھ محض پاس کی سراؤں میں ٹھہرے

ہوئے تھے اور محض تماشا دیکھنا چاہتے تھے' وکیل اور طالب علم ـــــ ایک رنگ برنگ بھیڑ تھی جو جلوس کی صورت یہاں جمع تھی۔ مجمع اب قاضی کی آواز کا منتظر تھا جو ایک طویل پرچہ ہاتھ میں لئے تھا اور اسے بار بار پڑھ رہا تھا۔ شحنہ بھی خلقت کے اس اژدھام کی وجہ سے ذرا مضطرب تھا۔

''تم پر الزام ہے کہ تم اپنے کو خدا کہتے ہو ''انا الحق'' اور ایک آدمی کے لئے ایسا کہنا کلمۂ کفر ہے۔ کیوں نہ تم کو کافر قرار دیا جائے ـــــ کیا تم اپنی بات کی وضاحت کرو گے۔ اس الزام کا جواب دو۔''

حسین نے اٹھنے کی کوشش کی مگر بیڑیوں کے بوجھ سے وہ اٹھ نہ سکا۔ تیرہ وزنی حلقے اس کے پاؤں میں تھے۔

''نہیں، میں نے بقائمی ہوش و حواس کبھی ایسا نہیں سمجھا نہیں کہا۔ اور احوال کی بات الگ ہے آدمی اپنے سے لے لیا جاتا ہے۔ پھر وہ جوابدہ نہیں۔ بندہ اپنے کو خدا کیونکر کہہ سکتا ہے۔''

عدالت میں سانس تک لینے کی آواز نہیں تھی۔

''تم سوال نہیں کر سکتے صرف جواب دے سکتے ہو۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ اپنی بے پناہ اور اس کے باوجود کثرتِ گریہ سے مچ مچاتی ہوئی آنکھیں بند کر لیں جیسے اگلے سوال کے لئے تیار ہو رہا ہو۔

''تم پر یہ الزام ثابت ہو چکا ہے کہ تم مُردوں کو زندہ کرتے ہو۔ تمہیں اس کے متعلق کیا کہنا ہے۔''

''زندگی اور موت پر تو قادر وہی ہے۔ زندگی سے موت اور موت سے زندگی بنانے والا۔ رات سے دن اور دن سے رات نکالنے والا۔ میں کون ہوں کہ زندہ کروں۔''

''کلامِ پاک کی آیات برحق مگر یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ محمود علی قنائی کو پیش کیا جائے۔''

دو شرطے جس شخص کو بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے سامنے لائے وہ رو رہا تھا جیسے تشنج کی کیفیت سے اس کا وجود ہل رہا ہو۔

عدالت کی فضا بوجھل تھی۔

"یہ تمہارا مرید ہے اور کہتا ہے کہ تم مُردوں کو زندہ کرتے ہو۔ تم نے ایک گدھے کو ٹھوکر ماری تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔"

دبی دبی ہنسی کی آواز عقب سے سنائی دی۔ کس نے زور سے کہا:

"گدھے کو زندہ کرنے والا خدا۔"

لوگ ہنسے اور فضا کا بوجھ ایک دم کم ہو گیا۔ بدل گیا۔ حسین نے بھی سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ اور کہا: "مرید اگر مجھ سے حسنِ ظن رکھیں تو اس میں میرا کیا اختیار ہے۔"

"سوال کرنے سے احتراز کرو۔"

"تم شعبدہ باز' حیلہ گر اور سحر جاننے والے ہو۔ تم نے سرد موسم میں پہاڑ کے کونے پر ہاتھ مار کر سبز ککڑی نکالی اور اپنے ساتھیوں کو دی۔ اس کا مزہ نہایت عمدہ تھا۔ تم نے سفر کے دوران ساتھیوں کی خواہش پر انہیں ہوا میں ہاتھ بڑھا کر بُھنی ہوئی سری اور روٹیاں فراہم کیں۔ تم نے تین سو قیدیوں کو بندی خانے سے آزاد کر دیا۔ کیا یہ صحیح ہے۔"

"یہ سب اتنی تفصیل سے تو آپ جانتے ہیں۔ میں بخدا ان سب الزامات سے بری الذمہ ہوں۔ کوئی انسان ایسی باتوں پر کوئی قدرت نہیں رکھتا جب تک خدا کی مدد اس کے شاملِ حال نہ ہو کیونکہ وہی مالک الملک ہے۔" حسین نے سر جھکا کر کہا۔

"تم نے ایک خط اپنے مرید کو خراسان میں لکھا جس میں تم نے اپنے آپ کو رحمان اور رحیم کہا۔۔۔"

"توبہ توبہ۔" عقب میں سے پھر آواز آئی۔

ابنِ منصور نے سیدھے شحنہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا:

"انسان کیا حقیقت رکھتا ہے کہ کچھ کہے۔ یہ سب طرف تو جلوۂ جاناں ہے جاری و ساری اصل اور پر تو وہی ایک ذات تو ہے۔ آدمی تو محض آلہ ہے اور جب وہ رب ہے تو سب کچھ وہی ہے۔ ہر رنگ میں ہر طور ہر جگہ' ہر طرف۔ نظارہ بھی اور تجلی بھی اور صرف وہی ہے ھُو۔ ھُو۔"

قاضی اور شحنہ اور دوسرے قاضی اور کاتب سب نے سر جھکا لئے تھے گویا اس کی بات پر صاد کر رہے ہوں۔ سمجھ رہے ہوں۔ باہر جمع بھیڑ میں اب اضافہ ہوا جاتا تھا۔

گویا تماشا تھا اور تماشائی ایک پر دوسرا گرے پڑتے تھے۔ تشہیر کے بعد لوگوں نے جان لیا تھا کہ انا الحق کہنے والا دیوانہ ہے مگر دیوانوں کو فرزانوں کی طرح کبھی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا تھا اور مارے حیرت کے وہ سب عدالت کی طرف بھاگے تھے کہ مقدمے کی تفصیلات عمدہ ہوں گی۔ ایک طرف حکومت اور عدالت اور نہایت علماء اور فضلاء کی جماعت اور دوسری طرف ایک دیوانہ جو اکثر چپ رہتا مگر جوش میں ہوتا تو جان کی بے تابی سے التہاب دل سے پُرسوز لے میں جو آتشیں ''انا الحق'' کہتا اور دیوانہ بھی نہیں لگتا تھا۔

''تم پر الزام ہے کہ تم نے بنتِ سمری کو سجدہ ریز ہونے کو کہا تھا۔ بنتِ سمری حاضر ہو۔''

چہرہ نقاب سے چھپائے ایک بند دریچے پیچھے سے وہ آئی۔ غلام سمری کی بیٹی لکڑی کے چبوترے کو پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ لرزتی ہوئی گھبرائی ہوئی۔

غلام سمری بھی اس کے ہمراہ تھا۔

''تم اس شخص کو پہچانتی ہو۔ یہ جو بیڑیوں میں جکڑا کھڑا ہے۔'' سوال کیا گیا۔

''بلیٰ'' — جواب آیا۔ ''یہ حسین ابنِ منصور حلاج ہے۔ میرا باپ ان کا مولا ہے۔

''کیا تم نے اس کو سجدہ کیا تھا۔'' پوچھا گیا۔

''شعبان کا چاند دیکھ کر میں سیڑھیاں اتر رہی تھی اور ابنِ منصور صحن میں تھے۔'' پھر ان کی پوتی نے مجھے کہا۔ جب تم اترو تو میرے دادا کے سامنے جھکنا اور انہیں سجدہ کرنا کیونکہ ان میں خدا کی سی طاقتیں ہیں وہ بہت عظیم ہیں'' — پھر دم لے کر اس نے کہا — ''میں نے ان کے سامنے کی زمین چومی اور اپنا سرِ نیاز جھکایا۔ سجدہ ریز ہوئی۔ انہوں نے میری طرف دیکھا بھی نہیں یہ کتاب میں لکھتے رہے۔''

قاضی نے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی بند در کی طرف چلی گئی۔

مجمعے میں سے کسی نے کہا: ''ایسی جسارتوں کو اٹھانے کے لئے بہت بڑا حوصلہ چاہیے۔''

''جب سجدہ ریز کی طرف دیکھا ہی نہیں گیا تو سجدہ قبول ہی نہیں ہوا۔ یہ سراسر الزام ہے کذب اور افترا۔'' کسی نے سرگوشی میں کہا۔

''خاموش رہو۔'' بھیڑ میں مل کر کھڑے کسی شرطے نے زور سے کہا۔
عجیب طرح کی گھٹن اور گرمی تھی اور وقت ٹھہرا ہوا لگتا تھا۔ جو آدمی در آئے تھے وہ واپس جانے کی نیت کرتے مگر کھڑے رہتے۔ لوگ اپنے دامنوں سے اپنے چہرے سے پسینہ پونچھ رہے تھے اور ان سے اپنے آپ کو ہوا بھی دے رہے تھے۔ شحنہ اور قاضی سب پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ حالانکہ یہ زمستان کے سخت ترین دن تھے اور برف بار شمالی ہوا نے عدالت سے قبل لوگوں کو کپکپا دیا تھا۔
''تم ابلیس پرست ہو کہ ابلیس کی شان میں تم نے ایک قصیدہ تحریر کیا ہے۔''
قاضی نے کچھ اشعار پڑھ کر سنائے۔
''وہ راندۂ درگاہ ہونے سے پہلے، ہر وقت سے پہلے خدا کا مقرب ترین فرشتہ تھا۔'' جواب دیا گیا۔
''تم اس کے پرستار ہو۔ اس کے مذہب کو رواج دیتے ہو۔'' قاضی نے ڈانٹ کر کہا۔
''بخدا وہ مذہب کبھی رواج نہیں پا سکتا۔ وہ تو قابلِ تقلید بھی نہیں قابلِ پرستش کیسے ہو گیا!''
''عدالت تم سے جواب چاہتی ہے۔ نہیں یا ہاں۔ زیادہ کچھ نہیں۔''
قاضی نے ایک کتاب ہوا میں لہرائی۔ بازو اوپر کیا:
''یہ دیکھتے ہو۔ اسے پہچانتے ہو۔''
اوپر نگاہ اٹھائے بنا حسین نے کہا: ''پہچانتا ہوں۔''
قاضی نے اوراق پلٹے اور پڑھا:
''اگر کوئی شخص حج کا ارادہ رکھتا ہو اور قدرت نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے گھر میں ایک کمرہ مربع مخصوص کر لے۔ اسے پاک و صاف رکھے۔ کسی قسم کی نجاست وہاں نہ پہنچے اور نہ اس کے سوا کوئی دوسرا وہاں جائے۔ سب کو اس سے دور کرے۔ پھر ایامِ حج میں اس گھر کا طواف کرے جیسا خانہ کعبہ کا کرتے ہیں اور جو مناسک مکہ میں ادا کئے جاتے ہیں سب بجا لائے۔ جب کر چکے تو تیس یتیموں کو جمع کر کے اپنی ہمت اور قدرت کے موافق کھانا کھلائے اور بذاتِ خود ان کی خدمت کرے۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہو کر

ہاتھ دھولیں تو پھر ہر ایک کو سات درہم یا تین درہم دے۔ یہ عمل اس کے لئے حج کا قائم مقام ہو گا۔"

حامد بن عباس پچھلے دروازے سے شحنہ کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ قاضی ابو عمر بھی اس کے ہمراہ تھا۔ ابو جعفر بن بہلول قاضی بھی ان کے ساتھ تھا۔ علماء اور شہود کی ایک جماعت بھی اسی دروازے سے آکر سامنے بیٹھ گئی تھی۔

قاضی ابو عمر نے کہا۔ "یہ مضمون تجھے کہاں سے پہنچا۔"

"حسن بصری کی کتاب الاخلاص سے۔" حسین نے نرمی سے جواب دیا۔

"اے حلال الدم۔" قاضی ابو عمر نے زور سے کہا۔ "تو جھوٹ کہتا ہے۔ ہم نے مکہ میں کتاب الاخلاص سنی ہے اس میں تو یہ مضمون نہیں تھا۔ اے کاذب و فاجر! تو غلط کہتا ہے۔" وہ سخت خفا تھے۔

حامد نے آگے جھک کر قاضی ابو عمر سے کہا: "یہ لکھ دیجئے۔"

ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے اسے رکنے کا کہا ملزم سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

"کیا تم نے خود کتاب الاخلاص دیکھی ہے یا محض سنی ہے۔"

"نہیں میں نے صرف سنا تھا اور یہ مضمون اس کے اندر تھا مجھے کسی ثقہ آدمی نے کہا تھا۔"

"تم صرف سنی سنائی اور مفروضوں پر اتنی بڑی بات لکھ گئے جو اگر عام ہو جائے تو اسلام کی ساری عمارت ہی زمین پر آرہے۔ تم نے مذہب میں رخنہ اندازی کی ہے۔"

حامد نے قلم قاضی ابو عمر کے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کی جس کو انہوں نے پکڑ تو لیا مگر پھر رکھ دیا۔

"حسن بصری اگر مذہبِ اسلام میں رخنہ اندازی کرنے والے تھے تو پھر کون ان خلاؤں کو پُر کر سکتا ہے۔" اس نے سوال کیا۔

"خاموش۔ سوالوں سے احتراز کرو۔ صرف یہ بتاؤ کیا تم نے یہ مضمون کسی کتاب سے نقل کیا ہے یا محض قیاس ہے!"

"بخدا ہرگز قیاس سے نہیں۔ مجھے ان مطالب پر پہلے پہل ایک ہاشمی نے خبر دی تھی۔"

قاضی بہلول ہاشمی کا ذکر سن کر مسکرائے۔ "وہی ہاشمی جو اپنے آپ کو تمہارا نبی کہتا ہے اور تم جو اپنے آپ کو اس کا خدا کہتے ہو۔"

قاضی ابو عمر نے کہا: "اور تمہارے مریدوں میں سے امام رضا کے داعی ہیں اور یہ سارے دفاتر جو جمع ہیں تم ان کی تکذیب کیسے کر سکتے ہو۔"

حامد نے کہا: "قاضی ابو عمر۔ اس سوال جواب سے اب کیا ملے گا۔ آپ اس کاغذ پر فتویٰ لکھ دیں کہ اس کا خون مباح ہے۔"

قاضی ابو عمر نے گفتگو روک کر پہلی بار بہت گہری نظروں سے حامد کی طرف دیکھا۔

"یہ بات کہ حسین بن منصور حلاج حلال الدم ہے۔" حامد نے کاغذ ان کے سامنے کیا۔

حسین نے نگاہ اٹھائی تو بھیڑ کے آخر میں آقائے رازی کو دیکھا اور نہایت محبت سے مسکرایا۔ آقائے رازی کی اڑی ہوئی رنگت اور گھبرایا ہوا چہرہ دیکھ کر اس نے سر ہلایا اور اشارہ کیا۔

قاضی بہلول نے کہا: "یہ معتزلی ہے اور لوگوں میں کفر پھیلاتا ہے اس لئے قابلِ گردن زدنی ہے۔"

حسین نے بازو سر سے اوپر اٹھائے اور زور سے کہا:

"میری پشت شرعاً محفوظ ہے اور میرا خون بہانا حرام ہے۔ میرا مذہب سنت کے مطابق ہے اور میرا اعتقاد اسلام ہے۔ میری کتابوں میں جو کچھ بھی ہے شرع کے موافق ہے اس لئے میرا خون بہانے میں اللہ سے ڈرو۔ اللہ سے۔"

حامد نے قلم پھر قاضی ابو عمر کے ہاتھ میں دے کر کاغذ سامنے کر دیا:

"آپ اس پر لکھ دیجئے۔"

"مجھے سوچنے غور کرنے کا موقع دیجئے وزیرِ مملکت۔" قاضی ابو عمر نے جھنجھلا کر کہا۔

قاضی ابوالحسین الاشنائی نے کہا: "جب آپ ایک بات کہہ چکے ہیں تو اس کو لکھ دینے میں کیا حرج ہے۔"

شحنہ نے ذرا سختی سے کہا: قاضی ابو عمر۔ جو بات ایک بار آپ کی زبان سے نکل گئی سو نکل گئی۔ وہ ٹھیک ہے۔ جائز ہے۔ سوچ کر کہی گئی ہے۔ آپ قضاۃ کے نہایت اعلیٰ منصب پر ہیں۔ کیا کوئی بات سہواً کہہ سکتے ہیں۔"

حسین کہتا رہا:

"میرے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ میری پشت مضبوط ہے۔ میرا خون بہانا حرام ہے۔"

زرد رُو آقائے رازی اپنا راستہ بناتا ہوا بھیڑ کو دائیں بائیں سے ہٹاتا ایک ایک بالشت آگے بڑھتا اس کے قریب آرہا تھا۔ لوگ یونہی شور مچا رہے تھے۔ "حلال الدم۔ حلال الدم۔" ایک طرف سے آواز آتی تھی۔ "ناجائز۔ ناجائز۔ محض سنی ہوئی باتوں اور مفروضوں پر کوئی بھی قابلِ گردن زدنی نہیں ہوتا۔"

"خاموش ـــــ" بغداد کا شحنہ دھاڑا۔ "سوائے قاضی ابو عمر کے کسی کو کوئی بات کہنے کا اختیار نہیں اور نہ ہی کوئی اور بات درخورِ اعتنا ہے۔"

حامد نے آگے بڑھ کر کاغذ قاضی ابو عمر کے ناک کے سامنے کر دیا تھا:

"جو آپ نے کہا ہے جو آپ نے سوچا تھا۔ جو فتویٰ آپ نے دیا تھا اسے لکھ دینے میں کیا قباحت ہے۔ یہ روز روز کا فتنہ مٹے۔ یہ کفر اور الحاد کا داعی۔ یہ معتزلی۔ زندیق۔ قرمطی فاجر گمراہ کرنے والا شخص زمین کے سینے پر بوجھ ہے قاضی ابو عمر ـــــ انا الحق کہنے والا چاہے وہ دیوانگی میں ہی کیوں نہ کہے قابلِ تعزیر ہے۔ آپ کس کی طاقت سے خوفزدہ ہیں؟ اور کیوں؟ لکھیے۔" اس نے قلم ان کے ہاتھ میں تھما دیا اور دوات خود پکڑے رہا۔ "لیجئے قلم کو روشنائی میں ڈبو کر لکھیے۔"

قاضی ابوالحسین نے کہا: "قاضی ابو عمر۔ اگر وزیرِ مملکت مجھے کہتے تو میں لکھ چکا ہوتا۔ جب آپ ایک فتویٰ دے چکے ہیں تو لکھنے سے گریز کیسا؟"

"یہ ایک کلمۂ خفگی تھا۔ میں اس کے خون کی حفاظت کروں گا اس لئے کہ وہ دیوانہ ہے۔"

ہنس کر نہایت مکروہ تفاخر سے حامد بن عباس نے کہا: "بغداد کو گمراہ کرنے والا ـــــ داعئ نبوت دیوانہ کیونکر ہو گیا۔ آپ کن بھول بھلیوں میں اٹک گئے ہیں قاضی ابو عمر۔"

شحنہ نے پھر کہا: "ایک بااختیار شخص ہوتے ہوئے ایک مجمع کے سامنے آپ نے جو بات کہہ دی ہے کیا وہ آپ نے بنا سوچے سمجھے کہہ دی تھی۔ قاضی ابو عمر۔ اب فرار کی راہ نہیں رہی۔"

پھر آوازیں آنے لگیں:

"فتویٰ تو آپ دے چکے۔ اب لکھ بھی دیجئے۔"

حامد نے قلم سیاہی میں ڈبو کر قاضی ابو عمر کو دیا اور کاغذ آگے کر دیا تاکہ وہ اس پر اپنے دستخط کر سکیں۔

سب لوگ خاموشی سے یہ کاروائی دیکھنے لگے۔

سر کو جھٹک کر، کوئی راہِ فرار نہ پا کر قاضی ابو عمر نے اس کاغذ پر اپنی مہر ثبت کر دی اور فتویٰ لکھ دیا۔ پھر اور لوگوں نے قضاۃ نے اور شحنہ نے اور خود ابوالحسین الاشنائی نے اپنی اپنی مہریں لگائیں نام لکھے اور حسین ابنِ منصور کی موت کے پروانے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

حامد بن عباس نے اٹھتے ہوئے بڑی گہری نظروں سے اس دیوانے کی طرف دیکھا ــــ "اغول کا روح اللہ۔"

شرطے حسین کو اسی زندان کی طرف لے گئے جس میں وہ اسیر تھا۔ اور کوچہ گرد شام کو جب گلستانوں اور باغوں میں کنارِ دجلہ شاہراہوں پر کشتیوں میں اور مغنیوں کی محفلوں میں ملے یہی تذکرہ تھا کہ دیوانہ جو "انا الحق" کہتا تھا اپنی سزا کو پہنچے گا کیونکہ قاضی ابو عمر نے اس کی موت کے فتویٰ پر مہر لگا دی تھی۔ ہاں حسین بن منصور حلاج کے مقدر پر مہر لگا دی گئی تھی۔ اب کوئی دعا کام نہیں آسکتی تھی۔ سب بیکار۔ بے کار!

اگر اس دیوانے کا یہی مقدر تھا تو کیا مقدر تھا۔

جنوں کیا اس قدر کڑی سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

شغب نے اپنے خانہ باغ میں جو قصرِ خلافت سے دوسری طرف تھا، پھولوں کی

کیاریوں کے درمیان چہل قدمی کرتے ہوئے سنا کہ قاضی ابو عمر نے انا الحق کہنے والے دیوانے کو سزائے موت دی ہے تو وہ لرز گئی__ بھلا مقتدر کے لئے اب دعا کون کرے گا__ اس کی درازیٔ عمر کے لئے' اس کی صحت و طاقت کے لئے' اس کے بختِ رسا کے لیے!

وہ برابر ٹوہ میں لگی رہی تھی اور جب نصر حاجب نے اسے بتایا تھا کہ حامد بن عباس نے اسے اپنے زندان میں منتقل کر لیا ہے تو وہ خوفزدہ ضرور ہوئی تھی مگر پھر وقت گزرتا رہا۔ گھٹتا رہا۔ پل پل' ساعت ساعت' دن اور مہینے اور سال گزر گئے تھے۔ وہ غافل تو نہیں ہوئی تھی مگر ذرا مطمئن ہو گئی تھی کہ اسیر زنداں سے ایک دن چھوٹ جائیں گے اور انتہائے خیال میں اس سے خوش بھی تھی۔ وہ سیر و سیاحت کا شوقین اگر زندان میں نہ ہو تو بغداد میں بھی نہ ہو اور وہ جو اس تک رسائی رکھتی ہے اسے کہاں پا سکے؟ اس نے اپنی خود غرضی کی وجہ سے اس کی رہائی کے لئے زیادہ کوشش بھی نہیں کی تھی۔

اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اب وہ کیا کرے؟

مقتدر کو وزرائے سلطنت اور عمائدین' سردارانِ قوم اور ترک لوگ اپنے گھیرے میں لئے تھے۔ وہ امِ جعفر سے' اپنی ماں سے' شغب سے بھی دور ہو گیا تھا۔ شروع میں جب وہ تختِ خلافت پر جلوہ افروز ہوا تو ڈرا اور سہا ہوا لڑکا تھا۔ اب زمانہ بدل گیا تھا۔ وہ زور اور قوت سے دانش و ہوشیاری سے ساری باگوں مہاروں کو تھامے تھا۔ ایک طاقتور حکمران جس کو سفارتوں اور بادشاہوں کے سلام وصول کرنے اور لوٹانے اور عباسی مملکت کے جاہ و جلال کی حفاظت کا اختیار تھا مگر وہ اب شغب کا کم سن بیٹا تو نہ تھا اور وہ اپنی ساری طاقت اور الگ دربار اور امراء کے ایک گروہ کے باوصف اس سے ایک ذرا سی بات منوانے کا حوصلہ نہ رکھتی تھی۔ وہ اسے ناکام و نامراد دیکھنا چاہتی تھی۔ ایک ماں کے دردِ دل سے وہ اس کی سلطنت کے استحکام کے لئے دعا گو تھی۔ حامد بن عباس نے نہ جانے کس طرح سے یک بیک یہ سارا اہتمام کر لیا تھا اور اسے خبر تک نہ ہوئی تھی۔ حسین کا مارا جانا خود عباسی حکمرانوں کے لئے نیک فال نہ تھی۔ وہ کیا کرے۔ وہ کہاں جائے اپنی بے بسی پر وہ مضطرب ہوئی۔

قاضی ابو عمر سے وہ پہلے ہی کئی معاملوں میں تنازعہ کر چکی تھی اور اب وہ ہرگز اس کے کسی حکم کی پیروی نہیں کرے گا بھلا کیوں کرے گا!

مدرسہ نظامیہ کے فقیہ اور جنید سے کچھ امید تھی مگر نہایت موہوم۔ حامد اتنا طاقت ور اور کینہ پرور اور ریشہ دوانیوں کا ماہر تھا کہ کوئی بھی اس سے دشمنی مول نہیں لے سکتا۔ مونس بھی اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آہ وہ کیا کرے۔ کہاں جائے۔ لوگ کہتے تھے خلیفہ کی ماں نہایت اثر و رسوخ رکھتی ہے اور دربار کے کاموں میں دخیل ہے مگر کیا وہ دخیل تھی؟ ___ ایک آدمی کی موت کے احکامات کو بدلوانے تک کی طاقت وہ نہ رکھتی تھی۔

وقت اور زمانہ اور حالات سب اس کے خلاف تھے۔

خود خدا اور اس کے فرشتے بھی شغب امِ جعفر سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔

اس نے نہایت مایوسی میں وہیں سبزے پر اپنا سر ٹیک دیا ___ ''او خدا!! او خدا!!''

آقائے رازی نے سلاخوں کے ساتھ اپنا ماتھا ٹیک دیا۔ اندھیری' سیاہ' اور بادو باراں سے مضطرب رات میں اس نے ہولے سے پکارا:

"ابنِ منصور!"

"آقائے رازی

عشق مزرعِ گلاب ہے
عشق مزرعِ زندگی ہے"

"حسین۔ دیوانہ نہ بنو۔ میں تمہیں لینے کے لئے آیا ہوں۔ گھوڑے باہر کھڑے ہیں۔ مضبوط اور تازہ دم۔ ہم صبح ہونے سے پہلے بغداد سے نکل جائیں گے۔ خراسان میں' تمہاری اپنی سرزمین میں لوگ تمہارے منتظر ہوں گے۔"

"نہیں نہیں۔ بخدا نہیں۔" اس نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔

"آخر کیوں ابنِ منصور۔"

حسین نے سلاخوں کی طرف دیکھا جو راستے سے ہٹ گئیں۔ وہ دونوں پاس پاس کھڑے تھے۔

"میں جس کی قید میں ہوں وہ مجھے رہا کرے تو؟" اس نے کہا۔

"حامد بن عباس کو تم سے یونہی کد ہے۔" رازی نے کہا۔

"نہیں یونہی نہیں آقائے رازی۔ یونہی نہیں۔ کد کی کوئی وجہ ہے۔ اس کا دل بھی تھوڑی خوشی چاہتا ہے۔ گو میں کبھی کسی واسطے سے بھی اس کی ناخوشی کا سبب نہیں ہوں ـــــ اسے شدتِ عطش سے ناکامی اور نامرادی کے خیال سے نکلنے کا ایک موقع ہے

یہ۔" حسین نے بات ختم کی۔

"تم سچ مچ دیوانے ہو۔ کوئی یوں بڑھ کر موت کو گلے لگاتا ہے۔ حسین! تم خراسان کی طرف نکل چلو۔ تمہارے مریدین ہیں۔ تم کو چاہنے والے داعی اور مبلغ۔ اور تمہارے مسلک سے آشنا لوگ اور تم پر جان نثار کرنے والے ___ تم بس نکل چلو۔ باقی سب ٹھیک ہو جائے گا۔" رازی چُپ ہو گیا۔

"مشیت یہی ہے آقائے رازی کہ میں عشق کی فصل کاٹوں۔ محبت کے لئے جان دوں اور سنو آقائے رازی! جس کے نصیب میں شہادت ہو۔ جسے یہ مرتبہ مل سکے وہ کیوں اس سے بھاگے۔ کہاں جائے جاوداں موت سے جاوداں زندگی کی طرف جبکہ موت سب کا مقدر ہے میں زندگی کو کیوں نہ پسند کروں۔ از پئے جاناں۔"

"میرا خیال تھا تم مجھے پہچانتے ہو۔ منصور کا بیٹا میری عزت کرتا ہے اور تم سمجھتے ہو نہ میں جذباتی ہوں نہ ہی خود پرست جوان۔ میرے بالوں میں گھُلی سفیدی پر ترس کھاؤ۔ چلو۔"

آقائے رازی۔ کیا سب کے مقدر میں شہادت ہے۔ ہو سکتا ہے فرار سے حالات بگڑ جائیں۔ ٹھہرے رہنے منتظر رہنے اور حالات کا مقابلہ کرنے میں ہی ساری لذت ہو۔ مجھے افسوس ہے میں آپ کی بات پر عمل نہیں کر سکتا۔" حسین زندان میں اپنی جگہ پر لوٹ آیا تھا۔

"تم کیوں موت کی تلاش میں ہو۔ کیوں مرنے سے عشق کرتے ہو۔" رازی نے پوچھا۔

"آپ نہیں سمجھیں گے۔ ریشم اور نوادرات کے سوداگر یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔ ایک اور فہم ایک جدا طرزِ خیال کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ اپنی جگہ نہایت ہمدرد اور بہت ہی عمدہ دوست ہیں مگر میں مجبور ہوں۔ میرے احکامات دوسری جگہوں کے نہیں ہیں۔ مجھے بغداد میں اپنے مقدر کے فیصلے کا انتظار کرنا ہے۔" حسین نے نہایت قطعیت سے کہا۔

آقائے رازی باہر، سلاخوں کے باہر اس کے خیالوں کی دنیا سے باہر اور اعمال کی دنیا سے باہر ٹھہرا رہا مگر اس نے پھر کچھ نہیں کہا ___ "حسین ٹھیک ہی تو کہتا

ہے۔ مقدر کا منتظر ہے یہ ابن منصور" ___ پھر اس نے اور سایوں کو زندان کی طرف بڑھتے دیکھا اور اوٹ میں ہو گیا۔

شغب نے کہا:

"یا شیخ! میں نے آپ کے یہاں سے فرار کا منصوبہ بنایا ہے۔ اگر آپ صاد کریں تو آج ہی رات نکل جائیں۔"

"امِ جعفر۔ شہادت کی رات برسوں میں صدیوں میں قرنوں میں ایک رات ہوتی ہے ___ کیا اسے ٹھکرا دیا جائے ___ اور زندگی کیا ہے۔ کب تک۔ اوّل و آخر فنا۔ ظاہر و باطن فنا ___ "

"یا شیخ۔ آپ اپنے اس فیصلے پر نظرِ ثانی نہیں کریں گے۔" اس نے سلاخوں سے تقریباً چمٹتے ہوئے کہا۔ "میرا بیٹا تو امراء کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ حامد بن عباس اس کی باگ ڈور تھامے ہے۔ مگر آپ اس تھوڑے وقت میں خراسان یا ماوراء النہر یا ہندوستان، کہیں چلے جائیں ___ !"

"امِ جعفر۔ میرے احکامات یہیں کے ہیں۔ بس یہیں منتظر ہوں۔ کیا وہ قدرت نہیں رکھتا کہ دلوں کو پھیر دے۔ حالات کو بدل دے۔ اندھیرے میں روشنی کر دے۔ ناامید نہ ہوں۔"

"یا شیخ۔ آپ حامد کو نہیں جانتے۔" امِ جعفر نے کہا۔

"نہیں۔ میں حامد کو نہیں جانتا مگر جاننے سے بھی کیا ہوتا۔ وہ مقدر کو تو پھیر نہیں سکتا۔"

شغب سلاخوں کے ساتھ لگ کر آہ و زاری کرنے لگی۔ پھر رات کے سناٹے میں ایک عجیب نوبت سی بجنے لگی۔ ایک گنگناہٹ، جیسے زمزمۂ موت سے معمور کوئی صدا ہو ___ مدہوش کرنے والی۔ سب کچھ بھلانے والی!

قاضی ابو عمر کے فتویٰ پر سوائے شبلی اور ابنِ عطار کے سب کے دستخط تھے ___ مقتدر نے دیکھا۔ پڑھا اور ایک طرف رکھ دیا۔ وہ رومی سفارت کی نہایت ضروری

تفصیلات اور گفتگو کے نکات پر غور کر رہا تھا۔ ایک بار پھر عباسی دربار کو سجایا اور شان و شوکت کا مکمل فن پارہ بنایا جا رہا تھا۔ وہ یعنی مقتدر باللہ اپنے اجداد کی طرح بار گاہوں اور ایوانوں اور ایک کے بعد دوسرے قصر سے دور طویل مسافت کے آخر میں جبکہ عجائباتِ زمانہ انہیں تقریباً نیم جاں کر چکے ہوں گے سفیروں سے ملے گا۔ وہ رعب و شان سے نہایت مرعوب آدھی باتیں بھی کہنے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں گے۔ تھکے ہوئے نظاروں سے سیر ہوئے وہ جب اس تک پہنچیں گے تو ہیبت و دبدبے سے تقریباً مدہوش ہوں گے۔

ایک سال سے بھی زیادہ عرصے سے وہ سفارت باریابی کی متمنی تھی اور بغداد کی رونقوں میں مگن تھی۔ یہ عربی النسل، ترکی، ایرانی، ہندوستانی تاتاری، خراسانی چھوٹی اور بڑی ریاستوں اور سلطنتوں کے نمائندے سوداگر اور طالب علم۔ مختلف مذاہب اور نسلوں کے مخلوط لوگ جیسے رنگ برنگ طیلساں ہو۔ رومی یہاں آکر حیران ہوئے تھے کھیل تماشے اور نظارے انہیں محو رکھتے تھے ر اتنے طویل انتظار سے وہ تنگ آ گئے تھے۔ انہوں نے نہایت قریب سے عام زندگی کو دیکھا تھا۔ فوج اور منتظم، وزراء اور فقہا، مسجدیں اور عبادت گاہیں، سب کا مطالعہ کیا تھا۔ صحرا نشینوں نے کیا دنیا تخلیق کی تھی کہ اس کے دبدبے اور شوکت سے وہ دہل دہل جاتے تھے۔ ہر امیر پر خلیفہ ہونے کا دھوکا ہوتا تھا۔ سواریوں پر ننگی تلواروں کے پہرے میں سرداروں کو نکلتے دیکھا تھا۔ محملوں میں خواتین اور عماریوں میں امراء نکلتے تھے۔ علم و فن کا چرچا اقصائے عالم سے بہترین چیزوں کے بازاروں میں ڈھیر گویا اقصائے عالم سے سمٹ کر سارا حسن اور تمام فن اور تمام وجاہت اور تمام رونق یہاں جمع ہو گئی ہو۔ مختلف مذاہب کے داعی اور نقیب اور درویش اور امیر یہاں جمع تھے۔ ایک خواب کی سی دنیا تھی کہ جب آنکھ کھلے گی تو سب غائب ہو گا۔ ایک طلسم تھا فریبِ نظر، یہ سب اصل نہیں لگتا تھا جیسے آئینہ آب پر کوئی عکس بہتا جائے۔ اس سلطنت کے جتنے فسانے انہوں نے سنے تھے وہ دیکھی ہوئی حقیقتوں سے کمتر تھے اور حقیقت اصل میں فزوں تر۔

مقتدر نے اپنی ماں امِ جعفر کا خط پڑھا اور پھر پڑھا۔ یہ درخواست تھی حسین بن منصور کو معاف کر دیا جائے، اس سے درگزر کرنے کی۔ یہ کہ وہ صرف دیوانہ تھا اور

دعاگو تھااور عالمِ ربّانی تھا۔ اس کا درجہ بڑا تھا۔ وہ اگر احوال کی وجہ سے انا الحق کہتا تھا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ یہ اس کی دعاؤں کی برکت تھی کہ جعفر (مقتدر) تختِ خلافت پر جلوہ افروز تھااور فرانس کی سفارتیں اس کی منتظر تھیں۔ اگر حسین بن منصور معاف کر دیا جائے توامِ جعفر مطمئن اور خوش ہو گی اور درازیٔ عمر و بادشاہتِ صحت کی دعا کرے گی۔

جب سے وہ خلیفہ بنا تھا وہ ماں کے سحر سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ وہ جو چاہتی وہی ہوتا تھا یہاں تک کہ عمائدین اور اس کے ہم وطن ترکی سردار خود مونس اس کے خلاف ہو گئے اور روز کوئی نہ کوئی اس کے خلاف ایک نیا فسانہ سناتا۔ اور مقتدر نے شغب کو منع کیا کہ وہ معاملاتِ سلطنت اور سیاست میں دخل نہ دیا کرے۔ ہارون رشید کی بیوی زبیدہ نے محض عقل اور فہم و فراست سے جیسے لوگوں کے دل جیتے تھے وہ بھی کرے۔

شغب نے اپنے ہاتھوں سے سلطنت عباسیہ پھسلتے دیکھ کر خود ہی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ وہ کبھی کسی شے کی طالب نہ ہوتی اور کبھی کسی معاملے میں دخل اندازی نہ کرتی۔ مگر امیر اور وزیر ہر معاملہ جو وہ اپنے طور پر طے کرتا یہی سمجھتے کہ ام جعفر کی وجہ سے ہوا ہے۔ انہیں بس شغب کی ذات سے لرزہ چڑھتا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ مقتدر کسی بھی طور خود مختار ہو۔ وہ اسے قصر کی دیواروں سے ورے کی دنیا سے نا آشنا رکھنا چاہتے تھے۔ جیسے خواب کی دنیا کا شہزادہ ہو۔ حامد' مونس' ابنِ فرات اور نصر حاجب اس کے گرد حصار کی طرح مقیم تھے جس کے اندر کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ ہر حاکم ایک حصنِ حصین کے اندر رہتا ہے باہر کی باتوں سے بے خبر۔ ایک نہایت ہی معزز قیدی کی طرح۔

شغب کا خط پڑھ کر وہ سوچتا رہا۔ ضرور کوئی اہم بات ہے ورنہ سارے جاسوسوں اور پرچہ نویسوں کی پرواہ کیے بنا وہ کبھی سفارش نہ کرتی حکم نہ دیتی بامنّت۔ اس سے ایک زندگی کی بھیک نہ مانگتی۔ اس کی ماں زمانہ شناس اور رمز شناس تھی۔

نہ چاہنے کے باوجود اس کا جی چاہا کہ وہ ام جعفر کی بات مان لے اور قاضی ابو عمر اور دوسروں کے دستخطوں کی لمبی فہرست رکھنے والے اس فتویٰ کے ٹکڑے اڑا دے۔ اسے اپنی ماں ساری خامیوں کی باوجود بہت عزیز تھی۔ وہ اس کے حکم سے سرتابی کرنے

کی مجال نہیں رکھتا تھا اور اختلافات گو تھے مگر اس کا خیال تھا یہ موت ٹالی جا سکتی تھی۔

حامد بن عباس کاغذوں پر خلیفہ کے دستخط کروانے کے بعد بھی کھڑا رہا۔

"امیر المومنین! سفارتِ روم کے آرام کا مناسب خیال رکھا جا رہا ہے۔ قصر مزیّن کئے جا رہیں" ــــ اور اس نے ایک نقشہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ اس راستے کی تفصیل جس سے وہ داخل ہوں گے اور سارے محلات جن سے وہ گزریں گے۔

مقتدر کے مکدّر چہرے پر روشنی سی ہوئی۔

حامد پھر بھی کھڑا رہا۔ خلیفہ کے ندیم اور دوست اور حاضر باش سر جھکائے منتظر تھے۔ ہاتھ میں پکڑے پلندے سے ایک کاغذ نکالا:

"امیر المومنین! اس پر بھی اپنی مہر ثبت فرمادیں۔"

مقتدر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس سے کوئی راز نہیں کھلتا تھا۔ کنویں کی سی گہرائی لئے ہوئے وہ اندر کی طرف دھنسی آنکھیں۔ وہ ایسا انسان تھا جس کے ظاہر اور باطن میں بہت فرق تھا۔ جو ادنیٰ غلاموں لی سی ذہنیت رکھنے کے باوجود اپنے محکمے کو کمالِ جانفشانی سے چلاتا تھا۔ جو بیمار ہو تو بھی کاتبوں کو بلا کر کام کی تفصیل طلب کرتا تھا ــــ ہاں مقتدر اس سے خوش تھا۔ بہت خوش نہیں جیسا وہ نصر حاجب کے ساتھ تھا، مونس کے ساتھ۔ مونس تو یوں بھی رعب و دبدبے سے اپنے ترک ہونے کا فائدہ اٹھاتا تھا۔

مقتدر نے روشنائی کے لئے ادھر ادھر دیکھا۔ حامد نے اپنے لمبے کوٹ کی جیب میں سے دوات حاضر کر دی۔ اسے کھول کر دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور ادب سے پیش کیا۔ اس وقت وہ کتنا بے بضاعت لگ رہا تھا۔ خلیفہ کو اس پر غصہ آیا کہ وہ کیوں اتنی عاجزی کر رہا تھا۔ کیوں!

اسے بے جا عاجز لوگ پسند نہ تھے۔ وہ انسانوں کو مجبور و مقہور دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور اسی لئے اس کے عہد میں بغداد کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ وہ عجیب شخصی آزادی کا قائل تھا اور لوگوں کے خیالات اگر باغیانہ نہ ہوں تو اسے پسند تھے۔ وہ

منفرد سوچ اور منفرد عمل کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ آدمی میں جو ایک ازلی شان ہے اور آدم کی پیشانی میں جو نور ہے جس کے لئے وہ سجدہ گاہِ قُدسیاں قرار دیا گیا' اسے وہ شان پسند تھی۔ تھوڑا سا استغنا' ذرا سی لاپرواہی اور بے نیازی جو انسان میں شانِ ربوبیت پیدا کر دے جو اسے ساری کائنات کا مطمع نظر' مقصودِ ازلی کا پیارا بنا دے' جب اس کے سامنے خوشامد سے لوگ جھکتے تو وہ پیچ و تاب کھاتا کیونکہ وہ امیر المومنین تھا اور لوگ اس کے سامنے کی زمین کو بوسہ دے کر اس سے بات کرتے تھے۔ یہ دستور زمانہ تھا اور کیا بُرا دستور تھا۔

جب اس فتویٰ پر خلیفہ کی مہر ثبت ہو چکی تو حامد نے سیدھا کھڑا ہو کر اپنے گرد و پیش دیکھا۔ نصر حاجب سراپردوں میں سے ظاہر ہو رہا تھا اور وہ مونس کے ہمراہ تھا۔

امیر المومنین نے ان دونوں سے کچھ امورِ سلطنت پر گفتگو کی۔ حامد نے اجازت چاہی اُلٹے قدموں وہ بارگاہ سے باہر آ گیا اور باہر ایک تاریک سیاہ آندھی نے بغداد کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے بڑھنا شروع کیا۔ بادل بجلی کو' طوفانوں کو سناٹوں کو' رعد اور شور کو اور ویران اداسی کو لئے بڑھتے رہے۔ قہرِ بلا اور باد و باراں نے غنیم کی فوج کی طرح بغداد کو اپنے حصار میں لے لیا۔

مقدرات کیا تھے!

اور یہ گنگناہٹ جیسے دور کہیں زمین کی پہنائیوں میں موت کا زمزمہ ہو۔

کون ایسی شاندار زندگی تھی جس کے استقبالِ کے لئے موت بے قراری سے منتظر تھی۔ اپنی بساط بچھائے وہ سراپا انتظار تھی اور مغنئ آتش نفس اپنے نغموں سے فنا۔ فنا۔ فنا کا زمزمہ سنا رہا تھا!

جنید نے آئینوں کی دکان بڑھا دی تھی۔ شبلی نے پوچھا:

"آخر یک بیک آپ نے آبائی کاروبار ترک کیوں کر دیا ہے۔"

"اس کاروبار میں یہی خرابی ہے کہ صیقل کرنے میں ذرا سا ہاتھ جنبش کرے تو آئینہ دھندلا جاتا ہے اور پھر سیاہ ہو جایا کرتا ہے۔ میرے کاروبار کی شہرت جس خوبی کی وجہ سے تھی اب اس کو قائم رکھنا اسی معیار پر آئینے بنانا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔" وہ چپ ہو گئے۔

شبلی نے سر ہلایا جیسے بہت کچھ سمجھ رہے ہوں۔ پھر دکان کے پچھلے حصے میں جا کر وہ بیٹھ گئے اور ایک ایک آئینے کو جو وہاں زمانوں سے جمع تھا دیکھتے رہے۔ سارے آئینے اندھے تھے۔ کسی میں ان کو کوئی بھی صورت نظر نہ آئی۔ ہر طرف سیاہی تھی اور اندھیرا تھا۔ زندگی کی رمق نہ تھی اور یخ بستہ تہ خانے سے برابر ایک صدا چلی آتی تھی اور سارے آئینے اس صدا کو پکڑ اور سن رہے تھے مگر وہ جانچ نہیں سکتے تھے کہ یہ گنگناہٹ کہاں سے آ رہی ہے۔ بہت آہستہ سے شبلی اس اسباب کو جو آئینوں کے بنانے میں استعمال ہوتا تھا ضائع کرنے لگے۔۔۔ انہوں نے رنگ اور سفیدی کو سرخی میں بے طرح ملانا شروع کیا۔ پھر سارے فرش پر اس کو پوت دیا اور پھر اس میں خود ڈگمگانے لگے اور گر گر کر اٹھنے اور اٹھ اٹھ کر گرتے رہے اور پھر انہوں نے غوغا کیا کہ وہ خود آئینہ بن گئے ہیں۔ وہ سرخی کو اپنے بازوؤں اور ہاتھوں اور منہ پر مل رہے تھے۔ جیسے کوئی تالاب میں ڈبکیاں لگانے والا ابھرے اور ڈوبے اور سطح آب پر بننے والے بلبلے کبھی اس کی غمازی کریں کبھی خود مٹ کر اسے چھپا لیں۔

جنید سیڑھیوں کے سرے پر روشنی میں کھڑے تھے۔ انہوں نے کم روشنی میں دیکھا کہ شبلی آئینہ بنے تھے۔ انہوں نے نہایت افسوس سے سر ہلایا اور کہنے لگے:

"آئینے کے مقدر میں ٹوٹنا ہوتا ہے۔"

تہ خانے میں سے کسی نے پکار کر کہا: "ہر ریزہ ایک الگ آئینہ بن جاتا ہے۔ ایک طرح سے تو یہ آئینے کی کامیابی ہے۔"

شبلی رقص کناں آئینوں کو ایک دوسرے پر مارنے لگے۔ اس شکست کی صدا اس زیرِ زمین نغمے پر چھا گئی۔ آئینوں کا ڈھیر بڑھتا گیا۔ چمک پکڑ کر کرنوں اور اجالوں اور روشنیوں اور آفتابوں کو منعکس کرنے لگا۔ وہ دکانِ شیشہ گراں کائنات بن گئی۔ دنیاؤں سے بھری ہوئی' آفتابوں او ماہتابوں سے لبالب بھری ہوئی۔ سرخی اور سفیدی سے بھری ہوئی۔

جنید اپنے کتب خانے میں بیٹھے رہے۔ ان کا قلم آج رک رک کر چل رہا تھا۔ خیالات مجتمع نہیں ہو رہے تھے اور شبلی سرخی میں ڈوبے ہاتھوں کو منہ پر مل رہے تھے۔ ہاں وہ سرخرو ہو رہے تھے جیسے وہ سارے کاروبارِ حیات کو تہ کر چکے ہوں۔

پھر وہ گلیوں و بازاروں' کوچوں اور گلیاروں میں بھاگنے لگے۔ آوارہ لونڈے ان کے پیچھے تھے۔ انہوں نے زندان کی طرف بھاگنا شروع کیا اور بچوں کی ٹولیاں ان کے عقب میں دوڑنے لگیں۔ وہ کسی بڑے سے دیوان خانے کی ڈیوڑھی میں چھپ جاتے اور آنے والی بھیڑ ان کے تعاقب اور زور سے آگے نکل جاتی۔ کبھی نئے پُر شوق لوگ اس گروہ میں مل جاتے اور کنارِ دجلہ کی شاہراہ پر امنڈ آتے۔ خوشگوار ہوا اور پھولوں کی خوشبو میں یہ آنکھ مچولی جاری تھی۔ شبلی بہت مزے میں تھے۔ انہیں ہمیشہ بھاگنے اور چھپنے اور لوگوں کی بھیڑ سے بچنے اور اسے اپنے پیچھے لگانے میں مزہ آتا تھا۔

زنداں کی سلاخوں سے لگ کر شبلی نے اندر جھانکا۔

حسین پُر مسرت اور خوش تھا۔ اس نے رنگے ہوئے چہرے کو قریب دیکھا تو ہنسا۔ اور پھر دیر تک ہنستا رہا۔

"یہ سرخی آدمی کو آئینہ تو بنا دیتی ہے آئینہ ساز نہیں بناتی۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اصل نہ سہی۔ پر تُو سہی۔" شبلی نے ہاتھوں کو دوبارہ منہ پر ملا۔

''کیا وضو کر رہے ہو شبلی۔'' حسین نے پوچھا۔

''نہیں۔'' پھر اپنے آپ کی طرف دیکھ کر کہا: ''میں دریا بُردہ ہوں۔ وضو ہی وضو ہے میرا۔''

''یہ بھی سچ ہے۔ ہاں یہ بھی سچ ہے۔ دریا میں ڈوبنے والے کو وضو کی ضرورت نہیں۔ مگر مجھے تو اس نے ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا میں پھینک دیا اور پھر ہوشیار رہنے اور دامن تر نہ کرنے کی بھی تاکید کی۔'' حسین نے نہایت طمانیت سے کہا۔

''وضو کی ضرورت تو پھر بھی رہی۔'' شبلی سرخروئی سے باہر کھڑے تھے اور بھیڑ احاطے کے باہر نعرے لگا رہی تھی۔

''دیوانہ۔ دیوانہ''

''وضو ہو تو نماز بھی ادا ہو۔''

''یقیناً۔ وضو کریں گے تو نماز ادا ہوگی۔'' حسین نے کہا۔ ''یہ وعدہ ہے۔''

''جنید اب فقیہ ہوگئے ہیں۔ وہ آئینہ خانے کو بند کر کے بیٹھ گئے ہیں۔'' شبلی نے کہا۔

''انہیں ایسا ہی کرنا تھا۔ مقدرات یہی تھے۔ مشیت سے بچ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے'' ـــــ حسین ہنسے۔ مگر کاروبارِ حیات کو لپیٹا تو نہیں جا سکتا۔ دروازے بند کرنے سے کوئی بچ تو نہیں سکتا۔ جو جس گواہی کے لئے پکارا جاتا ہے اسے گواہ رہنا ہی ہوتا ہے۔''

''یا شیخ۔ کل صبح سورج ٹوٹنے والا ہے۔'' شبلی نے سلاخوں کو چھوڑ دیا اور رونے لگے۔

''ہر ذرہ آفتاب ہوگا۔ شمشیر کا دم اب شمشیر سے باہر ہے۔'' حسین پھر جائے نماز پر جا بیٹھے اور زندان کی نیم تاریک کوٹھڑی میں ان کی بے پناہ آنکھیں جگمگانے لگیں۔

حامد بن عباس نے کہا:

''قاضی ابو عمر۔ میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں۔ اگر آپ ''حلال الدم'' نہ

کہتے تو میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔" اس نے نبیذ کا جام ایک ہی سانس میں خالی کر کے صراحی کے برابر میں رکھ دیا۔

قاضی ابو عمر کا چہرہ اڑا اڑا تھا اور بے سکون بھی۔

"حامد۔ خدا سے ڈرو اور اسے جانے دو۔ تم نے جان لیا کہ تمہاری طاقت بے پناہ ہے۔ تم ایک انسان کی زندگی اور موت پر تقریباً قادر ہو مگر یہ خونِ ناحق ہو گا۔"

حامد ہنسا اور دیر تک ہنستا رہا۔

"خونِ ناحق نہیں۔ یہ ایک زندگی کے بدلے زندگی ہے۔ یہ میری بے خواب اور بے چین اور نامراد زندگی کے جواب میں زندگی ہے۔ قاضی ابو عمر! کبھی آپ نے اذیت اور محبت کو یک جا اٹھایا ہے۔"

"اگر محبت، محبت ہو تو اذیت کہاں ہوئی۔ تمہارے مفروضے غلط ہیں۔ تم سے اس کی زندگی کی خیرات مانگنے آیا ہوں۔ میرے منہ سے سہواً یہ لفظ نکل گیا تھا۔ میرا مطلب صرف گالی دینا تھا۔ اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پانا۔ یونہی اپنی بڑائی آزمانا۔ اپنے قضا کے عہدے کا لطف لینا۔ مجھے حسین بن منصور کے چہرے کا اعتماد ہلا دیتا ہے۔ دوسرے داعی اور کاذب نبی اور مہدی کا دعویٰ کرنے والے لوگ، آل علیؓ کے لئے لوگ، اہلِ بیعت کی محبت میں گرفتار لوگ، سب روبرو آتے ہیں تو گھبرا جاتے ہیں مگر یہ زندانی دوسروں سے مختلف ہے۔" وہ سانس لینے کو رکے۔

حامد نے خوش ہو کر کہا: "تو اس کا انجام بھی دوسروں سے مختلف ہو گا۔ اس کو دار پر لٹکانے سے قبل ہم اس کو مُثلہ کریں گے۔ مجھے اس کی آنکھوں کے آنسو اور درد سے زرد پڑتا چہرہ بے پناہ خوشی دیں گے۔ قاضی ابو عمر! زندگی میں ایک بار تو مجھے خوش ہونے کا حق ہے۔ ہے نا!"

قاضی ابو عمر بیٹھے سے ایک دم کھڑے ہو گئے۔ "نہیں ہرگز نہیں۔ بخدا ہرگز نہیں۔"

حامد نے کہا: "یہ دیکھئے۔" اس نے کاغذ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ "سنگسار کرنے، مثلہ کرنے۔ اس سے پہلے ایک ہزار کوڑے مارے جانے اور آخر پر دار پر لٹکائے جانے کے احکامات ہیں۔ آپ پہچانتے ہیں نا خلیفہ کی مہر؟" اس نے کاغذ ان کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

''ایک ہی آدمی کے لئے اتنی بہت سی سزائیں۔'' قاضی نے کانپ کر کہا۔

''ہاں جرعہ جرعہ شراب کی طرح ایک ایک قدم موت اس کی طرف بڑھے گی تو کتنی اذیت ناک ہو گی۔'' حامد ہنسا اور صراحی سے اس نے نبیذ جام میں انڈیلی کیونکہ شب کی اس ساعت وہ دونوں اکیلے تھے اور دجلہ کی طرف کھلنے والے اونچے دریچوں سے باہر پوری دنیا تھی جو اس اذیت ناک لمحے پر گواہ اور عینی شاہد ہونے والی تھی۔

''تم اس موت سے اس قدر لذت محسوس کر رہے ہو جیسے ساری عمر تم نے اس کا انتظار کیا ہو۔'' قاضی ابو عمر بہت بدمزہ ہو رہا تھا۔

''یونہی سمجھ لیجئے۔'' حامد نے اٹھ کر وسیع نشست گاہ میں ٹہلتے ہوئے کہا:

''مگر کیوں۔ آخر کیوں۔ تم زندگی میں نہایت بامراد' کامیاب' بااختیار آدمی ہو اور وہ ایک فقیرِ بے نوا۔''

''اس کی بے نوائی میری کئی کامیاب زندگیوں پر حاوی ہے۔ میرا بااختیار ہونا کبھی اس کا مسئلہ نہیں رہا۔ اس لئے کہ اس نے جو اختیار مجھ پر حاصل کیا۔ گو محض اتفاق ہو گا مگر میری زندگی کو ریزہ ریزہ کر گیا۔ میری زندگی نامراد و ناکام رہی اور وہ کامگار و بامراد ہوا۔'' حامد اب تیز تیز بول رہا تھا۔

''میں اس سے ملا ہوں۔ مجھے تو حبّ جاہ اور حبّ دنیا دونوں میں سے ایک خواہش بھی اس میں نظر نہیں آئی۔ وہ تو موت کا طلب گار اور اس سے محبت کرنے والا ہے۔ وہ تو آزاد آدمی ہے۔ آزاد آپ سمجھتے ہیں نا۔'' پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر قاضی ابو عمر نے کہا۔

''اس کا ایک قدم عقبٰی پر ہے اور ایک دنیا پر' حامد اسے کسی بات کی پرواہ نہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ تم اس کی موت کو قریب لا کر اس کی آرزو پوری کرو گے اور اس کا خونِ ناحق تمہاری گردن پر ہو گا۔'' وہ چپ ہو گئے۔

''آپ نے خود ''حلال الدم'' کہا تھا اور اب آپ اپنے الفاظ واپس نہیں لے سکتے۔ اُسے معاف نہیں کر سکتے۔ اسے زندگی لوٹا نہیں سکتے۔ ہرگز نہیں بخدا ہرگز نہیں۔'' حامد بہت آہستہ آہستہ زیرِ لب بات کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور اس کی آنکھوں میں اور سر پر سیاہی امنڈی ہوئی لگتی تھی جیسے اس کے اندر کہیں سیاہ رات کروٹیں لے

رہی ہو اور زمزمۂ موت کی گنگناہٹ اس کے خون میں ہو۔

قاضی ابو عمر سحر زدہ سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

''کل کا دن اسے دار پر دیکھے گا اور آپ بطور گواہ وہاں موجود ہوں گے کہ ہر کام اسی طرح انجام پایا جس طرح میں نے چاہا ہے۔ ہاں میں چاہتا ہوں اس کی ہڈیوں میں اتنے چھید ہوں جیسے نئے میں ہوتے ہیں۔ اس کا گوشت ریشہ ریشہ کاٹا جائے اور اس کو اتنی بے پناہ اذیت ہو کہ دشتِ سماویہ تک اس کی آواز پہنچے۔ قبروں میں سونے والے جاگ اٹھیں اور ماتم کریں اور ان کی سینہ کوبی کی آوازیں مشرق سے مغرب تک ہر جگہ سنائی دیں۔ کبھی بھلائی نہ جاسکیں۔ دنیا اس کی کرب ناک چیخوں سے گونجتی رہے۔ گونجتی ہی رہے۔ کوئی زمانہ کوئی وقت کبھی اس اذیت کو بھلا نہ سکے۔ قطرہ قطرہ اس کا خون جس جگہ گرے وہاں ہمیشہ کے لئے ٹھہرا رہے۔ ساعت بہ ساعت اس کا سانس اکھڑے اور ہوائیں اسے اقصائے عالم میں لے جائیں وہ ایک ہمیشگی کی چیخ بن کر زندہ رہے۔ ہاں قاضی ابو عمر! یہ آپ کا نبی اور مہدی اور پارسا۔ یہ اغول کا روح اللہ۔''

''بخدا تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو وزیرِ مملکت۔ میں بغداد کا قاضی القضاۃ ہرگز اس حکم کی تعمیل نہیں کروں گا۔ کیونکہ دار پر لٹکائے جانے کا مطلب یہ ساری اذیتیں ہرگز نہیں۔ یہ اس حکم میں اس فتویٰ میں بعد میں لکھا گیا ہے۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے قاضی ابو عمر۔ دار تو بذاتِ خود ایک اذیت ہے۔ ایک دم مرنے کی جگہ۔ وہ ہولے ہولے مٹے گا۔ عذاب سے نجات کی دعا کرے گا تو رحمتِ خداوندی جوش میں آئے گی۔ وہ آپ کا مردِ صالح' عالمِ ربانی' انا الحق کہنے والا دیوانہ۔''

''مجھے یہ سمجھ نہیں آئی اس لمحے تک کہ تم اس کی موت کے اس شدت سے طلب گار کیوں ہو___؟''

''یہ راز آپ پر کبھی کھل نہیں سکے گا۔'' حامد نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ لئے اور نشست پر پیچھے کی طرف سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''اچھا۔ اب اجازت طلب کروں گا۔'' قاضی ابو عمر نے یک بیک اٹھتے ہوئے کہا۔

حامد کے سُتے ہوئے زرد چہرے پر طمانیت تھی۔ اس نے سر کے اشارے سے

اجازت دے دی۔ پھر پردوں کے پیچھے سے ایک کے بعد ایک دروازے کھلتے چلے گئے اور باہر نکل کر قاضی ابو عمر نے کہا۔ ''اور مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ اس قصر میں زندگی نہیں، موت مکین ہے ___ یہ قضا کا عہدہ جو حامد کا احسان ہے میں اس کو لوٹا دوں گا۔ زندگی پر موت کا یہ اختیار مجھے ہرگز پسند نہیں۔ زندگی پر موت کی بادشاہت۔ آدمی پر آدمی کا اتنا اختیار۔''

اور حامد نے اس کے جانے کے بعد دریچے میں سے جھانک کر باہر اترتی ہوئی رات کو دیکھا تو اجالوں میں سے اندھیرے کی ردا پھیلائے محوِ پرواز تھی اور اکیلے تارے سہمے ہوئے بچوں کی طرح کہیں کہیں جھانک رہے تھے۔ ہوا تھکی تھکی اور پریشان تھی جو کونوں اور کنجوں میں بیٹھ کر دل کا غبار نکالنے کے لئے گریہ کرنا چاہتی تھی اور زمین کے اندر دور کہیں ایک زمزمہ سا سنائی دے رہا تھا۔ گنگناہٹ جیسے عناصر کسی ترتیبِ نو میں مصروف ہوں اور کسی قصر دلفریب کی تعمیر ہو رہی ہو۔ استقبال کی تیاریوں کے باعث کنارِ دجلہ روغن اور روشنیوں سے آراستہ کئے گئے تھے اور عکس پانی میں بہتا ہوا آسمان لگتا تھا جو بادلوں نے اڑایا ہو اور پھریریوں کی طرح لہرایا گیا ہو اور سنوارا اور نیچے اتارا گیا ہو۔

یہ بغداد کی عام معمولی رات تھی۔

کیا یہ باقی راتوں کی سی رات تھی؟

وہ عزازیل تھا میرے بھائی کہ وہ راندۂ درگاہِ خداوندی تھا
وہ اپنی ازلی تقدیس سے دھکیلا گیا
وہ اپنے آغاز سے اپنے انجام کی طرف لوٹایا نہیں گیا
کیونکہ وہ اپنے انجام سے آزاد نہیں ہوا
اس پر اپنے آغاز سے لعنت کی گئی
اور وہ پیاس کی شدت سے اس جگہ تڑپایا گیا جہاں ہر طرف جھیلیں شفاف پانی سے لبریز تھیں
وہ عذاب میں چیختا رہا کیونکہ آگ نے اسے جلایا
اس کا خوف محض بہانہ تھا
وہ اپنے غرور میں اندھا تھا
اور اس لیے وہ جہاں پر ہے وہاں ہے

حسین کو اس زندان میں اپنے انجام کا انتظار تھا کہ اس نے ایک عظیم سائے کو سلاخوں پر محیط ہوتے محسوس کیا جیسے بادل سورج کے سامنے آجائے۔ پھر وہ ازلی قدیم مگر گھٹی گھٹی آواز آئی:

"تم انا الحق کہتے ہو اور تمہارا انجام دار ہو گا۔"

"کیا تم اپنے انجام سے باخبر نہ تھے۔" حسین نے پوچھا۔

"عرشیوں میں سے صرف میں ہی باخبر تھا اور میں راندۂ درگاہ قرار دیا گیا۔ تم

بھی غرورِ ذات سے انا الحق کہتے تھے اور تم شہید قرار دیئے جاؤ گے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

سایہ سکڑ گیا یہاں تک کہ ایک سلاخ تک بھی پہنچ نہیں پا تا تھا۔

"تم بھی شہیدِ ازل ہو مگر تم نے اپنے آپ کو ہر حکم سے بالاتر سمجھ لیا تھا۔ میری محبت میں نیاز تھا اور تمہاری محبت میں ناز اور وہ جو کسی لفظ اور کسی تقدیس کے بیان کئے جانے کا محتاج نہیں وہ نہ نیاز جانتا ہے نہ ناز اسے جو پسند آ جائے۔ کیا تم اپنے آپ کو اس درمیان سے نکال نہ سکتے تھے۔"

"نہیں حسین ابنِ منصور۔ یہ مشیت تھی۔ اگر وہ چاہتا تو سب ممکن تھا۔ اس نے مجھے اپنی بادشاہت سے نکال دیا تو کیا ہے۔ مجھ سے بڑھ کو اس کا چاہنے والا کون ہے۔" اس کی آواز کے تمسخر کو حسین نے محسوس کیا اور کہا:

"نہیں۔ مجھے چاہت کا دعویٰ نہیں۔ مجھے تو کوئی دعویٰ ہی نہیں۔ ہاں تمہارے اور میرے شوق میں فرق ہے میرا شوق گھاس کی پتی کی آروز ہے۔ تپاں! لرزاں اور بس!"

وہ افسوس زدہ سا کوئی جواب دیئے بنا وہاں کھڑا رہا۔ روشنی اور اندھیرے کے سنگم پر ایک ذرے کی طرح جس کی کُل کائنات اس کا اپنا آپ ہی تھا۔ اس کی بد صورتی میں ازلی حسن کی ایک جھلک سی تھی۔ موہوم سا شائبہ۔ جھکا ہوا، آوارہ بہ دل آوارہ بہ جاں۔ مقامِ پرواز کی زخمی یادوں کو لئے ہوئے۔

"وہ حق کے لئے انا الحق کو دار آویزاں کریں گے۔ بغداد کے جسرالاعلیٰ پر تمہاری لاش جھولتی رہے گی۔" اس نے ایک اور وار کیا۔

"نہیں۔ تم انا کے لئے دھکیلے گئے تھے۔ میں تو کہیں نہیں ہوں۔ سب طرف وہ ہی وہ ہے جلوۂ جاناں۔ خود جاناں۔ یہ ظاہر کی آنکھ ہے جو دیکھتی ہے۔ یہ ظاہر کے کان ہیں جو سنتے ہیں یہ شریعت ہے جس سے ابا کرنے والے کو دار پر کھینچا جاتا ہے اور خوب ہی کھینچا جاتا ہے۔ کیا تم منزلِ شوق میں نہیں ہو؟"

"مجھے اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں۔" اس نے یونہی کہا۔

"اپنے ساتھ نہیں۔ انا کے ساتھ نہیں۔ انا کے بغیر تم تو رازداں ہو۔" حسین

کو گلیارے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔

''الوداع۔ اب ہم کبھی نہیں مل سکیں گے۔''

''الوداع ـــــ حسین نے سلاخوں کے پار دیکھا۔ وہ نہایت افسردہ پژمردہ واپس جارہا تھا۔

در کھلے ـــــ سلاخیں کھلیں ـــــ آزادی کا وقت آ گیا تھا بالآخر!

خلقت کا اژدھام تھا اور جلاد کوڑا لئے کھڑا تھا۔ حسین کی پیٹھ جو محض استخوان تھی، ننگی کی گئی۔ آہ و بکا کی صدائیں برابر آرہی تھیں۔ اس کی پوتیاں، اس کے بیٹے، ان کے دوست اور جانے کون کون رو رہا تھا۔ دیوانے کو کلمۂ کفر کہنے کی سزا دی جارہی تھی۔

حبشی نے چمڑے کا لباس پہن رکھا تھا اور آندھی کے شور میں جو طوفان کی صورت اختیار کرتی جارہی تھی نہایت استقلال سے کھڑا تھا اور بہت خوفناک نظر آتا تھا۔ یہ شاہی جلاد تھا جسے محض بغاوت کرنے والوں کو سزا دینے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ حکومتِ وقت اور خلیفۂ وقت کے خلاف بغاوت کے جرم میں جو پکڑے جائیں ان پر وہ صاعقۂ قہرِ بلا بن کر گرتا تھا۔ اس کی آنکھیں پیدائشی سرخ تھیں کہ ان میں خون اترا ہوا لگتا تھا۔ وہ ظالم تھا اور ہر وقت شراب کے نشے میں دُھت رہتا تھا۔ وہ پانی کی جگہ بھی مئے ارغوانی پیتا تھا کہ اس کے منہ میں جو خون کا ذائقہ جم گیا ہے اس کی تلخی کچھ کم ہو۔ حلقوم سے لے کر معدے تک ایک خراب ذائقہ جم گیا تھا اس لئے وہ گھڑی گھڑی تھوکتا تھا۔ ایک غرغراہٹ سے جو اسے نہایت خوفناک بنادیتی تھی۔

سیاوش کی بھنویں اس کے پپوٹوں کو ڈھانپے تھیں اور دو آدمی اسے اپنے کندھوں پر اٹھائے تھے۔ اسے دکھائی نہیں دیتا تھا مگر کوڑوں کی آوازیں جیسے کسی دیوار پر مارے جارہے ہوں اسے برابر سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اس نے نالہ کیا:

''آہ پوتے۔ اسلام نے تم کو یہ دیا۔ کیا بُرا انجام ہے۔''

حسین نے اس شور میں جانے اس کی آواز کیسے سن لی کہ ہنسا اور زور سے کہا:

"دادا۔ میں نے خُوب تر صلہ پایا ہے تم رنجیدہ مت ہو۔ میں بہت مزے میں ہوں۔"

کوڑے کے لہرانے کی آواز جیسے سانپ کی پھنکار ہو اور حبشی کی ہانپتی ہوئی سانسیں جیسے ساز بجایا جا رہا ہو ـــــ پتہ نہیں دیوانہ چیخ کیوں نہیں رہا تھا۔ نالہ و بکا کیوں نہیں کرتا! کوڑے کو اور لہراؤ۔ شدت اور شدت۔ تلخ تر اپنی پوری قوت لگاؤ ـــــ حبشی کے اندر عجیب پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ اس کا دل گھنٹے کی طرح تیز چل رہا تھا اور آندھی کا شور بڑھ رہا تھا۔ ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ تماشا دیکھنے والے حیران تھے کہ دیوانہ خاموش تھا۔ کیا اس کے اندر خروش کو ضربوں نے زخمی کر دیا تھا؟

"انا الحق کہتے ہو" ـــــ حبشی نے اپنے کانوں میں پڑے بالے نوچ کر پھینک دیئے۔ اپنے سر پر منڈھی چمڑے کی ٹوپی اتار کر الگ کر دی۔ اس کے گھنگھریالے سیاہ بال لہرا گئے اور اس پر دیوانگی سوار ہو گئی۔ ضربوں کی شدت اسے اپنے جسم پر محسوس ہو رہی تھی مگر زخموں سے رِستے خون کے باوجود آہ کیوں نہیں کرتا۔ ہاں میں اس لَے کو اور تیز کر دوں گا ـــــ آہوں کا نغمہ کیوں سنائی نہیں دیتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوڑوں کے ساتھ وہ خود اس ناتواں جسم کے ساتھ ٹکرا رہا تھا اور دلدوز آہوں کے ساتھ اپنے سے بیگانہ وہ کوڑے لہرا رہا تھا اس نغمگی کو جو ہوا کے کمنچے پر کوڑے کے مضراب سے بجائی جا رہی تھی وہ سن رہا تھا۔ اور تیز اور تیز ـــــ اس کا بدن ایک دائرے کی طرح تھا جس کے اندر وہ قید تھا اور جس سے باہر نکلنے کے لیے اسے حسین کی آواز کا سہارا چاہیے تھا جو اسے مل نہیں رہا تھا۔

حسن کی بیٹیاں بے ہوش ہو گئیں۔ نالہ و بکا کی آوازیں آندھی کے ساتھ مل کر سارے بغداد پر' اس کے محلوں پر' اس کے گلیاروں اور بازاروں میں' شاہراہوں پر گھومیں۔ انہوں نے سیر کرنے والوں کو ہراساں کیا۔ سرائے میں سوداگروں کو پریشان کیا۔ دشتِ سُوس کی سرخ اور زرد اور سیاہ ریت فوج کی طرح اپنے ذرات کے ساتھ اس عروس البلاد پر حملہ آور ہوئی۔ حسین بن منصور کو دھنکی کا گیت تُستر کی ہوا نے سنایا ـــــ

از پئے جاناںِ جاں ہم رفت

مقتدر اپنے ایوان در ایوان محل میں رومی سفارت کو شرفِ باریابی بخش رہا تھا جب اس کے کانوں نے ایک آواز سنی۔ اونچی دیواروں اور فصیلوں اور مسافت کی دوری کے باوجود پتہ نہیں کیونکر سراپردوں اور بارگاہوں سے گزر کر جہاں ہوا کا گزر بھی ممکن نہیں ہوتا۔ یہ صدا اس تک پہنچی تھی ـــ شغب اپنے محل میں ماتم کناں' اپنی بے بسی پر مضطرب اور سینہ کوبی کر رہی تھی۔

حامد نے اس سے بدلہ لے لیا تھا مگر وہ اتنا طاقتور کب سے ہو گیا تھا؟

آدمی کیونکر آدمی کا مالک ہو جاتا تھا۔ اس کی جان لینے پر قادر۔ آخر کیوں۔ آخری کیوں؟

کنیزیں اور لونڈیاں رو رہی تھیں جیسے کوڑوں کی نغمگی انہیں رُلا رہی ہو۔

حسین بن منصور دیوانہ تھا تو سہی مگر کیسا دیوانہ تھا کہ کوڑوں کے باوجود ہنستا تھا اور جب خروش میں اس کی جان آرام پاتی تو انا الحق کہتا تھا۔

نصر حاجب کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ خلیفہ نے محسوس کیا کہ وہ غیر حاضر سا تھا اور گرا جاتا تھا۔ وہ ایک نرم خُو' رحمدل دوست نواز حاکم تھا اس لئے نصر کی طبیعت کی خرابی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے اسے جانے کی اجازت دی۔

مقتدر کے گرد دولتِ دنیا اور اپنے جدِّ امجد ماموں کی طرح دوستوں کا مجمع تھا۔ شان و شوکتِ دربار سے رومی سفیر تقریباً نیم بے ہوش ہو گئے تھے۔ اس شہرِ خوبی و محبوبی کو دیکھ کر اس کی رونقوں اور نظاروں سے لطف اندوز ہو کر انہوں نے ہیبت و رعب کو محسوس کیا تھا' مگر یہ سجے سجائے قصر جو محض گزرگاہ تھے کیا خوب تھے۔

عباسی خلفاء کی داستانیں جو ان تک پہنچی تھیں۔ یہ ایک اور ہی دنیا تھی جس سے یورپ ناآشنا تھا۔

ہاں گریہ کی صدا کہاں سے آ رہی تھی؟ انہوں نے گھبرا کر پردوں کی طرف دیکھا جو خلیفہ کے تخت سے دور تنے ہوئے تھے۔ ان پردوں سے پرے کچھ تھا۔

ہوائیں یہ ساری آوازیں اپنے دامن میں سمیٹ کر لا رہی تھیں اور لہریا لبادوں کو سمیٹ کر پھر ادھر کا رخ کرتیں۔ جیسے کسی چٹان کے راہ میں حائل ہو جانے

سے پانی اس کے گرد بڑھنے لگے۔ بھیڑ پُل کے اطراف بڑھ رہی تھی۔ دجلہ سے بڑا ایک دریا تھا کہ لہریں لیتا' سمٹا' پھیلتا اور برستا تھا۔ مجمعے میں سے اکثر لوگ "انا الحق" کہتے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ کُچلے جا رہے تھے۔ گرتے اور اٹھتے تھے۔

بغداد کی شاہراہوں پر رونق بڑھ گئی تھی کیونکہ دیوانہ سخت جان تھا۔ کوڑوں کی شدید ضرب بھی اسے آہ کھینچنے پر مجبور نہ کر سکی تھی۔ وہ زندہ تھا اور "انا الحق" کہہ رہا تھا۔ پھر لوگوں نے محسوس کیا کہ کوڑے کی ہر ضرب انا الحق کہہ رہی تھی۔ اور ہوا فضا سب اس کلمۂ کفر سے معمور ہونے لگی تھی خود حبشی آہ کرنے کی جگہ انا الحق کہہ رہا تھا۔ عجیب بات تھی۔

اطراف سے دور دراز کے علاقوں سے مضافات کی بستیوں سے سراؤں میں ٹھہرے ہوئے مسافر یہ تماشا دیکھنے کے لئے بھاگے آتے تھے۔

فضا میں جب کوڑا لہرایا جاتا تو ہوا کو چیر کر انا الحق سنائی دیتا۔

حامد بن عباس کو خبر کی گئی۔

لوگ آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے: "یہ معجزہ نہیں کہ ہر طرف سے انا الحق گھیرے ہوئے ہے ـــــ!"

کوئی کہتا تھا یہ کلمۂ کفر کیسے جاری و ساری ہو گیا ہے۔ یہ شیطان کا کام ہے۔ اس دیوانے کو ختم کر دینا چاہیے۔ کچھ لوگ یونہی سنگ باری کرنے لگے۔ پھر اور لوگ مل گئے اور سنگ باری تیز ہو گئی۔ پھر بغداد کے آوارہ لونڈوں نے پُل کے اِدھر اُدھر سے دور و نزدیک سے پتھر لا لا کر ڈھیر کرنا شروع کئے۔ وہ ایک تھا اور وہ ایک فوجِ ظفر موج کی طرح اس کے گرد تھے ـــــ

وہ چٹان تھا اور عوام پانی کے ریلے کی طرح اس سے آ کر ٹکراتے اور لوٹ جاتے تھے۔ سنگباری بھی ایک ساز کی آواز کی طرح اپنی لے بدلنے لگی۔ ہر پتھر جو دیوانے سے چُھو جاتا "انا الحق" کہنے لگتا۔

قاضی بہلول اور حامد نے بھی یہ نظارہ کیا۔ شبلی اور ابنِ عطار بھی اس بھیڑ میں کھڑے تھے:

"کیا یہ سنگباری کفر کے خلاف نہیں ہے کہ تم لوگ اس میں حصہ نہیں لیتے۔" قاضی نے سنگریزہ شبلی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "یا شیخ یہ کفر کے خلاف ہے۔ کلمۂ انا الحق اور اس کا کہنے والا سارے فقہا کے فتویٰ سے قابلِ گردن زدنی قرار پایا ہے۔ آپ بھی دیوانے پر پتھر پھینکیں۔"

شبلی نے پھول اٹھایا۔ اس کو اپنے ہاتھ میں تولا۔ نہایت آہستہ سے بازو لہرایا اور حسین بن منصور حلاج کی طرف اس کی پرواز کو دیکھتے رہے۔ سارے سنگ و خشت کے ڈھیر میں یہ واحد ضرب تھی جس کی چبھن نے اسے نہایت مضطرب کیا۔ زخمی نگاہ اور آنکھیں جن سے خون رواں تھا۔ شبلی پر ٹک گئیں۔ پھر وہ چیخ یوں گونجی کہ زمان و مکان نے اسے سنا اور سناٹے میں آ گئے۔

شام یک بیک رات بن گئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

لوگ دیوانے کو پتھروں کے ڈھیروں کو چھوڑ کر گھروں کی طرف پلٹے۔ زخموں سے چور چور محافظوں کے گھیرے میں وہ سخت جان دیوانہ وہ انا الحق سنتا رہا جو اس کے ہر بنِ مُو سے اور ہر اس شے سے جو اس کے گرد تھی نکل رہی تھی۔ یہ نعرۂ مستانہ انا الحق۔

"جو شے مجھے مس کرتی ہے تو اس کو مس کرتی ہے۔"

وہ سیاہ رات اس نے دار کے نیچے نوافل ادا کرنے میں گزاری۔

حسن اپنی بیٹیوں اور بیٹوں کو لے کر بیضا کی طرف لوٹ گیا کیونکہ اس کے لئے کوئی جائے امان نہ تھی کوئی پناہ گاہ نہ تھی۔ حسن نے اتنی بھری پُری دنیا میں جہاں وہ نہایت کامیاب تھا اپنے آپ کو بے آسرا اور تنہا محسوس کیا تھا۔ جن درباداریوں سے وہ سمجھتا تھا اس کی عزت ہے وہ سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے تھے۔ اور اس نے حکومتوں کے لیے اپنے جی میں شدید نفرت محسوس کی۔ ایک دیوانہ کیا لیتا تھا اگر انا الحق کہتا تھا ___ وہ اس کا باپ تھا اور اس کی ساری کوششیں اسے بچانے کے لئے ناکام ہوئی تھیں۔ کسی نے کوئی سفارش نہیں سنی۔ کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ دولت و جاہ کس کام آئے تھے اور جب وقت پڑے پر وہ کام نہیں آ سکتے تھے تو پھر وہ کس کام کے تھے۔

جب ہر شے فنا کی زد میں تھی تو پھر ہستی اور نیستی میں کیا فرق تھا۔
آدمی بیکار تمنائیں اور آرزوئیں اور امیدیں لے کر پھرتا ہے اور مضطرب ہوتا ہے اور آخر میں مارا جاتا تھا۔
مدرسہ نظامیہ کے سارے فقیہ اپنی کھال کو بچانے کی فکر میں وزیر مملکت کے زور سے مرعوب ہو گئے تھے اور انہوں نے اس فتوے پر مہریں ثبت کر دی تھیں جن کے نہ ہونے سے شاید حسین بن منصور بچایا جا سکتا تھا۔
اسے معلوم تھا کہ وہ جسم دار پر لٹکتا رہے گا تاکہ عبرت کا باعث ہو اور حسن یہ دلخراش نظارہ کب دیکھ سکتا تھا۔
سیاوش نے انہی دو آدمیوں کے کندھوں پر اٹھے اٹھے جان دے دی تھی کہ محمی کا دوست اپنی تابِ ظلم و ستم کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی روح مقدس آگ میں واپس مل گئی تھی جس کا وہ حصہ تھا اور ابو یعقوب اقطع نے کانوں کو لپیٹ لیا تھا۔ بھلا ان کا اس دار و گیر اور ہجوم میں کیا کام تھا ـــــ عمرو بن عثمان مکی کہتے تھے: افسوس میری بددعا پوری ہو گئی۔ کاش میں نے وہ لفظ نہ کہے ہوتے ' مگر گنج نامہ پر خبر پا لینے کا انجام بغیر رازِ شاہاں کا امین ہوئے یہی ہو سکتا تھا جو ہو گیا یونہی ہونا مقدر تھا۔
فاطمہ نیشاپوری نے دار کے نیچے محوِ عبادت حسین سے پوچھا:
"یا شیخ۔ تصوف کیا ہے۔"
حسین کی آواز بمشکل اس تک پہنچ پائی۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ ہونٹ ہل رہے تھے اور کہہ رہے تھے:
"جو آج دیکھا اور جو کل دیکھو گے۔"
"آپ لوگوں کے حق میں بددعا کیوں نہیں کرتے۔"
مگر جواب فاطمہ نیشاپوری تک پہنچ نہیں پایا۔ کیونکہ عناصر مل کر انا الحق کہہ رہے تھے اور کائنات میں یہی ایک آواز آ رہی تھی۔ انا الحق 'انا الحق!

دوسرا دن طلوع ہی نہیں ہوا کیونکہ اندھیرا بغداد کو گھیرے ہوئے تھا۔ ایک تاریک آندھی جس میں مغرب اور مشرق کی وادیوں اور کوہساروں کی آبِ جُو کی اور بحرِ محیط کی ہوائیں جمع تھیں، مسلسل چل رہی تھی اور ذرہ ذرہ گردیوں تھی جیسے آسمان ریزہ ریزہ ہو کر گر رہا ہو۔ صبح میں نہ پرندوں کی چہکاریں تھیں اور نہ ہی بوئے گل۔ ایسا سناٹا اور اداسی تھی کہ دجلہ اپنے کناروں میں اندھے آئینے کی طرح تھا اور خون کی بُو ہر سُو پھیلی تھی۔ گرم اور تازہ اور جاندار اور نہایت جوشیلے خون کی بُو جس کے ساتھ جلنے کی بساند بھی تھی جیسے آگ پر اسے پکایا جا رہا ہو۔

یہ مُثلہ کئے جانے کی گھڑی تھی اس لئے کہ نوبت کی طرح انا الحق کی صدا جیسے کسی جاں بلب مریض کے آخری سانس کے ساتھ سنائی دے رہی تھی۔

حامد نے کہا: "عمار۔ اگر کوڑے کھانے اور سنگباری کے بعد بھی وہ زندہ رہا ہے تو مثلہ کئے جانے پر بھی وہ شاید جان سے نہ گزرے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔"

عمار نے کہا: "یا سیّدی! جان سے تو وہ کب کا گزر چکا۔ صرف اس کی "انا" زندہ ہے اور وہ حق کو پکارتی ہے۔"

"خوب" حامد نے کہا۔ "خوب۔ انا زندہ ہے اور وہ مُردہ ہے۔ کیا پہیلیوں میں باتیں کرتے ہو۔"

"آقائی سیّدی ورنہ اتنی زحمت اٹھانے کے بعد کوئی ذی روح زندہ رہ سکتا ہے۔" عمار نے کہا۔

"میں اس کی انا کو قتل کروں گا وہ حق کو نہ پکار سکے۔" اس نے مُٹھیاں بھینچ لیں اور دانت پیس کر کہا: "تم دیکھنا کہ جب انا نہیں رہتی تو کچھ بھی نہیں رہتا۔ کچھ نہیں رہے گا اور یہ پکار جو در و دیوار سے 'پست و بلند سے 'خوب و زشت سے آ رہی ہے ختم ہو جائے گی۔"

حبشی نے اس کے پاؤں کاٹے۔ چُھری کُند تھی اور ریشہ ریشہ کٹ رہا تھا۔ نہایت آہستگی سے۔

حسین کا چہرہ زرد تھا۔ وہ اپنی ان بے پناہ آنکھوں سے جو اَب خشک تھیں کہ گریہ وزاری کے انجام تک اپنی منزل کو سامنے دیکھ رہی تھیں۔

"میری ہمت کے پاؤں کاٹ سکو تو جانوں" حسین نے مسکرا کر کہا۔ "جن راہوں سے میرا گزر ہو گا وہاں کی گردِ راہ کا بھی تمہیں اندازہ نہیں۔ ہاں کاٹو اور آہستگی سے تاکہ نس نس کٹے۔" اس نے آقائے رازی کو سامنے دیکھا تو کہا:

"آقائے رازی۔ اتنے زرد رُو کیوں ہو۔ کیا تمہیں دشتِ سُوس کی خوشبو چاروں طرف پھیلی محسوس نہیں ہوتی۔ آج دشت نازاں ہے اور ذرّے رقصاں ہیں۔ آج تو کامگار اور بامراد دن ہے۔ عشقِ تپاں آج اپنی منزل کو پہنچے گا آقائے رازی۔ سنو' ہوا مبارک باد کے نغموں سے یوں بھری ہے جیسے آوازوں سے باجا۔"

آقائے رازی نے آہ وزاری کی اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔ آنسو اس کی سفید داڑھی پر سے گردِ سفر کو دھو رہے تھے۔ وہ ہاتھ مل رہا تھا:

"آہ منصور کا بیٹا کیسا دیوانہ ہو گیا تھا۔ آہ آہ اور آہ۔"

کٹے ہوئے پاؤں میں سے انا الحق کی آواز آتی تھی۔ لوگ ڈر کر بھاگ رہے تھے۔

حامد کا پیغام آیا: اگر وہ اب بھی زندہ ہے تو اس کے بازو کاٹ ڈالو۔"

حبشی نے کہا: میں اب جوڑ جوڑ بند بند کاٹوں گا۔" وہ بھی جوش میں آیا ہوا تھا اور ساری آوازوں کی طرف سے کان بند کیے تھا۔

کٹے ہوئے ہاتھوں سے خون بہتا دیکھا کر اس نے اسے اپنے منہ پر مل لیا۔

آقائے رازی نے کہا: "بخدا میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ یہ کیا کر رہے ہو۔"

"وضو کر رہا ہوں تاکہ نمازِ عشق ادا کر سکوں۔ آقائے رازی کیا عشق مزرعِ زندگی نہیں۔"

"حسین کیا تم اتنے دیوانے ہو کہ تمہیں جان سے گزرنے کا بھی خیال نہیں۔" رازی نے کہا۔

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ یہ جان ہی تو تھی کہ راہ میں حائل تھی۔ اب میں آزاد ہوں۔ میں اور وہ یوں مل گئے ہیں جیسے شراب پانی میں مل جاتی ہے۔"

"حسین۔ حسین۔" فاطمہ نیشاپوری نے اپنے جگر کو تھام کر کہا: "یہ کیا ہے۔"
"یہ تصوف ہے۔ راضی برضا۔ خوش۔ مستعد۔ اس کو پانے کی خوشی میں دیوانہ۔"
"تمہیں تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔" آقائے رازی نے پوچھا۔
"نہیں بخدا نہیں۔ مجھے تکلیف کیوں ہو۔ وہ میرا دوست ہے میں اس کا دوست ہوں۔ ہم میں صرف لاہوت وناسوت کا فرق ہے۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ انا الحق ـــــ"
اس نے اتنے زور سے نعرہ لگایا کہ آسمانوں اور زمینوں اور دجلہ کی لہروں نے مل کر کہا۔ انا الحق' انا الحق۔ اور پھر یہ صدا اطرافِ بغداد سے سنائی دینے لگی۔
"اب وقت اور سوال برابر ہیں۔ جیسا کہ خواجہ حسن بصری نے حطیم میں کہا تھا۔" سمنون محبّ کے دل نے کہا۔
"بے شک بے شک۔ دونوں برابر ہیں۔ سوال بھی اور وقت بھی۔ ہاں خواجہ حسن بصری نے جو فرمایا تھا وہ پورا ہوا۔ میں ساری عمر منتظر رہتا اور میرے سوال کو برابر وقت نہ ملتا تو بھلا پورا ہو سکتا تھا۔ ہاں اے میرے دوست! اب سب برابر ہے اور میرا سوال پورا ہو۔ میں نے تجھ سے تجھے مانگا تھا اور کیا خوب سوال تھا۔ میں بارگاہوں کے باہر منتظر رہا اور میری نگاہ نہیں بھٹکی۔ میری نگاہ کا منتہی تُو تھا۔ انا الحق۔"
جنید نے کہا: "اسے اپنے پر اختیار نہیں تھا کہ اس کا اختیار کسی اور کے ہاتھ میں تھا۔"

قاضی ابو عمر نے کہا: میں اس سے بری الذمہ ہوں اے میرے خدا۔ میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ اس خونِ ناحق کا بوجھ حامد کی گردن پر ہو۔"
"یہ شعبدہ باز جادوگر کہیں موت کو بھی شکست نہ دیدے۔" حامد زخمی جانور کی طرح اپنے خانہ باغ میں گھوم رہا تھا۔ شورِ انا الحق سے گھرا ہوا غلام اسے دم دم کی خبریں دے رہے تھے جب حسین نے خون سے وضو کیا تو حامد نے کہا:
"بے مثال عاشق ہے۔ کیا وقت جذبے کی شدت کو کم نہیں کر دیا کرتا۔"
قاضی ابوالحسین نے کانپ کر کہا: "کہیں ہم سے غلطی تو نہیں ہوئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خدا سے تعلق میں بہت آگے نکل گیا ہو۔"

حامد بہت تلخی سے ہنسا۔ ''خدا کا عشق۔ اس کا کیا ذکر ہے یہاں۔''

قاضی نے نہایت مضطرب ہو کر کہا: ''آپ محسوس نہیں کرتے وزیرِ مملکت کہ کوئی انسانی فانی جذبہ اتنا شدید نہیں ہوتا کہ محبّ اور محبوب ایک ہو جائیں۔'' پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر اس نے کہا: ''آپ یہ صدائے انا الحق سن رہے ہیں۔''

''شعبدہ بازی۔ جادوگری۔ اس کے ختم ہوتے ہی یہ سب ختم ہو جائے گا۔''

اس نے تالی بجائی۔

حبشی نے روش پر قدم رکھا۔

''عمار کو بلاؤ۔ فوراً''

''عمار۔ یہ شورِ قیامت یونہی تھمے گا کہ اس کی گردن اڑا دو۔'' وہ تیزی سے اس روش کی طرف چلنے لگا جہاں فواروں کی ایک لمبی قطار تھی' اور پھوار راستے کو گیلا کرتی تھی۔ درختوں کے سائے میں یہ عجیب سماں تھا۔ مگر اب حامد کو لگا فواروں سے پانی کے ساتھ خون برس رہا ہے۔ پگڈنڈی خون رنگ ہو رہی ہے۔ سائے سکڑ گئے تھے اور ہر صدا آہ و نالہ کی صدا تھی۔

وہ پلٹا اور اس نے قاضی ابوالحسین سے کہا: ''اب سارے جذبے' انسانی اور آفاقی مِٹ جائیں گے۔''

قاضی نے سر کو دائیں بائیں ہلایا جیسے افسوس زدہ ہو مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

آخر یہ سب کیا ہے۔'' حامد نے قریب آ کر پوچھا۔

''کیا۔'' قاضی نے پوچھا۔

''یہی صدائیں اور آہ و نالہ۔ آخر کیوں۔ کیا عناصر اتنے مضطرب ہو جاتے ہیں۔ کیا ہر ذرہ ایک آنکھ بن جاتا ہے کہ اس ایک نظارے کے لئے کھلے۔''

''شاید۔'' ابوالحسین نے زیرِ لب کہا۔

''آپ شاید کیوں کہتے ہیں۔ کیا آپ کو دکھائی نہیں دیتا کہ ہر ہر کونہ قتلِ حسین کی تصویر بنا ہوا ہے۔ دیکھئے اب وہ اس کی گردن کو اڑا رہے ہیں۔ بخدا اس سے بہتر نظارہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

اس نے ایک نعرۂ مستانہ لگایا اور رقص کرنے لگا۔

قاضی ابوالحسین نے نہایت زرد چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور دشتِ سُوس کی فضا میں معلق زرد اور سیاہ اور سرخ ریت بارش کے قطروں کی طرح ٹپ ٹپ اس کے دائیں بائیں گرنے لگی۔ جیسے اس نظارگی سے اس کا تعلق ختم ہو گیا ہو۔ خود یہاں بغداد کے نواح میں اسے اب اور ٹھہرے رہنے کی اجازت نہ ہو۔ جیسے فوج نے محاصرہ اٹھا لیا ہو اور شہرِ ممنوع سے مراجعت کر رہی ہو۔۔۔ ایک قربانی کافی ہو۔ معبدِ ناہید کی آگ کے سامنے ایک ذبیحہ ہی سب کا کفارہ ہو فضا اناالحق کی صداؤں سے یوں بھری تھی جیسے ہر ذرے کو دار پر کھینچا گیا ہو اور اس کے حلق سے گھٹی گھٹی اناالحق کی آواز آ رہی ہو۔ ایک لفظ طبلِ جنگ کی طرح، نوبت کی طرح نقارے کی طرح بجایا جا رہا ہو۔ اعلان کیا جا رہا ہو کہ سب طرف وہی ہے وہی ہے۔ اناالحق، اناالحق!!

جہان اس خونِ ناحق میں ڈوبا ہوا لگتا تھا۔ سنگباری کے پتھر اور حبشی کی کند تلوار اور حسین کے جسم کا ہر بنِ مُو اناالحق پکار رہا تھا۔

آہ و نالہ کرتے لوگوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے اس شہیدِ ازل کے قتل کا نظارہ شوق سے کر رہے تھے اب سینہ کوبی کر رہے تھے۔ بغداد کی گلیاں اور بازار ایک عجیب اداسی سے بھر گئے تھے۔ سارے کاروبار معطل ہو گئے تھے۔ فضا بوجھل اور ہوا دم گھونٹنے والی تھی۔

"کون ہے اس قتلِ بے گناہ کا اصل محرک کون ہے۔" لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھا۔

لوگ گھروں سے نکل کر پُل کی طرف بھاگ رہے تھے۔ دجلہ کے دونوں کنارے ہجومِ خلق سے بے تاب لگتے تھے۔ بوڑھے سر ہلا کر کہتے تھے:

"اس خونِ ناحق کی وجہ سے اب بغداد پر آفت آئے گی۔"

ہراساں عورتیں بے پردہ اپنے بچوں کو سینے سے چمٹائے نکل آئیں:

"کیا قیامت قائم ہو گئی تھی۔"

"اس خونِ ناحق کے ذمہ دار کو دار پر کھینچو۔" سب طرف سے آوازیں آئیں۔

عمار نہایت حواس باختہ بغیر اجازت طلب کئے در آیا:

"مولائی سیّدی۔ وہ حسین بن منصور کے قاتل کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ لگتا ہے قیامت قائم ہو گئی ہے۔ لوگ فساد پر آمادہ ہیں۔"

حامد نے چیخ کر کہا: "جاؤ اور اس کے جسدِ خاکی کو جلادو۔ خاک اڑادو۔ اس کی انا کو میں نے قتل کر دیا ہے۔ اب وہ کیسے حق کو پکارے گی۔" وہ پھر رقص کرنے لگا۔

عمار نے سوچا۔ حامد بن عباس وزیرِ مملکت دیوانہ ہو گیا تھا۔

پھر وہ بھاگا اور اس نے خلقت کے ہجوم کو چیر کر راستہ بنایا۔ پل کے ایک حصے کو توڑ کر جمع کیا اور اس کٹے ہوئے سر بریدہ لاشے کو' ان مُثلہ کئے ہوئے بازوؤں اور پاؤں کو اس ڈھیر پر رکھ کر آگ لگادی۔ ہجوم برابر نعرے لگارہا تھا اور واویلا کر رہا تھا اور ہوا میں شعلے اور چنگاریاں اور ذرے انا الحق پکار رہے تھے۔ اتنی بہت آنکھیں اس پر نگراں تھیں اور محمی کا پوتا حسین خود آتشکدہ بن گیا تھا۔ تاکہ اس آگ کو فروزاں رکھ سکے جو اسے خون کی امانتوں کے طور پر ملی تھی۔ وہ ایک شعلے میں تبدیل ہو رہا تھا کہ خود شعلہ تھا۔ انا الحق کہہ رہا تھا کہ وہ حق تھا۔

انا الحق ـــــ انا الحق ـــــ انا الحق!

کربلا میں رودِ فرات کے کنارے قتلِ حسین کے بعد
بغداد میں رودِ دجلہ کے کنارے قتلِ حسین کے بعد

آقائے رازی قافلے کے ہمراہ دشتِ سُوس کی طرف جا رہا تھا۔ خراسانی سرائے کے باہر وہی شور و غوغا تھا جو الوداع کہنے والوں کے آنسوؤں اور دعاؤں اور رخصت ہونے والوں کی جلد لوٹ آنے کی مناجاتوں سے ترتیب پاتا تھا۔ اونٹ بار کئے جا رہے تھے اور بلبلا رہے تھے۔ خچروں پر سامانِ تجارت 'پانی' مشکیزے اور اسلحہ تھا۔ مضافات سے گھی اور مکھن اور موٹا سوتی کپڑا لے کر عورتیں گھوم رہی تھیں۔ ان کے چہرے نقابوں میں جھم جھماتے تھے اور زندہ جاندار بہت کچھ دیکھتی ہوئی آنکھیں نظر آتی تھیں اور ان پر ستاروں کا گمان ہوتا تھا۔ چاند کسی مسافر کی نیم کشیدہ کمان کی طرح آسمان کی پشت پر معلق تھا۔ ہودوں اور عماریوں میں سوار ہونے والوں کی چہل پہل' بچوں کا شور اور چہکار ایک بڑے میلے کی یاد دلاتی تھی اور شاہراہ پر کئی اور چھوٹے قافلے مختصر فاصلوں کے لئے رواں تھے۔ اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹیں ایک بڑے آہنگ میں شریک ساز کی سی دلنشینی سے بجتی تھی اور حدی خوانوں کے گیت ہوا میں سے آبشار کی طرح گر رہے تھے۔

دشتِ سماویہ میں اغول سوتی تھی۔

دشتِ سُوس میں آندھیوں کی بے قراریوں زرد' سرخ اور سیاہ ریت کے ذروں کو قرار آ گیا تھا۔ اس وقت تک جب تک شعلہ ساماں دل جان سے گزرنے اور جہاں سے گزرنے کا اہتمام نہ کرے جس کی پکار عرش کے کنگوروں کو نہ چھولے اور بارگاہوں

سرا پردوں سے پرے تک نہ پہنچ جائے۔

آبِ دڑ کے کنارے ریشم بُننے والوں کی بستی کے قریب ایک مسجد ہے۔ آقائے رازی نے سوچا' خانقاہ سے نکل کر درویشوں کی کوئی ٹولی اب بھی نماز میں شامل ہو اور پھر اپنے غرفلوں کو سمیٹ کر کلاہ تھامے ان میں سے ایک انگلی اٹھا کر کہے:

عشق مزرعِ گلاب ہے

عشق مزرعِ زندگی ہے

محّی کے پوتے اور منصور کے بیٹے کے لئے کیوں عشق مزرعِ گلاب نہیں بنا؟ــــ مزرعِ زندگی نہیں تھا؟ــــ اسے سارے جہان میں دُھنکیوں کا گیت ہی سنائی دیا:

از پئے جاناں جاں ہم رفت

جاں ہم رفت و جاں ہم رفت

"بے شک یہ اپنا اپنا مقدر ہے کہ عشق کہیں مزرعِ زندگی ہے اور کہیں جان سے گزرنے کا نام!"